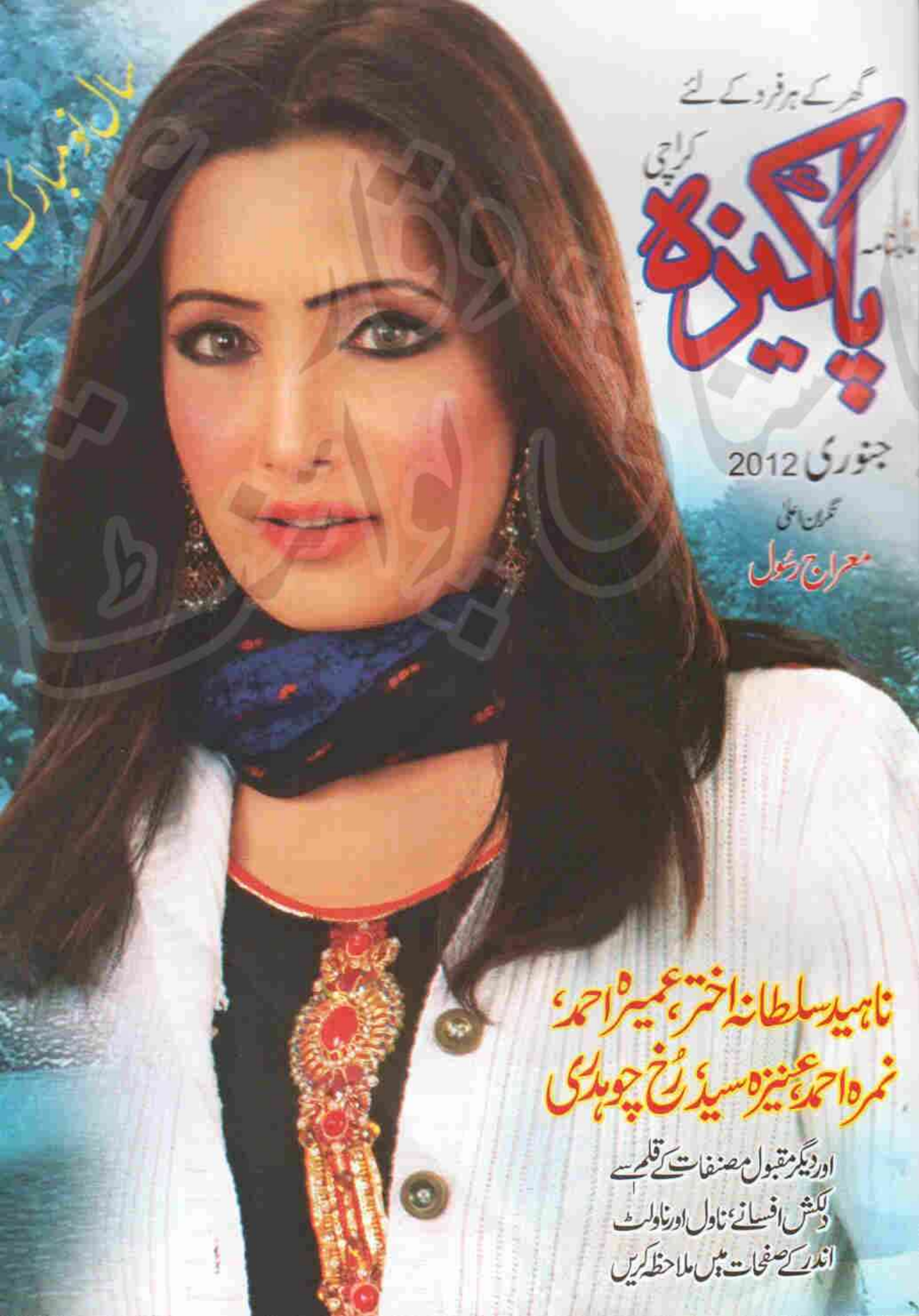


گھر کے ہر فرد کے لئے
ماہنامہ
پاکیزہ
کراچی
سال نو مبارک
جنوری 2012
نگرانِ اعلیٰ
معراج رسول
ناہید سلطانہ اختر، عمیرہ احمد،
نمرہ احمد، عنیزہ سید، رُخ چوہدری
اور دیگر مقبول مصنفات کے قلم سے
دلکش افسانے، ناول اور ناولٹ
اندر کے صفحات میں ملاحظہ کریں

مدیرۂ اعلیٰ: عذرا رسول
مدیرہ: انجم انصار .... معاون: آمنہ حماد

اداریہ

سلسلے وار ناول

ناولٹ

افسانے

خصوصی مضامین

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول • مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس کمرشل ایریا، مین کورنگی روڈ، کراچی 75500
پرنٹر [illegible] ل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی



مستقل عنوانات

شعبہ اشتہارات
منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789 نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391
نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0332-4214400 رانا اے حمید 0323-2895528

جلد 39 • شمارہ 10 • جنوری 2012 • زر سالانہ 600 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 50 روپے •
پتا: پوسٹ بکس نمبر 662 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

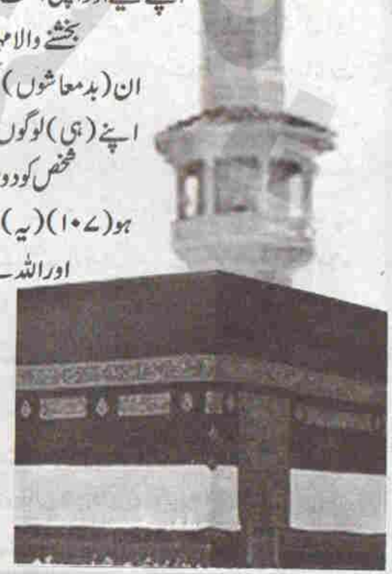
مجھے کچھ کہنا ہے......!

وقت میں اب برکت نہیں رہی ہے 2011ء یوں گزر گیا جیسے تیز ہوا کا کوئی جھکڑ......سال گزشتہ کسی بھی ہم وطن کے لیے اجتماعی طور پر خوشیوں کا سال ثابت نہیں ہوسکا۔ مہنگائی کے بڑھتے ہوئے گراف نے تمام شہریوں کی جان عذاب میں رکھی۔ بدامنی اور لوٹ مار نے سب کو ہی حراساں رکھا۔ بڑے شہروں میں کوئی گھرانہ بھی ایسا نہیں ہوگا جس کا سرراہ موبائل اور پرس نہ چھینا گیا ہو۔ سیاست دانوں کے بیانات اس سال بھی لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے۔ رشتے ناتے تاش کے پتوں کی طرح ہو گئے ......وگی نے اکے تک کو کاٹ دیا۔ محبت اور مروت کے لحاظ سے بھی یہ سال خسارے کا رہا۔ بہتان اور دشنام طرازیاں گھروں سے نکل کر ملکی اور غیر ملکی سیاست تک پر چھا گئیں۔ جھوٹ اور سفید جھوٹ نے اچھے اچھے بااعتبار شخصیات کے بلندی کے مینار دھڑام سے گرادیے۔ یہ ہمیں ماننا پڑے گا 2011ء میں لوگوں نے ایک دوسرے کو نیچا اور کم تر ثابت کرنے کے لیے خاصی محنت کی۔ اگر وہ اتنی محنت اپنی عزت بڑھانے کے لیے کرتے تو شاید اس کا انہیں فائدہ بھی ہوجاتا کہ عزت و دولت دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ نیا اسلامی سال شروع ہو چکا ہے اور نیا عیسوی سال بھی بس شروع ہونے کو ہے۔ ہماری یہ دلی دعا ہے کہ نئے سال کا ہر دن اور اس کا ایک ایک پل اللہ تعالیٰ کی رحمتوں اور نعمتوں کے ساتھ گزرے، آمین ......اور آپ سے یہ بھی کہنا ہے کہ نئے سال کے لیے اگر آپ یہ اپنے آپ سے وعدہ کرلیں کہ اپنی ذات سے اگر کسی کو خوشی نہیں دے سکتیں تو اسے دکھ بھی نہیں دینا ہے تو شاید ہمارے ملک میں خزاں کا موسم اتنا طویل نہ رہے، کیا خیال ہے......؟

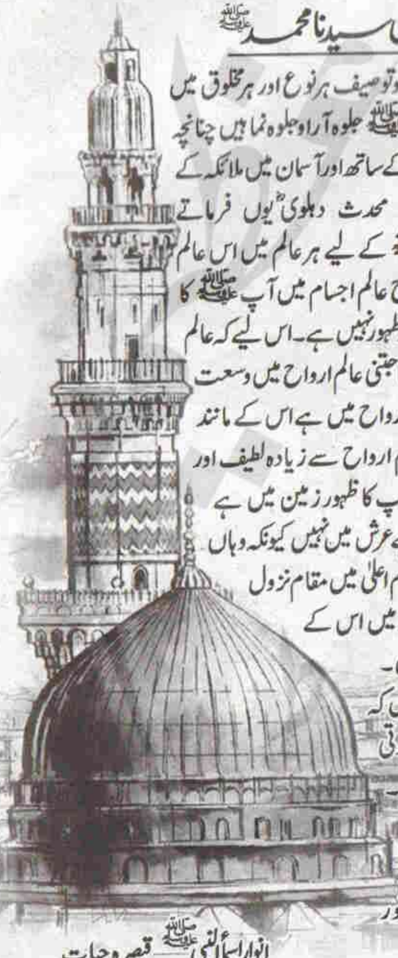
مدیرہ
انجم انصار

اور (اے مسلمانو) کافروں کے تعاقب میں سستی نہ کرو اگر تم تھک گئے ہو تو بے شک جیسے تم تھکے ہو وہ (بھی) تھک چکے ہیں اور (تم کو اتنی قوت بھی ہے کہ) تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں اور اللہ دانا (اور) حکمت والا ہے (۱۰۴) بے شک (اے نبی ﷺ) ہم نے (یہ مقدس) کتاب تمہاری طرف سچائی کے ساتھ اتاری ہے تاکہ تم اس کے موافق جو اللہ نے تمہیں تعلیم کیا ہے لوگوں (کے جھگڑوں) میں فیصلہ کرو اور (خبردار) تم خیانت کرنے والوں کے حمایتی نہ بننا (۱۰۵) اور (آپ ﷺ اپنے لیے اور اپنی امت کے لیے) اللہ سے معافی مانگو بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے (۱۰۶) اور (اے نبی ﷺ) تم ان (بدمعاشوں) کی طرف (ہو کر لوگوں) سے جھگڑا نہ کرو جو اپنے (ہی) لوگوں سے دغابازی کرتے ہیں بے شک اللہ اس شخص کو دوست نہیں رکھتا جو خیانت کرنے والا گناہ گار ہو (۱۰۷) (یہ) لوگوں سے تو (اپنی شرارتیں) چھپاتے ہیں اور اللہ سے نہیں چھپاتے اور (اس سے کیسے چھپا سکتے ہیں) وہ (تو) اس وقت ان کے ساتھ (ہوتا) ہے جب وہ راتوں کو ان باتوں کے مشورے کرتے ہیں جن کو اللہ پسند نہیں کرتا اور اللہ ان (تمام) کاموں کو جو وہ کرتے ہیں احاطہ کیے ہوئے ہے (۱۰۸)

(سورۂ نسا آیت نمبر ۱۰۴ تا ۱۰۸)



آنحضرت ﷺ کے اسمائے گرامی سیدنا محمد ﷺ

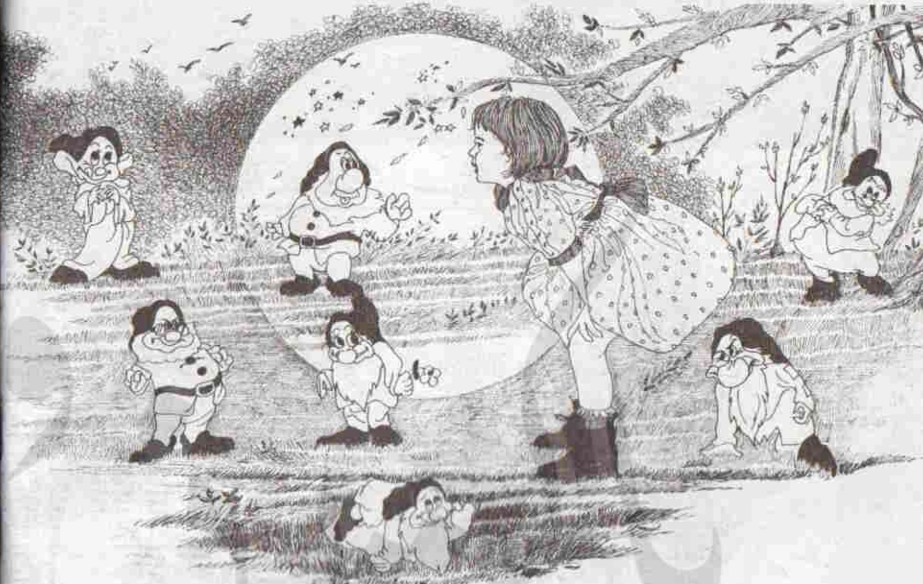


۵۔ سیدنا حضور ﷺ کی تعریف و توصیف ہر نوع اور ہر مخلوق میں جاری و ساری ہے اور ہر نوع میں آپ ﷺ جلوہ آرا و جلوہ نما ہیں چنانچہ زمین پر بشر کے ساتھ ہوا میں پرندوں کے ساتھ اور آسمان میں ملائکہ کے ساتھ۔ اس کی تشریح شیخ عبدالحق محدث دہلویؒ یوں فرماتے ہیں۔ "واضح رہے کہ حقیقت محمدی ﷺ کے لیے ہر عالم میں اس عالم کے مطابق ایک ظہور ہے لہٰذا جس طرح عالم اجسام میں آپ ﷺ کا ظہور ہے، عالم ارواح میں اس کے مانند ظہور نہیں ہے۔ اس لیے کہ عالم اجسام تنگ ہے اور اتنی وسعت نہیں رکھتا جتنی عالم ارواح میں وسعت ہے آپ ﷺ کا ظہور جس طرح عالم ارواح میں ہے اس کے مانند عالم معنی میں نہیں اس لیے عالم معنی عالم ارواح سے زیادہ لطیف اور زیادہ وسیع ہے۔ اس لیے جس طرح آپ کا ظہور زمین میں ہے آسمان میں نہیں اور جیسا آسمان میں ہے عرش میں نہیں کیونکہ وہاں این و کیف نہیں لہٰذا حضور ﷺ کا ہر مقام اعلیٰ میں مقام نزول سے اکمل و اتم ظہور ہوتا ہے اور ہر ظہور میں اس کے مطابق خاص جلالت اور ہیبت و اسرار ہیں۔

۶۔ حضرت امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ اگر حضرت ﷺ کی ذات اقدس نہ ہوتی تو پھر کائنات کی کوئی چیز تخلیق نہ ہوتی۔ آپ ﷺ کی ذات وہ ذات مقدسہ ہے کہ آپ ﷺ کے نور سے چاند کو روشنی ملی اور سورج بھی آپ ﷺ کے نور سے روشن ہے۔

انوار اسماء النبی ﷺ ——— قیصرہ حیات





قسط 06

عکس

عمیرہ احمد

آج کی زندگی تیز رفتار ہے، اس کے تجربے بڑی تیزی سے کرداروں کے نئے رخ سے متعارف کراتے ہیں۔ اس تیز رفتار زندگی میں چونکادینے والے موڑ بھی ہوتے ہیں... اور پُراسراریت بھی ... کہیں کرداروں کے حوالے سے تو کبھی ماحول کے حوالے سے... عمیرہ احمد کے اس ناول میں نہ صرف آپ تیز ترین، سنسنی خیز اور چونکادینے والے موڑ دیکھیں گے بلکہ ان کی ماہرانہ چابک دستی کے ساتھ ان کے کرداروں کی تہ داری کے بھی قائل ہو جائیں گے... یوں بھی اپنا عکس اور اپنا سایہ ہر شخص کے ساتھ رہتا ہے... مگر ان کی کہانیاں جدا جدا ہوتی ہیں... کہیں ایسا تو نہیں... ہماری یہ مایہ ناز مصنفہ... کوئی ایسا ناسور دکھانا چاہتی ہیں... جس کا آپریشن بھی ضروری ہو... بقول شاعر...

اس کائنات محبت میں ہم مثل شمس و قمر کے ہیں
اِک رابطہ مسلسل ہے اِک فاصلہ مسلسل ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

شیر دل ڈپٹی کمشنر کی پوسٹ پر فائز تھا اس کو سرکاری رہائش گاہ کے طور پر جو گھر ملتا ہے اس کے بارے میں بہت سی باتیں مشہور تھیں کہ وہاں کئی بونے مقیم ہیں۔ شیر دل کی بیوی شہر بانو ان سب باتوں سے بہت خوفزدہ ہو جاتی ہے لیکن جب انہوں نے وہاں سکونت اختیار کی تو ایسی کوئی بات سامنے نہیں آئی۔ ایک دن شیر دل اپنے سینئر اختر درانی کے گھر کھانے پر مدعو تھا۔ اختر درانی کی بیوی تزئین، شہر بانو کو بتاتی ہے کہ پہلے کسی آفیسر کی بیوی نے اس گھر میں اپنے شوہر کو مار کر خودکشی کرلی تھی اس لیے وہاں رہنے والوں کی ازدواجی زندگی مشکلات کی زد میں آجاتی ہے۔ تزئین کے پوچھنے پر کہ ان کی شادی لومیرج کا نتیجہ ہے...... یہ بات سن کر شہر بانو ماضی کی خوب صورت یادوں میں کھو جاتی ہے...... جہاں صرف وہ اور شیر دل ہوتے ہیں...... دونوں کی ذہنی ہم آہنگی انہیں شادی کے بندھن میں جکڑ دیتی ہے۔ ہاجرہ اور اس کے شوہر...... نے اپنے بیٹے کو پڑھا لکھا کر ایک بڑا آدمی بنانے کا خواب دیکھا۔ خیر دین میٹرک کے بعد کوئی اور نوکری تو نہ کر سکا لیکن ڈی سی ہاؤس میں کک کی نوکری کرنے لگا۔ خیر دین کی ایک ہی بیٹی تھی حلیمہ جسے طلاق ہو جاتی ہے۔ خیر دین اس کی دوسری شادی کرا دیتا ہے جس سے اس کی ایک بیٹی تولد ہوتی ہے...... لیکن کچھ ہی عرصے بعد حلیمہ کے شوہر کا انتقال ہو جاتا ہے...... یوں حلیمہ اور چڑیا خیر دین کے ساتھ اس ڈی سی ہاؤس میں رہنے لگتی ہیں۔ چڑیا کو جب اس گھر میں بونوں کے بارے میں پتا چلتا ہے تو وہ اپنی خیالی دنیا میں ان کے خاکے بنا لیتی ہے، ان سے باتیں کرتی رہتی ہے۔ اس نے ان بونوں کو مختلف نام بھی دیے، وہ ہر وقت ان کی کھوج میں رہتی ہے تاکہ وہ ان سے دوستی کر سکے۔ نئے صاحب کو یہ پسند نہیں ہوتا کہ ملازم کی فیملی ان کی فیملی کے ساتھ ربط وضبط رکھے۔ وہ جب ٹینس کورٹ بناتے ہیں اور وہاں کھیلتے ہیں تو چڑیا پودوں کے پیچھے سے چھپ کر انہیں دیکھتی ہے۔ وہ ہر روز شام کو ان آئینوں کو دیکھنا بھی نہیں بھولتی کیونکہ خیر دین نے اس سے کہا تھا کہ شام کے وقت بونے اس میں نظر آتے ہیں لیکن چڑیا کو جو بونا نظر آتا ہے وہ بہت خوفناک ہوتا ہے اس لیے وہ اسے بونا نہیں مانتی پھر اسے اس میں ایبک نظر آتا ہے۔ ایبک ڈپٹی کمشنر کی چھوٹی بہن آئزہ کا بیٹا ہے وہ لوگ چھٹیاں گزارنے اپنے ماموں کے گھر آتے ہیں ایبک کی چڑیا سے دوستی ہو جاتی ہے وہ ایبک سے ٹینس کھیلنا سیکھتی ہے اور ایبک اس سے شطرنج میں ہارتا ہے تو انکل سے چڑیا کی تعریف کرتا ہے۔ شیر دل گھر میں قرآن خوانی کا اہتمام کرواتا ہے اسے اپنے آپ پر حیرت ہوتی ہے کہ یہ کام اس نے پہلے کیوں نہیں کیا۔ شیر دل کے کولیگ فیاض کا ٹرانسفر ہو جاتا ہے اور اس کی جگہ عکس کی پوسٹنگ ہوتی ہے۔ چڑیا کی باربی ڈول سے دوستی ہو جاتی ہے، چڑیا اسکول میں باربی ڈول کا خیال کرتی ہے اور اسے چیزیں دیتی ہے، عکس سے پہلا تعارف شیر دل کا پبلک سروس کمیشن کے امتحان کے رزلٹ کے بعد ہوا کیونکہ پہلی پوزیشن شیر دل کی متوقع تھی لیکن وہ پہلی پوزیشن حاصل نہ کر سکا پہلی پوزیشن عکس مراد علی نے لی تھی۔ ایبک شطرنج کے لیے چڑیا کے خیالات اپنے انکل کو بتاتا ہے تو ایبک کی مما کو غصہ آتا ہے اور وہ ایبک کو چڑیا کے ساتھ کھیلنے سے منع کر دیتی ہیں۔ چڑیا ایبک کے رویے سے بہت ہرٹ ہوتی ہے اور ایبک کو نظر انداز کرے تو ایبک سے یہ برداشت نہیں ہوتا۔ شیر دل عکس کو فون کرتا ہے وہ سوچتا ہے کہ اس کی عکس سے بات اور ملاقات کب ہوئی تھی، شہر بانو سے منگنی کے بعد اس کو پتا چلا تھا کہ عکس کی غنی سے شادی متوقع ہے۔ شہر بانو جب دس سال کی تھی تو اس کے باپ شہباز کا انتقال ہو گیا تھا اور شرمین دوسری شادی فاروق سے کرتی ہے اس کی پہلی بیوی سے دو بیٹے تھے۔ فاروق اور شرمین کی ایک بیٹی ہوئی تھی جو مر جاتی ہے۔ شرمین کو شہر بانو جب شیر دل کے بارے میں بتاتی ہے تو وہ اس رشتے پر راضی نہیں ہوتی۔ ایبک چڑیا سے سوری کرتا ہے اور اسے رات کو بلاتا ہے تاکہ اسے میلنک چیس دکھائے لیکن ایبک خود سو جاتا ہے اس کی آنکھ کسی کے رونے اور چیخنے سے کھلتی ہے یہ چڑیا کی آواز تھی وہ باہر نکل کر جو منظر دیکھتا ہے وہ اس کے ذہن سے محو نہیں ہوتا۔ شیر دل نے عکس مراد علی کو اکیڈمی میں ٹریننگ اسٹارٹ ہونے کے ایک ہفتے بعد دیکھا اور کچھ دنوں میں اسے لگا کہ عکس مراد علی کا من کی تمام لڑکیوں سے مختلف تھی۔ چند ساتھیوں نے اسے شہد کی دلدل کا ٹائٹل دے دیا تھا۔ اتنے عرصے بعد شیر دل عکس کو میٹنگ میں دیکھتا ہے تو اس کو عکس میں کوئی فرق نہیں لگتا وہ اب بھی ویسی ہی تھی۔ ڈپٹی کمشنر خیر دین پر چوری کا الزام لگا کر اسے نوکری سے نکال دیتا ہے۔ ڈپٹی کمشنر کی بیوی کو اس بات پر یقین نہیں آتا، باربی ڈول، چڑیا کے اسکول نہ آنے سے پریشان ہوتی ہے۔

(اب آگے پڑھیں)

عکس نے گاڑی سے اترتے ہوئے سر اٹھا کر اس آئینے کو دیکھا جو اس گھر کے برآمدے میں دروازے کے پاس رکھا تھا اور جس میں اس وقت شیر دل اور شہر بانو کی پشت نظر آرہی تھی۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ کمشنر اور اس کی بیوی کا استقبال کر رہے تھے جن کی گاڑی اس وقت پورچ میں داخلی برآمدے کے بالکل سامنے کھڑی تھی، خود اس کی گاڑی پورچ کی چھت سے باہر تھی۔ نظریں آئینے سے ہٹا کر اس نے ایک

لمحے کے لیے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا جہاں سے ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ پانی کی ہلکی پھوار نے اس کے چہرے، بالوں اور لباس کو ذرا سا نم کیا اور برآمدے میں کمشنر اور اس کی بیوی سے ملتے ہوئے شیر دل نے بالکل اس لمحے گردن موڑ کر اسے دیکھا تھا۔ وہ سیاہ موتیوں سے ایمبرائڈرڈ ایک فٹنگ والا سیاہ شیفون کا لباس پہنے ہوئے تھی جو اس کے متناسب جسم کو کچھ اور بھی متناسب کر رہا تھا۔ عام طور پر کھلے رہنے والے گھنے سیاہ بال اس وقت ایک سیاہ نیٹ میں ڈھیلے جوڑے کی شکل میں اس کی گردن کے پیچھے سمٹے اس کی پتلی اور لمبی گردن کو نمایاں کیے ہوئے تھے۔ دائیں کندھے پر اسٹول کی شکل میں تہ شدہ دوپٹا ڈالے وہ بائیں ہاتھ میں ایک بہت چھوٹا اور خوب صورت سیاہ پرس پکڑے ہوئے تھی۔ شیر دل نے اس سے نظریں ہٹائیں مشکل کام تھا یہ اور اس نے مشکل سے ہی کیا۔ وہ کمشنر اور ان کی فیملی کے ساتھ آئی تھی اس لیے کمشنر اور ان کی بیوی گاڑی سے اتر کر سیدھا اندر جانے کے بجائے چند لمحوں کے لیے وہیں برآمدے میں رک گئے تھے۔ کمشنر کا استقبال کرنے کے بعد شیر دل برآمدے سے نکل کر اس کی گاڑی کی طرف بڑھا۔ اس کی طرف جاتے ہوئے غیر محسوس انداز میں اس نے اپنی جیب میں پڑا ٹشو پیپر ٹٹولا تھا۔

ڈرائیور سے کچھ کہتے ہوئے عکس جب تک پلٹی وہ اس کے سامنے تھا۔ دونوں بے اختیار ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ بلیک ڈنر سوٹ کے ساتھ ایک سرخ Striped ٹائی لگائے، سلور کف لنکس اور ٹائی پر ایک کرسٹل کی ٹائی پن لگائے وہ اپنے اس حلیے میں اس کے سامنے کھڑا تھا جو اس کی ایک وجہ شہرت تھی۔ اکیڈمی میں کوئی اور کامنر اپنی ڈریسنگ سینس میں شیر دل کے سامنے نہیں ٹھہر سکتا تھا۔ عکس مراد علی نے اپنے اتنے سال کی سروس میں بھی شیر دل سے زیادہ خوش لباس مرد نہیں دیکھا تھا۔

عکس نے گہری مسکراہٹ کے ساتھ ستائشی نظروں سے شیر دل کو دیکھا۔ ہوا کے ایک جھونکے نے شیر دل کی ٹائی کو اڑایا۔ عکس کی نظر بھٹکی۔ اس کی ٹائی کو بے اختیار اڑنے سے روک دینے کی خواہش کو اس نے اتنی ہی بے اختیاری کے ساتھ دبایا جس طرح وہ ابھری تھی۔

دونوں کے درمیان اب خیر مقدمی کلمات کا تبادلہ ہو رہا تھا۔ وہی رسمی جملے...... اور وہی ان کہے مفہوم...... وہ ہمیشہ کی طرح اس کے چہرے پر نظریں جمائے ہوئے بات کر رہا تھا۔ اور اس کے چہرے پر نظریں جمائے شیر دل کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ اس کے چہرے پر موجود کون سی شے کس کو ماند کر رہی تھی۔ اس کے کانوں کی لوؤں میں دمکتے سفید موتیوں کے studs اس کی شفاف چمکدار سیاہ آئی لائنر سے سجی آنکھوں کو یا اس کی آنکھیں سرخ لپ اسٹک سے رنگے ہونٹوں سے چھلکتی دودھیا دانتوں کی قطار کو جو اس کی مسکراہٹ کو اور بھی دلکش کر رہی تھی۔ بارش کی پھوار کے ننھے ننھے قطرے اوس کے قطروں کی طرح اس کے بالوں اور چہرے پر چمک رہے تھے۔ ایک لمحے کے لیے شیر دل کا دل چاہا وہ ہاتھ بڑھا کر اس کے چہرے کو اپنی انگلیوں کی پوروں سے صاف کر دے...... صرف ایک لمحے کے لیے پھر اس نے نظر چرائی تھی...... جیب سے ایک ٹشو نکال کر غیر محسوس انداز میں عکس کی طرف بڑھاتے ہوئے شیر دل نے کہا۔

”تم نے بڑا رسک لیا۔“ عکس نے کسی سوال کے بغیر وہ ٹشو تھام کر اسی غیر محسوس انداز میں چہرہ اور سر تھپتھپاتے ہوئے کچھ حیرانی سے اس سے پوچھا۔

"کیا؟" وہ دونوں اب ساتھ چل رہے تھے۔

"بارش میں گاڑی سے نکل آئیں۔" قدم بڑھاتے ہوئے شیر دل نے کچھ سنجیدگی سے کہا۔

"تو؟" وہ الجھی۔

"اگر میک اپ بہہ جاتا تو؟" اس بار شیر دل کے ہونٹوں اور آنکھوں میں شرارت لہرائی تھی یہ جاننے کے باوجود کہ وہ ایک سیاہ آئی لائنر اور لپ اسٹک کے سوا شاید ہی کچھ لگائے ہوئے تھی۔

"ہاں رسک تو تھا، میک اپ صاف ہو جاتا تو تم اس سے زیادہ گھورتے مجھے...... جتنا ابھی گھور رہے تھے۔" عکس نے ہاتھ میں پکڑے ٹشو کو بڑی نفاست سے لپیٹ کر پرس میں بے نیازی سے رکھتے ہوئے کہا۔ جواب ویسا ہی آیا تھا جیسا سوال کیا تھا۔ اسے دیکھے بغیر شیر دل نے بے اختیار سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ چھپائی۔ وہ باقی لوگوں کے قریب پہنچ چکے تھے اور وہ اسے جواباً کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔

کمشنر کی بیوی کے ساتھ بات کرتی شہر بانو عکس کے استقبال کے لیے چند قدم آگے بڑھ آئی تھی۔

"شہر بانو...... عکس مراد علی......" ایک لفظ میں شیر دل نے باری باری دونوں کو ایک دوسرے سے متعارف کروایا۔ دونوں ناموں کے ساتھ کوئی سیاق وسباق نہیں تھا پھر بھی دونوں ایک دوسرے کو اس سے کہیں زیادہ جانتی تھیں جتنا شیر دل نے ان کا تعارف کروایا تھا۔

سفید شیفون کے کلیوں والے کُرتے اور چوڑی دار پاجامے میں شہر بانو ایک باربی ڈول لگ رہی تھی۔ دودھیا رنگت، سیاہ لمبی خمدار پلکیں، ننھی سی نوک والی تیکھی ناک اور بے حد باریک مسکراتے ہونٹ۔ عکس کے ہونٹوں پر موجود مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی تھی اس کو دیکھ کر۔ شیر دل کو اس سے زیادہ پرفیکٹ لڑکی نہیں مل سکتی تھی۔ وہ واقعی صرف شیر دل کے ساتھ جچتی تھی۔ اس کی طرف بڑھتے ہوئے عکس نے سوچا تھا۔

شہر بانو نے اس سے پہلے عکس مراد علی کا نام سنا تھا یا اس کو شیر دل کی گروپ فوٹو گرافس میں دیکھا تھا۔ جہاں وہ لاکھ غور کرنے کے باوجود بھی اس کی شکل وصورت اور حلیے میں وہ خاص چیز کھوجنے میں ناکام رہی تھی جو اس کے ذہن میں کسی خدشے یا اندیشے کو جنم دیتی لیکن آج اس پر پہلی نظر ڈالتے ہی وہ عکس مراد علی سے بری طرح خائف ہوئی، کیوں ہوئی؟ یہ اسے کئی دن سمجھ نہیں آیا۔ نہ اسے شیر دل سے کوئی خدشہ تھا نہ عکس مراد علی اس حسن وجمال کی مالک تھی جس سے اسے کوئی احساسِ کمتری ہونے لگتا لیکن اس کے باوجود اسے یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ عکس مراد علی کو نظر انداز کرنا بے حد مشکل تھا اور اس کو پسند نہ کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار۔

برآمدے کی انٹرنس پر ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے وہ دونوں شہر بانو کو کسی فوٹو فریم کا حصہ لگے تھے۔ ایک پرفیکٹ پکچر، دراز قد، اٹریکٹو، پُراعتماد، اسمارٹ...... سیاہ لباس میں ملبوس وہ ایک ایسا کپل لگے تھے جو گھر سے نکلتے ہوئے پرفیکٹ میچنگ کر کے آئے تھے۔ کوئی بھی ایک نظر میں دیکھ لیتا کہ عکس کے ہونٹوں کی لپ اسٹک کا رنگ شیر دل کی ٹائی کے رنگ کا ایک حصہ لگ رہا تھا...... شہر بانو نے بھی نوٹس کیا تھا۔ ایک دوسرے کے ساتھ کھڑے کسی رشتے اور تعلق کے بغیر بھی ان دونوں کی باڈی لینگویج میں ایک عجیب کیمسٹری تھی۔ ایک عجیب سا ربط اور تعلق جس کو نہ چھپانے کی کوشش تھی نہ دکھانے کی...... لیکن پھر بھی وہ چھپ چھپ کر دیکھ رہا تھا۔ شہر بانو الجھی نہ تھی...... اور پھر چاہنے کے باوجود وہ عکس سے ویسی گرم جوشی کا مظاہرہ نہیں کر سکی جو وہ دوسرے

مہمانوں کے ساتھ کر رہی تھی۔ وہ نپے تلے انداز میں عکس کی طرف بڑھی تھی اور عکس نے بھی مصافحے کے لیے اس کا ہاتھ گرم جوشی پر اسی احتیاط سے پکڑا تھا جس کے ساتھ وہ بڑھایا گیا تھا۔ شہر بانو نے اس کے ہاتھ کے لمس کی حدت اور نرمی کو بیک وقت محسوس کیا۔ دونوں کی نظریں ملیں۔

"آپ کیسی ہیں؟" اس نے عکس کو کہتے سنا۔ اس کی آواز کی ملائمت نے شہر بانو کے وجود کی سرد مہری کو عجیب انداز میں پگھلایا۔

"I am fine. How are you" اس نے جواباً اپنی مسکراہٹ کو کچھ گرم جوش کرنے کی کوشش کی۔

"I am good too" عکس نے جواباً ایک دھیمی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔ شیر دل اب کمشنر کے ساتھ اندر جا رہا تھا۔ شہر بانو نے ایک عجیب سا اطمینان محسوس کیا اس فوٹو فریم کے ایک حصے کو ہٹتے دیکھ کر۔

"شیر دل سے بہت سنا ہے میں نے آپ کے بارے میں۔" عکس نے شہر بانو سے کہا۔

"اچھا......؟ میں نے آپ کے بارے میں کبھی نہیں سنا۔" عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔ شہر بانو نے کچھ جتانے کی کوشش نہیں کی تھی۔ اس نے واقعی شیر دل سے عکس مراد علی کے نام کے سوا اس کے بارے میں کچھ نہیں سنا تھا، اس کے باوجود وہ اتنا احساس ضرور رکھتی تھی کہ عکس مراد علی شیر دل کا وہ بلیک ہول ہے جسے کھوجنا صبر آزما اور خود اذیتی کے سوا کچھ نہیں اور شہر بانو کو کسی بلیک ہول میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ شیر دل کے ساتھ اس کی ازدواجی زندگی مثالی تھی۔ اس نے زندگی میں کبھی کوئی آئیڈیل نہیں بنایا تھا لیکن شیر دل کے ساتھ اتنے سال گزارنے کے بعد وہ جانتی تھی کہ وہ اگر ایک آئیڈیل شوہر کا کوئی خاکہ بناتی تو وہ شیر دل ہی کا ہوتا۔ وہ پیار کرنے والا، خیال رکھنے والا، وفادار شوہر تھا جس سے شہر بانو کو اس کی مصروفیات کے علاوہ کوئی شکایت نہیں ہوئی تھی۔ وہ ان عورتوں میں سے نہیں تھی جو شوہر کی زندگی اور ہر سرگرمی کو قابلِ دراندازی سمجھتی تھیں۔ شیر دل نے اسے ایک عورت اور بیوی کے طور پر بہت space دی تھی اور شہر بانو نے وہی space اس کو دی تھی۔ شیر دل اب اس کا تھا اور جب تک وہ اس کا تھا اسے یہ جاننے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ اس سے پہلے کون کون شیر دل کو اپنا بنانا چاہتا تھا یا شیر دل کس کو اپنا...... اور صرف یہ ایک بات اور سوچ تھی جس پر ہمیشہ اس کے دل کی دھڑکن ایک لمحے کے لیے رکتی تھی جس کو وہ ہمیشہ سر سے جھٹک دیتی تھی۔ اس کا دل یہ کبھی نہیں مان سکتا تھا کہ شیر دل اس سے پہلے کسی سے محبت کرتا تھا، کر چکا تھا یا کر سکتا تھا...... یہ خیال بھی اس کو جسم میں ٹھکنے والی میخوں کی طرح لگتا تھا۔

"شیر دل کی زندگی میں بہت لڑکیاں آئی ہوں گی لیکن محبت...... وہ اس نے صرف مجھ سے کی، مجھ سے کی تو مجھ سے شادی کی ورنہ وہ کسی سے بھی شادی کر سکتا تھا۔ کوئی لڑکی شیر دل کو انکار تو نہیں کر سکتی تھی۔" پتا نہیں کیا کیا تاویلیں اور جواز دے کر وہ خود کو یہ یقین دلاتی تھی کہ محبت نام کی شے شیر دل نے صرف اسی کے لیے محسوس کی ہو گی...... باقی سب کچھ...... کچھ بھی نہیں تھا اور شیر دل نے ازدواجی زندگی کے اتنے سالوں میں اپنے رویے سے جیسے اس کے اس بلی کے سامنے آنکھیں بند کیے کبوتر جیسے اعتماد اور یقین پر مہر تصدیق ثبت کر دی تھی...... اس نے شہر بانو کی ماں کی ان تمام پیش گوئیوں اور اعلانات کو غلط ثابت کر دیا تھا جو شرمین نے شیر دل

کے ساتھ شادی کی ضد پر اسے شیر دل اور اس کی فیملی کے حوالے سے بتائی تھیں۔

ضلع کی تمام ایڈمنسٹریشن ہال کمرے میں اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ شیر دل کے گھر پر ہونے والے اس ڈنر کے لیے موجود تھی اور کمشنر اور ان کی بیوی وہ آخری مہمان تھے جنہیں پہنچنا تھا۔ عکس وہاں بہت پہلے آچکی ہوتی اگر کمشنر اور ان کی بیوی نے ایک ہی شہر سے جانے کی وجہ سے اسے اپنے ساتھ جانے کی دعوت نہ دی ہوتی۔

ڈنر کے دوران شہر بانو کی نظریں وقتاً فوقتاً عکس پر بھٹکتی رہیں۔ وہ عکس مراد علی کو سننا چاہتی تھی جیسے اسے جاننا چاہتی تھی لیکن عکس مراد علی نے سارا وقت بے حد خاموشی سے وہاں ہاتھ میں ڈرنک یا چائے لیے مسکراتے دوسروں کی باتیں سنتے ہوئے گزارہ تھا۔ چند ایک بار ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ شہر بانو نے ایک مہمان نواز میزبان کی طرح اس سے کھانے وغیرہ کے حوالے سے پوچھا۔ عکس نے ایک مہذب مہمان کی طرح اپنی سیری کا اظہار کیا۔ شہر بانو کسی اور کی طرف متوجہ ہوگئی اور گفتگو کہیں سے کہیں چلی گئی۔

ڈنر کے اختتام پر مہمانوں کو رخصت کرتے ہوئے شہر بانو اور عکس کا ایک بار پھر آمنا سامنا ہوا تھا۔ شہر بانو اب اس سے پہلے کی طرح نہیں ملی تھی۔ وہ ایک گرم جوش میزبان کی طرح اس سے گلے ملی تھی۔ عکس مراد علی کی پورچ سے نکلتی ہوئی گاڑی کو دیکھتے ہوئے شہر بانو کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ چند ہفتوں میں عکس سے دوبارہ وہاں ایک مہمان کے طور پر ملے گی اور وہ اس سے میزبان کے طور پر۔

☆☆☆

کریٹ میں سے ایک ایک آم نکال کر وہ ساتھ ساتھ اس پر لگے اسٹیکرز چیک کر رہی تھی جس آم پر اسٹیکر نظر نہ آتا وہ ایک لحظے کے لیے رک کر آم کو گھما پھرا کر اس کا اسٹیکر تلاش کرنے کی کوشش کرتی پھر اسٹیکر کو آم کے کسی نہ کسی حصے پر موجود پا کر وہ جیسے مطمئن ہو جاتی۔ صبح اسکول جانے سے پہلے ریڑھی پر پھلوں کو سجانا اور ترتیب سے رکھنا اس کے پسندیدہ کاموں میں سے ایک تھا لیکن آج چھٹی کا دن تھا اور چھٹی کے دن وہ خیر دین کے ساتھ آتی اور فٹ پاتھ پر ایک اسٹول پر بیٹھی اپنا سبق یاد کرتے ہوئے پھلوں کی ترتیب کو بگڑنے نہ دیتی۔

کسی بھی گاہک کے آنے پر وہ بے حد ایکسائٹڈ انداز میں گاہک کے سب سے اچھا پھل چننے کی کوشش میں جیسے اس گاہک سے بھی زیادہ پھرتی اور دلچسپی دکھاتی، وہ اس کو پھلوں کی سجائی ہوئی ڈھیریوں میں سے اچھے سے اچھا پھل نکال کر دکھاتی اور پھر ترازو پر رکھ دیتی جس پر خیر دین پھل تول رہا ہوتا اور جب وہ گاہک چلا جاتا تو وہ نئے سرے سے بچے ہوئے پھلوں کو ترتیب دیتی۔ پھلوں کی بڑی بڑی ڈھیریوں کو گھٹتے دیکھنا اس کا جیسے ایک اور پسندیدہ مشغلہ تھا۔ خیر دین نے کیا کمایا اور کیا بچایا سے زیادہ چڑیا کو خوشی اس بات کی ہوتی تھی کہ اس کی ریڑھی کا پھل ضرور بکتا اور شام تک ختم ہو جاتا تھا۔ بالکل دال کی اس دیگ کی طرح جو صبح لبالب بھری ہوتی اور خیر دین کے لیے اسے ہلانا بھی مشکل ہوتا لیکن شام تک وہ اس طرح خالی ہو جاتی کہ بعض دفعہ خیر دین کو اسے ٹیڑھا کر کے چمچ کے ساتھ اس کے پیندے کو کھرچ کھرچ کر بھی اپنے کسی گاہک کی فرمائش پر اس کا پیالہ بھرنا پڑتا۔ خیر دین دال سے جتنا کماتا تھا پھلوں سے اتنا نہیں کماتا تھا لیکن چڑیا کو دال کے بزنس سے زیادہ پھلوں کی اس رنگین ریڑھی میں دلچسپی تھی جسے وہ خود سجاتی تھی۔ وہ جیسے اس کا کینوس تھی جس پر وہ مختلف رنگوں اور شکلوں کے پھلوں سے اپنی Creativity کا اظہار کرتی تھی۔ وہ ریڑھی اس فٹ پاتھ پر خیر دین کی دال مشہور اور مقبول

ہو جانے سے پہلے اس فٹ پاتھ کی سب سے خوب صورت پھلوں کی ریڑھی تھی جس پر پہلی نظر ڈالنے کے بعد کوئی پھل خریدنے کی خواہش نہ رکھنے کے باوجود بھی ایک دوسری ستائشی نظر ضرور ڈالتا تھا۔ کسی نے کبھی اس ریڑھی پر بدنظمی اور بے ترتیبی نہیں دیکھی تھی، نہ ہی گندگی اور اس میں خیر دین کے اپنے سلیقے کے ساتھ ساتھ چڑیا کے مزاج کی نفاست کا بھی عمل دخل تھا۔ شروع شروع میں خیر دین صرف پھلوں کی ایک ریڑھی لے کر ہی اس فٹ پاتھ پر کھڑا ہوا تھا۔ لیکن چند ہفتوں میں ہی اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ صرف پھلوں کی ریڑھی کے ساتھ گھر کا خرچہ چلانا مشکل تھا...... خاص طور پر اب جب کچھ بھی مفت نہیں تھا...... چند ہفتوں میں ہی خیر دین نے اسی پھلوں کی آدھی ریڑھی کو خالی کرتے ہوئے وہاں اس دال کا دیگچہ رکھ لیا تھا جس کے لیے وہ ڈی سی ہاؤس میں مشہور تھا...... اور اس کی دال کچھ دنوں کے اندر اس کی توقعات سے بھی زیادہ بکنے لگی تھی۔ چند ہفتے گزرتے ہی اسے اس دال کے دیگچے کو دیگ میں تبدیل کرنے کی ضرورت محسوس ہونے لگی اور اس کے ساتھ ہی اس نے پھلوں کی ریڑھی کو بھی ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا کیونکہ صبح صبح منڈی جا کر پھل لانا اور دال پکانا بہت دقت طلب کام تھے لیکن چڑیا کی آنکھوں اور چہرے پر اترتی مایوسی اسے اس کے فیصلے پر عمل درآمد نہ کرا سکی۔

خیر دین نے اپنی زندگی کی مشقت کچھ بڑھا لی تھی لیکن پھلوں کی وہ ریڑھی اس نے ختم نہیں کی البتہ اب اس ریڑھی سے دال کا بزنس اس نے ایک دوسری ریڑھی پر منتقل کر لیا تھا اور ایک نوعمر لڑکا اس نے اپنا ہاتھ بٹانے کے لیے بھی رکھ لیا تھا۔

خیر دین کی رہائش اس فٹ پاتھ سے ملحقہ رہائشی علاقے میں تھی اور اسکول سے واپس آنے کے بعد چڑیا خیر دین کے پاس آ کر اس کی ریڑھی پر بیٹھ جاتی۔ وہ وہیں اپنا اسکول کا ہوم ورک بھی کرتی اور اس کی ریڑھی کی حفاظت اور نگرانی بھی۔ جب تک خیر دین نے اپنا ہاتھ بٹانے اور اِدھر اُدھر کے کاموں کے لیے وہ لڑکا نہیں رکھا تھا چڑیا ہی تب تک خیر دین کا ''چھوٹا'' تھی۔ جو اس کا ہاتھ بٹانے کے ساتھ ساتھ سڑک پر لوگوں اور گاڑیوں کے شور سے بے نیاز اور بے پروا اپنا سبق یاد بھی کرتی تھی اور لکھنے والا ہوم ورک بھی۔ اس کے آس پاس ہونے والا کوئی شور اس کے فوکس اور توجہ کو بانٹنے میں کامیاب نہیں ہوتا تھا۔ فٹ پاتھ پر بیٹھ کر ہی چڑیا نے اپنے آپ کو آس پاس کی شور مچاتی دنیا کو شٹ آف کرنا سیکھا بالکل اس طرح جیسے اس نے اس رات اپنی زندگی کے سب سے بھیانک اور تکلیف دہ تجربے پر ایک مینٹل بلاک لگایا تھا اور جب تک وہ اس پر مینٹل بلاک نہیں لگا سکی چڑیا تب تک ذہنی طور پر مفلوج ہوتی رہی۔ نو سال کی اس بچی نے بڑوں کی دنیا کا ''جنس'' نام کا آسیب بہت غلط عمر میں دیکھا تھا۔ اس آسیب نے اس کی بچوں کی دنیا کی ساری خوب صورتی اور رنگینی کو پلک جھپکتے میں غائب کر دیا تھا۔ چند ہولناک گھنٹوں نے اس کی زندگی میں نیپام بم سے زیادہ تباہی برپا کی تھی۔ زندگی وہ fairytale نہیں تھی جو وہ گزار رہی تھی بلکہ وہ تھی جس کی ایک جھلک نے اس کو لرزا کر رکھ دیا تھا۔

وہاں اس رات اس کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ یہ سوال چڑیا کو گونگا کر دیتا تھا۔ وہ کوشش کے باوجود کچھ یاد نہیں کر پائی تھی، صرف تاریکی اور اپنی گردن پر کسی کے ہاتھوں کی گرفت۔ ایک کی ہذیانی چیخیں اور اس ساری تکلیف سے زیادہ تکلیف دہ اپنی عریانی اپنے برہنہ جسم کا تصور...... اور اس کے بعد چڑیا کا ذہن مفلوج ہو جاتا۔ وہ کانپتے جسم اور بھینچے ہونٹوں کے ساتھ سرد جسم اور پھٹی آنکھوں کے ساتھ ماں کو دیکھتی بے آواز اور بے حس د

حرکت روتی جاتی اور اس کے جسم پر ٹھنڈے پسینے آتے ...... اور اس کی ماں اس کی حالت دیکھنے کے بعد بلک بلک کر روتی جاتی۔ اس نے چڑیا سے کچھ بھی پوچھنا چھوڑ دیا تھا۔ جس حالت میں خیر دین نے اسے ڈی سی ہاؤس میں دیکھا تھا اس کے بعد کسی سوال جواب کے بغیر بھی وہ جانتا تھا وہاں کیا ہوا تھا؟ چڑیا کے ساتھ کیا ہوا تھا؟ حلیمہ کی طرح وہ چڑیا سے کبھی کچھ نہیں پوچھ سکا تھا، وہ سوال یا کوئی بھی سوال۔ وہ خیر دین کی عمر بھر کی کمائی سے کھڑی کی ہوئی ایک شاندار عمارت تھی جسے اس حالت میں اس گھر میں دیکھ کر خیر دین پلک جھپکتے میں خود ڈھے گیا تھا۔ کوئی ظلم سا ظلم ہوا تھا اس پر...... سوال جواب کیا رہ گئے تھے، کس نے کرنے تھے اور کیوں کرنے تھے۔

اس نے ہذیانی اور جنونی انداز میں صرف ڈی سی کو مارنے کی کوشش کی تھی۔ نتیجہ وہی ہوا تھا جو ہو سکتا تھا۔ چند منٹوں میں ڈی سی کے حفاظتی عملے نے اسے زدوکوب کرتے ہوئے پولیس اسٹیشن پہنچا دیا تھا جہاں وہ اگلے دو دن تشدد کا نشانہ بنتا رہا۔ راتوں رات اس کی بیٹی کو چڑیا اور کوارٹر کے سامان کے ساتھ ڈی سی ہاؤس سے باہر پھنکوا دیا گیا تھا۔ رات کے وہ آخری چند گھنٹے چڑیا نے اپنی ماں کے ساتھ ڈی سی ہاؤس سے باہر پھنکوائے ہوئے ان کے سامان کے ڈھیر پر اپنی روتی ہوئی ماں سے لپٹے ایک عجیب خوف اور دہشت کے عالم میں گزار دیے تھے۔

فجر کی نماز کے بعد دن ہونے پر اس کی ماں سامان کے اس ڈھیر کو وہیں چھوڑے اسے ساتھ لیے وہاں سے کئی فرلانگ دور ایک pco سے اپنے کسی جاننے والے کو فون کر کے وہاں پہنچنے کا کہہ کر جب تک واپس آئی سامان کے اس ڈھیر سے بہت کچھ راستے سے گزرنے والے اٹھا کر لے جا چکے تھے۔ اس سامان کا ماتم چڑیا کی ماں تب کرتی اگر ماتم کرنے کے لیے اس کے پاس کوئی اور سامان نہ ہوتا۔ اگلے چند گھنٹوں میں اس جاننے والے نے اس سامان کو اٹھوا کر انہیں اپنی چھت کے نیچے پناہ تو دے دی تھی لیکن خیر دین کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کے قابل نہیں تھا۔ وہ بھی کسی کالج میں اردلی تھا اور ڈی سی کے حکم پر بند کیے جانے والے خیر دین کے لیے وہ کیا کرتا۔ ایف آئی آر میں خیر دین پر ڈی سی کے گھر میں چوری کے الزام کے ساتھ چوری کرتے ہوئے پکڑے جانے پر ڈی سی پر قاتلانہ حملہ کرنے کا بھی الزام تھا اور ایک اعلیٰ سرکاری آفیسر کے جان اور مال پر ہاتھ ڈالنے کا نتیجہ جو ہو سکتا تھا وہی ہوا تھا۔ شہر کا کوئی بھی وکیل فیس لیے بغیر خیر دین کے لیے ضمانت کی کوششوں کا حصہ بننے کو تیار نہیں تھا اور بے بسی اور کسمپرسی کی اس انتہا کا ایک ایک لمحہ اس نو سالہ بچی کے ذہن پر انمٹ نقوش چھوڑ کر گیا تھا۔

دو دن کے بعد ڈی سی ہاؤس کے عملے نے ڈی سی کی طرف سے مصالحتی کوششوں کا آغاز کیا تھا اور خیر دین نے بنا چون و چرا اس مصالحت نامے پر دستخط کر دیے تھے۔ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ جیل کے اندر چلے جانے کے بعد پیچھے کچھ باقی نہیں بچنا تھا جو حلیمہ اور چڑیا کو سہارا دیتا۔ اس کے لیے تھانے سے باہر آنا اشد ضروری تھا۔ یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ چڑیا اور اپنی زندگی کے ملبے کے ڈھیر سے کیا کیا بچا سکتا تھا۔

ڈی سی خیر دین کے ساتھ مقدمہ افورڈ نہیں کر سکتا تھا۔ اگر مقدمے میں خیر دین چڑیا کے حوالے سے کچھ الزامات لگا دیتا تو کچھ ثابت نہ ہونے کی صورت میں بھی وہ الزامات اتنے خطرناک ضرور تھے کہ ایک لائق

فائق ڈی ایم جی آفیسر کی ساکھ، نام اور تابناک کیریئر ڈبونے کے لیے کافی تھے اور ڈی سی اس بات سے اچھی طرح واقف تھا۔ مالی بدعنوانی کے الزامات کا دفاع کیا جا سکتا تھا اور وہ ایسے الزامات ہوتے تھے جن کو اگر غلط ثابت کر دیا جاتا تو ہر معاملے میں باعزت طور پر نکل آنا ممکن تھا لیکن اخلاقی جرائم سے متعلقہ الزامات اگر کورٹ تک چلے جائیں تو پھر بے قصور ثابت ہونے کے باوجود الزامات اور شکوک و شبہات کی گرد بہت عرصے تک نہیں بیٹھتی۔ وہ دھول فریقین کو گرد آلود رکھتی ہے۔

ڈی سی بے وقوف نہیں تھا، چڑیا کے حوالے سے کسی الزام کی گونج اس کے کیریئر سے پہلے اس کی ازدواجی زندگی کو تباہ کرنے کا باعث بنتی۔ اپنی فیملی میں اسے بے حد شرمندگی اور خفت کا سامنا کرنا پڑتا...... اس کے لیے خیر دین سے خاموش مصالحت اس سے کہیں زیادہ ضروری تھی جتنی خیر دین کے لیے اس کے ساتھ...... خیر دین اس کے جیسی ذہانت رکھتا تو اپنے کارڈز زیادہ سمجھداری سے کھیلتا، مصالحت نامہ اپنی شرائط پر کرتا لیکن وہ ڈی سی اور اس کے پیچھے تمام انتظامی مشینری کے دباؤ اور دھمکیوں کے سامنے ٹھہر نہیں سکا۔ ڈی سی نے اس کے خلاف ایف آئی آر واپس لی تھی لیکن اسے ملازمت سے برخاست کر دیا تھا اور اس کے خلاف دی جانے والی رپورٹ میں لگائے گئے الزامات واپس نہیں لیے تھے۔ خیر دین کی صرف نوکری نہیں گئی تھی پنشن اور ریٹائرمنٹ پر ملنے والے تمام فنڈز بھی چلے گئے تھے لیکن بس یہ ہوا تھا کہ وہ تیسرے دن صبح سویرے اپنے جسم پر چوٹوں کے کئی چھوٹے بڑے نشان لیے حلیمہ اور چڑیا کے پاس پہنچ گیا تھا۔

زندگی میں پہلی بار چڑیا ہمیشہ کی طرح ہنستی کھلکھلاتی بھاگتی خیر دین کے پاس نہیں جا پائی تھی۔ جو کچھ ہوا تھا اس کی وجہ سے ہوا تھا۔ کوئی قصور نہ ہونے کے باوجود وہ نو سالہ بچی شدید احساسِ جرم کا شکار تھی۔ وہ جن کے گھر پر ٹھہرے ہوئے تھے وہاں وہ جیسے سرکس کا ایک جانور تھی جس کی کہانی دن میں کئی بار اس کے سامنے حلیمہ یا اس گھر کی عورتیں وہاں آنے والی آس پڑوس کی عورتوں کو سناتیں...... وہ وہاں موجود ہوتی تو سر جھکائے کسی بت کی طرح سب کچھ سنتی جاتی۔ وہ رات پھر اسی تکلیف کے ساتھ اس پر گزرتی، اسی خوف، اذیت اور بے بسی کے احساس سے وہ دوبارہ گزرتی...... اور دو دن کے درجنوں بار دہرائے جانے والے اس مینٹل ٹارچر کے بعد ایک لمحہ وہ آ گیا تھا جب 9 سال کی اس بچی نے اپنے لیے شدید نفرت محسوس کی تھی۔ وہ دو دن میں ہی احساسِ جرم کی دوسری سیڑھی پر آ گئی تھی۔ ہمدردی کے جملے، ترس بھری نظریں اور کریدنے والے سوالات، ان میں سے کسی چیز نے اس traumatized بچی پر کوئی اچھا اثر نہیں ڈالا تھا۔ اس کے ساتھ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ اچھی بچی نہیں تھی۔ ان دو دنوں میں اپنے حواس کو بحال کرنے کی پہلی کوشش کے دوران یہ پہلا نتیجہ تھا جو چڑیا نے نکالا تھا۔

جو اچھے بچے ہوتے ہیں ان کے ساتھ یہ سب کچھ نہیں ہوتا اور ان کی وجہ سے ان کے نانا کو تکلیف بھی نہیں پہنچتی۔ خیر دین کو پہلی بار تکلیف اور زخموں کی وجہ سے لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کے اندر داخل ہوتے دیکھ کر خوشی کے احساس کے باوجود آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ چڑیا نے دوسرا نتیجہ نکالا تھا۔

وہ چھوٹا سا گھر تھا، وہ وہاں چھپ نہیں سکتی تھی لیکن وہ چھپنا چاہتی تھی۔ وہ خیر دین کے سامنے آنا نہیں چاہتی تھی، اگر نانا نے کچھ پوچھا تو......؟ اگر نانا نے ڈانٹا تو؟ نانا اب مجھے بہت برا سمجھتے ہوں گے...... خدشات

اور واہموں سے زندگی میں اس کا پہلا تعارف بھی اسی عمر میں ہوا۔ چڑیا چپ چاپ سیڑھیاں چڑھ کر چھت پر چلی گئی تھی۔ دو کمروں کی وہ چھوٹی سی چھت کاٹھ کباڑ سے اٹی ہوئی تھی اور اس کاٹھ کباڑ میں کوشش کے باوجود چڑیا کوئی ایسی جگہ تلاش نہیں کر سکی جہاں وہ چھپ جاتی اور چھت پر آنے والا کوئی بھی شخص اسے پہلی ہی نظر میں نہ ڈھونڈھ لیتا۔ بس چھت پر کھڑکی کا ایک ٹوٹا ہوا پٹ دیوار کے ساتھ لگا ہوا تھا جس کے پیچھے پھٹی پرانی بوریوں میں کوئی سامان بھرا پڑا تھا۔ چڑیا اپنے پتلے وجود کے ساتھ اپنے آپ کو سکیڑ کر انہی بوریوں میں سے ایک پر چڑھ کر بیٹھ گئی اور اس دن وہاں بیٹھے اس نے اس سامان میں چند چھوٹی بڑی چھپکلیاں، ایک چوہا، بڑی بڑی دو مکڑیاں اور ایک لال بیگ کے ساتھ چند دوسرے کیڑے مکوڑے بھی دیکھے...... اور زندگی میں پہلی بار وہ گم صم کسی خوف کے بغیر ان تمام چیزوں کو اپنے آس پاس اور اردگرد حرکت کرتے دیکھتی رہی۔ صرف چند دن پہلے وہ ساری چیزیں اس کے خوف کا منبع تھیں۔ خوف نام کی کیفیت کو وہ ان غیر انسانی چیزوں کے ساتھ منسوب کر کے محسوس کرتی تھی۔ صرف چند دن میں خوف نے اپنا منبع بدل لیا تھا۔ خوف نے اب اپنے آپ کو انسانی شکل میں ڈھال لیا تھا۔ اب اس کی دم، پر، چار پاؤں، آٹھ ٹانگیں، سرخ، گرے، سیاہ چمکیلا کراہیت آمیز ننگا وجود نہیں ہوتا تھا جس کے ساتھ وہ رینگ کر اڑ کر دیواروں درختوں سے چپکتا دوڑتا پھرتا تھا۔ اب اس کا خوف دو آنکھوں، دو ہاتھوں، ایک ناک، ایک منہ والا اور خوب صورت صاف رنگت والا ہو گیا تھا جو خوب صورت لباس پہنتا تھا اور دو ٹانگوں پر چلتا تھا۔ وہاں بیٹھے ان سارے کیڑے مکوڑوں کو دیکھتے ہوئے چڑیا نے اپنے آپ کو ان کے قبیل کا حصہ محسوس کیا۔ ان سب کے ساتھ ایسا کیا ہوا تھا کہ وہ یہاں اس چھت پر سامان میں چھپے بیٹھے ہیں۔ چڑیا نے باری باری ان سب کو دیکھتے ہوئے بے حد ہمدردی سے سوچا۔

نیچے گھر کے اندر بیٹھے پانی پیتے ہوئے خیر دین نے چند ہی منٹوں میں چڑیا کی عدم موجودگی محسوس کر لی تھی۔ چڑیا کی ڈھنڈیا مچی تھی اور وہ نہیں ملی تھی۔ کسی نے اسے چھت پر جاتے دیکھا اور وہاں جا کر ڈھونڈا اور وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ خیر دین پانی کا گلاس چھوڑتا ہوا بے حد حواس باختگی کے عالم میں خود اسے چھت پر ڈھونڈنے پہنچا تھا۔ چھت خالی تھی۔ وہ چڑیا کا نانا نہ ہوتا تو اسے بھی چھت خالی ہی نظر آتی، پر اس نے چڑیا کو اس خالی چھت پر بھی تلاش کرنا شروع کر دیا تھا۔ چند منٹ لگے تھے اس کھڑکی کے اس ٹوٹے پٹ کے پیچھے سانس روکے بے حس و حرکت بیٹھی چڑیا تک پہنچتے جو چھت پر خیر دین کے بار بار پکارنے پر بھی برستی آنکھوں کے ساتھ اسی طرح چھپی بیٹھی رہی تھی پھر اس نے ایک سائے کو سورج کی روشنی کو روکتے دیکھ کر سر اٹھایا تھا۔ خیر دین کبھی چڑیا کو اتنا بوڑھا نہیں لگا تھا جتنا اسے اس دن لگا تھا۔ بڑھی ڈاڑھی، وحشت زدہ آنکھیں اور ملگجے کپڑے، وہ اپنے نانا کو پہچان نہیں سکی۔ وہ اس حلیے کے کسی شخص سے کبھی واقف نہیں رہی تھی لیکن وہ پھر بھی خیر دین کو سر اٹھا کر دیکھتی رہی، آنسوؤں سے بھری آنکھوں کے ساتھ۔ اس کا اور خیر دین کا آخری سامنا اس رات تب ہوا تھا جب اس نے اپنی چادر کے ساتھ اس کے برہنہ جسم کو لپیٹا تھا لیکن اس رات روتی بلکتی چڑیا سے اس نے کچھ کہا نہیں تھا۔ خیر دین کے دل کو کسی چیز نے آری لے کر کاٹا تھا۔ یہ چڑیا کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں اور ڈرا سہا کانپتا وجود نہیں تھا، یہ ان آنکھوں میں جھلکنے والی ندامت تھی جس نے خیر دین کو مارا تھا۔ کس چیز کا احساسِ جرم...... کیسی ندامت؟ کچھ بھی کہے بغیر اس نے دونوں ہاتھ بڑھا کر چڑیا کو بوری سے اٹھا کر اپنی گود میں لے لیا پھر اس نے فرش پر بیٹھتے ہوئے چڑیا کو اپنے ساتھ لپٹا لیا، نہ وہ رویا تھا نہ اس نے چڑیا سے کچھ کہا تھا، نہ اس نے چڑیا سے

کچھ پوچھا تھا۔ وہ اسے بہت دیر تک اپنے سینے سے لپٹائے رہا تھا یوں جیسے اس کی تکلیف کو اسفنج کی طرح اس کے وجود سے نچوڑ کر خود جذب کر لینا چاہتا ہو، یوں جیسے کسی کی اکھڑتی سانس کو بحال کرنے کے لیے اسے آکسیجن کی سپلائی دینے کی کوشش کی جا رہی ہو اور اس کی اس گرم جوش آغوش نے دونوں کام کیے تھے۔ وہ ٹھٹھرتا، کانپتا، سکڑتا، سہما، ننھا وجود جان بلبی کی اس کیفیت سے نکلنے لگا تھا۔ اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں خود بخود خشک ہونے لگی تھیں۔ چڑیا کو اس کا نانا دوبارہ مل گیا تھا۔

خود سے الگ کر کے خیر دین نے سب سے پہلے اس کے بکھرے الجھے بال سلجھائے تھے۔ ان ہیئر پنز کو اس کے بالوں سے نکالا تھا جو ان تین دنوں میں اس کے بالوں کو سلجھانے سے زیادہ الجھانے کا کام کر رہی تھیں۔ پونی میں پڑا ربر بینڈ اب پونی کے آخری سرے پر آچکا تھا اور چڑیا کے آدھے سے زیادہ بال اس کی گرفت سے آزاد بے ترتیب لٹوں کی شکل اختیار کر چکے تھے۔ اس چھت پر بیٹھے خیر دین نے سب سے پہلے اس کے بکھرے بالوں کو سلجھایا۔ اس کی چھوٹی سی پونی نما چٹیا گوندھ کر اس کی باقی لٹوں کو ہیئر پنز کے ساتھ دوبارہ جمایا...... وہ جیسے چڑیا کو اپنی زندگی کا ایک اور بڑا گُر دے رہا تھا، منہ پر چوٹ کھانے کے بعد اوندھے منہ گرنے کے بعد ہتھیار ڈالنے کے بجائے اٹھ کر دوبارہ کھڑے ہونے کا۔ اپنے پیروں پر اپنی ہمت اور اپنی مرضی سے بالکل وہیں کھڑے ہونے کا جہاں گرائے گئے ہو۔

☆☆☆

''تو یہ تھی عکس مراد علی...... بڑی curiosity تھی اس سے ملنے کی مجھے۔ آج بالآخر موقع مل ہی گیا......'' رات کو ڈنر ختم ہونے کے بعد سونے کے لیے کپڑے تبدیل کرنے کے بعد شہر بانو نے واپس بیڈ روم میں آتے ہوئے شیر دل سے کہا۔ وہ بھی کپڑے تبدیل کر کے ابھی کچھ دیر پہلے ہی آ کر بستر پر لیٹا تھا اور اس وقت اپنے سیل فون پر بڑی برق رفتاری کے عالم میں اپنے ٹیکسٹ میسجز دیکھنے اور ان کے جواب بھیجنے میں مصروف رہا۔ اس نے شہر بانو کا تبصرہ سنا تھا لیکن اس تبصرے کے جواب میں کچھ نہیں کہا تھا۔ شہر بانو اپنے بستر پر سونے کے لیے لیٹنے کے بجائے کروٹ لے کر شیر دل کے پاس آ گئی۔ اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے اس نے مزید کہا۔

''اچھی ہے۔'' شیر دل نے جواب دیے بغیر اس کے گرد اپنا بازو حمائل کر لیا لیکن وہ اب بھی اپنے سیل فون کے ساتھ ہی مصروف تھا۔ شہر بانو کو لگا اس نے شاید عکس کے بارے میں اس کا تبصرہ نہیں سنا۔ شیر دل کے سیل فون والی کلائی اور نیچے بازو کی کہنی تک پھیلے ہوئے سیاہ بالوں کے گھنے روئیں کو اپنے ہاتھ کی نرم پوروں سے سلجھاتے ہوئے شہر بانو نے ایک بار پھر اپنا تبصرہ دہرایا۔ اس بار جواب آ گیا تھا۔

''ہونہہ......'' شہر بانو نے ذرا سا سر اٹھا کر شیر دل سے کہا۔

''شیری اب تم مجھ سے بات کرو گے یا ابھی بھی کمشنز کو text کرتے رہو گے؟'' اس کے انداز میں خفگی تھی۔

''میں سن رہا ہوں یار۔'' شیر دل نے مسکرا کر بہلانے والے انداز میں سیل فون سے اس کی ناک کی نوک تھپتھپائی۔ وہ ایک بار پھر فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

"لگتا ہے تمہارے چیف نے نیا نیا text کرنا سیکھا ہے۔ پچھلے دو دن سے اس نئی مصیبت نے ناک میں دم کیا ہوا ہے۔" شہر بانو واقعی شیر دل اور کمشنر کے درمیان رابطے کے اس ایک اور ذریعے سے تنگ آ گئی تھی جو دو دن پہلے شروع ہوا تھا۔ شیر دل اس کی بات پر مسکرا دیا۔

"چیف نے بلیک بیری لیا ہے نیا نیا اور ابھی اس کے فنکشنز نہیں سمجھ پا رہے۔ آج ڈنر پر بھی وہی سمجھا تا رہا ہوں انہیں اور اب بھی وہی سمجھا رہا ہوں۔" شہر بانو اس کے اس سوشل ورک کے بارے میں جان کر زیادہ خوش نہیں ہوئی تھی۔

دو دن سے بھابی کو کیے جانے والے سارے میسجز بھی مجھ تک آ رہے ہیں۔ پتا نہیں بھابی تک کس کے جا رہے ہوں گے۔ میں نے ابھی منع کیا ہے انہیں کہ جب تک ہاتھ صاف نہ ہو جائے کم سے کم بھابی کو کوئی پرائیوٹ میسج نہ کریں۔" شہر بانو کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ وہ کمشنر کی ٹیکنالوجی کے حوالے سے Incompetence کے بارے میں آگاہ تھی۔

"تم نے یہ کہہ دیا ان سے؟" اس نے ہنستے ہوئے شیر دل سے پوچھا۔

"ہاں کہا لیکن اس طرح نہیں کہا۔" شیر دل بھی جواباً مسکرایا۔

"اب تک پہنچ نہیں گئے ہوں گے؟" اس نے کمشنر کے اپنے شہر میں پہنچنے کے حوالے سے پوچھا۔

"نہیں لیکن پہنچنے والے ہیں۔" شیر دل اب بھی text کر رہا تھا۔

"اب بس کرو نا۔" شہر بانو جھلّائی۔

"One last text" شیر دل نے بے ساختہ کہا اور پھر چند لمحوں کے بعد سیل فون بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

"کیا کہہ رہی تھیں تم؟" شہر بانو کے گرد اپنے دونوں بازو حمائل کرتے ہوئے اس نے کہا۔

"عکس کے بارے میں بات کر رہی تھی۔"

"ہونہہ۔" شہر بانو نے بے اختیار سر اٹھا کر شیر دل کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

"یہ ہونہہ کیا ہوتا ہے؟"

"اور کیا کہوں؟ تعریف تو تم پہلے ہی کر رہی ہو۔" شیر دل مسکرایا تھا۔

"وہ جتنی اٹریکٹو ہے میں حیران ہوں اب تک سنگل کیسے ہے...... شادی کیوں نہیں کی اس نے ابھی تک۔" وہ شیر دل سے یہ سوال نہیں کرنا چاہتی تھی لیکن اسے سمجھ نہیں آیا یہ سوال کیسے اس کی زبان پر آیا تھا۔ رات کے پچھلے پہر جیسے اس کا لاشعور بولنے لگا تھا۔ شیر دل کے چہرے سے چند انچ دور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے اس نے شیر دل کو جیسے کسی دام میں لانے کی کوشش کی تھی۔ وہ اس سوال کا جواب اس کی زبان سے نہیں جیسے اس کی آنکھوں میں پڑھنا چاہتی تھی۔ شیر دل اس سے آنکھیں نہیں چرا سکا۔ وہ اس کے اتنے قریب تھی کہ آنکھیں چرا کر بھی اسے دوبارہ اس سے آنکھیں ملانی پڑتیں۔

"اس کا ذاتی مسئلہ ہے...... میں نے کبھی پوچھا نہیں۔" بے تاثر لہجے میں شیر دل نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اپنے لاشعور کو بولنے نہیں دیا۔ اس کے اور عکس کے درمیان ہونے والا ہر سوال جواب صرف دو

سامعین اور دو لوگوں کے لیے تھا...... عکس...... اور...... شیر دل کے لیے۔ وہ اپنی اور عکس کی کوئی ذاتی گفتگو کہیں نہیں دہراتا تھا، کسی تیسرے چوتھے شخص کے سامنے نہیں۔ یہ ان کے رشتے اور تعلق کا ایک unsaid rule تھا۔ ایک دوسرے کا کوئی راز کسی سے شیئر کرنا تو خیر ناممکنات میں سے تھا۔

"تم اور وہ تو آپس میں کافی کلوز ہو شاید...... تم نے بھی کبھی نہیں پوچھا؟" لاشعور نے پھر ایک اور سوال کیا جو شعور چھپائے ہوئے تھا۔

"نہیں۔" وہ پلکیں جھپکائے بغیر شیر دل کو دیکھتی رہی، وہ بھی اسے اسی طرح دیکھ رہا تھا۔ یہ بھی وہ جواب نہیں تھا جس کی اسے توقع تھی، نہ اس جواب کی...... نہ اس کے اتنے مختصر ہونے کی لاشعور اگلا سوال کرنے کے لیے تیار بیٹھا تھا جب اس نے شیر دل کو کہتے سنا۔

"I love you shabi" وہ اب اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا تھا۔ عکس مراد علی سیکنڈز میں کہیں غائب ہو گئی تھی۔

"سو بار کہو۔" اس نے مسکراتے ہوئے شیر دل کی ٹھوڑی کو اپنے ہونٹوں سے چھوتے ہوئے کہا۔

"صرف سو بار......؟" شیر دل ہنسا۔

"تم زیادہ بار کہنا چاہتے ہو؟" اس نے شیر دل کے سینے پر عجیب سرشاری کے عالم میں اپنا ماتھا ٹکاتے ہوئے اسے چھیڑا۔

"نہیں تو......" شیر دل مسکراتے ہوئے سنجیدہ ہوا۔

"نہیں؟" وہ ایک دم اس سے الگ ہوئی۔

"ہاں......" وہ پھر ہنسی۔

"تو پھر کہو۔"

"After you ma'am." وہ پھر ہنسی۔

"I love you sherdil." شیر دل مسکرایا۔ "میں نے تمہارے علاوہ کسی دوسرے مرد سے محبت نہیں کی۔ کر ہی نہیں سکتی۔" اس کے گال چھوتے ہوئے وہ اسی سرشاری کے عالم میں کہہ رہی تھی۔

"اور تم......؟" وہ جیسے اب وہی سب کچھ اس کی زبان سے سننا چاہتی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی اس نے اپنے سوال سے شیر دل کو کیسی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ وہ نادانستگی میں اپنے اور اس کے بیچ عکس مراد علی کو لے آئی تھی۔

"I love you shabi" شیر دل ایسے نازک مرحلوں سے بہت بار گزرا تھا۔ عکس مراد علی سے بہت بار بچ کر گزرنے کی کوشش کی تھی اس نے۔ لیکن عکس کو اپنے دل میں اس جگہ سے ہٹائے بغیر اور ہلائے بغیر جہاں وہ تھی۔

"تم میری زندگی کی دو خوب صورت اور قیمتی ترین چیزوں میں سے ایک ہو...... I am incomplete without you" شہر بانو مسکرا دی۔ وہ ہمیشہ اس سے یہی کہا کرتا تھا اور وہ جانتی تھی وہ دوسری قیمتی اور خوب صورت چیز کون تھی...... مشال شیر دل۔

دنیا کا کوئی مرد شیر دل جیسا نہیں تھا...... ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے سینے پر سر رکھے آنکھیں موندتے ہوئے شہر بانو نے سوچا۔ وہ ٹھیک سوچ رہی تھی۔ دنیا کا کوئی مرد شیر دل جیسا نہیں تھا...... ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ وہاں سے 250 کلومیٹر دور اپنے گھر کے بیڈروم میں اپنے پرس سے شیر دل کا دیا ہوا ٹشو پیپر نکالتے ہوئے عکس مراد علی نے بھی یہی سوچا تھا۔

☆☆☆

”تیری ہے زمیں، تیرا آسماں
تو بڑا مہرباں تو بخشش کر
سبھی کا ہے تو سبھی تیرے ہیں
خدا میرے تو بخشش کر“

باربی ڈول کا دل خوشی سے بلّیوں اچھل رہا تھا۔ وہ اگر اس وقت اسمبلی ایریا میں کھڑی نہ ہوتی تو چھلانگیں لگاتی جا کر چڑیا سے لپٹ جاتی۔ کئی ہفتوں کے بعد اس دن اس نے کمبائنڈ اسمبلی کے دوران پہلی بار دوبارہ چڑیا کو دیکھا تھا اور اسے وہ سب گاتے سنا تھا جسے گاتا سنتے ہوئے وہ پہلی بار چڑیا کے عشق میں گرفتار ہوئی تھی۔ وہ آواز ویسی ہی میٹھی تھی، میٹھی، مدھر، پُرسوز، ملائم اور پُراثر...... اور اسمبلی ایریا آج بھی اسی ٹرانس میں تھا جس ٹرانس میں چڑیا کی آواز انہیں لے جاتی تھی۔

اس دن بریک کے دوران باربی ڈول بہت دیر چڑیا کی منتظر رہی۔ بریک گزر گئی چڑیا نہیں آئی اور جب وہ نہیں آئی تو وہ جیسے کچھ بے قراری کے عالم میں باتھ روم جانے کا بہانہ کر کے خود اس کی کلاس میں چلی آئی تھی۔

باربی ڈول کو اس کی کلاس کے دروازے میں نمودار ہوتے سب سے پہلے چڑیا کی دوست نے دیکھا تھا۔ وہ ہمیشہ کی طرح دروازے کے سامنے سے ایک بار گزری تھی، دوبار گزری تھی۔ اس نے اپنی آمد اور موجودگی کا احساس چڑیا کو دلانے کی کوشش کی تھی۔ ہمیشہ وہ یہی کیا کرتی تھی اور چڑیا اسے بار بار اپنے دروازے کے سامنے سے گزرتے دیکھ کر کلاس ٹیچر سے کوئی بہانہ کر کے باہر آ جاتی تھی لیکن آج ایسا نہیں ہوا تھا۔ باربی ڈول بار بار دروازے کے سامنے سے گزرتی رہی اور اپنی دوست کے احساس دلانے کے باوجود بھی چڑیا نے ایک بار بھی گردن موڑ کر دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ نہ دروازے کی طرف دیکھنے کی کوشش نہ کلاس سے باہر جانے کا تردد۔ کسی بت کی طرح بیٹھی وہ سامنے بلیک بورڈ کو دیکھتی رہی اور اپنی نوٹ بک میں کلاس ورک اتارتی رہی۔ ٹیچر کے بورڈ صاف کرنے کے بعد بھی وہ گردن سیدھی کیے بلیک بورڈ کو بے مقصد دیکھتی رہی اور تب تک دیکھتی رہی جب باربی ڈول نے اس کی بے اعتنائی محسوس کر کے بڑی مایوسی کے عالم میں دروازے کے سامنے سے بار بار گزرنا چھوڑ دیا اور جب اس نے دروازے کے سامنے سے گزرنا چھوڑ دیا تو چڑیا نے گردن موڑ کر پہلی بار دروازے کو رنجیدگی کے عالم میں دیکھا۔ وہ کتنی بار دروازے کے سامنے سے گزری تھی، دروازے کی طرف متوجہ نہ ہونے کے باوجود چڑیا بتا سکتی تھی اور اب جب وہ باہر نہیں تھی تو کلاس کے اندر بیٹھے بیٹھے چڑیا یہ بھی جانتی

تھی وہ اور باربی ڈول کبھی فرینڈز نہیں بن سکتی تھیں۔ نہ وہ اور باربی ڈول۔ نہ وہ اور ایک۔

باربی ڈول کی صبح جتنی خوشی اور سرشاری کے عالم میں گزری تھی باقی کا دن اتنی ہی اداسی میں گزرا تھا۔ چڑیا نے اس سے بات نہیں کی تھی اور اس بات نہ کرنے کی وجہ باربی ڈول کی سمجھ سے باہر تھی۔

اس نے اس دن گھر جا کر اپنی ممی کو سب سے پہلے چڑیا کے بارے میں ہی بتایا تھا۔ اس کی ممی چڑیا کی واپسی کے بارے میں جان کر چونکی تھی پھر اس نے موضوع بدلنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ موضوع نہیں بدل سکی تھی۔ چڑیا نے اس سے بات کیوں نہیں کی باربی ڈول کی زندگی کا اہم ترین ایشو تھا۔ لنچ، ڈنر، ہوم ورک کہیں بہت پیچھے رہ گئے تھے۔ اپنے باپ کے گھر آنے پر بھی باربی ڈول نے اسے سب سے پہلے چڑیا کے بارے میں ہی بتایا تھا اور اس کے باپ کا رنگ جیسے فق ہو گیا تھا۔ وہ کچھ دیر چپ کا چپ بیٹھا رہ گیا تھا پھر اس نے باربی ڈول سے بے حد تحکمانہ انداز میں کہا۔ ”تم آئندہ کبھی چڑیا سے نہیں ملو گی، نہ ہی اس سے بات کرو گی، نہ ہی اس کی کلاس میں جاؤ گی۔“ باربی ڈول باپ کا منہ دیکھتی رہ گئی تھی۔ اسے باپ سے یہ سننے کی توقع نہیں تھی۔

”لیکن کیوں۔“ باربی ڈول نے حیران نظروں سے اپنے مخصوص انداز میں باپ سے پوچھا۔ وہ اسے کوئی جواب دیے بغیر کچھ جھنجلاہٹ کے عالم میں وہاں سے چلا گیا۔ چڑیا کی واپسی کب ہوئی تھی؟ اور کیوں ہوئی تھی......؟ یہ اس کے لیے ایک نیا دردِ سر تھا۔ خیر دین کے ساتھ مصالحت کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ بھی تھی کہ وہ اب دوبارہ شہر نہیں آئے گا اور چڑیا کے واپس آنے کا مطلب تھا کہ خیر دین ان شرائط کی خلاف ورزی کر رہا تھا۔ لیکن بہت چالاکی اور عقلمندی دکھاتے دکھاتے بھی وہ ایک بے وقوفی کر گیا تھا کہ اس نے خیر دین کو بلیک میل کرنے کے لیے اس کے پاس کچھ نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی نوکری ختم ہو چکی تھی، پنشن روک لی گئی تھی، اسے کسی بھی قسم کی سرکاری نوکری کے لیے نااہل قرار دے دیا گیا تھا...... اور اب اگر وہ خیر دین کو ایک بار پھر سے شہر چھوڑ دینے پر مجبور کرنے کی کوشش کرتا تو کس چیز کی دھمکی دے کر کرتا۔ مقدمے کا نئے سرے سے آغاز۔ اسے یقین تھا اس دباؤ میں خیر دین نہیں آ سکتا تھا۔ لے دے کے باقی یہی بچا تھا کہ وہ ناجائز طور پر اسے پولیس کی تحویل میں رکھتا...... اور اس بار وہ یہ کام کرنے سے جھجک رہا تھا۔ خوف اسے اس طبقے سے صرف یہ تھا کہ اگر وہ کوئی درخواست لے کر شہر کے کسی دوسرے انتظامی آفیسر یا کسی MAN یا MPA کے پاس چلا جاتا تو اس کا دھڑن تختہ ہو سکتا تھا۔ وہ جن جس کو اس نے بڑی صفائی لیکن بے حد مشکل سے بوتل میں بند کیا تھا وہ دوبارہ آزاد ہو جاتا اور اس سے زیادہ خوفناک ثابت ہوتا جتنا وہ بوتل میں بند کرتے ہوئے تھا۔ اس رات کے واقعات کی بازگشت وہ کان بند کیے ہوئے بھی بہت جگہوں پر سن رہا تھا اور اس کی وجہ ڈی سی ہاؤس کا عملہ تھا۔ وہ ڈی سی کو سرو کرتے تھے لیکن ان کی ہمدردیاں خیر دین کے ساتھ تھیں اور ڈی سی اس حقیقت سے واقف بھی تھا اور خائف بھی۔ طاقت سے وہ ان سب کو رسیاں تو ڈالے ہوئے تھا لیکن وہ لوئر مڈل کلاس سے آنے والے اس ماتحت عملے کی نفسیات سے واقف تھا۔ مالیوں، ڈرائیوروں، چوکیداروں، خانساماؤں، ویٹرز اور دوسرے ملازموں پر مشتمل یہ طبقہ کسی بھی آفیسر کے لیے آستین کا سانپ ثابت ہو سکتا تھا۔ ان کے پاس

کسی بھی آفیسر کی ساکھ کو خراب کرنے کے لیے زبان جیسا خطرناک ہتھیار تھا جس کا وار کبھی خطا نہیں جاتا تھا۔ خیر دین کے معاملے کی بازگشت کو ڈی سی صرف ڈی سی ہاؤس تک رکھنے کے لیے سر توڑ کوشش کر رہا تھا لیکن وہ جانتا تھا کہ اندرونِ خانہ شہر کے دوسرے بہت سارے انتظامی آفیسرز کو اپنے ماتحت عملے کے توسط سے خیر دین اور اس کے درمیان جھگڑے کی اصل نوعیت کا پتا تھا...... اور اس تمام صورتِ حال میں خیر دین کا دوبارہ نمودار ہو جانا اس کے لیے گلے کی ہڈی کے برابر تھا جسے وہ اگل سکتا تھا نہ نگل سکتا تھا۔

اپنی desperation میں اس نے خیر دین پر ایک اور وار کرنے کی کوشش کی تھی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کا وہ وار اس کے لیے کتنا تباہ کن ثابت ہونے والا تھا۔ اس سارے مسئلے سے اتنی ہوشیاری سے جان چھڑا لینے کے بعد اس نے نادانستگی میں اپنے ہاتھوں سے دوبارہ اپنے لیے وہ جال بچھایا تھا جو اس کو لے ڈوبنے والا تھا۔

☆☆☆

''میں بہت خوش ہوں۔'' اس نے فون پر چہکتے ہوئے عکس کو بتایا۔ ''and actually Im happy for you'' ''تم آنا چاہتی تھیں نا اس سیٹ پر۔''

''تم زہر لگتے ہو اس طرح کی منافقت کا مظاہرہ کرتے ہوئے شیر دل۔ صاف صاف کہو تمہاری دلی مراد بر آئی ہے بلکہ کیا کہوں...... لاٹری نکل آئی ہے تمہاری۔'' وہ عکس کی بات پر برا منائے بغیر ڈھٹائی سے ہنسا تھا، جانتا تھا وہ جھنجلائی ہوئی ہوگی۔ صوبے میں غیر متوقع انتظامی اکھاڑ پچھاڑ کا طوفان آیا تھا اور وہ دونوں بھی اس کی زد میں آئے تھے۔ عکس کی پوسٹنگ شیر دل سے زیادہ بڑے شہر میں تھی جو ڈویژن کا درجہ بھی رکھتا تھا اور اس کی وہاں سے شیر دل کی سیٹ پر تبدیلی کم از کم پروفیشنلی عکس کو اچھی نہیں لگ سکتی تھی یہ شیر دل جانتا تھا اور وہ اس صورتِ حال سے محظوظ ہوا تھا۔ وہ ڈی ایم جی کے قابل ترین آفیسرز میں سے تھے اور آپس کے تعلق کے باوجود پروفیشنلی ان دونوں کے درمیان کانٹے کا مقابلہ رہتا تھا ہمیشہ۔ شیر دل کا خیال تھا کہ عکس بہت مواقع پر بہت جگہوں پر خوش قسمت رہی تھی اور قسمت کا یہ غیر متوقع ساتھ عکس کے کیریئر گراف کے مسلسل اوپر کی طرف سفر میں ایک اسٹرونگ فیکٹر تھا اور عکس کے بارے میں یہ رائے رکھنے والا وہ اس کے بیچ میٹس میں سے واحد نہیں تھا...... اور اب خوش قسمتی کی دیوی کا چند لمحوں کے لیے شیر دل پر مہربان ہونا اس کے لیے نعمتِ غیر مترقبہ ہی تھا۔

''دیکھو تم کو بھی خوش ہونا چاہیے...... اپنے شہر میں پوسٹنگ کا موقع مل رہا ہے تمہیں، کم اعزاز کی بات ہے کیا۔'' وہ اسی طرح ہنستے ہوئے اطمینان سے کہہ رہا تھا۔

''شیر دل تم کبھی مجھے اپنے سے کسی بہتر پوسٹ پر دیکھ ہی نہیں سکتے۔'' اس نے شیر دل کے بہلاوے سے بہلنے کے بجائے کہا۔

''تم دیکھ سکتی ہو؟'' شیر دل نے جواباً کہا۔

''ہاں......''

''Really''

''Shut up''

''عکس! تمہیں شرم نہیں آئی اس طرح کی بات کرتے ہوئے؟''

''تم نے کہا پہلے یہ۔ چلو ٹھیک ہے میں فون رکھ رہی ہوں۔'' وہ بے حد اور خلافِ معمول سنجیدہ تھی۔

''تم کیا واقعی میری سیٹ پر آنا نہیں چاہتی تھیں؟'' شیر دل کو اس کے لہجے سے پہلی بار تشویش ہوئی۔

''نہیں......'' اس کا جواب دوٹوک تھا۔

''کیوں؟'' وہ بھی سنجیدہ ہوا۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے عکس کو کسی ٹاسک یا پوسٹ کے حوالے سے اتنا reluctant دیکھا تھا۔

''بہت ساری وجوہات ہیں۔''

''کوئی ایک دو بتا دو۔'' وہ واقعی حیران تھا۔

''چلو خیر اب کیا ہو سکتا ہے...... پوسٹنگ ہو گئی ہے تو سیٹ تو سنبھالنی ہی پڑے گی۔'' شیر دل کو محسوس ہوا اس نے بات بدلی تھی۔

''trust me اس پوسٹنگ اور ٹرانسفر میں میرا کوئی عمل دخل نہیں ہے۔ تم کو پتا ہے میں کبھی tenure پوری کیے بغیر ان ایمرجنسی ٹرانسفرز کے حق میں نہیں رہا۔ میں نے تو پتا نہیں کیا کیا شروع کروایا ہے یہاں اس بجٹ کے بعد، ہر چیز کا کریڈٹ تم لے جاؤ گی۔'' شیر دل ایک ہی جملے میں سنجیدہ ہوا اور پھر فکر مند۔ عکس کو ہنسی آئی وہ جانتی تھی یہ فکر مندی مصنوعی نہیں تھی۔ شیر دل کو ٹرانسفر آرڈرز آتے ہی سب سے پہلے یہی پچھتاوا لگا ہوگا کہ اس کی محنت کا پھل کوئی اور کھانے والا تھا۔

''ایک سال میں ایسے بھی کیا تیر مار لیے ہوں گے تم نے، حوصلہ رکھا کرو اور دل بڑا کروا اپنا'' اس کے تبصرے کو نظر انداز کرتے ہوئے شیر دل نے اس سے اچانک خیال آنے پر پوچھا۔

''عکس تم conventarian ہو؟'' وہ اس کے سوال پر چند لمحوں کے لیے ٹھٹکی پھر اس نے کہا۔

''ہاں، تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''مثال کے اسکول گیا تھا۔ وہاں پرنسپل آفس میں رول آف آنر پر تمہارا نام دیکھا۔ پہلے تو کبھی میں نے غور نہیں کیا تھا، اس بار اتفاقاً اسے دیکھتے ہوئے تمہارے نام پر نظر پڑ گئی میری۔'' شیر دل نے اسے بتایا۔ ''ویسے تمہیں اپ ڈیٹ رکھنے کے لیے بتا رہا ہوں کہ تمہارا ریکارڈ ابھی تک ٹوٹا نہیں ہے۔'' عکس اس کی بات پر مسکرا دی۔

''اچھا...... نہیں ٹوٹا......؟ ٹوٹ جائے گا، ہر کسی نہ کسی نشانے کی زد میں ہوتا ہے، کون پرنسپل ہے آج کل وہاں؟'' اس نے دلچسپی لیتے ہوئے کہا۔

''سسٹر ایگنس ہیں۔''

''Great...... تو مثال کو بھی تم نے وہیں ایڈمٹ کروایا ہوا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''ہاں، شہر بانو کانونٹ کے علاوہ کہیں اور بھیجنے پر تیار نہیں ہوئی ورنہ میں کچھ اور try کرنا چاہتا تھا اس کے لیے۔'' عکس دلچسپی لیتے ہوئے اس کی بات سنتی رہی۔ وہ مثال کے ساتھ شیر دل کی گہری جذباتی وابستگی سے واقف تھی۔ مثال شیر دل کی کمزوریوں میں سے ایک تھی اور وہ ان موضوعات میں سے ایک تھی جس پر بات کرتے ہوئے شیر دل کسی کو بھی بور کر سکتا تھا...... عکس کے علاوہ۔ وہ دلچسپی سے شیر دل کی باتیں سنتی رہتی تھی اور اس کی باتیں سنتے ہوئے اسے اکثر احساس ہوتا کہ وہ قابلِ رشک حد تک اچھا باپ تھا اور وہ کئی بار شیر دل کو یہ بتائے بغیر نہیں رہ سکی۔ وہ ہر بار جواباً مسکرا دیتا تھا۔

''تمہیں پتا ہے سب سے بڑا فائدہ تمہیں میری سیٹ پر آ کر کیا ہونے والا ہے؟'' شیر دل بات کرتے کرتے اچانک بولا۔ عکس کو موضوع گفتگو کی اس abrupt تبدیلی سے حیران نہیں ہوئی۔ وہ جب سے شیر دل کو جانتی تھی وہ ایسا ہی تھا۔ ایک ایشو پر بات کرتے کرتے اس کی ذہنی رو پتا نہیں کہاں پلٹا کھا جاتی۔ بے حد سنجیدہ باتیں کرتے ہوئے وہ اچانک درمیان میں ایک انتہائی احمقانہ بات بڑی سنجیدگی سے کر دیتا اور کبھی انتہائی احمقانہ باتیں کرتے ہوئے سنہری حروف میں لکھی جانے والی کوئی بات کہہ دیتا۔ عکس اس کے چہرے اور ذہن کو کسی psychic کی طرح پڑھتی تھی۔

''کیا......؟''

''تمہیں ایک شاندار گھر ملنے والا ہے well decorated.well maintained شہر بانو اور میں نے جان لگا دی ہے اس بھوت بنگلے کو اس حالت میں پہنچانے میں...... جس میں تم نے اسے دیکھا ہوگا۔''

''اچھا......'' مختصر جواب آیا۔

''اور بڑی مزے کی بات بھی ہے اس گھر کے بارے میں۔'' شیر دل کو اچانک اس پر ایک اور انکشاف کرنے کا خیال آیا۔

''کیا......؟'' عکس نے اسی انداز میں ایکسائٹڈ ہوئے بغیر کہا۔

''اس گھر کے بارے میں بہت ساری myths ہیں۔ پہلی یہ کہ یہاں بونے ہیں اور دوسری یہ کہ یہاں رہنے والا کوئی کپل اکٹھا نہیں رہ سکتا۔ وہ ضرور الگ یا کسی حادثے کا شکار ہو جاتے ہیں۔ اگرچہ چیف نے یہ کام کروانے کی بڑی کوشش کی ہے لیکن کچھ ہوا نہیں ورنہ کچھ ہو جاتا تو میری پوری خواہش ہوتی کہ تم اور جواد ملہی بھی شادی کے بعد اسی گھر میں رہتے۔'' وہ اس کی انتہائی سنجیدگی سے کہی بات پر کھلکھلا کر ہنس دی۔

''تم کتنے mean ہو شیر دل۔''

''ہمیشہ سے تھا۔'' اس نے برجستہ کہا۔ ''ویسے یہ پہلی myth کوئی myth نہیں ہے. یہاں واقعی کچھ نہ کچھ ہے۔ لیکن وہ کسی کو بھی نقصان نہیں پہنچاتا۔'' شیر دل کو اس سے بات کرنے کے بعد اچانک خیال آیا تھا کہ شاید اس نے کسی مافوق الفطرت چیز کا ذکر کر کے کچھ غلطی کی تھی کیونکہ عکس کو اس گھر میں اکیلا رہنا تھا لیکن پھر اسے خیال آیا تھا کہ وہ غلطی کوئی اتنی سنگین نہیں تھی۔ وہ جس عورت سے بات

کر رہا تھا اسے اس نے کم از کم اپنے سامنے اکیڈمی کے تمام عرصہ کے دوران کسی چیز سے خائف نہیں دیکھا تھا۔ اس کا نرم و نازک سراپا آہنی اعصاب رکھتا تھا۔ وہ اس سے اکیڈمی میں پہلی بار متاثر بھی ایسی ہی کسی چیز سے ہوا تھا۔

اکیڈمی کے دنوں میں کسی اسٹڈی ٹور کے سلسلے میں وہ لوگ قلعہ روہتاس گئے تھے وہاں سے واپسی پر انہوں نے ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس میں لنچ کیا تھا۔ لنچ ابھی ارینج نہیں ہوا تھا اور اس کے انتظامات دیکھنے کے لیے ہی کچن میں دوسرے کامنرز کے ساتھ انہوں نے کچن کا وزٹ کیا تھا اور کچن سے ملحقہ ڈائننگ ہال میں گھومتے ہوئے انہیں پتا چلا کہ وہاں یہ آزادی صرف سول سروس اکیڈمی میں زیرِ تربیت ان کے کامن کو نہیں تھی بلکہ ہر رنگ، سائز اور شکل کے بے خوف چوہوں کو بھی تھی جن میں اور شیر دل سمیت دوسرے کامنرز کی اس ریسٹ ہاؤس میں گھومنے پھرنے کی آزادی اور بے تکلفی میں صرف یہ فرق تھا کہ وہ ان کی طرح پشت کے پیچھے ہاتھ باندھ کر اِدھر سے اُدھر نہیں جا رہے تھے...... ورنہ انہیں کم از کم اس ریسٹ ہاؤس میں انسان نامی شے سے تو کوئی خوف محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ جس اطمینان و سکون سے وہ تمام چوہے ان سب کی موجودگی کے باوجود اپنی اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں میں مشغول تھے ان پر کامنرز کو رشک آ رہا تھا اور رشک کی اس کیفیت کے دوران ہی مرد کامنرز میں سے کسی نے ان چوہوں میں سے کسی ایک کو پکڑ کر لڑکیوں کو خوفزدہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

شیر دل ویسے تو اس طرح کے پریکٹیکل جوکس میں شامل نہیں ہوتا تھا لیکن اس دن یہ عکس کو دوسری لڑکیوں کے ساتھ ریسٹ ہاؤس میں ڈرتا ہوا بھاگتے ہوئے دیکھنے کی خواہش تھی جس نے اسے بھی اس پریکٹیکل جوک کا حصہ بنا دیا۔

چند چوہوں پر ریسٹ ہاؤس کے ملازمین کی مدد سے بڑی آسانی سے کپڑا ڈال کر قابو پایا گیا اس کے بعد انہیں ایک تھیلے نما بیگ میں منتقل کر دیا گیا اور لنچ کے بعد جب سب لوگ سویٹ ڈش سے محظوظ ہو رہے تھے تو ایک کامنرز نے بڑے اطمینان کے عالم میں ٹیبل کے ایک کونے پر بڑی احتیاط سے باری باری وہ دو تین چوہے چھوڑ دیے تھے۔ ڈائننگ ہال میں دو تین ڈائننگ ٹیبلز کو جوڑ کر بہت لمبی چوڑی کھانے کی ٹیبل سجائی گئی تھی جس کے ایک سرے سے چوہوں نے بھاگنا شروع کیا۔ شروع کے چند قدموں کے بعد انہوں نے ٹیبل کے اطراف سے نکلنے کی کوشش کی لیکن دونوں اطراف میں لوگوں کی قطاروں کو دیکھ کر وہ کسی رکاوٹوں والی ریس میں شریک کھلاڑیوں کی طرح بالکل سیدھا بھاگنے لگے تھے۔ ڈونگوں، چمچوں، پلیٹوں، ڈشز کی رکاوٹوں کو برق رفتاری اور ہوشیاری سے پھلانگتے ہوئے ان چوہوں کے اچانک کہیں سے نمودار ہو جانے پر وہاں بیٹھے پاکستان کی مستقبل کی اسٹیبلشمنٹ کو پہلے سکتہ ہوا، پھر ان میں سراسیمگی پھیلی اور پھر ہڑبونگ اور چیخ پکار کا آغاز ہوا...... اور بھاگنے والوں میں پہلی صف میں وہ مرد کامنرز تھے جنہیں اس منصوبے سے لاعلم رکھا گیا تھا۔ خواتین سے تو خیر چوہا نظر آنے پر اس کے علاوہ کسی اور ردِّعمل کی توقع کی ہی نہیں جا سکتی تھی۔ کرسیاں الٹاتی، چمچ پلیٹیں اور گلاس گراتی...... بیگز اور سینڈلز کو پھینکتی...... دوپٹوں سے الجھتی چیخ پکار کے کورس کے ساتھ ایک منٹ سے بھی کم عرصے میں تمام خواتین

کا منرز کمرے سے باہر تھیں۔ مرد کا منرز ان سے پہلے ہی باہر بھاگ چکے تھے۔ ہال میں اب ہنسی سے دوہرے ہوتے ہوئے ٹیبل کے ایک سرے پر کھڑے وہ چند کا منرز تھے جو اس پریکٹیکل جوک کے خالق تھے یا ٹیبل کے بالکل درمیان ایک کرسی پر کسٹرڈ پڈنگ کا ایک پیالہ ہاتھ میں لیے بیٹھی عکس مراد علی تھی جس کے سامنے سے اب وہ چوہے بھاگتے ہوئے گزر رہے تھے۔

وہ اس وقت کسٹرڈ پڈنگ کے چند آخری چمچ لے رہی تھی جب اس نے ٹیبل کے داہنی طرف چیخ پکار کے ساتھ افراتفری دیکھی اور اس افراتفری کی نوعیت جاننے کے لیے ٹیبل پر کچھ آگے کو جھک کر گردن موڑ کر اس نے داہنی طرف کی میز کے حصے کو دیکھا اور تب اس نے پہلی بار ٹیبل پر بے حد تیزی سے حرکت کرتی ان ننھی منی سی چیزوں اور ان چیزوں کے بیک گراؤنڈ میں کھڑے ہنسی سے بے حال شیر دل اور چند دوسرے کا منرز کو دیکھا۔ صورتِ حال کو سمجھے بغیر جو پہلا کام اس نے کیا تھا وہ نہایت سرعت اور سکون کے ساتھ سویٹ ڈش کا اپنا پیالہ اٹھانا تھا۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ اس کی اس حرکت نے کسی کو حیرانی کا پہلا جھٹکا دیا تھا۔ جہاں چمچ، پلیٹیں اور گلاس گرائے اور چھوڑ کر بھاگا جا رہا تھا وہاں وہ بڑے اطمینان کے ساتھ میز پر بھاگتے چوہوں کو کسٹرڈ پڈنگ کھاتے ہوئے دیکھنے لگی تھی یوں جیسے وہ ومبلڈن کے سینٹر کورٹ میں رائل گیلری میں بیٹھی گرینڈ سلام کا فائنل دیکھ رہی تھی۔ شیر دل اس کے انداز کے لیے اس سے اچھی analogy نہیں لا سکتا تھا۔ عکس نے اس کی امیدوں پر گھڑوں پانی ڈالا تھا۔ اس کے سامنے ٹیبل پر پڑے کسٹرڈ پڈنگ کے ایک باؤل کو خود کو اسپائڈر مین سمجھنے والے ایک چوہے نے پھلانگنے کی کوشش کی اور اس کوشش کے دوران وہ اس پلیٹ سے غڑاپ سے باؤل کے اندر گرا جس پر سے وہ ہوا میں چھلانگ لگا کر بلند ہوا تھا۔ پڈنگ کے چند چھینٹے باہر آ کر گرے اور وہ بدحواسی کے عالم میں اس پڈنگ سے نکلنے کے لیے بری طرح ہاتھ پاؤں مارنے لگا جو اس وقت اس کے لیے دلدل ثابت ہو رہی تھی اور اس کے سامنے بیٹھی ”شہد کی دلدل“ نے بے حد ہمدردی سے اسے دیکھا تھا۔ اپنے ہاتھ میں پکڑے پیالے میں موجود پڈنگ کا آخری چمچ بڑے پُرسکون انداز میں منہ میں ڈالتے ہوئے شیر دل نے عکس کو پڈنگ کا پیالہ میز پر رکھتے ہوئے دیکھا پھر اسی سکون کے ساتھ اس نے ہاتھ بڑھا کر سرونگ اسپون...... کے ساتھ لجلجی پڈنگ سے نبرد آزما چوہے کو باؤل سے نکالا اور بے حد احتیاط کے ساتھ ٹیبل پر چھوڑ دیا۔ چوہا سیکنڈز میں وہاں سے غائب ہوا تھا۔ اپنی گود میں رکھا ٹیبل نیپکن بے حد نفاست سے تہ کر کے ٹیبل پر رکھتے ہوئے وہ کرسی کے پائے کے قریب رکھا اپنا ہینڈ بیگ اٹھائے ہوئے بڑے اطمینان کے عالم میں کرسی دھکیل کر ہال سے چہل قدمی کے انداز میں باہر گئی تھی۔ وہ اپنے جس Composure کے لیے گروپ ٹاسکس کے دوران مشہور تھی وہ Composure آج بھی حواس باختگی میں تبدیل نہیں ہوا تھا۔ شیر دل کو اگر عکس مراد علی کو ایک چوہا دیکھ کر بھاگتا نظر آنے کی تمنا تھی تو وہ تمنا پوری نہیں ہوئی تھی۔ اپنے حواس اور اعصاب پر قابو رکھنے کا اس سے بہترین ڈسپلے شیر دل نے کسی عورت میں نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

اگر کوئی ایک چیز تھی جس کو چڑیا ڈی سی ہاؤس سے نکالے جانے کے بعد مس کرتی تھی تو وہ اس کے وہ سات ساتھی بونے تھے...... ٹوکو، کٹوشنٹو، ٹوفو، کنغا، منغا، ڈیڈو...... جو اس رات اس گھر میں ہی رہ گئے تھے۔ کئی دن تو چڑیا کو ان کا خیال ہی نہیں آیا لیکن پھر آہستہ آہستہ اسے ان کا خیال آنے لگا تھا۔ وہ ایلس تھی جسے اس کے ونڈر لینڈ سے نکال دیا گیا تھا اور لاکھ چاہنے کے باوجود بھی وہ اس ونڈر لینڈ میں دوبارہ نہیں جا سکتی تھی کیونکہ وہ اس ونڈر لینڈ کا رستہ بھول چکی تھی اور اس کے سات ساتھی اس ونڈر لینڈ سے باہر نہیں آ سکتے تھے۔ لاکھ کوشش کے باوجود بھی چڑیا اب کسی طرح بھی اس ونڈر لینڈ اور اس میں بسنے والے اپنے سات ساتھیوں کا کوئی تصوراتی رابطہ اور تعلق بھی نہیں ڈھونڈ سکتی تھی۔ چڑیا وہ پاس ورڈ بھول گئی تھی جسے استعمال کر کے وہ اپنے تصورات کی اس خوب صورت دنیا میں دوبارہ رسائی حاصل کر سکتی۔ وہ سات بونے کام پر گئے تھے اور ان کی عدم موجودگی میں سنو وائٹ زہر والا سیب کھا کر سو گئی تھی۔ چڑیا نے اپنی فیری ٹیل کا خاتمہ بھی نہیں کیا تھا۔ اپنے سات ساتھی بونوں سے بے پناہ شکایتیں رکھنے کے باوجود...... وہ کیوں اس کی مدد کو نہیں آئے تھے؟ انہوں نے کیوں اس کو اکیلا چھوڑ دیا تھا؟ انہوں نے کیوں اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہونے دیا جو ہوا تھا؟ گلے شکوؤں کی ایک لمبی فہرست تھی جنہیں دل میں لیے چڑیا بہت دیر تک ان ساتوں سے خفا رہی تھی لیکن پھر وہ گلے شکوے آہستہ آہستہ خود ہی ختم ہو گئے تھے۔ وہ اب صرف بے حد سنجیدگی سے انہیں مس کرتی تھی۔ اس کی تصوراتی دنیا میں اب کوئی جیتا جاگتا ساتھی نہیں تھا اور اس تنہائی نے چڑیا کو اکیلا ہی نہیں خاموش بھی کر دیا تھا۔ اکیلے بیٹھ کر اپنے آپ اور کنغا، منغا سے باتیں کرنے کا سلسلہ ختم ہو گیا تھا۔ ان کے ساتھ کھیل کود اور ان کو اپنے پورے دن کی سرگرمیوں کا بتا کر ان کے قصے سننے کا سلسلہ بھی ختم ہو گیا تھا۔

خیر دین حلیمہ، چڑیا اور وہ بچا کھچا سامان لیے تھانے سے رہائی کے اگلے ہی دن اپنے گاؤں واپس چلا گیا تھا۔ جہاں اس کی اور چڑیا کی رسوائی کی داستان اس کی آمد سے بھی پہلے پہنچ چکی تھی۔ شہر میں اب اردلیوں، نائب قاصدوں، مالیوں اور چوکیداروں کے طور پر سرکاری اداروں میں گاؤں کے بہت

سارے لوگ کام کر رہے تھے اور خیر دین کے لیے یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ وہ ان تمام واقعات کو گاؤں اور وہاں موجود اپنے خاندان تک پہنچنے سے روک پاتا، چھپا سکتا...... اور ایسا ممکن ہوتا تب بھی خیر دین اپنے خاندان سے یہ کبھی نہیں چھپانا چاہتا تھا، وہ اپنے خونی رشتوں کے کندھوں پر سر رکھ کر رونا چاہتا تھا، اس اذیت اور تکلیف کو ان کے ساتھ بانٹنا چاہتا تھا جو وہ کسی کے ساتھ نہیں بانٹ پایا تھا۔

گاؤں پہنچنے کے بعد خیر دین کا پہلا کام اپنے گھر کے دروازے پر لگی وہ تختی اتارنے کا تھا جو پچھلی کئی دہائیوں سے اس کے گھر کے دروازے پر بجی گاؤں میں اس کے خاندان کی عزت اور پہچان کا باعث تھی اور اس تختی کے اترتے ہی گاؤں میں خیر دین کے نام اور خاندان کا دبدبہ بھی ختم ہو گیا تھا، وہ اب پھر سے کمی کمین ہو گئے تھے۔ وہ کمی کمین جو شاہ کے کتے تھے اور شاہ کی وجہ سے اپنی اوقات بھول بیٹھے تھے۔

سرکاری نوکری اور اس نوکری کے ساتھ ملنے والی تمام مراعات گنوا کر خیر دین زندگی میں پہلی بار خالی جیب اپنے گاؤں اور گھر پہنچا تھا۔ ساری عمر وہ جب بھی چھٹی پر گھر آتا رہا اس کے گھر ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا رہتا...... گاؤں کے لوگ اور قریب اور دور کے رشتے دار اس کے پاس چھوٹے موٹے کاموں کے لیے یوں رقعے اور چٹھیاں لے کر آتے جیسے وہ ڈی سی کا خانساماں نہیں خود ڈی سی تھا اور خیر دین وہ ساری چٹھیاں اور رقعے اکٹھے کرتا اگلی چھٹی تک واقعی ایک ایک کر کے ان تمام درخواستوں پر عمل درآمد کے لیے اپنے صاحب اور صاحب کے جاننے والے دوسرے صاحبوں سے سفارش کرواتا پھرتا...... اور خیر دین کے کہنے پر کام ہوتا تھا تو گاؤں میں خیر دین کے خاندان کے سر پر ایک اور قلغی کا اضافہ ہو جاتا تھا۔

اب وہی خیر دین لٹے پٹے حال میں واپس آیا تھا۔ اس سے ملنے کے لیے آنے والوں کا تانتا اب بھی اسی طرح بندھا ہوا تھا لیکن اب وہ سب لوگ تماشائیوں کا روپ دھار کر وہاں آئے تھے...... یہ دیکھنے اور سننے کے لیے کہ خیر دین آسمان سے زمین پر کس طرح آیا تھا...... اور زمین پر آنے کے بعد اس کی حالت کیا تھی۔ خیر دین جس طبقے سے تعلق رکھتا تھا وہاں سانپ سیڑھی کا کھیل دیکھ کر خوش ہونے والوں کی بڑی تعداد تھی جن کے لیے دوڑ میں سب سے آگے بھاگنے والے کو فنشنگ لائن کے قریب پہنچنے سے پہلے منہ کے بل گرتے دیکھ کر تالی بجا کر اٹھنے والوں کی تعداد اس کی شاندار رفتار اور کارکردگی کو دیکھ کر داد و تحسین دینے والوں سے کہیں زیادہ تھی۔ خیر دین اب ان جیسا ہو گیا تھا۔ ان سب کی طرح اور یہ امر باعثِ اطمینان تھا۔ چار جملے اس سے ہمدردی اور ڈی سی اور حکومت پر ملامت کے بعد وہ سب جس ایک احساس کے ساتھ خیر دین سے مل کر رخصت ہوتے وہ یہی اطمینان تھا۔ ان کے اس یقین میں اضافہ ہوتا کہ لاکھ پڑھ لکھ لو، کچھ نہیں ہوگا۔ ان کے طبقے کے حالات نہیں بدلتے اور نہیں بدلیں گے۔ وہ خدمت اور ذلت کے لیے پیدا ہوئے تھے اور یہی دو کام کرتے مر جائیں گے۔ اب خیر دین کو ہی لے لو ساری عمر سرکار کی خدمت کر کے اتنا پڑھ کر لکھ کے بھی کیا مل گیا اسے، خود بھی خوار ہوا اور بچی کی زندگی بھی برباد کر دی۔ اس سے تو اچھا تھا کہ گاؤں میں اپنی بھٹی پر بیٹھتا یا زمیندار کا مزارعہ بن جاتا یا پھر اپنی ہی

خاندانی زمین پر کاشت کاری کر لیتا...... دال روٹی تو اس سے بھی چل ہی جاتی۔ خیر دین ان سب کے لیے اپنی زندگی کو بہتر کرنے کے لیے جدوجہد نہ کرنے کے حق میں دی جانے والی ایک سنہری مثال بن گیا تھا۔

آہستہ آہستہ خیر دین کے گھر آنے والے لوگوں کی تعداد میں کمی ہونا شروع ہو گئی تھی اور اس کمی کے ساتھ ساتھ خیر دین کے خاندان والوں میں بھی اس کے اور حلیمہ اور چڑیا کے لیے دکھائی جانے والی ابتدائی ہمدردی اور گرم جوشی بھی ختم ہوتی گئی تھی۔ خیر دین اس سے پہلے ساری عمر انہیں دینے والا تھا اب ان سے لینے والا بن کر پلٹا تھا۔ ایک کمرے اور دو وقت کی روٹی کے علاوہ خاندان والوں کے پاس خیر دین کو دینے کے لیے کچھ نہیں تھا اور خود خیر دین کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ گاؤں میں کیا کرے یا کیا کر سکتا تھا۔ بھٹی پر وہ نہیں بیٹھ سکتا تھا، نہ تو اسے اس کام کا تجربہ تھا اور نہ ہی ساری زندگی سرکاری نوکری کرنے کے بعد وہ اس مشقت والے کام کے قابل رہا تھا۔ واحد کام جو وہاں وہ کر سکتا تھا وہ کاشت کاری تھی اور اس کے لیے زمین چاہیے تھی۔ اس کے ماں باپ کی طرف سے وراثت میں ملنے والی زمین کا رقبہ اس کے تمام بھائی مشترکہ طور پر کاشت کرتے تھے۔ زمین کا وہ چھوٹا سا ٹکڑا اس مشترکہ خاندانی کاشت کاری کے نتیجے میں صرف اس قابل ہو سکا تھا کہ پورے خاندان کو سال بھر کا اناج دے دیتا یا پھر اتنی سبزی پیدا کر دیتا جو اس کے بھائی، ہر روز قریبی شہر کی منڈی میں ریڑھے پر لاد کر بیچ آتے اور اس سے ملنے والی رقم سے ان کے اور زمین کے اخراجات پورے ہوتے رہتے۔ سبزی کی فروخت سے ملنے والی وہ رقم پہلے ہی بہت سارے حصوں میں تقسیم ہونے کے بعد کبھی بھی ہر روز کسی کے حصے میں آنے والے چند سو سے زیادہ نہیں بڑھتی تھی اور ان چند سو میں سے بھی کچھ اور کمی کرنے کے لیے خیر دین کو حصہ دار بنانے کا فیصلہ خاندان کے ہر شخص کے لیے مشکل تھا۔ وہ اس حصہ داری کے بجائے صرف اس بات پر آمادہ تھے کہ خیر دین کی تین وقت کی روٹی مختلف بھائیوں کے چولھوں پر تقسیم کر دی جاتی۔ خیر دین نے سرکاری نوکری کے دوران گاؤں میں ہی تھوڑی اور زمین خریدی تھی لیکن اپنے ماں باپ کی محبت میں اس

نے زمین کے اس ٹکڑے کو بھی اپنے بھائیوں کو کاشت کاری کے لیے سونپ دیا تھا۔ زمین کا وہ ٹکڑا اس کے بھائیوں کے زیرِ استعمال ہونے کے باوجود اس کے اپنے نام تھا۔ گاؤں میں واپس آجانے کے چند ہفتوں میں ہی خیر دین کو یہ احساس ہوگیا تھا کہ خاندانی زمین میں سے فوری طور پر کسی قسم کا کوئی مالی فائدہ ملنا مشکل تھا لیکن وہ اپنی ملکیتی زمین کو اپنے زیرِ استعمال لے آتا تو فوری طور پر اس کے بہت سارے مالی مسائل حل ہوسکتے تھے۔ اپنے بھائیوں سے اس نے ایک شام اس زمین کو واپس لینے کی خواہش کا اظہار کیا اور اگلے دن وہ جس گھر میں رہ رہا تھا وہ اس کے خونی رشتوں کا نہیں رہا تھا۔ ایک ہی رات میں ان سب کی نظریں بدل گئی تھیں۔ خیر دین نے ایسی بے گانگی اور بے رخی پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ خیر دین کو اس گھر میں رکھنے پر تیار تھے لیکن ان میں سے کوئی بھی خیر دین کو اس کی زمین واپس کرنے پر تیار نہیں تھا۔ وہ اس کا جائز حق ہوتا نہ ہوتا...... خیر دین جن حالات سے گزر رہا تھا ان میں اس کے لیے یہ مزید ایک صدمہ اور دھچکا تھا۔ اپنوں سے ملنے والے زخم تھور کے زہر کی طرح ہوتے ہیں۔ شہر سے خیر دین مر کے آیا تھا اور خاندان والوں نے اسے دفن کردیا تھا۔ ایسا بوجھ اس نے کبھی زندگی میں نہیں اٹھایا تھا۔ ایسا محتاج اور کمزور خیر دین کبھی نہیں پڑا تھا۔ وہ اپنے بھائیوں سے زمین کا مطالبہ کرسکتا تھا لیکن ان سے لے نہیں سکتا تھا کیونکہ ان کے ساتھ ان کے بیٹے کھڑے تھے اور بھتیجوں کی اس لمبی فوج سے خیر دین ٹکر نہیں لے سکتا تھا۔ زندگی میں وہ پہلا موقع تھا جب خیر دین کو ایک بیٹا نہ ہونے کا دکھ ہوا تھا...... بیٹے شاید ایسے موقعوں کے لیے ہی مانگے جاتے ہیں۔

خیر دین روز زمین پر جاتا...... بھائیوں اور بھتیجوں کے منہ نہ لگانے کے باوجود ڈھیٹوں کی طرح ان کے ساتھ کام کرتا پھر شہر جاکر سبزی بیچتا...... اور اس ساری مشقت کے عوض کوئی اسے پچاس سو پکڑا دیتا۔ وہ چند نوٹ ہاتھ میں لے کر خیر دین خون کے آنسو روتا۔ اس پر چڑیا اور حلیمہ کی ذمے داری نہ ہوتی تو وہ مرجاتا لیکن کبھی اس طرح حق کے بجائے بھیک نہ لیتا لیکن اس کی زندگی میں موجود دو عورتوں نے اسے بہت کمزور کردیا تھا...... مجبور، کمزور اور بے بس۔

چڑیا اپنے نانا کی اس بے بسی کی داستان کی عینی شاہد تھی۔ ایک بچہ انسانوں کے عروج اور زوال کی سائیکل کو نہیں سمجھتا۔ اپنے اردگرد سب کچھ اچھا دیکھ کر وہ یہی سمجھتا ہے کہ دنیا بس ایسی ہی اچھی ہوتی ہے اور ایسی ہی رہے گی اور اپنے آپ کو برے حالات میں بھی دیکھ کر اس کی سوچ یہی ہوتی ہے۔ چڑیا نے اس گاؤں میں خیر دین کا عروج وزوال، عروج وزوال سے واقف ہوئے بغیر دیکھا تھا اور خیر دین کے ساتھ اس نے اپنا عروج وزوال بھی دیکھا تھا، وہ خیر دین کے ساتھ چھٹی پر گاؤں آتی تو وہاں اس کا بھی شاندار استقبال ہوتا تھا۔ وہ جتنے دن وہاں رہتی شاہانہ انداز میں رہتی کیونکہ وہ خیر دین کی نواسی تھی۔ انگلش میڈیم اسکول میں پڑھتی تھی اور خیر دین کی طرح انگریزی بول سکتی تھی اور ہمیشہ فرسٹ آتی تھی۔ وہ فراک پہنتی تھی اور اپنے خاندان کے تمام بچوں سے زیادہ اچھی اور مہنگی چیزیں تھیں اس کے پاس۔ ربنز تھے، گھڑی تھی، بالیاں تھیں، بوٹ بھی تھے۔ وہ دوسرے بچوں کی طرح مسواک اور دنداسے سے دانت صاف نہیں کرتی تھی ٹوتھ پیسٹ کرتی تھی اور وہ اپنے بالوں کو دیسی صابن سے رگڑ رگڑ کر نہیں دھوتی تھی

پالش بھی کرتی تھی۔ وہ اپنے بالوں میں برش کرتی تھی اور پاؤڈر اور کریم لگاتی تھی۔ وہ چاول ہاتھ سے نہیں کھاتی تھی چمچ سے کھاتی تھی، شیشے کے گلاس میں پانی پیتی تھی اور اس کے پاس ایسے کھلونے تھے جو گاؤں میں بھی کسی نے دیکھے تک نہیں تھے۔ خیر دین نے چڑیا کو میم صاحب کی طرح پالا تھا اور چڑیا اور چڑیا کا رہن سہن پورے خاندان کے بچوں کو اس پر رشک کرنے پر مجبور کر دینے کے لیے کافی تھا۔

اور اب وہ میم صاحب ایک تماشے کی صورت میں ان کے بیچ واپس آئی تھی۔ اس کے بارے میں عجیب عجیب باتیں دنوں میں ہر جگہ پھیل گئی تھیں اور انہیں پھیلانے میں خیر دین کے اپنے خاندان کا زیادہ حصہ تھا۔ چڑیا کے سامنے بچے چڑیا کے بارے میں اس کو دیکھتے ہوئے سرگوشیاں کرتے یا اسے عجیب مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے...... اسے اپنے جیسا بلکہ اپنے سے زیادہ بری حالت میں دیکھنا خاندان کے بچوں سے زیادہ ان کے ان بڑوں کو خوشی اور تسکین پہنچا رہا تھا جو اس سے پہلے اسے دیکھ کر اپنے بچوں کے حوالے سے مزید حسرتوں کا شکار ہو جاتے تھے۔

وہاں آنے کے چند دن کے بعد ہی خیر دین نے اسے گاؤں کے اسی اسکول میں دوبارہ داخل کروا دیا جہاں سے اس نے اپنی تعلیم کا آغاز کیا تھا۔ چڑیا اس دن پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ اسے اس کانونٹ سے بہت پیار تھا جہاں وہ پڑھ رہی تھی وہاں اس کی فرینڈز تھیں فیورٹ ٹیچرز تھیں اور باربی ڈول بھی تھی۔ اس کی تصوراتی دنیا پہلے ہی جیتے جاگتے کرداروں سے محروم ہو چکی تھی اب اس کی حقیقی دنیا بھی ان تمام لوگوں سے محروم ہو گئی تھی جن سے وہ پیار کرتی تھی۔

گاؤں کے اسکول میں گزارے ہوئے چند ہفتے چڑیا کی زندگی کا ایک اور بے حد تکلیف دہ تجربہ تھا۔ وہ چھوٹا سا گاؤں چڑیا کے ساتھ ہونے والے واقعہ سے آگاہ تھا اور اسکول میں آنے والا ہر بچہ بھی چڑیا کو پہلے اسی حوالے سے پہچاننے اور اس میں دلچسپی لینے لگا تھا۔ پہلے ہی دن اس کی ایک ٹیچر نے اسے اسٹاف روم میں بلوا کر وہاں تمام ٹیچرز کے درمیان ڈی سی ہاؤس میں ہونے والے واقعے کے بارے میں اسے کریدنا شروع کر دیا۔ وہ خوف سے اسی طرح گنگ ہو گئی تھی جس طرح اس واقعے کے بارے میں کسی کے بھی سوالوں سے ہو جاتی تھی اور اس کی خاموشی نے جیسے ان ٹیچرز کو Irritate کیا تھا۔ چڑیا پہلے دن ہی اپنی ٹیچرز پر ایک برا تاثر چھوڑ کر آئی تھی جو اس کے اس اسکول میں آخری دن تک قائم رہا تھا۔

اس کی ٹیچر کا وہ تجسس صرف ایک ابتدا تھی اس کے بعد کے ہفتوں میں چڑیا نے اپنی ہم عمر بچیوں اور ٹیچرز کی طرف سے بدترین جنسی سوالات اور darassment کا سامنا کیا تھا۔ اس کی اپنی کلاس کی بچیوں سے لے کر بڑی کلاسز کی بچیوں تک ہر ایک کو چڑیا سے اس واقعے کی تفصیلات جاننے کے لیے ایک عجیب سا تجسس اور بے چینی رہتی تھی۔ وہ کسی فری پیریڈ یا لنچ بریک کے دوران اسکول کے میدان میں بڑی کلاسز کی بچیوں سے چھپتی پھرتی جو اسے گروپ کی شکل میں گھیر لیتیں اور پھر ان سے انتہائی بے ہودہ سوالات کرنا شروع کر دیتیں...... ایسے سوالات جن پر چڑیا کبھی خوفزدہ ہوتی تو کبھی شرم سے سرخ اور کبھی وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی۔ اس اسکول میں اس کا کوئی دن ایسا نہیں گزرا تھا جب وہ دن میں کم

ازکم ایک بار کسی بچی یا ٹیچر کی وجہ سے رونا پڑتی ہو۔

اور اسکول میں اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا تھا وہ خیر دین نہیں جانتا تھا۔ چڑیا جو ہمیشہ اپنے اسکول میں ہونے والی ایک ایک بات خیر دین کو بتایا کرتی تھی اب اس واقعے کے حوالے سے کچھ بھی خیر دین کو بتانے سے ڈرتی اور جھجکتی تھی۔ اسکول سے اب اسے خیر دین کے بجائے حلیمہ لینے آتی تھی اور وہ حلیمہ کے سامنے اترے چہرے کے ساتھ اسکول سے برآمد ہوتی اور خاموشی سے اس کے ساتھ گھر کے رستے پر چل پڑتی۔ پورے دن میں وہ پہلا موقع ہوتا تھا جب وہ خوف و ہراس کی اس کیفیت سے باہر آتی تھی اور جب وہ سر اٹھا کر رستے میں آنے والے کسی شخص کو دیکھ سکتی تھی، سر اور نظریں جھکائے نہیں چلتی پھرتی تھی۔ حلیمہ نے بیٹی کے اترے چہرے کو دیکھ کر پریشان ہونا یا سوال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ زندگی میں اب اتنے مسئلے ہوگئے تھے کہ چڑیا کی اداسی اور ناخوشی جیسا مسئلہ بہت پیچھے چلا گیا تھا۔

چڑیا اسکول والے عقوبت خانے سے گھر والے چھوٹے سے عقوبت خانے میں آجاتی جہاں باقی کا سارا دن وہ اس کمرے میں ہی بیٹھے بیٹھے گزار دیتی جس میں حلیمہ اور خیر دین کی رہائش تھی۔ وہ وہیں ہوم ورک کرتی وہیں کھانا کھاتی اور پھر وہیں اپنے کھلونے یا کہانیوں کی کوئی کتاب نکال کر بیٹھ جاتی اور اس طرح ایک اور دن گزر جاتا۔ خیر دین شام کو گھر آتا تھا اور اتنا تھکا ہوا ہوتا تھا کہ اس کے لیے چڑیا یا حلیمہ سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نہیں ہوتا تھا۔ اسکول کی پڑھائی اتنی آسان تھی کہ خیر دین کو پہلے کی طرح اسے پڑھانے کی جدوجہد میں خود کو ہلکان نہیں کرنا پڑتا تھا۔ وہ اب بھی چڑیا کی ہر چیز کا خیال کرتا تھا اس کے کھانے پینے کا لباس کا...... اب بھی وہی اس کی پونی یا چٹیا کر کے اسے صبح اسکول چھوڑ کر آتا تھا لیکن بس اس میں فرق یہ آیا تھا کہ اب اس نے اپنی پروا کرنی چھوڑ دی تھی۔ وہ بالوں کو نہیں رنگتا تھا اب، نہ ہی کپڑے استری کر کے پہنتا تھا...... نہ اپنی ڈاڑھی باقاعدگی سے منڈواتا تھا اور چڑیا کو خیر دین پر ترس آتا تھا اسے لگتا تھا خیر دین کے اس حلیے کی ذمے دار بھی وہی ہے اس نے اپنے نانا کو اتنا بوڑھا کر دیا تھا۔

سب کچھ شاید اسی طرح چلتا رہتا اگر چڑیا زندگی میں پہلی بار امتحان میں فیل نہ ہو جاتی اور اس کی ناکامی خیر دین کے لیے جیسے ہارٹ اٹیک سے کم نہیں تھی۔ وہ بے یقینی کے عالم میں رزلٹ کارڈ میں تقریباً ہر مضمون کے نیچے لگی سرخ لکیر کو دیکھتا رہا۔ سہ ماہی امتحان کا نتیجہ لینے وہی اسکول گیا تھا اور رزلٹ کارڈ کو دیکھ کر ہونے والی بے یقینی اس کے پیپرز کو دیکھ لینے کے باوجود بھی قائم رہی تھی۔ اس کے برابر کھڑی چڑیا سر جھکائے نظر پاؤں پر جمائے ہوئے اس کے کسی سوال کا جواب نہیں دے رہی تھی اور اس کی کلاس ٹیچر خیر دین کو چڑیا کی شکایات پر شکایات لگا رہی تھی۔ خیر دین گم صم اس کو لیے اسکول سے آگیا تھا۔ اس نے رستے میں چڑیا سے کچھ نہیں پوچھا تھا۔

گھر آ کر اس نے گاؤں آنے کے بعد پہلی بار چڑیا سے اسکول کے حوالے سے بات کی۔ ”تم پڑھنا نہیں چاہتیں چڑیا؟“ چڑیا نے نفی میں سر ہلا دیا خیر دین کو یقین نہیں آیا۔

”تم پڑھو گی نہیں تو کیا کرو گی؟“ چڑیا بے تاثر چہرے کے ساتھ خیر دین کو دیکھتی رہی۔

”میں نے تم پر کتنی محنت کی ہے چڑیا۔“ اس نے جیسے بے بس سے انداز میں چڑیا سے زیادہ خود سے

کہا تھا۔

”یہ اسکول مجھے اچھا نہیں لگتا۔“ بہت دیر کے سوال جواب کے بعد چڑیا کے منہ سے بالآخر نکلا۔

”کیوں؟“ خیر دین حیران ہوا۔

”یہاں سب مجھ سے غلط سوال کرتے ہیں۔“

اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئی تھیں۔ خیر دین دھک سے رہ گیا تھا اسے تو یہ اندازہ ہی نہیں تھا کہ چڑیا کو اسکول میں ایسا کوئی مسئلہ ہو سکتا تھا۔ اس نے چڑیا سے غلط سوالوں کی نوعیت دریافت نہیں کی تھی، اسے اندازہ تھا وہ سوال کیسے ہوں گے۔

اس رات خیر دین نے بیٹھ کر ایک بار پھر سوچا تھا کہ اسے کرنا کیا ہے...... وہ وہیں گاؤں میں رہے یا پھر شہر کو پلٹ جائے اور شہر کو پلٹ جانے کا مطلب اس معاہدے کی خلاف ورزی بھی جو وہ ڈی سی کے ساتھ کر کے آیا تھا۔ چڑیا اس کی زندگی کا فوکس تھا اس نے آج تک جو کچھ کیا تھا چڑیا کے لیے کیا تھا۔ اس کو آگے بھی جو کچھ کرنا تھا چڑیا کے لیے ہی کرنا تھا۔

☆☆☆

باربی ڈول نے چند ایک بار ہوم ورک کرتے ہوئے اپنی ممی کو اپنی طرف متوجہ کرنے کی کوشش کی لیکن وہ اس کوشش میں کامیاب نہیں ہو سکی۔ اس کی ممی فون پر اس کی دادی سے بات کر رہی تھی اور بات کرتے ہوئے مکمل طور پر مگن تھی۔

”جی ممی بس ایک ہفتے تک شفٹ ہو جائیں گے۔“ باربی ڈول کی ممی نے مسکراتے ہوئے اپنی ساس سے کہا تھا۔

”چلو اچھا ہے...... حبیب نے سیکریٹری کے پیچھے پڑ کر پوسٹنگ کروائی ہے اس بار اور وہ بھی صرف تمہاری وجہ سے ورنہ حبیب کہاں اس چیز پر believe کرتے ہیں کہ ایک جگہ پر مدت مکمل کیے بغیر کسی دوسری جگہ ٹرانسفر کروائی جائے۔“ اس نے ساس کی باقی بات پر دھیان نہیں دیا۔

”میری وجہ سے؟ میری وجہ سے کیوں ممی؟“ اس نے ساس سے کہا۔

”تم نے ہی تو کہا تھا ٹرانسفر کے لیے...... تم کمفرٹیبل نہیں تھیں گھر میں...... انہی بونوں وغیرہ کی وجہ سے...... کہہ رہا تھا کہ گھر میں پھر کچھ عجیب و غریب واقعات ہونے لگے ہیں۔“

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ اپنی ساس کو کیا جواب دے۔ وہ اس وقت حیرت کے ایک شدید جھٹکے کا شکار تھی۔ اس کے شوہر نے یہ امپریشن دے کر اس کے سسر سے اپنی ٹرانسفر کے لیے سفارش کروائی تھی کہ اسے اس گھر میں مسائل ہو رہے تھے۔ حالانکہ وہ پرمسائل اب پرانی بات ہو چکی تھی، وہ ان سب چیزوں کے ساتھ اپنے آپ کو ایڈجسٹ کر چکی تھی، یہ اب اس کے لیے کوئی بڑی بات نہیں رہی تھی...... اور ابھی حال ہی میں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا جس کی شکایت اس نے اپنے میاں سے کی ہو، پھر اس کے شوہر کو اچانک اس طرح بیٹھے بٹھائے کیا ضرورت پڑی تھی کہ اس نے اپنی بیوی کا نام استعمال کیا۔ اس نے ساس سے کوئی تردید نہیں کی تھی اور موضوع بدل کر بات کرنے لگی لیکن وہ بری طرح الجھ گئی تھی اور جب

دس منٹ بعد فون رکھ کر وہ باربی ڈول کی طرف متوجہ ہوئی تو باربی ڈول بھی بے حد بیزار بیٹھی تھی۔

"Mummy I need to tell you something"

اس نے فون سے فری ہوتی ہوئی ماں کو اپنی طرف متوجہ ہوتے دیکھ کر کہا۔

''ہاں بتاؤ۔'' اس کی کلاس ورک کی نوٹ بک اٹھاتے ہوئے اس کی ممی نے اس سے کہا۔

''بابا آج اسکول آئے تھے۔'' وہ نوٹ بک پر نظر دوڑاتے ہوئے چونک گئیں۔

''پاپا آئے تھے؟'' اس نے حیرانی سے باربی ڈول سے پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔

''لیکن وہ مجھ سے نہیں ملے...... ان کو ملنا چاہیے تھا نا ممی۔'' باربی ڈول نے اسے بتایا پھر ساتھ ہی شکایت کی۔

''تم سے نہیں ملے تو پھر تمہیں کس نے بتایا؟'' اس نے سنجیدگی سے باربی ڈول سے پوچھا۔

''مجھے ٹیچر نے بتایا۔ "He had a fight with sister" '' وہ باربی ڈول کی بات پر کچھ لمحے ہل نہیں سکی پھر اس نے بے یقینی سے کہا۔

"Your Papa had a fight with sister"

"yes"۔ باربی ڈول نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

"which sister?"

"Sister Agnus" وہ اپنی بیٹی کا چہرہ دیکھ کر رہ گئی تھی۔

''اور ممی' پاپا نے سسٹر سے کہا تھا کہ چڑیا کو اسکول سے نکال دیں۔'' باربی ڈول نے روانی سے لیکن کچھ بے چینی سے کہا۔

☆☆☆

فاطمہ نے ایبک کو اپنی ڈیبیٹ کا آغاز کرنے کے لیے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دیکھا۔ اس کا نام اناؤنس ہونے سے لے کر اب تک وہ اس سے اپنی نظریں نہیں ہٹا پائی تھی۔ اپنی ڈیبیٹ کا کاغذ ہاتھ میں لیے وہ ایک بت کی طرح بیٹھی اس کی تین منٹ کی تقریر سنتی رہی تھی جس کے دوران ہال کئی بار تالیوں سے گونجا تھا اور کئی دفعہ حاضرین کے چہروں پر مسکراہٹیں آئی تھیں۔ صرف وہ تھی جس نے نہ تالی بجائی تھی نہ وہ مسکرائی تھی۔ وہ گم صم اسے دیکھتی رہی تھی۔ وہ اسٹیج سے تالیوں کی گونج میں نیچے اترا تھا اور اپنی ٹیم کے ساتھ جا کر بیٹھ گیا۔ فاطمہ کو اب اپنے ادارے کی ٹیم کو لیڈ کرنا تھا اور اب ان کی ٹیم کی باری تھی اور میزبان ٹیم ہونے کی حیثیت سے وہ تالیوں سے گونجتے ہال میں اپنا نام لیے جانے پر اپنی کرسی سے اٹھی تھی۔ اس کے ادارے کے اسٹوڈنٹس اور ٹیچرز کے تالیاں بجاتے ہاتھوں میں پہلے سے بھی زیادہ جوش آ گیا تھا۔ وہ اپنے ادارے کی سب سے بہترین ڈیبیٹر تھی اور جہاں وہ ہوتی وہاں پہلی پوزیشن کہیں اور نہیں جا سکتی تھی...... تو آج بھی وہ سارے اس ہال میں اسی اندھے اعتماد اور یقین کے ساتھ بیٹھے تھے...... صرف سیڑھیاں چڑھتی فاطمہ تھی جو اس اعتماد اور یقین سے محروم تھی۔

(باقی آئندہ)

ہم کہاں کے دانا تھے

عظمیٰ سید افتخار



دلشاد اس وقت ایک کمرے پر مشتمل اپنے چھوٹے سے آرٹ اسٹوڈیو میں بیٹھا ہوا تھا اور کافی دیر سے گلاس ڈور کے اس پار موجود لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو اسٹوڈیو سے ملحقہ چبوترے پر بیٹھی تھی۔ وہ ایک درمیانے درجے کا مصور اور مجسمہ ساز تھا۔ فطرت کے مناظر اور انسانی خوب صورتی سے اسے گہرا لگاؤ تھا۔ کچھ مہینوں سے اسے ایک ایسے چہرے کی تلاش تھی جس کی خوب صورتی میں ایک اچھوتا پن ہو۔

ملگجے کپڑوں میں لپٹا ہوا معصوم سا حسن...... جو یقیناً مہذب دنیا میں ملنا مشکل تھا۔ اس لیے اکثر وہ اپنے چھوٹے سے اسٹوڈیو سے نکل کر ریلوے پھاٹک پر کبھی روہی کے صحرا میں اور کبھی خانہ بدوشوں کی جھگیوں کو کھوجتا پھرتا تھا کہ شاید کسی گدڑی میں لعل مل ہی جائے۔ جسے وہ یوں کینوس پر رنگوں سے نکھارے کہ آرٹ کے شائقین اس کے اصل سے بے نیاز ہو کر اسے چھونے کے لیے مچل جائیں۔ گویا وہ حسن تصویر میں قید نہیں بلکہ مجسم ان کے سامنے ہو اور یہی بحیثیت مصور اس کی جیت ہوتی۔ جس مقام پر وہ اس وقت تھا وہ اس کی منزل نہیں تھی...... اسے آگے بڑھنا تھا۔ زندگی کے حوالے سے اس کے کچھ خواب تھے جو اس نے اپنی محبت ندا کے سنگ دیکھے تھے مگر اُن کی تعبیر پانے کے لیے اسے جیتنی تھی ہر حال میں ایک بین الاقوامی نمائش جو اس سے صرف دو مہینے کی دوری پر تھی اور اس لڑکی کو دیکھ کے لگ رہا تھا کہ آج اس کی تلاش ختم ہوگئی، وہ اسٹوڈیو کا دروازہ دھکیلتا ہوا باہر نکل آیا۔

"اے لڑکی سنو! میرے لیے کام کروگی؟" دلشاد بالکل اس کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

"اے صاحب! لڑکی وڑکی نہ کہو، رکھی نام ہے میرا۔" وہ گنے کو دانتوں سے چھیلتے ہوئے اسے ٹوک گئی۔ دلشاد نے اسے غور سے دیکھا، بہ مشکل انیس، بیس سال کی لڑکی تھی۔ ملگجے سے گلابی رنگ کے کپڑوں میں ملبوس تھی۔ کپڑے اس کے بدن پر کافی چست تھے شاید کسی کی اترن تھے۔ بہت معصوم سا حسن مگر لہجہ بڑا کٹیلا تھا۔ انداز میں ایک بے نیازی سی تھی جو دیکھنے والے کو ٹھٹکنے پر مجبور کردیتی تھی۔ دوپٹا بے پراوئی سے دائیں شانے پر پڑا تھا اور وہ اپنی بھیڑ بکریوں کو پچکارنے کے ساتھ ساتھ گنا کھانے میں مگن تھی۔

"تم پکھی واس (خانہ بدوش) ہو؟" دلشاد نے نرمی سے پوچھا وہ ہر حال میں اس لڑکی کو کام کے لیے رضامند کرنا چاہتا تھا۔

"نی تو میں کیا محلوں کی لگے ہوں؟" اب کی بار بھی رکھی نے ٹیڑھا جواب دیا۔

"تم کیا آرام سے بات نہیں کرسکتیں؟" اس کا لہجہ اب بھی دھیما اور نرم تھا۔

"اے...... صاحب، دنیا ہمیں جتے (جوتے) کی نوک پر رکھے ہے۔ ٹکے ٹکے کا سمجھے ہے تو ہم کیے کو آرام سے بات کرے اور تم بھی کیوں ہمارا راستہ کھوٹی کرے ہو۔ تمہاری بک بک میں سب بھیڑ بکریاں اِدھر اُدھر منہ مار گئیں۔ پرلی طرف والے ملکوں کی ہیں یہ، ایک بھی کم ہوئی تو ابا تو میرا قیمہ کردے گا۔" اس کے لہجے میں جھلاہٹ تھی۔ وہ اٹھ کر بکریوں کے پیچھے جانے لگی۔

"رکھی، رکھی...... رکو تو، میری بات تو سنو۔" دلشاد اس کے پیچھے بھاگا۔ "یہ بتاؤ، پلیز میرے لیے کام کروگی۔"

"میں نے کہا نا صاحب، میرا ٹیم (ٹائم) کھوٹی نہ کرو۔ رکھی موفت (مفت) میں کسی کا کام نہ کرے ہے۔" وہ چلتی جارہی تھی اور ساتھ ساتھ تیز تیز بولتی جارہی تھی۔

"میں مفت میں کوئی کام نہیں کراؤں گا۔ پیسہ دوں گا، میرا نام دلشاد ہے، جہاں تم بیٹھی ہو وہیں میرا اسٹوڈیو ہے۔ سب لوگ مجھے جانتے ہیں، مجھے پیار سے چیکو کہتے ہیں۔ تم بھی مجھے پیار سے چیکو کہہ سکتی ہو۔" دلشاد نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نرمی ہمیشہ سے اس کے مزاج کا حصہ رہی تھی مگر اس کا اتنا کہنا غضب ہوگیا رکھی پٹڑی سے اتر گئی۔

"اے صاحب! پیار کی بات چھوڑو، پیسے کی بات کرو، پیار سے پیٹ نہیں بھرتا۔ یہ بھوک ہی ہے جو ڈھور ڈنگروں کی طرح گھمائے پھرتی ہے۔ ٹھیک ٹھاک پیسے دوگے تو رکھی کام کرے گی ورنہ نہیں...... ویسے کام کیا ہے؟" آخر وہ مطلب کی بات پر آہی گئی۔

"یہاں راستے میں بات کرنا مناسب نہیں اگر میرے اسٹوڈیو چل سکو تو مہربانی ہوگی۔" مگر رکھی نہ مانی، پہلے اسے یہ بھیڑ بکریاں واپس چھوڑ کر آنی تھیں۔ دلشاد بھی اس کے سنگ ہولیا۔ اسے ڈر تھا کہ جو تلاش اتنی مشکل سے ختم ہوئی ہے وہ پھر سے نہ جاری ہوجائے۔

❊❊❊

"دیکھو مجھے پانچ تصاویر بنانی ہیں۔ مختلف جگہوں پر مختلف انداز میں...... دو اسی اسٹوڈیو میں، ایک روہی میں، ایک تمہاری جھگی کے پاس اور ایک باہر گل مہر کے درخت کے سائے تلے۔ ان سب میں جو مشترک بات ہوگی وہ تم ہو مگر ہر بار ایک نئے پوز میں، ایک نئے انداز میں کیونکہ میری تھیم ہے حسن۔" دلشاد ایک جذب سے بولتا چلا گیا۔ پھر اٹھ کر کچھ پینٹنگز لینے چلا گیا تا کہ رکھی کو بتا سکے کہ کیسے پوز دینے ہیں۔

"میں سمجھ گئی چیکو استاد! کہ میرے کو کیا کرنا ہے۔ مگر مجھے پیسہ تو ملے گا ناں۔ اب دیکھو ناں...... اتنا اپنا وکھت...... (وقت) تمہارے ساتھ خراب ہوگا تو کچھ تو فیدا (فائدہ) ہو ناں میرے کو۔" اس کی سوئی پیسے پہ ہی اٹکی ہوئی تھی۔

"تمہیں میری زبان پر اعتبار نہیں رکھی۔ فکر نہ کرو تمہیں مناسب پیسہ ملے گا۔" دلشاد نے دوبارہ یقین دہانی کروائی۔

"ہاں وہ تو ٹھیک ہے، اس کے علاوہ تمہیں جب کھانا بھی روز میرے کو کھلانا پڑے گا جب تک کام کرواؤ گے اور ہاں ٹھنڈی بوتل بھی ساتھ میں۔" رکھی کی فرمائشوں کی لسٹ جاری تھی۔

"اور کوئی شرط ہے رکھی تو وہ بھی بتادو۔" دلشاد قدرے زچ ہوا مگر کیا کرتا ابھی تو کام کا آغاز ہوا تھا جبکہ وقت کافی کم تھا اس کے پاس۔

"شرد ورد (شرط ورط) کیا صاحب، بس پرسوں اِدھر ریلوے پھاٹک کے آگے والے میدان میں میلہ لگے گا تو وہ چھیمو ہے ناں، وہ جو گڑوی بجاتی ہے، اس کے ساتھ میلے میں گھومنے جانا ہے۔ تو بس کل دو سو تین سو روپے دے دینا۔" رکھی جو اسٹول پر بیٹھی اپنی چوٹی ہلا رہی تھی مزے سے ایک اور فرمائش نشر کی۔ دلشاد نے اسے غور سے دیکھا وہ جتنی معصوم نظر آتی تھی اتنی تھی نہیں۔ گہری سانس لے کر وہ فقط سر ہی ہلا سکا۔

اگلے دن رکھی مقررہ وقت پر اسٹوڈیو پہنچ گئی اور دلشاد نے بھی تندہی سے کام شروع کردیا۔ پہلی دو پینٹنگز اسے اسٹوڈیو میں ہی بنانی تھیں کہ اس میں صرف رکھی کا چہرہ ہی اسکیچ کرنا تھا۔ ہر مصور کی کوئی نہ کوئی خصوصیت ہوتی ہے۔ دلشاد کو بھی پین ورک میں مہارت تھی اور اس وقت وہ رکھی کے چہرے کا سائڈ پوز پین سے بنا رہا تھا۔ پین ورک کی سب سے اہم خاصیت ہوتی ہے کہ اس میں غلطی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

بلاشبہ رکھی کے نقوش دل کو چھو لینے والے تھے۔ وہ جیسے جیسے اس کے نقش کھوجتا جارہا تھا ویسے ویسے اس کے حسن میں ڈوبتا جارہا تھا۔ وہ واقعی ایسی تھی کہ اپنے حسن سے کسی کو بھی باندھ سکتی تھی پھر یکدم اس کے دل نے سرزنش کی کہ جو لڑکی اس وقت اس

کے سامنے موجود ہے وہ صرف پیسوں کی وجہ سے ہے۔ ایک خانہ بدوش جس کا کہیں مستقل ٹھکانا نہیں ہوتا اور وہ تو خود ویسے بھی ندا سے منسوب تھا جو اس کی خالہ زاد تھی۔ وہ دونوں اسکیچز دو دن میں بنے تھے۔ اپنی حساس اور کیئرنگ نیچر کی وجہ سے دلشاد نے خود جتنی دفعہ چائے پی اسے بھی پلوائی اور اس کی فرمائش پر دونوں دن دوپہر کا کھانا ہوٹل سے منگوایا اور ساتھ میں ٹھنڈی بوتل بھی۔ جب اسکیچز مکمل ہوئے تو رکھی انہیں دیکھ کر اچھل پڑی۔

''یہ چیکو صاحب! یہ میں ہوں، اتنی کھوب صورت (خوب صورت) اس لمحے اس کے اندر سے وہی انیس سال کی لڑکی نکل کے باہر آگئی تھی جو کٹیلے لہجے میں کہیں بکل مارے چھپی ہوئی تھی۔

''یہ تو ایسے ہے جیسے فیلم (فلم) کی ہیروین'' (ہیروئن) وہ دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

''ہاں...... یہ تم ہو......'' دلشاد دلکشی سے مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بہت جاندار تھی۔

''اسی لیے تم مجھ پر مر مٹے تھے۔'' رکھی تفاخر سے اترائی۔

''اونہوں...... مر نہیں مٹا تھا، متاثر ہوا تھا۔''

''چلو ایک ہی بات ہے، لاؤ میرے تین سو روپے دو، مجھے میلے میں جانا ہے۔'' وہ اپنے مطلب پر فوراً آگئی۔

''ایک بات نہیں رکھی، دونوں میں بہت فرق ہے... پر شاید تمہیں سمجھ نہ آئے، بہر حال یہ لو اپنے پیسے...... اور کل بھی یاد سے آجانا۔'' دلشاد نے اسے جتایا تو وہ سر ہلاتی باہر نکل گئی۔

❋❋❋

''رکھی کیا مسئلہ ہے، کیوں مسلسل ہل رہی ہو، میری توجہ بھٹک رہی ہے ناں۔'' جب پانچویں بار رکھی نے پوز میں تبدیلی کی تو دلشاد چڑ گیا۔ آج [illegible] گل مہر کے سائے تلے موجود تھے۔ منظر کچھ ایسا [illegible] کہ پیچھے سورج تھا، جس کی تمازت کو گل مہر کے پھیلے [illegible] ہوئے سائے نے قدرے سمیٹ دیا تھا اور اس کی [illegible] چھاؤں میں رکھی ماتھے پر ہاتھوں کا چھجا بنائے انتظار کی کیفیت میں کھڑی تھی۔ پہلے دلشاد کو اسے یہ کیفیت سمجھانے میں وقت لگا تھا اور اس کے بعد اب مسلسل رکھی کا ہلنا۔

''میں کیا کروں چیکو صاحب، ادھر وہ تمہارے گھر (اسٹوڈیو) میں تو وہ مٹکی کو گھورتی رہتی تھی (و[illegible] اسٹوڈیو میں ایک صراحی پر نظر رکھے رہتی تھی) اور تم تصویر بناتے تھے۔ ادھر کیا چیز کو تاڑوں۔ کبھی کوا سر پر سے کائیں کائیں کرتا جا رہا ہے تو کبھی یہ سورج آنکھوں میں گھس رہا ہے۔ کبھی پیر میں کچھ کاٹ رہا ہے۔'' رکھی اس سے زیادہ چڑی ہوئی تھی۔ دلشاد نے سر پر ہاتھ مارا اور پھر قریب جانے کے اسے سمجھانے لگا۔

''دیکھو رکھی تم نے مجھے گھورنا ہے، ٹھیک ہے ناں، اپنی نظر بھٹکانی ہے نہ انداز تبدیل کرنا ہے۔ بس مجھے دیکھتی رہو۔'' رکھی نے اس کے کہنے پر مزے سے آنکھیں پٹپٹائیں اور پھر واقعی اس کے ہاتھ .... ایک مشغلہ آگیا۔ وہ کبھی چیکو کو ایک ٹک دیکھتی رہتی، کبھی اسے تنگ کرنے کے لیے پلکیں جھپکتی رہتی اور پھر دلشاد کے ٹوکنے پر معصوم بن جاتی۔

''کیا کروں صاحب، وہ آنکھوں میں درد ہو رہا ہے ناں۔'' یہ اور بات کہ اس آنکھ مچولی میں خود رکھی کو پتا نہ چلا کہ اسے چیکو صاحب کتنا اچھا لگنے لگا ہے، آڑی مانگ نکالے سلیقے سے بنائے بال، پتلون قمیص پہنے بابو بنا ہوا، اس کے نقوش کو اپنے رنگوں سے چمکانے میں مگن...... وہ اسے دیکھے جاتی۔

اس تصویر کے بعد دلشاد نے اس کی دو تصاویر اور بنائیں۔ ایک جھگیوں کے پاس اور دوسری روہی کے صحرا میں۔ پہلے پہل وہ اچھا پوز دینے کے لیے اسے دیکھتی رہتی تھی اور پھر یہ دیکھتے رہنا گویا اس کے لیے عبادت بن گیا۔ دلشاد نے بھی اس پورے عرصے میں اپنی کیئرنگ نیچر کی وجہ سے اس کا پورا خیال رکھا۔ نہ صرف کھانے پینے کا بلکہ اگر کام کے دورانِ شام ہو جاتی تو وہ خود اس کی جھگی تک اسے چھوڑ کر آتا۔ یہی نہیں بلکہ رکھی بہانے بہانے سے اس سے پیسے بھی لیتی رہتی تھی اور وہ بھی اس کی مدد کر دیا کرتا تھا۔ رکھی کو لگتا تھا کہ وہ اس پر مرمٹا ہے اس لیے اتنا مہربان ہے جبکہ دلشاد کے دل میں کیا ہے؟ وہ اس سے انجان تھی۔

❋❋❋

پھر وہ دن بھی آیا جب اسے نمائش کے لیے شہر سے روانہ ہونا تھا۔ جانے سے پہلے وہ رکھی کو بتا گیا تھا کہ وہ واپس آکے اس کا معاوضہ اسے دے گا۔ وہ کیا گیا رکھی کو لگا اس کا دل بھی اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہر پل اس کی نگاہیں چیکو صاحب کو کھوجتی رہتی تھیں۔ رات میں جب وہ کام کاج سے فارغ ہو کے اپنی چارپائی پر لیٹتی تو چیکو صاحب کے مسکراتے لب اور چمکتی آنکھیں چھم سے اس کے تصور میں اتر آتیں۔

اس نے کہا تھا۔ ''سب پیار سے مجھے چیکو کہتے ہیں، تم بھی کہہ سکتی ہو۔'' اور وہ زیرِ لب چیکو کا ورد کرتے کرتے سو جاتی۔ مہینے سے زیادہ ہو چلا تھا مگر وہ اب تک واپس نہیں لوٹا تھا۔ رکھی کے تو جیسے سارے شوق مر گئے تھے۔ بجنا سنورنا، میلے میں گھومنا، چھیمو کے ساتھ جا کے سیر سپاٹے کرنا۔ اب تو اسے جب بھی موقع ملتا وہ اسٹوڈیو کے باہر تھڑے پر آکے بیٹھ جاتی۔ کچھ ہی فاصلے پر گل مہر کا درخت تھا۔ اسے اس درخت سے بھی ایک خاص انسیت

ہو چلی تھی۔ یہیں پر تو پہلی بار چیکو اس کے دل کو بھایا تھا۔ دو مہینے پہلے یہ درخت اپنے جوبن پر تھا۔ گل مہر کے پھولوں سے لدا پھندا اور اب اس کا ایک حصہ بجلی کے تاروں میں آگ لگنے سے جھلس کر سیاہ ہو گیا تھا۔ بالکل اس کے دل کی طرح سوختہ جاں۔

مگر ایک چیز اسے ہر روز حیران کرتی تھی کہ چڑیا غول کی صورت میں اس جلے ہوئے حصے پر آ کے بیٹھ جاتی تھیں جانے کیوں حالانکہ اس کی سیاہ راکھ ہوتی شاخوں پہ تو اک پتا تک نہیں تھا۔ ''شاید ماتم کے لیے آتی ہیں۔'' اس کی سوچ یہیں تک آ کے رک جاتی مگر جب اس پر ننھی ننھی ہر کونپلیں پھوٹیں تو اس پہ یہ عقدہ کھلا کہ وہ ماتم کے لیے نہیں مناجات کے لیے جمع ہوتی تھیں۔ کیسی بے ریا محبت تھی ان چڑیوں کی...... بنا کسی صلے اور وصول کے۔ وہ اتنی چھوٹی سی مخلوقِ خدا یہ بات جانتی تھی اور وہ ایسی جھلی کہ یہ ہنر اپنے اندر نہ جگا سکی مگر وہ بھی کیا کرتی جب سے وہ پیدا ہوئی تھی تب سے اب تک اس نے ایسے احساسات محسوس ہی کب کیے تھے۔ خیال رکھنا، پیار، محبت توجہ کیا ہوتا ہے؟ وہ جانتی ہی نہ تھی، اس کے اردگرد تو بس ایک ہی لفظ چکراتا تھا۔ ''بھوک'' جہاں سے پیٹ بھرتا، جہاں سے چار پیسے ملتے، یہ پکھی واس (خانہ بدوش) وہیں چل پڑتے۔ وہیں ان کی دنیا بس جاتی، ان کے بچے بھی وہیں پیدا ہوتے اور پلتے اور پھر اسی لشکر کا حصہ بن جاتے۔

''مگر مجھے اس بھیڑ کا حصہ نہیں بننا۔ مجھے بھی محبت کی ایسی مناجات پڑھنی ہے۔ یہاں اسی جگہ بیٹھ کر... کہ جب چیکو صاحب آئیں تو میں انہیں بتا دوں گی کہ رکھی کو ان سے پیار ہے، بہت پیار ہے۔'' وہ آہستہ آہستہ خود کہتی جا رہی تھی اور کچی مٹی میں آڑھی ترچھی لکیریں کھینچتی جا رہی تھی۔

❋❋❋

''اے رکھی، کہاں گھومتی پھرے ہے، کب سے ڈھونڈ رہا ہوں، چل اِدھر جھگی کے پاس، وہ پینٹر بابو آیا ہے، تجھ سے ملنے کے واسطے۔'' رکھی سے چھوٹا اچھو اسے ڈھونڈتا ہوا چلا آیا۔ وہ گل مہر کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ یکدم کھڑی ہو گئی۔

''کیا چیکو صاحب آئے ہیں؟'' اس نے اچھو سے تصدیق بھی نہ چاہی اور جھگی کی سمت بھاگی۔

''مجھے بہت کھوسی (خوشی) ہو رہی ہے آپ کو یہاں دیکھ کر۔ میں اُدھر روز تھڑے پر آپ کی راہ تکا کرتی تھی...... آپ، آپ بوہت (بہت) اچھے لگ رہے ہیں۔'' وہ بھاگتے ہوئے آئی تھی اس لیے اس کی سانس پھول رہی تھی۔ وہ ڈیڑھ مہینے بعد تقریباً اس کے سامنے تھا۔ آنکھوں کی چمک کئی گنا بڑھ چکی تھی اور لبوں پر وہی جاندار مسکراہٹ تھی۔

''میں تو ایک دم اے ون...... مگر تمہیں کیا ہوا ہے کافی زرد لگ رہی ہو، لگتا ہے میرے پیچھے بہت بیمار رہی ہو اور کافی بدلی بدلی سی لگ رہی ہو، خیریت تو ہے نا سب۔'' دلشاد واقعی حیران تھا۔ رکھی کے چہرے پر زردیاں گھلی ہوئی تھیں اور آنکھوں کے نیچے حلقے...... اسے اچھی طرح یاد تھا جب وہ پہلی بار اسٹوڈیو کے باہر ملی تھی تو اس کے انداز میں مقابل کے لیے ایک دعوت ہوتی تھی، چست کپڑوں میں بے نیاز سی، کٹیلے لہجے میں بات کرتے ہوئے سامنے والے کو چونکاتی تھی پر اب جو سامنے کھڑی تھی یہ تو کوئی اور ہی رکھی تھی۔ پوری آستین کی ڈھیلی سی قمیص پہنے، چنری کو بار بار سر پر ٹکائے رکھنے کی کوشش میں ہلکان...... جیسے کوئی جوگن اور اس پر آپ، آپ کا تخاطب۔

''میں ٹھیک ہوں چیکو صاحب! آپ کہو، آپ کا کام ہو گیا؟'' وہ صرف اتنا ہی کہہ کر مسکرا دی۔ اسے خوشی تھی کہ دلشاد آج بھی اس کی فکر کرتا ہے۔

''مجھے پتا ہے تم میرے کام کے بارے میں کیوں پوچھ رہی ہو۔ تمہیں اپنے پیسوں کی فکر ہے نا......؟'' دلشاد شرارت سے مسکرایا۔ ''تمہارے پیسے ہی تو دینے آیا ہوں اور اپنے اسٹوڈیو سے سامان اٹھانے...... میں نے ایک نیا اور قدرے بڑا اسٹوڈیو لیا ہے۔ اس لیے اب وہاں شفٹ ہو رہا ہوں۔ رکھی میں بہت خوش ہوں، تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ ان تصویروں کو کتنی پذیرائی ملی ہے۔ سچ میں، میں لائم لائٹ میں آ گیا ہوں، میرا مطلب ہے کہ مشہور ہو گیا ہوں۔'' اس نے جملے کی تصحیح کی تا کہ رکھی کو سمجھ آ جائے۔

''صاحب آپ یہاں سے چلے جاؤ گے؟'' رکھی کو ساری باتوں میں بس اتنا ہی سمجھ آیا تھا۔

''ہاں رکھی جانا تو ہے...... یہ لو تمہارے پیسے، گن لو، پورے بیس ہزار ہیں۔'' اس نے دو گڈیاں رکھی کی جانب بڑھائیں۔ اسے یقین تھا کہ رکھی خوشی سے چیخ پڑے گی اس نے تو خواب میں بھی ایک ساتھ اتنے سارے پیسے نہ دیکھے ہوں گے مگر جو ہوا اس پر دلشاد ہکا بکا رہ گیا۔ رکھی نے ہاتھ مار کر دونوں گڈیاں نیچے گرا دی تھیں۔

''ایسے نہ کہو صاحب! یہ مت کرو، رکھی بے موت مر جائے گی۔ وہ تو میری پوجا تھی، آپ کو ٹکٹکی باندھ کر دیکھتے رہنا...... پوری جندگی (زندگی) میں بس یہی تو میری عبادت تھی، باقی تو نرا کھوٹ ہے سارا۔ میری عبادت کو میرے منہ پر نہ مارو صاحب، اس کا مول نہ لگاؤ۔'' رکھی تڑپ اٹھی۔

''رکھی کیا ہو گیا ہے، ہوش میں آؤ، تم بھول گئیں، یہ سارا کچھ تم نے پیسوں کے لیے کیا تھا۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ مفت میں تم کسی کے لیے کچھ نہیں کرتیں۔ تمہارے نزدیک پیٹ کی بھوک سب سے اہم ہے۔ یہ پورے بیس ہزار ہیں...... تم نے اب تک اتنے نہ کمائے ہوں گے اور خود تمہارے ماں باپ انہیں بھی تو ان پیسوں کا انتظار تھا۔ اسی لیے تو انہوں نے تمہاری تصویریں بنانے کی اجازت دی تھی۔ یاد کرو تم نے مجھے بتایا تھا۔'' وہ ایک ایک بات اسے یاد دلا رہا تھا۔

''مجھے پیسہ نہیں چاہیے صاحب۔'' وہ چیخ پڑی۔ ''مجھے آپ کا پیار چاہیے، آپ کا پیار بس...... یہ رکھی آپ پر مرمٹی ہے صاحب۔'' رکھی نے دلشاد کے ہاتھ پکڑ لیے اس کے لہجے میں بے حد لجاجت تھی۔ دلشاد کے دل کو کچھ ہونے لگا تھا۔ وہ الھڑ سی لڑکی اس کے لیے جوگ لے بیٹھی تھی۔ اس نے اپنے ہاتھ رکھی کے ہاتھوں میں سے نکالے۔

''تم بہت اچھی لڑکی ہو رکھی مگر افسوس تم میری منزل نہیں ہو، میں اپنی کزن سے محبت کرتا ہوں۔ ہماری شادی ہونے والی ہے۔ یہ پیسے رکھ لو تمہارے بہت کام آئیں گے۔'' وہ جھکا اور دونوں گڈیاں مٹی میں سے اٹھا کے پلنگ کی تپائی پر رکھ دیں اور جھگی سے باہر نکل آیا۔ اس نے جتنی کمٹ منٹ کی تھی وہ پوری کر دی تھی۔ اب اس کے ذمے رکھی کا کچھ حق دینا واجب نہ تھا۔

رکھی زمین پر پھسکڑا مار کر بیٹھتی چلی گئی۔ اس کی آواز میں بین تھے۔ اس کے من کا مسافر اس سے دور ہوتا جا رہا تھا۔

قدرت نے عجب طریقے سے اس پر محبت کا عقدہ کھولا تھا۔ مگر وہ پکھی واس تھی بھول گئی تھی کہ خانہ بدوشوں کا کہیں مستقل ڈیرا نہیں ہوتا، چاہے وہ کسی کا در ہو یا کسی کا دل۔

❋❋❋



قسط 01

زندگی

ناہید سلطانہ اختر

نوکِ شمشیر یہ یوں ہم نے گزارے لمحے
کانچ کی آنکھوں سے خوابوں کا گزر ہو جیسے

زندگی میں جہاں رشتے ناتے اور روابط بہت اہم ہوا کرتے ہیں... وہیں ایک دوسرے کے مثبت رویے بھی کسی خاندان کے لیے مضبوط ستون کا درجہ رکھتے ہیں... مگر ہمیں بہت سے لوگ، بہت سے مواقع ایسے ضرور ملتے ہیں... جب محبت دستک دیتی ہے... اور اس کی خوشبو میں روشنی کی تابناکی بھی ہوا کرتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ... مکر و فریب... سفاکی اور تنگ نظری کے سائے... ازل سے محبت کرنے والوں کے دشمن رہے ہیں اور زندگی بھی یہی ہے کہ کبھی کبھی ترپ کی دُگی بھی حکم کے اکّے کو کاٹ دیا کرتی ہے...

ہماری مایہ ناز مصنفہ ناہید سلطانہ اختر کے قلم سے ایک شاہکار ناول...... جس کی سطر سطر میں زندگی سفر کرتی نظر آئے گی......



رات کا پچھلا پہر تھا اور وہ جاگ رہی تھی۔ سونے کی ہر کوشش نے اس کا منہ چڑا دیا تھا۔ نیند اور اس کی گہری سبز آنکھوں میں ان دنوں بے طرح ٹھنی ہوئی تھی۔ دس بجے کے لگ بھگ بستر پر لیٹ جانا اور دیکھتے ہی دیکھتے نیند کا آنکھوں میں اتر آنا خواب کی سی بات بن گئی تھی۔ زندگی کے نقوش اچانک یوں بگڑ جائیں گے اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔ مضطرب ہو کر اس نے کروٹ بدلی تو گزرے دنوں کا ایک منظر قصرِ خیال میں در آیا۔

''میڈم حجاب کس نے کہا تھا آپ سے کہ پرنسپل بن جائیں۔ اچھی بھلی سولہ گریڈ کی ٹیچر تھیں۔ سترہ بھی مل ہی جاتا۔ جلد ترقی کے شوق میں خوامخواہ یہ روگ پال لیا۔ پہلے صرف اسی کلاس روم کی صفائی ستھرائی اور آرائش کی فکر کرنا پڑتی تھی جس کی آپ کلاس انچارج ہوتی تھیں۔ اب تو پورے ادارے کی ایک ایک بات، ہر ہر ضرورت کا خیال رکھنا پڑتا ہے۔ کبھی کلاس رومز کا معائنہ تو کبھی اسٹاف روم کا۔ کبھی بچوں کے واش رومز کی نکاسی بند تو کبھی آفس کلرک کی الماری کا کنڈا ڈھیلا۔ کبھی کوئی ماتحت کوئی مسئلہ لے کر آ کھڑا ہوتا ہے تو کبھی کوئی ملاقاتی ذرا سی بات پر پورا گھنٹا برباد کر کے جان چھوڑتا ہے۔ مائی گاڈ! پرنسپل ہونے سے تو ٹیچر ہونا بھلا۔'' دل ہی دل میں خود کلامی کرتی وہ طویل راہداری سے گزر کر اپنے دفتر میں داخل ہو رہی تھی۔

ریوالونگ چیئر پر بیٹھ کر اس نے میز کے شیشے پر اپنے سامنے رکھے اخبار کی شہ سرخی پر نظر ڈالنی چاہی تھی کہ آفس کلرک تاج دین کمرے کے دروازے پر وارد ہوئے۔ ''السلام علیکم میڈم جی۔''

''وعلیکم السلام...... کیا حال ہے...... تاج صاحب؟''

''شکر ہے جی...... میڈم! ابھی جب آپ راؤنڈ پر تھیں ریاست کا فون آیا تھا۔ اس کی فیملی میں ماتم ہو گیا ہے جی...... تین دن کے لیے گاؤں چلا گیا ہے۔ سوموار کو آئے گا۔''

''چار دن کہیے...... اتوار بھی تو ہے۔''

''ہاں جی...... ہاں جی......'' تاج دین نے خفت سے کہا۔

''کتنے ماتم کرائے گا یہ ریاست علی اپنی فیملی میں تاج دین صاحب۔''

''بس میڈم جی اللہ معاف کرے، یہ بہانے باز لوگ ہیں۔''

''بہانہ ساز کہیے۔''

''یہ پکی نوکریوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں جی، پرائیوٹ شعبہ تو دوسرے دن انہیں ٹھڈا مار کر نکال باہر کرے یا پھر یہ انسان کے بچے بن کر رہیں۔''

''ناشکرے ہیں یہ لوگ۔''

''بالکل۔'' تاج دین نے تائید میں سر ہلایا۔ ''میڈم جی! مس علی اپنے سپلیمنٹری بل کا پوچھ رہی تھیں۔ آپ سائن کر دیں تو میں اکاؤنٹ آفس بھجوا دوں۔''

''بل تیار ہے تو لائیں میں ابھی سائن کیے دیتی ہوں۔'' تاج دین نے اس کی میز کے دائیں پہلو میں اِستادہ ریک پر سے ایک فولڈر اٹھا کر کھولا اور بل دستخط کے لیے اس کے سامنے رکھ دیا۔ وہ حسبِ عادت بل کا گہری نظروں سے جائزہ لینے لگی۔ کسی دستاویز کو اچھی طرح دیکھے بغیر آنکھیں بند کر کے دستخط کر دینا اس کا مسلک ہی نہ تھا۔

''میڈم جی! ایک بچی کی والدہ بھی آئی بیٹھی ہیں آپ سے ملنے کے لیے۔'' تاج دین نے بتایا۔

''بھیج دیں انہیں میرے آفس میں۔''

''میڈم اجازت ہو تو ایک عرض کروں جی۔''

''جی...... جی تاج صاحب...... اجازت کی کیا ضرورت۔''

''میڈم ملاقاتیوں کے لیے کوئی وقت مقرر کریں جی...... دس سے گیارہ یا پھر گیارہ سے بارہ اور چوکیدار کو ہدایت ہو جی سختی سے کہ وہ ملاقات کے وقت کے سوا کسی کو اندر نہ آنے دے۔'' بل پر بحیثیت ڈی ڈی او دستخط کرتے ہوئے وہ دھیرے سے مسکرا دی، تاج دین یہ مشورہ پہلے بھی کئی مرتبہ اس کے گوش گزار کر چکے تھے۔

''تاج دین صاحب! ملاقات کا وقت مقرر کر دینے سے ملاقاتیوں کے لیے مسائل پیدا ہوں گے۔ بے چارے نہ جانے اپنی کن کن مصروفیات سے وقت نکال کر یہاں آتے ہیں، میں تو یہیں ہوتی ہوں، مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوتا۔''

''سوری میڈم...... ڈسپلن کی خاطر کہہ رہا تھا۔''

''وہاں سے زیادہ ڈسپلن کہاں ہے تاج صاحب؟'' حجاب نے ایک نظر کھلی کھڑکی سے باہر کمرے میں جھانکتے نیلگوں آسمان کے ٹکڑے کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''وہ جو حاکمِ کل ہے اس کا در تو ہم اپنی شنوائی کے لیے دن رات وقت بے وقت کھٹکھٹائے جاتے ہیں اور اپنے دروازوں پر اوقاتِ ملاقات عائد رکھنا چاہتے ہیں۔''

''انہیں بھیج دوں جی؟'' تاج دین نے اس کے سامنے سے فولڈر اٹھاتے ہوئے سپاٹ لہجے میں پوچھا۔

''جی...... فوراً......'' تاج دین نے دروازے کا رخ کیا۔

ملاقاتی خاتون کا اپنی بچی کے سلسلے میں بہت چھوٹا سا مسئلہ تھا۔ اس کی کسی ہم جماعت نے اردو قواعد کی کتاب چار پانچ دن سے مستعار لے رکھی تھی اور اس کی واپسی سے گریزاں تھی۔ حجاب نے دونوں بچیوں کو ان کی جماعت سے بلوا کر پوچھ گچھ کی تو پتا چلا کتاب مستعار لینے والی بچی کی ناسمجھ بہن نے کتاب کا سرورق پھاڑ ڈالا تھا۔ بچی کتاب کی واپسی سے اسی لیے گریزاں تھی۔ کتاب اس وقت بھی اس کے بیگ میں موجود تھی۔ حجاب نے کتاب مستعار دینے والی بچی اور اس کی والدہ سے درگزر کی درخواست کی اور کتاب مستعار لینے والی بچی کو ہلکی سی تنبیہہ۔ مسئلہ حل ہو گیا۔ بچیوں کے واپس جانے کے بعد ملاقاتی خاتون شکریہ ادا کر کے جانے کو اٹھی ہی تھی کہ سینئر ٹیچر مسز افزا اس کے دفتر کے دروازے پر آ کھڑی ہوئیں۔ ان کے ہاتھ میں ایک شوخ رنگ لفافہ تھا اور لبوں پر دھیمی سی مسکان۔

''اجازت ہے میڈم؟''

''آئیں، آئیں مسز افزا۔'' وہ گرمجوشی سے بولی۔ اس کی نظریں مسز افزا کے ہاتھ میں لفافے پر تھیں جو شادی نامہ ہونے کی چغلی کھا رہا تھا۔ ملاقاتی خاتون دروازے سے نکل گئی تھیں۔

مسز افزا نے اس کی میز کے دوسرے کنارے سے لفافہ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میڈم یہ زوباریہ کی شادی کا انویٹیشن کارڈ ہے۔''

''زوباریہ کی شادی!'' وہ چونکی۔

''جی میڈم...... زوباریہ کا چھوٹا بھائی میرے گھر پہنچا گیا تھا، ایک کارڈ اسٹاف کے لیے اور ایک علیحدہ

سے آپ کے لیے۔“

”بیٹھیں مسز افزا......“ حجاب نے لفافے سے دعوت نامہ نکالا اور دیکھنے لگی۔ زوباریہ اسی اسکول کی سابقہ ٹیچر تھی۔ گزشتہ برس اس کا تبادلہ ایک دوسرے اسکول میں ہوگیا تھا۔ سابقہ ساتھیوں سے ملنے کے لیے وہ کبھی کبھار اسکول آتی رہتی تھی۔ پچھلے ہفتے بھی آئی تھی اور حجاب کو بہ اصرار پرفیوم کی ایک شیشی بطور تحفہ دے گئی تھی جو بقول اس کے بڑے بھائی مسقط سے اس کے لیے تحفہ لائے تھے اور وہ اپنی خوشی سے یہ تحفہ اسے دینے کو لے آئی تھی۔

دعوت نامے پر درج عبارت پڑھنے کے بعد اس نے مسز افزا کی جانب توجہ کی۔ ”زوباریہ پچھلے ہفتے ہی تو ہو کر گئی ہے تب تو اس نے ایسا کوئی ذکر نہیں کیا تھا۔“

”بس میڈم جب مقدر کے پھول کھلنے ہوتے ہیں تو دیر نہیں لگتی۔“ مسز افزا بولیں۔

”مگر اس قدر اچانک! یا شاید زوباریہ نے بتانا مناسب نہیں سمجھا ہو۔“

”نہیں، نہیں...... ایسی کوئی بات نہیں...... وہ بے چاری تو خود بھی ہکا بکا ہے...... کل جب اس کا بھائی کارڈ میرے گھر پہنچا کر گیا تو میں نے اسے فوراً ہی فون کیا۔ پتا چلا بڑے بھائی کے کوئی دوست ہیں جو مسقط میں ان کے آفس میں ہی جاب کرتے ہیں۔ ان کی مسز کا پانچ چھ ماہ قبل انتقال ہوگیا۔ تین بچے ہیں، وہ دوسری شادی کے خواہشمند تھے۔ زوباریہ کے بھائی جو چھٹی پر وطن آئے ہوئے ہیں انہوں نے گھر میں ذکر کیا اور ان صاحب کی تعریف کی تو زوباریہ کے امی، ابو نے کہا جب اچھا آدمی ہے تو تم اپنی زوباریہ کے لیے ہی بات کرو اس سے۔ زوباریہ کے بھائی نے بات کی تو وہ صاحب بولے میرے لیے اس سے اچھی اور کیا بات ہوگی کہ جانے بوجھے لوگوں میں رشتہ ہوجائے۔ زوباریہ بتا رہی تھی اس کے بھائی اور وہ صاحب پندرہ سولہ سال سے اکٹھے ایک ہی دفتر میں ملازمت کررہے ہیں۔ اچھے آدمی ہیں۔“

”مائی گاڈ! بچوں والے آدمی سے ہو رہی ہے اس کی شادی۔“ حجاب نے منہ بنایا۔

”رشتوں کی پریشانی جو ہے میڈم اور آدمی اچھا ہو تو بچے چل جاتے ہیں۔ بیوی بھی مرچکی ہے۔ بیوی زندہ ہو تو پرابلم ہوتی ہے۔ دوسری بیوی کو پہلی بیوی کا بھوت چین سے نہیں رہنے دیتا۔“

”مسز افزا! بیوی زندہ ہو یا مردہ...... میں تو کم از کم ایسے آدمی سے کسی قیمت پر شادی نہ کروں۔“

”زوباریہ نے بھی ایسا کب چاہا ہوگا میڈم...... بس قسمت کی بات۔“ مسز افزا بولیں۔

”انکار کردیتی...... کوئی اور مل جاتا۔“

”بس میڈم لڑکیاں بے چاری بھی ارد گرد کے حالات دیکھ کر مجبور ہوجاتی ہیں۔“

”اپنے پیروں پر کھڑی لڑکی کو مضبوط ہونا چاہیے مسز افزا۔“

”مسز افزا نے اسے گہری نگاہوں سے دیکھا۔ ”آپ مائنڈ نہ کریں تو ایک بات پوچھوں میڈم۔“

”جی ضرور۔“ مسز افزا کی نگاہوں میں ڈولتی معنی خیزی چغلی کھا چکی تھی کہ وہ اس سے کوئی غیر معمولی بات کہنے جارہی تھیں۔

”آپ اتنی خوب صورت ہیں، باصلاحیت ہیں۔ ماشاء اللہ جوانی ہی میں اس سیٹ پر بیٹھی ہیں جس پر

بیٹھنے کے لیے ہم جیسے تو برسوں کی مسافت کے بعد پہنچ پاتے ہیں۔ بلکہ اکثر تو پہنچ ہی نہیں پاتے۔ آپ کو شادی کرلینی چاہیے میڈم۔“

وہ بے ساختہ ہنس دی۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“ مسز افزا بولیں۔ ”پرنسپل شپ عموماً اس وقت ملتی ہے ٹیچرز کو جب وہ ریٹائرمنٹ کے نزدیک ہوتی ہیں۔ آپ باصلاحیت ہی تو تھیں جو پبلک سروس کمیشن کے امتحان میں بیٹھیں اور پہلی ہی کوشش میں پرنسپل بن گئیں۔“

”میں اس بات پر نہیں ہنسی ہوں مسز افزا۔“ اس نے وضاحت کی۔

”تو پھر؟“

”میں تو اس بات پر ہنسی ہوں کہ آپ کے خیال میں مجھے شادی کرلینی چاہیے۔“

”سوری میڈم! اس میں ہنسنے کی بھلا کیا بات...... میں نے تو یہ بات پوری نیک نیتی سے کی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے مسز افزا...... مجھے ہنسی اس لیے آئی کہ نہ ہوئیں اس وقت میری والدہ کہیں آس پاس ورنہ وہ اس معاملے میں آپ کے ساتھ مل کر ہم خیال گروپ بنانے میں ذرا دیر نہ لگاتیں۔ ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں وہ اس سلسلے میں۔“

”پھر تو مجھے ان سے ضرور ملنا چاہیے۔ ایک بہت اچھا رشتہ ہے میری نظر میں۔“ مسز افزا بولیں۔

”پھر تو آپ کو میرے گھر کا راستہ بھی پتا نہیں چلنا چاہیے۔“ وہ مسکرائی۔

”کیوں!“ مسز افزا چونکیں۔

”کیونکہ ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے میرا۔“

”ویسے ایک بات بتاؤں آپ کو...... ہم اسٹاف ممبرز اکثر آپس میں یہ بات کرتے ہیں کہ ہماری پرنسپل اتنی حسین ہیں کہ ان کے لیے تو رشتوں کی لائن لگی رہتی ہوگی۔“ مسز افزا نے لمحے بھر کو توقف کیا پھر محتاط لہجے میں بولیں۔ ”ہمارا اندازہ غلط تو نہیں نا میڈم۔“

”اب ایسی بھی بات نہیں مسز افزا کہ لائن لگی ہو...... بس آتے رہتے ہیں۔“

”تو ارادہ باندھ لیجیے۔“ مسز افزا مسکرائیں۔ ”وقت پر شادی کے بہت فائدے ہوتے ہیں۔“

”مثلاً؟“ اس نے مسکراتے ہوئے مسز افزا کو دیکھا۔

”مثلاً...... آدمی دھوپ چھاؤں ہر رُت انجوائے کرتا ہے، اپنے بچوں کے ساتھ چلتے ہوئے ہانپتا نہیں۔ زندگی بہت دور تک اور بہت دیر تک خوب صورت دکھائی دیتی ہے۔“

”ارے......“ حجاب نے اپنی خوب صورت آنکھیں حیرت سے مسز افزا کے چہرے پر گاڑدیں اور بولیں۔ ”آپ تو بہت شاعرانہ باتیں کرتی ہیں۔“

”آپ ذرا موقع تو دے کر دیکھیں ہم تو اس سے بھی زیادہ شاعرانہ باتیں کرسکتے ہیں۔“ ٹیلی فون کی گھنٹی نے حجاب کو اپنا ہاتھ ریسیور کی طرف بڑھانے اور مسز افزا کو کرسی سے اٹھ جانے پر مائل کردیا۔ فون زوباریہ کا تھا۔

”میم! آپ کو کارڈ تو پہنچ گیا ہوگا؟“

”ہاں، مس زوباریہ۔“

”میم کوشش کیجیے گا آنے کی۔“

”ضرور......ویسے تم خوش تو ہو؟“

”میم گھر والوں کو خوش دیکھ کر مجھے بھی خوش ہونا پڑ رہا ہے۔“

”کیسی پاگل لڑکی ہے، دوسروں کی خاطر خود کو داؤ پر لگا بیٹھی ہے۔“ حجاب نے دل ہی دل میں سوچا۔ ”میں تو امی کی خاطر بھی جو مجھے دنیا بھر میں سب سے زیادہ پیاری ہیں خود کو اس طرح ہرگز داؤ پر نہ لگاؤں۔“ ایک اسی کو کیا امی تو اپنے تمام بچوں کو پیاری تھیں۔

☆☆☆

امی بچوں کے اس پیار کی بجا طور پر حقدار تھیں۔ ان چاروں بھائی بہنوں کو زندگی میں جو کچھ ملا تھا اللہ کے فضل اور اسی کے کرم سے امی کی بے لوث محبت کے طفیل۔ بابا بے چارے تو ساری زندگی غریب الوطن رہے۔ سال دو سال بعد مہمانوں کی طرح آتے اور اپنی یادوں کو دل دکھانے کے لیے چھوڑ کر پھر مسافرت پر نکل جاتے۔ امی نے تینوں بیٹیوں اور اکلوتے بیٹے کی تعلیم و تربیت میں اپنی جانب سے کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر اور کنبے کی جس محبت، خلوص اور جانفشانی سے آبیاری کی تھی اس نے انہیں ایک ماورائی سی مخلوق بنا دیا تھا۔ امی کی محبت ان چاروں بھائی بہنوں کے دلوں میں بہت دور تک سرایت کیے ہوئے تھی۔ امی کی آنکھ کا اشارہ ان میں سے ہر ایک کے لیے حکم کا درجہ رکھتا اور ان کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ فرمانِ شاہی کی طرح تعظیم پاتے۔ گھر میں ہر فیصلہ امی کی مرضی سے ہوتا اور امی کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا۔ اس چھوٹے سے کنبے کے ہر نفس کا ایمان تھا کہ امی اپنے گھر اور گھر کے مکینوں کے لیے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کر سکتیں۔ امی اس اعتماد کی اہل تھیں۔

امی ان لوگوں میں سے تھیں جو ہجومِ خلائق میں بھی اپنی انفرادیت نمایاں رکھتے ہیں۔ وہ پُرجمال بھی تھیں، پُرجلال بھی۔ جب کسی بات پر ڈٹ جاتیں تو ڈٹ جاتیں۔ انہیں اللہ میاں نے بڑی فرصت میں بنایا تھا۔ ایسی ستھری، ملائم اور سفید مٹی سے کہ ادھیڑ عمر میں بھی ان کا چہرہ جوانوں سے زیادہ دمکتا تھا۔ امی کو یہ حُسن اپنے بڑوں سے وراثت میں ملا تھا اور یہ خوب صورتی ان کے اپنے بطن سے جنم لینے والے بچوں کو بھی بطور میراث ملی تھی۔ تقریباً ایک صدی پرانا قصہ تھا۔ امی کے جدِامجد خوب صورت اور غیور پٹھانوں کے علاقے سے سندھ کے میدانوں میں آبسے تھے۔ بس پھر یہ میدان ہی مسکن بن گئے تھے اور ایسے کہ حُسن تو ایک نسل سے دوسری نسل کو منتقل ہوتا رہا، رہن سہن نئی تہذیب میں مدغم ہو گیا اور زبان دانی بتدریج جاتی رہی۔ امی پشتو سمجھ تو لیتی تھیں بولنے پر قادر نہیں تھیں اور ان کے بعد کی نسل تو اردو دانوں کی طرح آپ جناب والی اردو بولتی تھی۔ پشتو ان چاروں بھائی بہنوں میں سے کسی کو امی جتنی بھی نہ آتی تھی۔

بابا بھی پٹھان تھے۔ امی کے برعکس روانی سے پشتو بولتے۔ ان کی اور ان کے خاندان کی جڑیں سرحد کی زمین میں اتری ہوئی تھیں۔ بابا آفریدی تھے امی شنواری۔ بابا کی کتابِ زندگی میں امی کا تذکرہ بی بی جان کے بعد آتا تھا جو بابا کی پہلی منکوحہ تھیں۔

بی بی جان کی پہلی شادی بابا کے بڑے بھائی رحمت خان آفریدی سے ہوئی تھی۔ رحمت خان اپنے سات بہن بھائیوں میں سب سے بڑے تھے۔ ان کے بعد اوپر تلے پانچ بہنیں تھیں اور سب سے آخر میں دولت خان یعنی بابا تھے۔ رحمت خان سے بی بی جان کے دو بیٹے تھے ایاز خان اور ارباز خان۔ بابا اپنے بڑے بھتیجے ایاز خان کے ہم عمر تھے۔ ایاز خان اور بابا ہم مکتب ہونے کے ساتھ ہم جماعت بھی تھے۔ جن دنوں وہ دونوں ساتویں جماعت کے طالب علم تھے رحمت خان کو خریف کی بوائی کرواتے ہوئے دل کا دورہ پڑا جو اتنا شدید تھا کہ رحمت خان اچانک گھر والوں کی زندگی سے نکل کر خواب بن گئے۔ بی بی جان کی عدت کے بعد خاندانی روایت کے مطابق بی بی جان کا عقد ثانی ان کے مرحوم شوہر کے بھائی دولت خان سے کر دیا گیا۔ نکاح سے کچھ دیر پہلے بابا اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ گلی میں کھیل رہے تھے۔ آغا جی انہیں بلا کر گھر لے گئے۔ انہیں نہانے کو کہا اور نیا جوڑا پہننے کو دیا۔ نکاح خواں کے آنے پر بی بی جان کا عقد ثانی بابا سے کر دیا گیا۔ اگلے دن جب بابا حسبِ معمول ایاز خان اور ارباز خان کے ساتھ اسکول گئے تو ان کے ایک ہم مکتب نے جو اُن کا ہمسایہ بھی تھا دوسرے لڑکوں کو ہنس کر بتایا، دولت خان کی شادی ایاز خان کی ماں سے ہو گئی ہے۔ ایاز خان اب دولت خان کو ابو بولا کرے گا۔ بابا کو ایسی شرم آئی کہ اس دن کے بعد انہوں نے پلٹ کر اسکول کا منہ نہیں دیکھا۔

بابا کو بی بی جان کے ساتھ اپنے اس نئے رشتے سے ایسی شرم محسوس ہوتی تھی کہ ایک دن وہ گھر والوں کو بتائے بغیر گھر سے نکلے اور بغیر ٹکٹ ریل گاڑی میں بیٹھ کر ٹکٹ چیکر سے چھپتے چھپاتے کراچی جا پہنچے۔ کراچی اس زمانے میں غریبوں کا مائی باپ اور مسافروں کے لیے ایک مسافر نواز شہر ہوا کرتا تھا۔ معاش کی تلاش میں دور دراز علاقوں سے آنے والوں کو کسی مہربان دوست کی طرح اپنی بانہوں میں سمیٹ لیتا۔ بابا کو بھی پناہ مل گئی۔ ربِ رحیم و کریم نے ایک دن بھی بھوکا نہ سلایا۔ پہلے ہی دن ایک قصاب کی دکان کے باہر ہوٹل سے منگوائے گئے کھانے کی جھوٹی رکابی سے پیٹ بھرنے کا سامان ہو گیا۔

تھڑے پر بیٹھے قصاب نے انہیں اپنا بچا جھوٹا کھانا کھاتے دیکھ کر ہلکا پھلکا سا انٹرویو کیا اور پوچھا۔ ”کام کرے گا؟“ اندھا کیا چاہے دو آنکھیں، کچھ دن بابا قصاب کی دکان پر اوپر کا کام کرتے رہے پھر ایک ہوٹل والا جو قصاب کی دکان پر گوشت لینے آیا کرتا تھا اپنے ساتھ لے گیا۔ کچھ عرصہ بابا نے اس ہوٹل میں بیرا گیری کی پھر ایک رنگ ریز کی دکان پر چلے گئے۔ وہاں سے ایک پرچون کی دکان پر پھر ایک مالی کے ساتھ بطور مددگار کام کرنے لگے۔ چند دن ایک برف فروش کی دکان پر بھی کام کرتے رہے۔ پھر ایک پلمبر نے جو ہم زبان بھی تھا انہیں اپنی شاگردی میں لے لیا اور صبح ناشتا اور دو وقت کھانے کے ساتھ اپنی دکان کے ایک گوشے میں قیام کی سہولت بھی دے دی۔ اس شخص کے ساتھ بابا کا دل ایسا ملا کہ خوب انہماک سے کام سیکھا اور بقول استاد جو کام دوسرے چار دن میں سیکھتے بابا نے ایک ہی دن میں سیکھ کر استاد کے دل میں اپنی جگہ بنالی۔ ناشتے اور کھانے کے ساتھ کام کی اجرت بھی ملنا شروع ہوئی تو بابا نے گھر والوں کو نہ صرف اپنے بخیریت ہونے کی خبر دی بلکہ پیسے بھی گھر بھجوانا شروع کر دیے۔

آٹھ نو سال بابا اسی استاد کے پاس رہے پھر قسمت نے مزید یاوری کی تو ایک ریکروٹنگ ایجنسی کے توسط سے انہیں اپنی مہارت میں بھرتی ہو کر کویت جانے کا موقع مل گیا۔ بابا وہاں سے بھی گھر والوں کو باقاعدگی سے

پیسے بھجواتے رہے۔ حسبِ معاہدہ دو سال کے بعد چھٹی پر وطن واپس لوٹے تو پشاور جانے کے بجائے کراچی پہنچے۔ استاد کی قدم بوسی ضروری سمجھی کہ اسی کے سکھائے ہوئے ہنر کی بدولت تو بیرونِ وطن جا کر پیسہ کمانے کا موقع ملا تھا۔

استاد جو بابا کے نجی حالات سے کافی حد تک باخبر تھا پوچھا۔ ''گھر کب جانے کا پروگرام ہے؟''

جواب دیا۔ ''کوئی پروگرام نہیں۔''

اس نے ہنس کر کہا۔ ''اب تو بڑے ہوگئے ہو، باہر کی دنیا بھی دیکھ آئے ہو، اب بھی بیوی سے شرم کرتے ہو۔''

بابا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

استاد نے کہا۔ ''ایسے زندگی کیسے گزرے گی؟''

بابا نے جواب دیا۔ ''جیسے اب گزر رہی ہے۔''

استاد نے دلسوزی سے سمجھایا۔ ''مرد کی زندگی میں عورت نہ ہو تو مرد یتیم سا رہتا ہے۔ گھر جاؤ اور بیوی سے نباہ کرنے کی کوشش کرو۔''

بابا نے کہا۔ ''وہ تو مجھے بیوی لگتی ہی نہیں۔''

استاد نے ہنس کر پوچھا۔ ''بیوی نہیں تو پھر کیا لگتی ہے؟''

جواب دیا۔ ''ماں!''

استاد چکرا کر رہ گیا۔ ''ایسے گزارہ کیسے ہوگا؟''

بابا نے جواب دیا۔ ''اسی لیے تو نہیں ہو رہا۔''

''استاد سوچ میں پڑ گیا پھر مشورتاً بولا۔ ''دوسری شادی کرلو۔''

بابا نے کہا۔ ''سوچ تو میں بھی یہی رہا ہوں مگر گاؤں میں نہیں شہر میں شادی کرنے کا ارادہ ہے۔ آپ کوئی گھر دیکھیں جہاں سے مجھے رشتہ مل سکے۔'' استاد نے اپنے ہی گھر سے اپنی بیٹی کا رشتہ پیش کر دیا۔ یوں استاد کی ایف اے سی ٹی پاس بیٹی ماہتاب شنواری بابا کی دوسری منکوحہ ماہتاب آفریدی بن گئیں۔

ماہتاب شنواری کا بابا کی زندگی میں آنا ان کی کتابِ زندگی میں ایک نیا باب کھلنے کے مترادف تھا۔ یہ باب کیا کھلا بابا کی زندگی کے سارے بام و در ہی جگمگا اٹھے۔ ماہتاب اسم بامسمّیٰ تھیں۔ خوش جمال اور خوش خصال۔ ایک مزدور پیشہ باپ کی بیٹی ہونے کے باوجود انہیں زندگی گزارنے کا ایسا سلیقہ تھا جو بسا اوقات بہت سے دولتمندوں کو بھی نہیں ہوتا۔ انہیں اللہ نے بڑی صلاحیتوں سے نوازا تھا۔ وسیع القلب ایسی تھیں کہ بابا سے شادی کے بعد انہوں نے بابا کے دل میں ان کی پہلی منکوحہ کے لیے بھی جگہ نکالنے کی کوشش کی۔

''دولت خان، اللہ آپ ہی سے نہیں مجھ سے بھی اس عورت کے سلسلے میں سوال کرے گا کیونکہ میں آپ کی شریکِ حیات ہوں۔ آپ کو اس کا حق بھی ادا کرنا چاہیے۔'' وہ بابا کو سمجھاتیں۔

''اس کا حق بھجوا تو دیتا ہوں۔'' بابا کہتے۔

''عورت کا حق صرف اتنا نہیں ہوتا کہ اسے خرچہ بھجوا دیا جائے۔ اسے مرد کی محبت اور سرپرستی بھی درکار ہوتی ہے۔''

''محبت میں نہیں دے سکتا۔''

''کیوں؟''

''کیونکہ میرے بس کی بات نہیں۔ جس عورت سے مجھے شرم محسوس ہوتی ہے اسے میں محبت کیسے دے سکتا ہوں۔''

سچی بات یہی تھی کہ بابا کو بی بی جان بیوی لگتی ہی نہیں تھیں۔ جب وہ چھوٹے تھے تو ان کی ماں اکثر انہیں ننگ دھڑنگ کر کے اس وقت بی بی جان کے سامنے کھڑا کر دیا کرتی تھیں جب وہ اپنے دونوں بچوں کو نہلا دھلا رہی ہوتی تھیں۔

''لو اسے بھی نہلا دو۔ یہ بھی تو تمہارے لیے بیٹوں کی طرح ہے۔'' ماں کہتیں۔ ماں کچھ غلط بھی نہیں کہتی تھیں اس وقت تو ایسا ہی تھا۔ بی بی جان کے لیے وہ ایاز اور ارباز کی طرح ہی تھے۔ مگر رحمت خان کی اچانک موت نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ انہیں نہلانے دھلانے والی ماں سمان بھابی ان کی بیوی بنا دی گئیں۔

اپنی دوسری منکوحہ کے سمجھانے بجھانے اور خدا کا خوف دلانے پر بابا گاؤں تو آنے جانے لگے مگر جتنی محبت انہیں اپنی دوسری بیوی سے تھی اور رہی اس کا عشرِ عشیر بھی وہ بی بی جان کو نہ دے سکے۔

بابا آخر عمر تک بیرونِ ملک ہی نوکری کرتے رہے۔ چھٹی پر وطن واپس آتے تو چار چھ دن کے لیے گاؤں بھی جاتے۔ والدین فوت ہو چکے تھے۔ بہنیں اپنے اپنے گھروں کے معاملات میں گھری ہوئی تھیں۔ ایاز اور ارباز کے بچے بھی جوان تھے۔ بابا چھٹی پر گھر آتے تو ان کا زیادہ وقت شہر میں ماہتاب اور ان کے بطن سے جنم لینے والے اپنے چاروں بچوں کے ساتھ گزرتا۔ ماہتاب آفریدی کے بطن سے جنم لینے والے بچوں میں نایاب سب سے بڑی تھیں۔ نایاب سے چھوٹا بھائی تھا۔ بہجت خان آفریدی، تیسرے نمبر پر حجاب تھیں اور سب سے چھوٹی رباب۔

بابا کو ماہتاب آفریدی سے ایسا عشق تھا کہ کویت سے بلاناغہ انہیں فون کرتے۔ ہر آتے جاتے کے ہاتھ اپنی کیسٹ بھجواتے جس میں اپنا دل کھول کر سامنے رکھ دیتے۔ جہاں کوئی جاننے والا پاکستان آتا جاتا ملتا اس کے توسط سے بیوی بچوں کے لیے سوغاتیں بھجواتے۔ خود چھٹی پر وطن آتے تو نوع بنوع چیزیں لے کر گھر آتے تو بیوی بچوں کو خوب گھماتے پھراتے، چھٹی گزارنے کے بعد کویت واپس جانے لگتے تو ڈپارچر لاؤنج میں داخل ہونے سے پہلے بار بار بیوی بچوں کی طرف پلٹتے۔ بار بار انہیں خدا حافظ کہتے اور بار بار اپنی آنکھوں سے آنسو خشک کرتے۔ لاؤنج میں داخل ہونے کے بعد بھی ان کی نگاہیں شیشوں کے اس پار اپنی محبوب بیوی کو ڈھونڈے جاتیں۔ جہاز میں سوار ہوتے ہی ان کا دل بیٹھنے لگتا۔ آنکھیں بار بار بھیگے جاتیں۔ معشوقہ بیوی اور اس کے بطن سے جنم لینے والے بچوں سے پھر دوری کا احساس ان کے دل کو پھوڑے کی طرح دکھانے لگتا۔ معاش کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کسی قیمت پر بھی ان سے دور نہ جاتے۔ کویت پہنچتے ہی وہ گھر فون کر کے بیوی بچوں سے بات کرتے۔ بچوں کو بار بار نصیحت کرتے کہ امی کا خیال رکھنا۔

امی جو بابا کے جانے سے بہت اداس اور اپنے اندر تنہائی کا شکار ہوتیں اپنی قلبی کیفیت کو دباتے ہوئے انہیں بڑے اعتماد سے اطمینان دلانے کی کوشش کرتیں۔ ''دولت خان آپ اِدھر کی فکر نہیں کرنا...... سب خیر

ہے...... میں اِدھر ہوں نا آپ کے گھر اور بچوں کا خیال رکھنے کو۔"

"ہاں، ہاں یہ تو میں جانتا ہوں۔" بابا کے لہجے میں اعتبار کے ساتھ ملال بھی ہوتا۔

بابا کے جانے کے بعد بچوں کو باپ کی دوری اور کمی کا احساس نہ ہونے دینے کی خاطر امی اپنے خانہ دارانہ فرائض سرانجام دینے کے علاوہ باہر کے سارے کام بھی مردانہ وار کرتیں۔ گھر کے اندر اور باہر کون سی ایسی ذمّے داری تھی جسے انہوں نے کبھی نظر انداز کیا ہو۔ بابا کی معاشی ذمّے داریوں میں بھی ان کا خاطر خواہ ہاتھ بٹانے کو وہ برسوں ملازمت بھی کرتی رہیں۔ ایف اے سی ٹی تھیں۔ سرکاری پرائمری اسکول میں نوکری کے علاوہ گھر پر بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاتیں۔ بورڈ کے امتحانات میں کہہ سن کر اپنی ڈیوٹی لگواتیں تاکہ معاشی تگ و دو میں بھی ہاتھ بٹانے کے ساتھ اپنے بچوں کو بہتر معیارِ زندگی بھی فراہم کرسکیں۔

امی کو تعلیم کی اہمیت کا بخوبی احساس تھا۔ تعلیم ہی کے طفیل انہیں زندگی کا صحیح شعور ملا تھا۔ تعلیم ہی تھی جس کی بدولت انہیں سرکاری نوکری ملی۔ تعلیم نے ان کی شخصیت کو نکھارا تھا۔ اچھے بُرے کی تمیز سکھائی تھی۔ اعتماد بخشا تھا۔ دنیا کا سامنا اور مقابلہ کرنا سکھایا تھا۔ تعلیم نے ان کی خوب صورتی کو دوچند کیا تھا۔ یہ احساس کہ گھر کی گاڑی چلانے میں وہ برابر سے بابا کی شریک تھیں انہیں توانا، پُراعتماد اور پُرامید رکھتا۔ ہر ماہ پہلی تاریخ کو تنخواہ کا حصول، مہینے بھر تگ و دو اور اگلے ماہ پہلی تاریخ کو اپنی محنت کی کمائی ہاتھ میں آنے کا انتظار زندگی کو غیر معمولی تسکین بخشتا۔

تعلیم کی اہمیت وافادیت کے پیشِ نظر امی نے چاروں بچوں کی تعلیم پر بھرپور توجہ دی تھی۔ اپنا آرام تج کر مشقت اور جان سوزی سے کام لیا تھا۔ صبحِ صادق سے قبل بیدار ہوتیں اور رات گئے تک کام میں جتی رہتیں۔ ابھی ایک کام تو ابھی دوسرا۔ بیکار اور بے مصرف بیٹھنا ان کا مسلک ہی نہ تھا۔ رات کو دیر تک گھر کی بتیاں روشن رہتیں اور گھر میں مکتب کا سا سماں رہتا۔ بچے پڑھتے رہتے اور امی گھر کے دھندے نمٹانے کے ساتھ ان کی پڑھائی پر بھی نظر رکھتیں۔ کبھی کسی کو ہوم ورک کرنے میں مدد دیتیں تو کسی کو ٹیسٹ دے کر اس کی کارکردگی کا اندازہ کرنے کی کوشش کرتیں۔ کہنے کو امی معمولی تعلیمی قابلیت کی حامل تھیں۔ فقط ایف اے سی ٹی مگر اپنی محنت، شوق اور لگن سے انہوں نے اپنی تدریسی استعداد میں نمایاں اضافہ کرلیا تھا۔ بچوں کو پڑھائی میں مدد دینے کے لیے وہ دوسروں سے اکتساب کرکے بچوں کو استفادہ بہم پہنچانے کی کوشش کرتیں۔ انہیں اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم یافتہ دیکھنے کی ایسی لگن اور چاہ تھی کہ ان کے اپنے خاندان کی عورتیں ان کا مذاق اڑاتیں۔

"ماہتاب اپنی بیٹیوں کو بھی اپنی طرح ٹیچر بنانے کے خواب دیکھتی ہے۔" استہزائیہ لہجے میں کہا جاتا۔

"میں تو ایک بیٹی کو ٹیچر، ایک کو ڈاکٹر اور ایک کو انجینئر بنانا چاہتی ہوں۔" امی اپنے رشتے داروں کے طنز و استہزا کی چنداں پروا کیے بغیر انہیں مزید جلانے کو کہتیں اور بچوں کو سمجھاتیں۔

"یہ لوگ اپنی طرح سب کو جاہل دیکھنا چاہتے ہیں مگر تمہیں کسی کی پروا نہیں کرنی ہے۔ ایک روز جب تم سب پڑھ لکھ کر اپنی اپنی منزل پر جا پہنچو گے تو ان سب کی زبانوں کو تالے پڑ جائیں گے۔"

ایسا ہی ہوا تھا مگر بابا اپنے بچوں کے ان کی منزلوں سے ہمکنار ہونے سے قبل ہی راہیٔ عدم ہولیے تھے۔ پردیس میں بابا کی اچانک موت نے ان چاروں بھائی بہنوں کو حواس باختہ کردیا تھا مگر امی نے اس موقع پر بھی

انتہائی پامردی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بابا کے بعد انہوں نے بچوں کے حوصلے پست نہ ہونے دیے۔ بڑی بیٹی نایاب کو ڈاکٹر بنایا اور جوں ہی اس کے لیے اچھا رشتہ ملا اسے گھر بار کا کردینے میں مطلقاً دیر نہ کی۔ نایاب سے چھوٹا بہجت خان الیکٹریکل انجینئر تھا۔ ایک پرائیوٹ ادارے سے وابستہ تھا۔ امی نے بہجت خان کی شادی کرنے میں بھی دیر نہیں کی تھی۔ بہجت کی بیوی ارم امی کی ایک کولیگ کی بھتیجی تھی۔ سافٹ ویئر انجینئر اور ملٹی نیشنل ادارے کی ملازم مگر بہو کے انتخاب میں امی چوک گئی تھیں۔ ارم زیادہ اچھی بہو ثابت نہیں ہوسکی تھی۔ بہجت سے چھوٹی حجاب نے ایم اے بی ایڈ کیا تھا۔ پبلک سروس کمیشن کے مروجہ طریقہ انتخاب سے گزر کر اس نے محکمۂ تعلیم میں سولہ گریڈ کی ملازمت حاصل کی تھی پھر کچھ عرصے بعد دوبارہ پبلک سروس کمیشن کے توسط سے خود کو ہیڈ مسٹریس کی اسامی کا اہل ثابت کیا تھا۔ پبلک سروس کمیشن کی سفارش پر اس کا تقرر طالبات کے ایک ثانوی تعلیمی ادارے میں کیا گیا تھا۔ اس ادارے کے انتظام وانصرام کو اس نے اتنی خوبی سے سنبھالا تھا کہ بورڈ کے امتحانات میں ادارے کی طالبات کی غیر معمولی کارکردگی پر اسے محکمہ تعلیم کی جانب سے توصیفی سند اور نقد انعام سے نوازے جانے کے علاوہ حکومت کی جانب سے سرکاری خرچ پر عمرے کی ادائیگی کا موقع بھی دیا گیا تھا۔ نوجوانی ہی میں اسے یہ گراں قدر اعزاز ملنے پر امی کے خاندان کی وہ عورتیں جو اولاد کی تعلیم کے معاملے میں امی کا جوش واستقلال دیکھ کر اکثر مذاق اڑایا کرتی تھیں اب رشک وحیرت میں مبتلا تھیں۔ حجاب سے چھوٹی رباب بھی ایف ایس سی میں اٹھاسی فیصد نمبر حاصل کرنے اور داخلہ امتحان میں بھی غیر معمولی کارکردگی کا مظاہرہ کرنے کے بعد انجینئر یونیورسٹی میں داخل ہوچکی تھی۔ یوں امی کی وہ بات جو وہ اپنے خاندان والیوں کی اس بات کے جواب میں کہا کرتی تھیں کہ ماہتاب تو بیٹیوں کو بھی اپنی طرح ٹیچر بنانے کے خواب دیکھتی ہے پوری ہوچکی تھی۔ امی کی تین بیٹیوں میں سے ایک ڈاکٹر تھی، ایک ہیڈ مسٹریس اور ایک انجینئر بننے جارہی تھی۔

امی واقعی کمال کی عورت تھیں۔ معمولی تعلیمی قابلیت کی حامل مگر فولادی ارادوں کی مالک! وومین آف اسٹیل جس بات کا عزم کرلیتیں سو کرلیتیں۔ ان کا حوصلہ ہمیشہ توانا رہتا۔ وہ جو چاہتیں کر گزرتیں جو چاہتیں پا بھی لیتیں۔ کون کہتا ہے کہ زندگی میں کامیابی کے لیے بڑی بڑی ڈگریوں، غیر معمولی عقل ودانش یا وسائل کی فراوانی لازم ہوتی ہے۔ اپنے فرائض کو نیک نیتی، محبت اور محنت سے سرانجام دینے والوں کو خدا کبھی مایوس نہیں کرتا سو امی بھی نہ ہوئی تھیں۔

نایاب باجی اپنے گھر میں بہت خوش تھیں۔ محبت کرنے والا شوہر اور دو بیٹے جن میں سے ایک اسکول بھی جانے لگا تھا۔ بہجت بھائی کی ایک بیٹی تھی۔ ڈھائی سالہ انعم اپنے ماں باپ اور دادی پھوپھیوں کی آنکھ کا تارا تھی۔ امی کو حجاب کی فکر تھی اس کے لیے رشتے آتے رہتے تھے۔ امی اٹھتے بیٹھتے کہتی رہتی تھیں کہ بس اب حجاب کی شادی ہوجانی چاہیے مگر اب تک آنے والے رشتوں میں سے کوئی سوفی صد امی کے دل کو نہ لگا تھا ورنہ وہ یہ کہنے کے بجائے کہ اب حجاب کی شادی ہوجانی چاہیے کہتیں بس اب حجاب کی شادی ہونی ہے۔ امی کا طریقۂ کار یہی تھا۔

مسز افزا سے تو اس نے یونہی کہہ دیا تھا کہ امی شادی کے لیے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑی ہوئی ہیں۔ اس کے لیے کوئی رشتہ امی کے دل کو لگنے کی دیر تھی بس پھر تو چاہے اس سمیت ساری دنیا ہاتھ پاؤں مارتی امی اس کی

شادی کر کے ہی رہتیں۔ امی کے فیصلے کے بعد وہ بھلا ہاتھ پاؤں مارتی بھی کیوں۔ اس گھر میں امی کی آنکھ کا اشارہ حکم بن جاتا اور ان کی زبان سے نکلے الفاظ فرمانِ شاہی کی طرح تعظیم پاتے تھے۔ امی وہ بڑے بڑے فیصلے بھی جو خاندان کے بہت سے افراد باہم مل جل کر کرتے ہیں تنہا ہی کر جاتیں۔ ان کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوتا اور ان کے فیصلے سے رُوگردانی کی اہلِ خانہ میں سے کسی کو مجال نہیں ہوتی۔ بھلا ہوتی بھی کیوں، اس گھر اور گھر کے مکینوں کا امی سے بڑھ کر بھی کوئی اور بہی خواہ ہو سکتا تھا۔ بابا تو ساری زندگی پردیسی رہے تھے۔ امی نے اپنے گھر کا نظام عورت نہیں مرد بن کر چلایا تھا۔ گھر کے سودا سلف سے لے کر بیٹی کے جہیز اور بیٹے کی بری تک، بچوں کے اسکولوں میں داخلے سے کالج، یونیورسٹی میں داخلے تک ہر مرحلے پر امی نے مردانہ وار کام کیا تھا۔ اولاد کی تعلیم، تربیت، خوشی، غم، بیماری، آزادی، تہوار، تقریب، صلاح، مشورہ غرض ہر معاملے میں امی نے ماں ہی نہیں باپ کے فرائض بھی نبھائے تھے۔ کنبے کی مختلف النوع ضروریات نے امی کو تمام زندگی متحرک رکھا تھا۔ کبھی کسی کو وین نہ آنے پر اسکول، کالج پہنچانا ہوتا، کبھی امتحانی مرکز لے جانا ہوتا۔ آج ایک کا ڈومیسائل بنوانا ہے تو کل دوسرے کا شناختی کارڈ، کسی کو جوتے کی ضرورت ہوتی کسی کو کپڑے کی، کسی کو بیگ خرید کر دینا ہوتا تو کسی کے کپڑے درزی کے ہاں سے اٹھانے ہوتے۔ امی بچوں کے معاملے میں اتنی محتاط تھیں کہ بیٹیوں ہی نہیں بیٹے کو بھی جب تک اچھے بُرے کی بخوبی سمجھ نہ آگئی اکیلے کہیں نہ آنے جانے دیا۔ خود سائے کی طرح ساتھ رہتیں اور بچوں کو ہدایت تھی کہ جو بھی بات ہو مجھے ضرور بتاؤ تاکہ میں تمہیں صحیح راستہ بتا سکوں۔ کبھی کوئی بات چھپاؤ مت۔ اسی تربیت کا نتیجہ تھا کہ تمام بچے امی سے ہمیشہ بہت قریب اور مانوس رہے۔ کسی نے کوئی بات ان سے نہ چھپائی۔ کنبے کی ذمے داریوں اور خانہ دارانہ فرائض کی انجام دہی کے ساتھ امی اپنے ملازمتی فرائض بھی پوری لگن اور ایمانداری کے ساتھ سرانجام دیتیں۔ سوا اس کو چھٹی نہ ملی جس نے سبق یاد کیا کے مصداق انہیں کبھی اسکول میں کسی فنکشن کی تیاری کرانا ہوتی کبھی طلبہ کو کھیلوں کے مقابلوں کے لیے تیار کرنا ہوتا۔ کبھی روزمرہ کے تدریسی فرائض تو کبھی کمرہ امتحان میں طلبہ کی نگرانی۔ اپنی گوناگوں ذمے داریوں کے باعث امی اپنی تعلیمی استعداد میں رسمی اضافہ تو نہ کر سکیں مگر حقیقت یہ تھی کہ ایف اے سی ٹی ہونے کے باوجود وہ بہت سے ایم اے بی ایڈ استادوں سے بہتر تھیں۔

گھر سے باہر مختلف النوع امور کے باعث امی کا ایک پاؤں گھر کے اندر ہوتا دوسرا گھر سے باہر۔ کبھی کبھی واپسی میں بہت دیر بھی ہو جاتی۔ ان کے بعض قریبی لوگ بھی ایسے موقعوں پر عجیب و غریب باتیں بنانے لگتے۔ عورت کے سر پر مرد نہ ہو تو لوگوں کو باتیں بنانے میں کیا دیر لگتی ہے۔ امی کو اپنی کردارکشی کا صدمہ بھی سہنا پڑا۔ خوش رو بیٹیوں کو انہی کے کاموں سے اپنے ساتھ لے کر باہر جاتیں تو لوگوں کے لب ہی نہیں آنکھیں بھی مسکرانے لگتیں مگر امی اپنے پائے استقامت میں لغزش نہ آنے دیتیں۔

اچھا بُرا سب وقت گزر گیا تھا۔ امی اب جوان نہیں رہی تھیں بوڑھی ہو گئی تھیں۔ جوانی تو مٹھی میں دبی ریت کی طرح نہ جانے کہاں ذرہ ذرہ مٹھی سے نکل گئی تھی۔ بچوں کے اصرار پر اور خانگی تقاضوں کے پیشِ نظر امی نے پچیس سالہ عرصۂ ملازمت مکمل ہونے پر سرکاری ملازمت سے قبل از وقت ریٹائرمنٹ لے لی تھی۔ اپنی عمر کی عام گھریلو عورتوں کی طرح بستر پر لیٹ کر بیٹے بیٹیوں اور بچوں کے بچوں سے اپنے پاؤں دبوانے کے

نبھائے وہ اب بھی صبح سے شام تک متحرک رہتیں۔ اٹھاون سال کی عمر میں بھی وہ صبح فجر کی نماز اور قرآن مجید کی تلاوت کے بعد ہلکی پھلکی ورزش ضرور کرتیں۔ جوانی کی طرح ان کا بڑھاپا بھی حسین تھا۔ امی واقعی زبردست خاتون تھیں۔

☆☆☆

غضب کی گرمی تھی۔ مئی کی تپتی دوپہر میں بارہ ساڑھے بارہ کلومیٹر کی مسافت پبلک وین میں اور بس اسٹاپ سے گھر تک تقریباً دس منٹ کی مسافت پیدل طے کر کے تقدیم اسکول سے گھر پہنچی تو گرمی کی شدت سے اس کا بُرا حال تھا۔ گھر کا دروازہ روزانہ کی طرح کھلا ہوا تھا اور اماں حسبِ معمول گلی کے رخ پر کھلنے والی کھڑکی کے نزدیک اپنی وہیل چیئر پر بیٹھی گھر کے دروازے کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ گھر کا نقشہ ہی کچھ ایسا تھا کہ مرکزی دروازہ کھلتے ہی کوئی دس بارہ میٹر لمبی راہداری کے اختتام پر اماں کے کمرے کا دروازہ سامنے ہوتا اور یوں مرکزی دروازے سے اماں کے کمرے کے نصف سے زائد حصے کا منظر قطعاً واضح ہوتا۔ کمرے کے دروازے کے عین مقابل دیوار میں پانچ فٹ چوڑی کھڑکی گلی میں کھلتی تھی۔ اس کھڑکی سے نہ صرف گلی بلکہ دور مین روڈ تک منظر دیکھا جا سکتا تھا۔ اماں کی طبیعت بہتر ہوتی تو وہ اپنی وہیل چیئر پر عموماً اسی کھڑکی کے نزدیک بیٹھی باہر دیکھے جاتیں۔ اماں کے لیے یہ کھڑکی گویا جامِ جہاں نما تھی جس کی آہنی جالی کے ننھے ننھے جھروکوں سے باہر جھانک کر وہ خود کو مصروف رکھنے اور بہلانے کی کوشش کرتیں۔

اماں کی معذوری کوئی سولہ سال پرانا قصہ تھا جب وہ پانچویں اور آخری بیٹی تقدیس کی پیدائش کے بعد جوڑوں کے درد کا شکار ہوئیں اور رفتہ رفتہ وہیل چیئر پر آ گئیں۔ ابا کینٹ بورڈ میں ملازم تھے۔ اللہ نے پانچ بیٹیاں دی تھیں جنہیں ابا نے اللہ کی رحمت سمجھ کر بڑی خندہ پیشانی سے قبول کیا تھا۔ پانچوں بیٹیوں کے نام بھی ابا نے خود ہی رکھے تھے۔ تمہید، تقدیم، تسنیم، تعظیم اور تقدیس۔ پانچ بہنوں کا ایک ہی بھائی تھا مونس جو چوتھی بہن سے چھوٹا اور پانچویں سے بڑا تھا۔ بیٹیوں کی طرح اس کا نام بھی خود ابا ہی نے رکھا تھا اور یہ نام رکھتے ہوئے اماں سے کہا تھا۔

”جانتی ہو مونس کا مطلب کیا ہوتا ہے؟“

اماں جو یکے بعد دیگرے چار بیٹیوں کی پیدائش کے بعد اولادِ نرینہ پیدا ہونے پر بے حد نہال سرکاری اسپتال کے زچہ بچہ وارڈ میں بستر پر لیٹی تھیں دھیرے سے بولیں۔ ”مطلب نہ بھی جانوں تو کیا بیٹے کا کوئی بھی نام رکھ دو اس کا مطلب خوشی ہوتا ہے۔“

ابا مسکرا دیے اور اماں کے بالوں پر آہستہ آہستہ ہاتھ پھیرتے ہوئے بولے۔ ”مونس کا مطلب ہوتا ہے آرام دینے والا۔ ساتھی، دوست، یار۔“ پھر ابا نے اماں کے پہلو میں لیٹے نوزائیدہ کا سر جھک کر چوما اور کہا۔ ”جب ہماری ساری بیٹیاں اپنے اپنے گھروں کی ہو جائیں گی تو یہ ہمارا مونس بنے گا...... ہمارا دوست، ہمارا یار، ہمارے بڑھاپے کا ساتھی۔ ہمیں آرام دینے والا، ہم سے محبت اور انس رکھنے والا۔“

مونس کے ڈیڑھ سال بعد تقدیس پیدا ہوئی تھی اور اس کی پیدائش کے بعد اماں کے جوڑوں میں ایسا درد اٹھا کہ وہ چارپائی سے لگ کر رہ گئیں۔ گھر کے کام کاج تو دور کی بات اٹھنے بیٹھنے کو بھی محتاج ہو گئیں۔ بچوں میں

سب سے بڑی ہونے کے ناتے تمہید کو اماں کی دیکھ بھال کے ساتھ گھر کے کام کاج بھی سنبھالنے پڑے۔ تمہید ان دنوں نویں جماعت میں تھی۔ بھائی بہنوں میں وہ واحد تھی جس کا تعلیمی ریکارڈ کبھی اچھا نہ رہا تھا۔ غبی نہ تھی مگر پڑھائی سے اسے رغبت ہی نہ تھی۔ ابا کی طرح اپنی پکی رنگت اور معمولی شکل وصورت کے باعث وہ چھوٹے بھائی بہنوں کے مقابلے میں احساسِ کمتری کا شکار بھی تھی۔ اماں کی معذوری کے باعث گھر میں ایک فرد کی ہمہ وقت موجودگی لازم ٹھہری تو تمہید نے حصولِ تعلیم کا شوق نہ ہونے کے سبب اسکول سے جان چھڑانے کے لیے اماں کی دیکھ بھال اور گھر کے کام کاج کی ذمّے داری اس شوق سے سنبھالی کہ ابا نے جو اماں کی معذوری اور گھر داری کے معاملات منتشر ہونے کی وجہ سے سخت الجھے ہوئے تھے نویں جماعت کے امتحان کے لیے تمہید کا داخلہ بطور پرائیوٹ امیدوار بھجوا دیا۔ نویں اور دسویں کا امتحان تمہید نے دو کے بجائے تین امتحانات دے کر سپلیمنٹری امتحان میں پاس کیا۔ ابا نے انٹرمیڈیٹ کے لیے اس کی رجسٹریشن علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی میں کرادی مگر اول تو پڑھنے کا شوق کسے تھا دوسرے گھر کے دھندے کب جان چھوڑتے تھے۔

تمہید کو گھر سنبھالے کئی برس ہو گئے تھے مگر اب وہ اس مسلسل مشقت اور مستقل مصروفیت سے اوب چکی تھی۔ یہ بھی بھلا کوئی زندگی تھی۔ صبح اٹھتے ہی باورچی خانے کی چوکھٹ! ابا کو ناشتا دو، اماں کا ناشتا تیار کرو۔ تسنیم کے نخرے دیکھو، کڑوی کسیلی سنو، انڈا اجلا دیا، بھجیا میں نمک تیز ہے، آج پھر پراٹھا...... عجیب لڑکی تھی کام کی نہ کاج کی کڑوے مزاج کی۔ توبہ توبہ...... لڑکیاں کہیں ایسی بھی ہوتی ہیں بھلا۔ تعظیم اور تقدیس کو بھی ٹرے میں لگا کر ناشتا دینا پڑتا۔ تقدیس بھوک کی کچی تھی اسے ساتھ لے جانے کے لیے لنچ میں بھی کچھ نہ کچھ رکھ کر دینا ہوتا۔ تقدیم واحد تھی جو خدمت لینے کے بجائے اس کا ہاتھ بٹانے کی ہر ممکن کوشش کیا کرتی تھی۔ اپنا ناشتا بھی خود ہی بناتی۔ جب تک مونس رہا دونوں بہنوں کو اس کی پسند ناپسند کا حتی الوسیع خیال رہا کرتا تھا۔ تقدیم اس کے لیے بڑے پیار سے فرنچ توس فرائی کرتی۔ مونس کو ناشتے میں فرنچ توس ملنے کا مطلب تھا اس کی عید ہو جانا۔ جب سے وہ گیا تھا ناشتے کے وقت تمہید اور تقدیم کو اکثر اس کا خیال آتا۔ اب نہ جانے اسے فرنچ توس کبھی ملتے ہوں گے یا نہیں، یہ خیال تقدیم کے دل کو تو بہت تڑپاتا۔ سب کو ناشتا کرانے اور دفتر میں ابا کے دوپہر کے کھانے کے لیے رات کا سالن چھوٹے سے ٹفن میں ڈالنے اور اماں کے کمرے میں ناشتا پہنچانے کے بعد تمہید کی اپنی باری آتی۔ اس وقت تک عموماً چھوٹی چاروں بہنیں کوئی اپنے دفتر کوئی یونیورسٹی کوئی کالج جا چکی ہوتی تھیں۔ تمہید کو ان سب کا بچا بچایا ناشتا خود اپنے لیے علیحدہ سے ناشتا بنانے کی زحمت سے بچا لیتا۔ چائے کبھی بچی ہوئی ہوتی بس اسے گرم کرنا پڑتا کبھی نہ ہوتی تو ایک پیالی چائے فٹافٹ بن جاتی۔ کچن میں پڑی تپائی پر ناشتا رکھ کر وہ وہیں اونچے موڑھے پر بیٹھ کر ناشتا کر لیتی۔ ناشتے سے فارغ ہو کر اسے اماں کو دوا دینی ہوتی۔ اماں کی ہمت تھی جو چھ گولیاں ناشتے کے بعد چار دوپہر کو اور سات رات کے وقت لیتیں۔ ناشتے کے جھوٹے برتن دھونے سے قبل وہ ٹیپ ریکارڈر باورچی خانے میں اٹھا لاتی۔ لتا کی اس کے پاس نئی پرانی بے شمار کیسٹیں تھیں۔ لتا کے گانے سنتے ہوئے وہ ساتھ ساتھ خود بھی گنگنانے لگتی۔ برتن دھونے اور باورچی خانے کی صفائی کے بعد اسے گھر کے چاروں کمروں، برآمدے اور صحن کی صفائی کرنا ہوتی۔ ٹیپ ریکارڈر اس کے ساتھ ساتھ گھومے جاتا۔ گھر کی صفائی کے بعد دوپہر کا کھانا پکانا ہوتا۔ ہفتے میں دو تین مرتبہ اپنے اور اماں ابا کے کپڑے،

بستر کی چادریں اور تکیوں کے غلاف بھی دھونے ہوتے۔ کبھی کبھی چھوٹی بہنیں بھی منت سماجت کے ساتھ اپنے کپڑے دھلوانے کو ڈال گئی ہوتی تھیں۔ مونس کے جانے سے پہلے اس کی کالج کی یونیفارم، موزے بنیان اور گھر میں پہننے والے کپڑے بھی اکثر اسی کو یا تقدیم کو دھونا پڑتے تھے۔ تقدیم اماں ابا کے میلے کپڑوں اور بستروں کی چادروں کی دھلائی میں بھی حسبِ فرصت اس کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کیا کرتی تھی۔ اس بے چاری کو فرصت ہی کم کم ملتی تھی۔ کپڑے دھوتے وقت تمہید کو اکثر مونس یاد آتا بے چارہ اب نہ جانے کس سے دھلواتا ہوگا اپنے کپڑے، شاید خود ہی دھونا پڑتے ہوں۔ ویسے وہ کہتا تو تھا کہ وہاں خدمت گار ہوتے ہیں۔ کیا پتا گھر والوں کو تسلی دینے کو جھوٹ ہی بولتا ہو اپنے کپڑے اسے خود ہی دھونا پڑتے ہوں۔ دوپہر کو بہنیں واپس آجاتیں تسنیم کو کھانے میں فی نکالنے کی ایسی بری عادت تھی کہ تمہید لاکھ جتن کر لیتی اسے نکتہ چینی کیے بغیر قرار نہ آتا۔ گوشت میں لوکی کیوں ڈال دی۔ دال میں اتنی مرچیں کیوں جھونک دیں، تمہید باجی کو تو میتھی کا ایسا خبط ہے کہ ہر سالن میں میتھی کا بھگار لگا لگا کر ان کے اپنے پاس سے بھی میتھی کی بو آنے لگی ہے۔ دوپہر کے کھانے کا قصہ تمام نہ ہوتا کہ رات کے کھانے کی فکر آ گھیرتی۔ ابا بے چارے تو صبح کو گھر سے ناشتا کر کے جانے کے بعد رات ہی کو گھر پر کھانا کھاتے تھے۔ دوپہر کو تو وہیں دفتر میں تازہ نان سے گھر کے باسی سالن پر گزارہ کیا کرتے تھے۔ ابا کی وجہ سے رات کو بہرصورت تازہ کھانا پکایا جاتا۔ رات کے کھانے کی تیاری میں تقدیم بھی تمہید کا پورا ہاتھ بٹاتی۔

تقدیم نے ابلاغ عامہ میں ماسٹر ڈگری لینے کے بعد ایک این جی او سے وابستگی اختیار کر رکھی تھی جو اپنے علاقہ کار میں کم وسائل والدین کے بچوں کو بہتر تعلیم کی فراہمی کے لیے کام کر رہی تھی۔ ابا کی معاشی ذمے داریوں میں ان کا ہاتھ بٹانے کو اس نے محلے کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے کا سلسلہ تو اپنے کالج کے زمانے میں ہی شروع کر دیا تھا لیکن تعلیم مکمل کرنے اور ملازمت شروع کرنے کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھی۔ وہ صبح سے رات تک مصروف رہتی۔ صبح نوکری، شام کو ٹیوشنز، ساتھ امی کی دیکھ بھال، ان کی دوا دارو کا خیال، بلاناغہ مساج، فزیو تھراپی، ان کا ملول و محزون دل ہاتھ میں رکھنے کی تدابیر اور شام کو وہیل چیئر پر انہیں تھوڑی سی دیر کے لیے باہر گھمانے پھرانے لے جانا۔ چھوٹے بھائی بہنوں کے معاملات پر بھی توجہ دینا ہوتی تا کہ امی کو یہ احساس نہ ہو کہ وہ اپنی ذمے داریاں پوری نہیں کر پا رہیں اور ابا کی ذمے داریوں کا بوجھ بھی کچھ اور ہلکا ہو سکے۔ ابا سے تقدیم کی گہری ذہنی ہم آہنگی تھی۔ گھریلو معاملات و مسائل کے سلسلے میں جتنی وہ ابا کے نزدیک تھی کوئی اور نہ تھا۔ ابا کو کسی معاملے میں صلاح مشورہ کرنا ہوتا اسی سے کرتے۔ ایف ایس سی کے بعد مونس کے مستقبل کے سلسلے میں اسی نے ابا کے ساتھ سر جوڑ کر سوچ بچار کی تھی اور بالآخر اسی حق میں فیصلہ دیا تھا جو مونس کی دلی خواہش تھی اور جو ابا بھی چاہتے تھے۔

تقدیم سے چھوٹی تسنیم یونیورسٹی میں شعبۂ نفسیات کی طالبہ تھی۔ کلینکل سائیکلوجی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے وہ ماہرِ نفسیات بننا چاہتی تھی لیکن درحقیقت وہ خود ایک کیس تھی۔ خوش رو مگر بدفطرت، انتہائی خود غرض اور خود پسند۔ اسے نہ گھر کے مسائل کی پروا تھی نہ گھر والوں کے دکھ درد سے کوئی خاص غرض۔ امی کی دیکھ بھال سے مطلب تھا نہ گھر کے کام کاج کی کچھ فکر۔ اسے صرف اپنی فکر رہتی۔ ''میں'' اس کے اعصاب پر طاری رہتی۔ گھر

میں ہوتی تو باقی بھائی بہنوں کا استحصال کرنا فرضِ عین سمجھتی۔ کسی سے مطلب پڑتا تو گھگیانے لگتی۔ غرض پوری ہوتے ہی طوطے کی طرح آنکھیں پھیر لیتی۔ اس کی حرکتیں دیکھ کر ابا اکثر بڑی فکرمندی اور دکھ سے سوچتے کہ ان کی یہ بیٹی فطرت میں آخر کس پر چلی گئی تھی کیونکہ خود غرض اور مطلب پرست نہ خود وہ تھے نہ ہی اماں۔

تسنیم کی خود پسندی اور خود غرضی کبھی کبھی بلکہ اکثر دیگر اہلِ خانہ کو مشکل میں ڈال دیتی۔ گھر میں چار کمرے تھے۔ ایک کو اہلِ خانہ نے مہمانوں کے لیے بیٹھک کے طور پر آراستہ کر رکھا تھا۔ ایک اماں اور ابا کے زیرِ تصرف تھا۔ باقی دو کمروں میں افرادِ خانہ کی تقسیم اس طرح تھی کہ تمہید، تقدیم، اور مونس ایک کمرے میں رہا کرتے تھے۔ رات کو مونس بیٹھک میں سوتا، دوسرے کمرے میں تسنیم، تعظیم اور تقدیس رہتیں لیکن تسنیم کے یونیورسٹی میں داخلے کے دوسرے سال جب مونس تمام مقررہ آزمائشوں سے گزرنے کے بعد منتخب ہو کر لانگ کورس کے لیے پی ایم اے کاکول چلا گیا تو تسنیم نے لڑ جھگڑ کر تعظیم اور تقدیس کو اپنے کمرے سے بے دخل کر کے بڑی بہنوں کے کمرے میں منتقل ہونے پر مجبور کر دیا۔ اب چار بہنیں ایک کمرے میں رہتی تھیں اور تسنیم اکیلی پورے ایک کمرے پر قابض تھی۔ جن دنوں اس کی چھوٹی بہنوں کو کمرے سے نکالنے کی جنگ چل رہی تھی ابا اور ان کے ساتھ اماں بھی انتہائی کبیدہ خاطر رہنے لگی تھیں۔ یہی ایک بات نہیں اس سے قبل بھی تسنیم متعدد مواقع پر ایسی ہی خود غرضی کا مظاہرہ کر چکی تھی۔ آئے دن وہ کسی نہ کسی چھوٹی سی بات کو مسئلہ بنا کر بڑا ہنگامہ کھڑا کر دیتی اور کوئی بہانہ نہ ملتا تو وہ تمہید کے خانہ دارانہ کاموں میں عیب ثواب نکالنا شروع کر دیتی اور کبھی کبھی تو اتنا چیختی چلاتی کہ اماں پریشان ہو کر انتہائی بے بسی سے رونے لگتیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ تسنیم گھر والوں کے لیے ایک روگ بنتی جا رہی تھی۔

مونس کے کاکول چلے جانے کے بعد اماں بہت اداس رہنے لگی تھیں۔ ابا انہیں دلاسا دیتے اور یقین دلاتے کہ مونس کی فوجی تربیت کے دو سال پلک جھپکتے گزر جائیں گے۔

''پھر بھی وہ کون سا ہمارے پاس رہے گا۔'' اماں دلگیر لہجے میں کہتیں۔ بات تو ٹھیک تھی۔

''نگری نگری پھرا مسافر گھر کا رستہ بھول گیا۔'' ایک روز اماں نے نہ جانے کب کا اور کس کا ذہن میں اٹکا یہ مصرعہ دہرایا تو ابا کا دل بھی جیسے منوں بوجھ تلے آ گیا۔ بات تو سچ تھی۔

فوج میں یہی ہوتا ہے، سپاہی سے افسر تک خانہ بدوش پھرتے ہیں، سال یہاں دو سال وہاں، تین سال ایک اسٹیشن پر تو چھ ماہ دوسرے اسٹیشن پر۔ کبھی کبھی تو یوں بھی کہ سامان کھلا نہیں دوبارہ بندھنے کے احکامات صادر ہو گئے۔ بات ضرورت کی ہوتی ہے۔ نہ جانے کب، کہاں کس افسر کس سپاہی کی ضرورت پڑ جائے۔

ابا نے کینٹ بورڈ کی ملازمت میں رہتے ہوئے فوج میں صفر سے آغاز کرنے والوں کو بہت اوپر بھی جاتے دیکھا تھا۔ معمولی گھروں سے آنے والوں کو فوج میں کرنل اور جرنیل بنتے دیکھا تھا۔ ابا کے بھی کچھ خواب تھے۔ ہر باپ کی طرح وہ بھی اپنی اولاد کو زندگی کے میدان میں آگے، بہت آگے دیکھنے کے متمنی تھے۔ اپنے خوابوں کو تعبیر دینے کے لیے ابا نے مونس کے فوج میں شمولیت کی خواہش کی خاطر خواہ حوصلہ افزائی کی تھی۔ حالانکہ اماں اسے گھر سے دور نہ بھیجنا چاہتی تھیں۔ ایک ہی تو بیٹا تھا، ان کے دل کا چین، آنکھوں کی ٹھنڈک، اسے دیکھتیں تو زندگی بھلی لگنے لگتی۔ کاکول جانے کے بعد مونس دو مرتبہ چھٹی پر گھر آ چکا تھا۔ فون پر روزانہ نہ سہی

ہر دوسرے دن ضرور اس سے بات ہو جاتی تھی۔ ابا اب اس دن کے انتظار میں تھے جب اپنی تربیت مکمل ہونے کے بعد مونس نے افسر بن کر انہیں اور اماں کو اپنے فوجی یونیفارم میں سلیوٹ کرنا تھا۔

”تقدیم کی ماں جب مونس کی پاسنگ آؤٹ ہو گی تو مجھے اگر اپنے کندھوں پر سوار کر کے بھی تمہیں کاکول لے جانا پڑا تو لے جاؤں گا۔“ ابا انتہائی جذبے سے اماں سے کہتے۔ عجیب بات تھی تمہید کے پہلی اولاد ہونے کے باوجود ابا، اماں کو ہمیشہ تقدیم کی ماں کہتے تھے۔

اماں کی آنکھوں میں روشن روشن خواب دمکنے لگتے۔ فوجی وردی میں ملبوس افسر بیٹا جس کی کشادہ پیشانی افسری کے رعب سے اور بھی فراخ لگتی ہو گی۔

مونس کے لیے اماں کی نظریں ابا کی چھوٹی بہن حمیرا کی بیٹی خوش بخت پر لگی تھیں۔ اچھی بچی تھی، خوش شکل، کم گو، مودب اور خدمت گزار۔ تعظیم اور تقدیس سے اس کی گاڑھی چھنتی۔ دونوں مہینے میں ایک دو مرتبہ پھوپی سے اصرار کر کے چھٹی والے دن خوش بخت کو گھر بلا لیتیں۔ دن بھر ان کے ساتھ گزار کر شام کو وہ کبھی ابا کے ساتھ اور کبھی اپنے والد یا بھائیوں میں سے کسی کو بلا کر ان کے ساتھ گھر واپس چلی جاتی۔ کبھی کبھار وہ ایک دو دن رہنے کے لیے بھی آ جاتی۔ وہ آتی تو اماں کے سر میں تیل کی مالش کرتی، ٹانگوں پر روغن زیتون کا مساج کرتی۔ ان کے قدموں میں بیٹھ کر سج سج ان کے پاؤں دباتی۔ انہیں چائے بنا کر دیتی۔ انہیں اپنے گھر، بہن بھائیوں، دادا، دادی اور کالج کے قصے سناتی۔ وہ مونس سے ڈیڑھ پونے دو سال چھوٹی تھی مگر ماں کی تربیت نے اسے اپنی عمر سے کہیں زیادہ سمجھ عطا کر دی تھی۔ حمیرا خود بھی نہایت اچھی فطرت کی حامل تھی۔ اس نے اپنے بچوں کی تربیت میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھا تھا۔ سچ ہے اولاد بالخصوص بیٹی ماں کا عکس ہوتی ہے۔ اماں کو خوش بخت اسی لیے پسند تھی کہ وہ حمیرا جیسی سمجھدار ماں کی بیٹی تھی۔ گھر میں کون سی کوئی دو چار بہوئیں آنی تھیں کہ اگر ایک خراب نکل گئی تو دوسری سے امید...... مونس اکلوتا بیٹا تھا۔ اماں ابا بلکہ پورے گھرانے کی تمام خوشیاں، تمام امیدیں مونس اور اس کی ہونے والی شریکِ زندگی سے بندھی تھیں۔ بیٹیوں کو تو رخصت ہو کر اپنے اپنے گھر چلے جانا تھا۔ مونس کی دلہن ہی نے اس گھر کی باگ ڈور سنبھالنی تھی۔ خوش بخت کو اماں چپکے چپکے اپنے دل سے بندھی اسی آرزو سے دیکھتی تھیں۔ ابا بھی اس معاملے میں اماں کے ہمنوا تھے اور کیوں نہ ہوتے حمیرا ان کی عزیز بہن تھی۔ ان کی شریکِ حیات نے اپنے اکلوتے اور لائق فائق بیٹے کے لیے ان کی بہن کی بیٹی کا انتخاب کر کے انہیں خوش اور مطمئن کیا تھا۔ امی کی آرزو کی خوشبو خاندان بھر میں تقریباً سبھی کو پہنچی ہوئی تھی۔ خود خوش بخت کو بھی۔ چنانچہ وہ جب بھی اس گھر آتی اسے یہ گھر نہایت اپنا اپنا سا لگتا۔

”میرا بس چلے تو خوش بخت کو ابھی سے اپنے گھر میں رکھ لوں۔“ اماں وفورِ شوق سے کئی مرتبہ ابا سے کہہ چکی تھیں۔

”دعا کرو، مونس کے پاس آؤٹ ہونے تک کم سے کم تین بیٹیاں تو اپنے گھر بار کی ہو جائیں۔“ ابا کہتے۔

اماں ٹھنڈی سانس بھرتیں۔ اور کیا کرتی تھیں وہ دن بھر وہیل چیئر پر بیٹھ کر۔ ابھی اِس کے لیے دعا تو کبھی اُس کے لیے دعا...... مونس کی خیر و عافیت، سلامتی، درازیٔ عمر اور بیٹیوں کے لیے نیک بروں کی دعا مانگتے زبان

خشک ہونے لگتی تھی۔ تمہید خیر سے تیس کی ہو کر اکتیسویں برس میں لگ چکی تھی۔ تقدیم اٹھائیس کی ہو چکی تھی اگر تقدیم اور تسنیم کی پیدائش میں سات سال کے وقفے کے بجائے باقی بھائی بہنوں کی طرح سال، ڈیڑھ سال یا حد سے حد دو سال کا وقفہ ہوتا تو تسنیم بھی اب چھبیس ستائیس کے پیٹے میں تو ہوتی ہی۔ اس کی فکر بھی لگی ہوتی۔

لڑکیوں کے لیے مناسب رشتوں کا تو جیسے کال پڑ گیا تھا یا شاید بیٹوں والے ضرورت سے زیادہ خود غرض ہو گئے تھے۔ وہی زمانہ اچھا تھا جب ہڈی بوٹی اور حسب نسب کی بنیاد پر لڑکیاں اور لڑکے گھر میں نمٹ جاتے تھے۔ اپنا مارے بھی تو چھاؤں میں ڈالتا ہے کی سوچ دلوں میں یوں موجزن تھی کہ اینڈی بینڈی لڑکیاں اور نکھٹو آوارہ لڑکے بھی خاندان کے اندر ہی لپیٹ دیے جاتے۔ اللہ اللہ خیر سلاّ۔ نہ ماؤں کو بیٹیوں کی فکروں میں دق لگتی تھی نہ بیٹوں کے باپ رشتوں کی تلاش میں ہلکان ہوتے تھے۔ زمانہ بدل گیا تھا۔ زمانے کو بدلنا ہی ہوتا ہے مگر ایسا بھی کیا بدلنا...... ایسی بھی کیا خود غرضی کہ اب تو لڑکے والے جب لڑکے کے لیے لڑکی کی تلاش میں نکلتے تو لگتا کوہ قاف سے قارون کے کسی جانشین کی بیٹی لے کر ہی پلٹیں گے۔ لڑکی دیکھتے وقت دماغ ساتویں آسمان پر رکھتے اور آنکھیں ماتھے پر اٹھا دھرتے۔

تمہید خوب صورت ہی تو نہیں تھی نا۔ صورت شکل پر کیا جانا اللہ کی دین ہے، کسی کو چندے آفتاب چندے ماہتاب بنا دیا کسی کو بس واجبی سی شکل و صورت عطا کر دی۔ لڑکی کا اصل حسن اس کی سیرت اس کی سلیقہ شعاری اس کی خدمت گزاری ہے۔ تمہید کی خوش خلقی، سلیقہ مندی اور خدمت گزاری کے اپنے پرائے بھی معترف تھے۔ اماں کی بیماری کے بعد سولہ سترہ برس سے پوری گھر گرہستی اسی کے ذمے تھی، کیسی خوش اسلوبی اور خدمت گزاری سے چلا رہی تھی۔ البتہ کچھ عرصے سے مزاج میں فرق آ گیا تھا۔ پہلے کی طرح خوش خلق اور ملنسار نہ رہی تھی۔ اس کے مزاج میں تبدیلی کے ڈانڈے ان لوگوں کے رویّوں سے ملتے تھے جو اس کے لیے اپنے بھائی، بیٹے یا دیور، جیٹھ کا رشتہ لے کر آتے تھے۔ جو آتا اس کے بجائے تقدیم، تسنیم یا تعظیم کو پسند کر جاتا۔ اماں، ابا کو انکار کرتے ہی بنتی۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ بڑی بیٹھی رہ جائے اور چھوٹیوں کی شادی ہو جائے۔ آنے والوں کی نظریں تو اس سے صرفِ نظر کر کے چھوٹیوں پر ہی رکتی تھیں جن میں سے ہر ایک اس کے مقابلے میں زیادہ خوش شکل تھی۔ آنے والوں کی نگاہِ پسندیدگی پر آمنّا صدقنا کہنے کا مطلب تھا ایک ایک کر کے چھوٹی چاروں بہنیں اٹھ جاتیں اور وہ عمر بھر کے لیے ماں باپ کے گھر میں بیٹھی رہ جاتی۔

اب کچھ عرصے سے تو اس کے لیے بھولے بھٹکے ہی سہی بڑے عجیب و غریب رشتے آنے لگے تھے۔ رنڈوے جنہیں اپنے گھر اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے گھر بسانا ہوتا۔ طلاق دہندہ جو اپنی مطلقہ کے چھوڑے ہوئے گھر کو دوبارہ آباد کرنا چاہتے۔ بال بچوں کی ذمّے داریوں سے فارغ کھاتا پیتا اور شوقین مزاج ریٹائرڈ بڈھا جسے اپنی تنہائی دور کرنے اور خدمت لینے کے لیے مضبوط ہاتھ پیروں والی بیوی درکار ہوتی یا کوئی پان چباتا ”میں بول ریا تھا“ قسم کی اردو بولتا نوجوان جس کا حلیہ، چہرہ اور لہجہ اس کے اعمال کی گواہی دینے کو کافی ہوتے۔

اماں ابا کو سب سے زیادہ تمہید اور اس کے بعد تقدیم کی فکر لگی ہوئی تھی۔ دونوں عمر کے اس حصے میں تھیں جس کے بعد لڑکیوں کے لیے کنوارے رشتے ملنا مشکل ہو جاتے ہیں۔ بے چاری تمہید کے لیے تو اس کی قبول

صورتی کے باعث اب بھی مشکل ہی تھی۔ اوراس مشکل کا ردِعمل یہ تھا کہ اب وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر چیخنے چلّانے لگتی یا رونے بیٹھ جاتی تھی۔ اب تو وہ اکثر و بیشتر یہ بھی کہنے لگی تھی۔ ’’بس ایک میں ہی رہ گئی ہوں اس گھر کے لوگوں کی نوکرانی بن کر رہنے کے لیے۔‘‘

ابا نے ایک روز اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ’’کون کہتا ہے تم اس گھر کی نوکرانی ہو، ارے بیٹا تم نے تو اس گھر کی ڈولتی ناؤ کو کھینچنے میں سب سے زیادہ ہمت دکھائی ہے اگر تم اپنی ماں کی بیماری میں گھر نہ سنبھالتیں بیٹا تو نہ میں ٹھیک سے نوکری کر پاتا نہ تمہارا بھائی افسر بننے کے لیے جاسکتا تھا اور نہ ہی تمہاری چھوٹی بہنیں اتنی یکسوئی سے تعلیم حاصل کرسکتیں۔

’’میری زندگی تو برباد ہوگئی نا......‘‘ وہ ایک دم پھٹ پڑی۔

اس کے سر پر دھرا ابا کا ہاتھ کانپنے لگا۔ ’’نہیں، نہیں بیٹا ایسا کچھ نہیں ہوا۔‘‘

’’ایسا ہی ہوا ہے۔‘‘ وہ بھبک کر بولی۔

ابا اس کے نزدیک بیٹھ گئے اور اس کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو اپنی انگلیوں کی پوروں میں جذب کرتے ہوئے تسلی آمیز لہجے میں بولے۔ ’’تم دیکھنا...... تم دیکھنا میری بیٹی اللہ تمہاری اس خدمت گزاری کا کیسا انعام دے گا تمہیں...... جتنا آرام تم نے ہم سب کو دیا ہے انشاء اللہ تمہیں اس سے بیس گنا زیادہ سکھ ملے گا۔ اللہ ربُّ العزت کے ہاں ہر نیکی کا اجر کئی گنا ہو کر ملتا ہے۔ تم نے اس گھر کی پریشانی جس طرح بٹائی اللہ تعالیٰ اس نیکی کے بدلے تمہیں اتنی خوشیاں دیں گے کہ تمہارا دامن تنگ پڑجائے گا۔‘‘ ابا کو اتنی لجاجت سے تمہید کی دلجوئی کرتے دیکھ کر تقدیم کا جی کٹنے لگا۔

’’ابا جی ٹھیک کہہ رہے ہیں باجی۔‘‘ اس نے دبی زبان سے کہا۔

’’ہاں تمہیں کیا......‘‘ تمہید نے بلبلا کر اپنی بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا اور چبھتے ہوئے لہجے میں بولی۔ ’’تم تو صبح صبح تیار ہو کر اپنا بیگ لے کر عیش کرنے نکل جاتی ہو، تمہیں میری تکلیف کا کیا اندازہ۔‘‘

عیش! تقدیم دھک سے رہ گئی۔

صبح سے دوپہر تک بھاگ دوڑ اور جسمانی و ذہنی مشقت کو وہ عیش کہہ رہی تھی۔ این جی او والے تنخواہ تو دیتے مگر کام بھی ڈٹ کر لیتے تھے۔ مگر تقدیم کو بہن کی تکلیف کا اندازہ تھا اور وجہ تکلیف کا احساس بھی۔ دو دن قبل اس کے لیے ایک رشتہ آیا تھا اس کی اسکول کے زمانے کی ایک ساتھی، تاحال بہترین دوست اور ہم پیشہ حجاب کے توسط سے۔ اس کی کسی اسٹاف ممبر کو اپنے ڈاکٹر دیور کے لیے لڑکی کی تلاش تھی۔ حجاب نے اسے تقدیم کو دیکھنے بھیج دیا تھا۔ خاتون بڑی طرح دار دکھائی دیتی تھیں۔ خود گاڑی ڈرائیو کر کے لائی تھیں۔ لشکارے مارتی نئی سٹی، حجاب کی مروت میں وہ تقدیم اور اس کے گھر والوں سے ملیں تو خاصی گرمجوشی سے لیکن اپنا کوئی ارادہ ظاہر کر کے نہ گئیں مگر تمہید تو ان دنوں اتنی زود رنج ہوگئی تھی کہ اسے خاتون کا آنا ہی بہت کھلا۔ اس کا چیخنا چِلّانا اور رونا اسی کا ردِعمل تھا۔ وہ دکھی تھی کہ اسے کیوں نظرانداز کر رہے تھے لوگ! وہ بھی انسان تھی، لڑکی تھی۔ گوشت پوست کا دل رکھتی تھی جو دھڑک دھڑک کر زندگی کا احساس بھی دلاتا تھا۔ اس دل سے ٹھاٹھیں مار کر نکلتے لہو میں ارمان بھی موجزن تھے اور جذبات کا بہاؤ بھی۔ لوگ صرف صورت شکل پر ہی کیوں جا رہے تھے، یہ

سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہے تھے کہ اس کی جگہ ان کی اپنی بہن، بیٹی بھی ہوسکتی تھی۔ لوگوں کی خودغرضی اور بے رحمی اس کا دل توڑے ڈال رہی تھی۔ دل...... جو معبد ہے، خدا کا مسکن ہے۔

تمہید اور دیگر اہلِ خانہ کے جذبات و تفکرات سے بے نیاز تسنیم نے اپنی الگ دنیا تراش لی تھی۔ مدثر یونیورسٹی میں اس سے ایک سال جونیئر مگر عمر میں بڑا تھا۔ یونیورسٹی میں ہونے والے ایک کنسرٹ میں دونوں ایک دوسرے سے متعارف ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے چند ہی دنوں میں یہ تعارف معاشقے میں بدل گیا تھا۔ مدثر نے جب پہلی بار اس سے کہا۔ ''آئی لو یو۔'' تو وہ ٹکٹکی باندھے اس کا منہ دیکھے گئی۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو۔'' وہ بولا۔

''دیکھ رہی ہوں کہ اگر اس وقت تمہاری جگہ میرے سامنے یونیورسٹی کا کوئی اور لڑکا ہوتا تو میں کیا کرتی۔''

''کیا کرتیں؟''

تسنیم نے اپنا دایاں ہاتھ کھڑا کر کے تھپڑ مارنے والے انداز میں مذاقاً اس کے چہرے کی طرف بڑھایا۔

''نو...... نو...... نو پلیز......'' مدثر نے اچانک ہی اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں دبوچ لیا۔

تسنیم کا دل اچھل کر حلق میں آن اٹکا...... زندگی میں پہلی بار کسی غیر مرد نے یوں بے باکی سے اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا۔

دونوں کچھ دیر ٹکٹکی باندھے ایک دوسرے کو دیکھتے رہے پھر مدثر نے پوچھا۔ ''شادی کرو گی مجھ سے؟''

تسنیم کا دل جیسے بند ہی تو ہونے کو چلا۔

''بولو...... جواب دو......'' اس نے تقاضا کیا۔ وہ دم بخود تھی۔

وہ مسئلہ جو اس کے گھر کا سب سے بڑا مسئلہ تھا۔ جس نے تمہید کو چیختے چلّانے، رونے اور بھکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ جس نے اماں کی مجبور نگاہوں میں بے بسی کی طنابیں کھینچ رکھی تھیں جس کی وجہ سے ابا مضطرب رہا کرتے تھے وہ مسئلہ اس کی ذات کے حق میں اتنی آسانی سے حل ہونے کو ہوگا اس کے سان گمان میں بھی نہ تھا۔

مگر ابھی اس کی باری کہاں تھی۔ ابھی تو تمہید باجی تھیں اور ان کے بعد تقدیم باجی...... پھر کہیں اس کی باری آنی تھی سو اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ مدثر کے توانا ہاتھوں کی گرفت سے نکالتے ہوئے کہا۔ ''ابھی میری باری میں دیر ہے۔''

''کیا مطلب؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھ سے بڑی دو بہنیں موجود ہیں گھر میں۔'' وہ دل گرفتگی سے بولی۔

''سو وہاٹ یار!'' اس نے بڑی بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔ ''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ اب وہ زمانہ نہیں رہا اب تو جو لپک کر اٹھا لے جام اسی کا...... مجھ سے چھوٹا منعم، بدمعاش ایک لڑکی کو بھگا لایا۔ پولیس، تھانہ، کچہری سب کچھ ہوا۔ لڑکی نے عدالت میں بیان دے دیا کہ میں بالغ ہوں اپنی مرضی سے آئی ہوں۔ لڑکی والے سر جھکا کر لوٹ گئے۔ میں کنوارا پھر رہا ہوں اور وہ بدمعاش اپنی گود میں چھ ماہ کا بیٹا لیے پھرتا ہے۔'' وہ ایک لمحے کو رکا اور اپنی انگشتِ شہادت کھڑی کر کے جتانے والے انداز میں بولا۔ ''سو مائی لو! یاد رکھو جام اسی کا ہوتا ہے جو آگے بڑھ کر اٹھا لے۔ باری کے انتظار میں رہنے والے نقصان میں رہتے ہیں۔ یو گاٹ اٹ؟''

وہ اسے دیکھتی رہی۔

”بابا اس طرح مت دیکھا کرو، پگھلنے لگتا ہوں۔“

وہ ہنس دی۔

”قسم سے مسکراتے ہوئے تو تم مونالیزا لگتی ہو۔“

”بناؤ مت۔“

”خدا کی قسم۔“

”اب میں پگھلنے لگی ہوں۔“

”ہا...... ہا...... ہا۔“ وہ منہ اوپر کر کے ہنسا پھر یک بیک غیر معمولی سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے بولا۔ ”سومائی لو، باری کے انتظار میں رہنے کی حماقت مت کرنا ورنہ بوڑھی ہو جاؤ گی۔“ تسنیم الجھی الجھی، کھوئی کھوئی نظروں سے اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ غلط تو نہیں کہہ رہا تھا۔ بڑی خالہ کی بیٹی عمرانہ باجی اپنی باری کے انتظار میں اپنے سیاہ گھنیرے بالوں میں نقرئی دھاریاں پھیلا بیٹھی تھیں کہ نہیں۔ اس کے اپنے گھر میں تمہید باجی بھی پہلے نمبر پر کھڑی اپنی باری کا انتظار ہی تو کر رہی تھیں اور المیہ یہ تھا کہ پہلے نمبر پر ہونے کے باوجود ان کی باری نہیں آ پا رہی تھی۔

مدثر نے اس کے قلب میں باری کا انتظار نہ کرنے اور بڑھ کر جام اٹھا لینے کا صور کیا پھونکا اس کے تو جیسے قدم ہی زمین پر نہ رہے گالے کی طرح فضاؤں میں پرواز کرنے لگی۔ یہ خیال ذہن میں پنجے گاڑ کر بیٹھ گیا کہ اپنی باری کے انتظار میں بوڑھا ہو جانے کی حماقت ہرگز نہیں کرنی لپک کر جام اٹھا لینا ہے۔

مدثر کھاتے پیتے گھرانے کا نوجوان تھا۔ اس کا باپ ایک تھری اسٹار ہوٹل کا مالک تھا جہاں الٹے سیدھے سب دھندے ہوتے۔ پولیس والوں اور دن کی روشنیوں میں معزز دکھائی دینے والوں سے مراسم تھے کہ مراسم کے بنا الٹے سیدھے دھندے کب چلتے ہیں۔ باپ کے انہی مراسم کے طفیل چھوٹے بیٹے کو جو غیر گھرانے کی لڑکی بھگا لایا تھا تھانے کچہری میں غیر معمولی آؤ بھگت ملی تھی۔ لڑکی والے با اثر نہ ہوتے تو شاید اسے تھانے کچہری جانا بھی نہ پڑتا۔ مدثر کے دو چھوٹے بھائی تھے اور ایک بڑی بہن جو شادی کے بعد اسکاٹ لینڈ میں مقیم تھی۔

”شادی کے بعد ہم دونوں ہنی مون کے لیے اسکاٹ لینڈ جائیں گے۔“ مدثر نے ایک دن کہا۔ ”تم گئی ہو کبھی اسکاٹ لینڈ؟“ اس نے پوچھا۔

وہ احساسِ کمتری میں ڈوبنے لگی۔ وہ اسکاٹ لینڈ دیکھنے کی بات کر رہا تھا اس نے تو کبھی کراچی کے علاوہ اپنے وطن کے کسی دوسرے شہر میں بھی قدم نہیں رکھا تھا۔ سو اس نے خاصی شرمندگی سے نفی میں سر ہلایا۔

”اوہ! اٹس بیوٹی فل...... میں دو مرتبہ گیا ہوں۔ تیسری بار جانے کی خواہش ہے اور وہ بھی تمہارے ساتھ مائی لو۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔

وہ مدہوش سی ہونے لگی۔ عجب نشہ تھا۔ اس کی قربت میں وہ یونہی خمار آلود ہو جایا کرتی تھی، کہاں کی یونیورسٹی اور کیسی پڑھائی۔ وہ تو مکتبِ عشق میں محبت کی نفسیات پڑھ رہی تھی۔

محبت! جو انسان کی مت گت سب چھین کر اسے سودائی بنا دیتی ہے، کہیں کا نہیں رہنے دیتی۔ اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، تسنیم کو ان دنوں ایک ہی نشہ تھا۔ وہ مدثر کے ساتھ یونیورسٹی میں بے محابا گھومتی پھرتی۔ یونیورسٹی سے باہر بھی دونوں اکثر اکٹھے گھومتے دیکھے جانے لگے تھے۔ مدثر تو خیر مرد ذات تھا وہ لڑکی ذات ہوتے ہوئے بھی بے مہار ہوئی جا رہی تھی۔ یونیورسٹی سے باہر مدثر کے ساتھ گھومتے پھرتے ہوئے اسے نہ یہ خوف ہوتا کہ کوئی جاننے والا دیکھ لے گا، نہ خاندان کی ذلت و رسوائی کی فکر...... مدثر کی آلٹو میں وہ اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر بڑے ٹھسے سے بیٹھتی۔ وہ اسے گھماتا، پھراتا کھلاتا، پلاتا اور کبھی کوئی تحفہ بھی دے دیتا۔ گھر آنے کے بعد ان دونوں کا موبائل فون کے ذریعے مسلسل رابطہ رہتا۔ رات گئے تک ان کے درمیان میسجنگ ہوتی، راز و نیاز ہوتے۔ سہیلیوں سے ان کے معاشقوں کے چٹخارے لینے کی خاطر اس نے تعظیم اور تقدیس کو لڑ جھگڑ کر کمرے سے نکالا تھا۔ اب خود عشق کر رہی تھی۔ کمرے میں تعظیم اور تقدیس کی موجودگی میں وہ رات، رات بھر مدثر سے فون پر باتیں کر سکتی تھی بھلا۔ عشق کا نشہ سر چڑھ کر بول رہا تھا اس کے بھی اور مدثر کے بھی۔ مدثر کی باتیں تو پاگل کر دینے والی ہوتیں۔ جب وہ اسے پیار سے ”مائی لو“ کہتا تو وہ فضاؤں میں اڑنے لگتی۔ اسے چھوٹے موٹے تحائف دینے کی خاطر اب وہ یونیورسٹی میں اضافی خرچوں کے بہانے ابا یا تقدیم سے گاہے بہ گاہے پیسے اینٹھنے لگی تھی۔ اب نہ اس کا پڑھائی میں دل لگتا تھا نہ دوستوں کی محفلوں میں۔ اس کا تو ان دنوں بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوئے والا حال تھا۔ دن رات اسے بس مدثر ہی کا خیال رہتا۔ موبائل فون کمپنی کی جانب سے دی جانے والی گھنٹا پیکج سہولت نے اس سے تادیر رابطے میں خاطر خواہ آسانی پیدا کر دی تھی۔ مدثر کے عشق میں وہ پور پور ڈوب چکی تھی۔ اب تو اسے پہلے کی طرح بات بے بات چھوٹی بڑی بہنوں سے لڑنے جھگڑنے کا خیال بھی کم ہی آتا۔ ابا، تمہید، تعظیم اور تقدیس اس کی اس کایا پلٹ پر حیران بھی تھے مطمئن بھی۔ مطمئن اس لیے کہ گھر میں جھگڑے کم ہو گئے تھے۔

اماں کہتیں...... ”یہ سب میری دن رات کی دعاؤں کا اثر ہے۔“

ایک تقدیم تھی جسے تسنیم کی اس کایا پلٹ نے فکر مند کر رکھا تھا۔ ”کہیں نہ کہیں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔“ اس کا دل چغلی کھاتا اور وہ اس لیے کہ ایک تعلیم یافتہ، ملازمت پیشہ اور باشعور لڑکی ہونے کے ناتے وہ زندگی کو زیادہ باریک بینی سے دیکھنے اور سمجھنے کا وصف رکھتی تھی۔

☆☆☆

سپر ہائی وے پر واقع چھوٹے چھوٹے فلیٹوں پر مشتمل ایک رہائشی اسکیم میں ہائی وے کے رخ پر کھڑی بلند و بالا عمارات میں سے ایک کی تیسری منزل پر واقع اپنے فلیٹ کی بالکونی میں کھڑا اعباد الرحمٰن بالکونی میں سر تا سر لگے آہنی جنگلے سے باہر نیچے ہائی وے پر رواں دواں زندگی کو دیکھ رہا تھا۔ یہاں سے وہاں تک جدھر نظر اٹھتی تھی گھما گھمی تھی۔ آگے پیچھے لپکتی، دوڑتی، ہارن بجاتی بھانت بھانت کی موٹر کاروں کا ازدحام اور ان موٹر گاڑیوں کے درمیان سے شوخ ادا، البیلی ناروں کی طرح لہراتی، بل کھاتی موٹر سائیکلوں کا سلسلہ، سڑک کنارے مکانات اور دکانات کے سلسلے، شادی ہالوں کی سرِ شام ہی جگمگا اٹھنے والی روشنیاں، پیدل چلنے اور سڑک پار کرنے کے انتظار میں سڑک کنارے کھڑے افراد کا ہجوم، فوڈ پوائنٹس پر کھانے پینے کے شوقین افراد کا ازدحام اور فضاؤں میں حلول

شدہ اشتہا انگیز مہکاروں کے قافلے...... لگتا تھا کسی کو تھمنے کی فرصت تھی نہ دوسرے کی طرف دیکھنے کی۔ ہر منظر، ہر موٹر کار، ہر فرد بس اپنی رواروی میں گزرے چلا جا رہا تھا۔ اور وہ اپنے فلیٹ کی بالکونی میں آہنی جنگلے سے اپنا ماتھا ٹیکے محوِ تماشا تھا۔ دفتر سے گھر واپس لوٹنے کے بعد وہ عموماً اسی طرح شام گزارتا تھا۔ بالکونی میں پلاسٹک کی دو کرسیاں اور ایک میز پڑی تھی۔ جب جی چاہتا وہ کرسی پر بیٹھ جاتا۔ کبھی کبھی امی بھی دوسری کرسی پر اس کے ساتھ آ بیٹھتیں اور اس سے باتیں کرنے لگتیں۔ کبھی حال کی، کبھی ماضی کی اور کبھی مستقبل کی۔ امی اور وہ ایک دوسرے کے دکھ سکھ کے ساتھی، ہمدرد، غمگسار اور رازدان تھے۔ جو بات امی کسی اور سے نہ کہہ سکتیں اس سے کہہ دیتیں اور جو بات وہ کسی اور سے نہ کر سکتا امی سے اپنے ہمزاد کی طرح شیئر کر لیتا۔

تقریباً پانچ سال کا رہا ہوگا وہ جب ابو اس کی اور امی کی زندگی سے اچانک ہی نکل گئے تھے۔ ابو مصنوعی زیورات کی ایک دکان پر بطور سیلز مین ملازم تھے۔ اپنی موٹر سائیکل پر ایک روز دکان سے گھر واپس آ رہے تھے کہ ایک بڑی گاڑی نے ان کی موٹر سائیکل کو ان سمیت اپنے بھاری پہیوں تلے روند ڈالا۔ ابو موقع پر ہی دم توڑ گئے۔ ابو سے امی کی شادی کو ساتواں برس لگے دو ہی ماہ گزرے تھے۔ ابو کی موت کے بعد تایا جی نے امی کو بڑی چالاکی سے آبائی گھر سے بے دخل کر کے ان کے میکے بھجوا دیا۔ امی کے میکے میں ایک خالہ تھیں، محبت کی شادی کر کے ایک امیر گھرانے کی بہو بنی ہوئی۔ دو ماموں تھے جن کی بیویاں ایک سے بڑھ کر ایک چھٹی ہوئی بدتمیز اور خودغرض عورتیں تھیں۔ ماں باپ امی کی شادی کے دو سال بعد آگے پیچھے صرف پندرہ دن کے وقفے سے انتقال کر چکے تھے۔ ابو کے فوت ہونے کے بعد امی اپنے بھائیوں کے گھر آئیں تو انہیں اپنے قریبی رشتوں کی خودغرضی اور بے رحمی کا سامنا کرنا پڑا۔ کبھی ایک بھائی کے گھر تو کبھی دوسرے بھائی کے گھر۔ بھولے بھٹکے کبھی بہن کے ہاں چلی جاتیں تو ان کا رویّہ چغلی کھاتا کہ اپنی امیر سسرال میں ایک بے نوا بہن کا اپنے یتیم بچّے کے ساتھ آنا انہیں ناگوار گزرتا ہے۔ ایک روز انہوں نے کہہ ہی دیا۔

”مہرالنساء تم یہاں نہ آیا کرو، مجھے شرمندگی ہوتی ہے کیونکہ میرے سسرال والے سمجھتے ہیں میں تمہیں بھرتی ہوں۔ دیکھو مجھ سے جو بھی ہو سکے گا میں تمہیں خاموشی سے خود ہی دینے آ جایا کروں گی۔“

بہن کی اس بات کے بعد امی پھر کبھی ان کے گھر نہیں گئیں۔ بھائیوں کے ہاں امی دن بھر نوکروں کی طرح گھر والوں کی خدمت گزاری میں لگی رہتیں۔ رات کو بستر پر لیٹتیں تو انگ انگ دکھ رہا ہوتا۔ دن بھر کولھو کے بیل کی طرح جتے دیکھ کر غیروں کو امی پر رحم آ جاتا اور وہ بڑی دلسوزی سے امی کو کسی شریف آدمی سے نکاح ثانی یا بچّے کے ساتھ اپنا کوئی علیحدہ ٹھکانا بنا کر محنت مزدوری کرنے اور خودمختار زندگی گزارنے کا مشورہ دیتے مگر امی کے لیے دونوں مشورے ناقابلِ قبول تھے۔ نکاح ثانی کا ان کے لیے تصور بھی محال تھا۔ اپنے بچّے کو وہ سوتیلے باپ کے رحم و کرم پر نہیں پالنا چاہتی تھیں۔ مقدر کی بات کوئی برا آدمی مل گیا تو؟ زندگی عذاب بن جاتی خود ان کی بھی اور یتیم بچّے کی بھی۔ رہی علیحدہ ٹھکانا بنا کر خودمختار زندگی گزارنے کی بات تو یہ بھی اتنا آسان نہ تھا۔ جوان عورت کے سر پر کسی مرد کی چھایا نہ ہو تو لوگوں کے دلوں میں شیطان اترتے اور زبانوں کو باتیں بناتے کتنی دیر لگتی ہے۔ سو بیٹے کے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے تک امی بھائیوں کے رحم و کرم پر ہی رہیں۔ بھائیوں اور ان کے اہلِ خانہ کی خدمت گزاری کے ساتھ وہ اپنے یتیم بچّے کے تعلیمی اخراجات پورے کرنے

کے لیے اجرت پر سلائی بھی کرتی تھیں۔ دو سال پہلے بیٹے نے سول انجینئرنگ میں ڈگری لینے کے بعد ایک تعمیراتی فرم سے وابستگی اختیار کر لی تھی۔ ملازمت کے تین چار ماہ بعد اس نے ایک چھوٹا سا فلیٹ کرائے پر لے لیا تھا اور اب دونوں ماں بیٹا سب سے الگ تھلگ پُرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ امی نے کفایت شعاری سے کام لے کر گھرداری کا وہ تمام اسباب فراہم کر لیا تھا جو اُن دونوں کی ضروریات پوری کر سکتا۔ محلے میں ایک کمیٹی ڈال کر تیسری کمیٹی لینے کے بعد امی نے ایک چھوٹا ریفریجریٹر بھی خرید لیا تھا۔ امی کو ان کے ماضی کی افتاد نے وقت سے پہلے بوڑھی اور ناتواں کر دیا تھا۔ بیٹے کو اپنے ماضی کی ایک ایک محرومی اور ہر دکھ یاد تھا لیکن ان دونوں سے خون کے رشتوں میں جڑے لوگ بھول گئے تھے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ شاید ان کے حافظے کمزور تھے یا پھر وہ سب چڑھتے سورج کے پجاری ہونے کا ثبوت دے رہے تھے۔ اب تو ابو کے وہ رشتے دار بھی جنہوں نے کبھی پلٹ کر ایک محزون حال بیوہ اور اس کے یتیم بچّے کی خیر خبر نہ لی تھی بڑھ بڑھ کر ان دونوں سے ملنے اور اپنی رشتے داری جتانے لگے تھے۔

ماں بیٹا شام کو اکثر اپنے فلیٹ کی بالکونی میں بیٹھ جاتے اور باتیں کرنے لگتے۔ ماں، بیٹے کی اور بیٹا، ماں کا دوست تھا۔ ماضی اور حال میں رشتے داروں کے رویّے کے بارے میں دونوں کے اختلافِ نظر کے باوجود دونوں کی دوستی اٹوٹ تھی۔ ماں رشتے داروں کو معاف کر چکی تھی اور بیٹے سے بھی درگزر کی طالب تھی مگر بیٹا اگرچہ دشمنی نہ باندھنا چاہتا تھا مگر معاف کر دینے کے حق میں بھی نہ تھا۔ اس کا اپنا فلسفۂ زندگی تھا۔

دونوں ہاتھوں میں پلاسٹک کی ایک چھوٹی سی ٹرے پکڑے جس میں چائے کے دو مگ دھرے تھے امی بالکونی میں آ کھڑی ہوئیں۔ وہ باہر کے نظاروں میں اتنا گم تھا کہ اس نے آہٹ پر پلٹنے کی زحمت ہی نہیں کی۔ پلاسٹک کی میز پر چائے کی ٹرے رکھ کر امی اس کے نزدیک آ کھڑی ہوئیں اور پیار سے بولیں۔ ”کیا دیکھ رہا ہے میرا عباد بچہ؟“

اس نے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھا۔ ایک گہری سانس کھینچی اور دوبارہ بالکونی سے سڑک کے رخ رنگ برنگی گاڑیوں کے ازدحام میں اپنی نظریں الجھاتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ رہا ہوں کہ ان گاڑیوں میں سے کس گاڑی پر میرا نام لکھا ہے۔“

”میں جانتی ہوں میرے بچّے کو اب گاڑی کی ضرورت ہے۔“ امی نے اس کے شانے پر ہاتھ دھرتے ہوئے کہا پھر انتہائی محبت سے معمور لہجے میں یقین سے بولیں۔ ”فکر مت کرو جس اللہ نے اب تک ہماری ساری ضرورتیں پوری کی ہیں وہی تمہیں گاڑی بھی دے گا۔“

عباد دھیرے سے مسکرا دیا اور امی کے رُوبرو دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔ ”اللہ پر توکل اچھی بات ہے امی مگر کوشش کیے بغیر تو انسان کو کبھی کچھ نہیں ملتا۔“

”ہاں یہ تو ٹھیک کہتے ہو تم۔“ امی نے تائید کی

چائے کا مگ اٹھا کر ہونٹوں سے لگاتے ہوئے عباد کی نظریں بالکونی کے اس پار تیزی سے رواں دواں زندگی میں پھر نئے منظر دیکھنے لگیں۔

(باقی آئندہ)

مہرباں کیسے کیسے

ثمینہ عظمت علی

''باجی! اے باجی......''

''اُف!'' ہم درد سے بلبلا اٹھے کیونکہ یہ آواز سر پر یوں آن لگی گویا کسی نے دو ہتھوڑے زور سے سر پر دے مارے ہوں۔ دو اس لیے کہ ان معزز خاتون جن کو سب قمر النسا بلاتے ہیں اور نہیں معلوم کہ کیوں بلاتے ہیں کیونکہ ان کو بلانا شامت، مصیبت اور بیل کو بلانے کے مترادف ہے۔ ان کی آواز کیمیائی، طبیعاتی، قدرتی طور پر ہتھوڑے کی آواز سے بے حد مشابہ تھی اور دوسرا ہتھوڑا لفظ ''باجی'' تھا جو ہر عمر کی شریف خاتون کو ہتھوڑے کی طرح ہی لگتا ہے لیکن کیونکہ شادی کرنے کا گناہِ عظیم ہم ان قمر النسا سے پہلے سرزد کر چکے تھے سو اس ہتھوڑے سے ہمارا سر تو زد میں آنا ہی تھا۔

''جی فرمائیں قمر النسا؟'' ہم نے دل پر اس طرح جبر کیا جس طرح سیاسی مہمان کرنٹ افیرز کے میز بانوں کے آگے کرتے ہیں۔ ان کے جثے کو دیکھ کر پہلا خیال تو یہ آتا تھا ہمیشہ کہ ان کا نام قمر النسا کے بجائے کمر النسا ہونا چاہیے تھا۔

''باجی اس دن جو آپ نے ہماری دعوت پر مرغی کا ایک لال سالن بنایا تھا اس کی ترکیب بتادیں مجھے۔''

''مرغی کا لال سالن؟'' ہم سوچ میں پڑ گئے، قمر النسا نے تو یوں کہہ دیا گویا ہم نے سالن میں جام شیریں ملایا ہو اور دوسرے یہ کہ عموماً مرغی کے سالن لال یا اس سے ملتے جلتے ہی ہوتے ہیں۔

''وہ نہیں جس میں مرغی کے چکور ٹکڑے تھے، وہ کیا تھا...... چکن جل...... پری نہیں...... دل پذیر...... کیا تھا؟'' وہ سر پر ہاتھ مارتے ہوئے بولیں اور ہمارا دل چاہ رہا تھا کہ اپنا سر دیوار پر دے ماریں کیونکہ ان کا سر دیوار پر مارنے سے دیوار کو شدید نقصان پہنچنے کا احتمال تھا، دیوار احتجاجاً وہیں دھرنا دے دیتی تو ہمارا کیا ہوتا۔

''چکن جلفریزی......'' ہم نے جلدی سے کہا کیونکہ ہمارا سارا دھیان واشنگ مشین میں دھلتے کپڑوں، کچن میں رکھے ان دھلے برتنوں اور ٹی وی پر جلوہ افروز ندایا سر میں اٹکا ہوا تھا اور اس پر قمر النسا......

''جی، جی باجی...... وہی...... وہ اس دن یہاں سے جا کر بھائی جی اور بھابی جی اور سب لوگ بڑی تعریف کر رہے تھے...... (اور ہم جی ہی جی میں قمر النسا کے ایک جملے میں ''جی'' گن رہے تھے) تو میں نے سوچا کہ آج وہی بنادوں جی۔ ویسے تو جی مجھے بڑی ککنگ آتی ہے اور سب کو پسند ہے لیکن جی دیکھیں نا جی...... کسی کے ہاتھ کا کچھ پسند آجائے تو جی میں نہیں رکھنا چاہیے، کہہ دینا چاہیے جی۔ اس سے کوئی چھوٹا بڑا نہیں ہوجاتا جی...... کیوں باجی؟''

''جی قمر النسا آپا جی، چھوٹا بڑا تو شادی ہونے نہ ہونے سے ہوتا ہے'' ہم نے پھر جی ہی جی میں اس کو کوسا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے میاں ''جی'' کو کہ نئے پڑوسی بھائی ''جی'' نہ صرف ان کے آفس میں ٹرانسفر ہو کر آئے بلکہ گھر بھی ہمارے گھر کے برابر ملا اور میاں ''جی'' کے ''جی'' میں آیا کہ ان کی دعوت کرنی چاہیے۔ ہماری شادی کو بھی تھوڑا ہی وقت ہوا تھا سو ہم بھی ''جی'' ہی ''جی'' میں میاں ''جی'' کے ''جی'' میں اترنے کی کوشش براستہ معدہ کر رہے تھے تو اس دن زیادہ ہی شو آف کا مظاہرہ کرتے ہوئے کچھ زیادہ ہی اہتمام کرلیا۔

''باجی...... کس سوچ میں ہیں؟'' دو ہتھوڑوں نے ہمارا دھیان پھر ان کی طرف لوٹا دیا۔

''قمر النسا وہ تو بڑی آسان ہے یوں کریں کہ پہلے......''

''نہیں ایسے مجھے سمجھ نہیں آئے گا، آپ میرے گھر چل کر بتا دیجیے، میں ساتھ ساتھ پکالوں گی جی!''

''جی اچھا۔'' ہم نے جی ہی جی میں پھر اسے کوسا۔ ''ذرا سا کام نمٹا لیں تو......''

''کوئی بات نہیں۔'' وہ آرام سے صوفے پر بیٹھ گئیں اور ریموٹ اٹھا کر بولیں...... ''میں انتظار کرلیتی ہوں۔'' اور مزے سے چینل بدل کر کوئی



پرانی انڈین فلاپ فلم دیکھنے لگیں۔

ہم نے جیسے تیسے تھوڑا بہت کام نمٹایا اور قمرالنسا کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ مجبوری تھی ایک تو طبیعتاً ہم مروتی تھے اور دوسرے میاں کی ہدایت تھی کہ ان سے ہر طرح سے اچھے تعلقات رکھے جائیں کیونکہ ان کے بھائی کا عہدہ ہمارے میاں کے عہدے سے بڑا تھا۔

"بون لیس چکن میں بنے گا۔" ہم نے ان کے کچن میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"بون لیس......؟" وہ ہمیں سوالیہ نظروں سے دیکھنے لگیں پھر اس سے قبل کہ ہم کوئی جواب دیتے، وہ ہماری آستین تھامتے ہوئے بولیں۔

"جی...... لیس آپ نے بڑی اچھی لگائی ہوئی ہے، کدھر سے لی ہے؟" اس وقت ہم سوچ میں پڑ گئے کہ ان کو لیس کی دکان کا ایڈریس سمجھا دیں یا چکن جلفریزی کی ترکیب...... یہی سمجھ آیا کہ جو سر پر پڑی آفت ہے اس کو پہلے نمٹا لیں۔

"ہمارا مطلب ہے کہ بغیر ہڈی والی مرغی......"

"ایں! بغیر ہڈی والی مرغی بھی ہوتی ہے؟"

"مرغی کا گوشت......" ہم نے کہا۔

"اچھا...... اچھا......" انہوں نے فریج سے مرغی کے گوشت کا پیالہ نکالا اور اس کا جائزہ لیتے ہوئے بولیں۔

"یہ تو ہڈیوں والا ہے، کیا فرق پڑتا ہے، مرغی تو مرغی ہے گوشت کے بغیر ہڈی اور ہڈی کے بغیر گوشت کھانے کا کیا فائدہ...... اور ترکیب سیکھ لوں اگلی بار بغیر ہڈی والا۔" ہم نے اس ہڈیوں سے بھرپور گوشت پر نظر ڈالی اور سوچا۔ "جیسے آپ کی مرضی ہمیں کیا۔"

"شروع کریں باجی......"

"ضرور......"

"اور ٹماٹر...... اس میں بلینڈ کر کے ڈالیں گے یا بوائل کر کے چھل لیں...... اچھا پیسٹ بنے گا۔" ہم نے بتایا...... "ویسے بھی آج کل ٹماٹر بہت سخت آرہے ہیں۔"

"باجی ہمارا تو بلینڈر خراب ہے اور اب اتنا لمبا طریقہ...... یونہی کاٹ کر ڈال دیتی ہوں گل ہی جانے ہیں۔" انہوں نے ٹماٹروں کے بڑے بڑے ٹکڑے کاٹتے ہوئے کہا۔

"اور کیچپ...... اور......"

"جی...... کیچپ......؟" وہ یوں حیران پریشان ہو گئیں جیسے ہم نے انہیں "ہینڈز اپ" کہہ دیا ہو۔

"ہاں...... اس سے بڑا اچھا ٹیسٹ آتا ہے۔" ہم نے بتایا۔ "بعض ریسٹورنٹس میں تو جلفریزی مکمل کیچپ میں بناتے ہیں۔"

"رہنے دیں...... وہ تو پتا نہیں کیا الٹا سیدھا کھلاتے ہیں۔ لو جی اب سالن میں کیچپ کا کیا کام ہے" انہوں نے خود ہی فیصلہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں ٹماٹر زیادہ کاٹ لیتی ہوں......" انہوں نے مزید ٹماٹر قتل کرنا شروع کر دیے۔ ہم خاموشی سے ان کی ترامیم برداشت کیے جا رہے تھے۔

"اور بتائیں باجی......؟"

"شملہ مرچ......" ہم نے کہا۔

"وہ پہاڑی مرچ، نہیں وہ تو بھائی جی کو سوٹ نہیں کرتیں۔ اس دن آپ نے دیکھا نہیں......" ہمیں گھورتے ہوئے بولیں...... "انہوں نے ساری مرچیں نکال نکال کر الگ کر دی تھیں"۔ انہوں نے اس استحقاق سے پوچھا گویا ہم اس کھانے کے دوران بھائی جی کو پنکھا جھلتے ہوئے ان کے نوالے گن رہے تھے۔

"لیکن آپ نے تو کہا تھا کہ بھائی جی کو بہت پسند آیا تھا؟" ہم نے پوچھا۔

"ہاں جی پسند تو بہت آیا تھا بس شملہ مرچ ہی انہیں پسند نہیں...... اس سے کیا فرق پڑتا ہے جو چیز پسند نہ ہو بندہ نکال کر پھینک دے۔" انہوں نے اتنے آرام سے کہا کہ ہمارا دل چاہا کہ ان کو کچن کی کھڑکی سے باہر پھینک دیں لیکن قمرالنسا تو کمرالنسا تھیں، مرچ نہیں تھیں۔

"چلیں، میں یہ والی ہری مرچیں زیادہ ڈال لیتی ہوں۔ خوب تیکھا بنے گا۔" انہوں نے مرچوں کا ڈھیر اٹھاتے ہوئے کہا۔

اب آخر میں پیاز کی باری تھی لیکن ہمارے اندر کا کک مزید ترامیم برداشت کرنے کی حالت میں نہیں تھا۔ ہماری قومی اسمبلی میں اتنی ترامیم نہیں ہوتی ہوں گی جتنی محترمہ قمرالنسا نے اس ڈش پر کی تھیں...... اس لیے ہمیں اس کا انجام اپنے آئین سے بھی برا نظر آرہا تھا۔

"بس بن گیا......" ہم نے فوراً کہا۔ قمرالنسا نے آخر میں اس کے اوپر گرم مسالا پاؤڈر، ہری مرچ، دھنیا، پودینہ یوں لٹایا جیسے حکومت قومی خزانہ لٹا رہی ہو۔

چکن جلفریزی کے نام پر یہ چکن کڑھائی گھر والوں نے بڑے شوق سے کھائی۔ قمرالنسا نے رات کو بطورِ خاص اطلاع پہنچائی۔

☆☆☆

ابھی اس سانحے کو گزرے زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ قمرالنسا نے چائنیز ویجی ٹیبل رائس کی کلاس لینے کا فیصلہ کیا۔ جس سے ہمیں پاک چائنا بے مثال دوستی شدید خطرے میں نظر آنے لگی۔ اس سے بہتر تھا وہ کوئی امریکن ڈش سیکھ کر اپنی بھڑاس نکالتیں لیکن وہ

بضد رہیں اور ساتھ ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتی رہیں کہ ویسے تو وہ چائنیز بنانے کی ماہر ہیں بس ایسے ہی جاننا چاہ رہی ہیں کہ ہماری ترکیب کیا ہے۔

"ویسے تو جی...... بھائی جی کہتے ہیں چائنا کا سارا مال دو نمبر ہوتا ہے لیکن جی چائنیز کھانے کا تو بڑا فیشن ہے۔"

دل تو بڑا چاہا کہ قمرالنسا کو فیشن کے اتار چڑھاؤ پر ایک لیکچر دیں لیکن پھر ارادہ ملتوی کردیا۔ کھانوں کی نئی رینج کے بجائے بہتر تھا انہیں یہ ترکیب ہی بتادی جاتی لیکن اس وقت ہم بالکل بوکھلا کر رہ گئے جب قمرالنسا نے چاولوں کو ایک کنی ابالنے اور سبزیوں کو Stirfry فرائی کرنے سے قطعی انکار کردیا۔

"یوں تو سارے چاول کچے رہ جائیں گے......" انہوں نے پرزور احتجاج کیا۔

"چائنیز Cuisne کی یہ انفرادیت ہوتی ہے کہ اس میں ہلکا سا کچا پن ہوتا ہے، کھڑا کھڑا کھائیں تو ہلکی سی کچ کچ کی آواز آئے۔" ہم نے وضاحت کی۔

"چائنیز کزن؟ آپ کا کوئی کزن چائنیز ہے باجی! وہ باورچی ہے کیا؟" قمرالنسا نے آنکھیں پھیلانے کی حتی المقدور کوشش کی۔ ہم نے ان کی چنی آنکھیں دیکھ کر سوچا کہ اصل میں چائنیز کزن تو ان کے ہونے چاہئیں۔

"میرا مطلب چائنیز کھانے سے ہے۔"

"باجی...... تو کوئی ضروری تھوڑی ہے کہ ہم پوری کی پوری ان کی نقل کریں، زبیدہ آپا کہتی ہیں کہ ہر کھانے میں اپنی طرف سے تھوڑی تبدیلی ضرور کرنی چاہیے۔" ہم نے بڑی دکھی نظروں سے اس "تھوڑی تبدیلی" کی طرف دیکھا جس کی وجہ سے ساری سبزیوں کا بھرتہ بن چکا تھا اور چاول تقریباً حلیم...... قمرالنسا نے تبدیلیوں کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ایک کپ فل کیچپ کا بھرا اور چاولوں اور سبزیوں کے ملغوبے میں ملانے لگیں۔

"ارے...... ارے یہ کیا کر رہی ہیں......؟" ہم نے ٹوکا۔

"باجی میں تو ہمیشہ چائنیز رائس بناتی ہوں تو میں تو ہمیشہ کیچپ ڈالتی ہوں۔"

"لیکن ہم اس میں چلی ساس ڈال چکے ہیں۔" ہم نے کہا۔

"لیں جی...... چلی ساس تو چلی ساس ہوتا ہے اور کیچپ، کیچپ ہوتا ہے۔" انہوں نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا اور سارا کیچپ چاولوں میں انڈیل دیا۔ "چائنیز بھات" تیار تھا۔

"دیکھیں باجی...... میں نے اس کے ساتھ کھانے کے لیے پالک گوشت بھی بنایا ہوا ہے۔" انہوں نے فخر سے کہا۔

"پالک گوشت، چائنیز رائس (بھات) کے ساتھ؟" ہم نے حیرت سے کہا۔

"تو اور کیا، ایسے کیا اس پھیکے کھانے کا سواد آنا تھا۔" چائنیز رائس اور پالک گوشت کا کامبی نیشن ایسا تھا جیسے Peng liyvan اور فردوس عاشق اعوان ساتھ بیٹھی ہوں لیکن یہ چائنیز فرائیڈ رائس کب تھے، یہ تو چائنیز "بھات" تھا۔

☆☆☆

غالب کی طرح ہمیں بھی ساری بلائیں تمام ہونے کا گمان نہ تھا لیکن غالب تو صرف ایک مرگ کو ہی باقی سمجھتے تھے لیکن ہماری قسمت میں کچھ اور ناگہانیاں بھی تھیں۔ جن میں سے ایک ہمارے سر پر بم کی طرح اس وقت پھٹی جب قمرالنسا نے ہمارے

کانوں میں یہ بریکنگ نیوز سنائی کہ آج وہ ہم سے مچھلی کے کوفتے بنانا سیکھیں گی۔ اب تو ہمیں یہ شک ہونے لگا تھا کہ شاید قمرالنسا خفیہ طور پر کوئی اعلیٰ ماہرِ نفسیات ہیں جو خصوصی طریقے سے ہمیں نہ جتاتے ہوئے اور خود کو کم علم ظاہر کرتے ہوئے دراصل ہماری ہی تربیت کررہی ہیں اور ہمارے کھانے کے نقائص نہایت استادانہ انداز میں دور کررہی ہیں۔

اس بار بڑی رقیق القلبی سے ان کو ترکیب بتائی لیکن ہمارے سارے گمان اڑنچھو ہوگئے اور رقیق القلبی دھری کی دھری رہ گئی جب وہ "رقیق" شوربہ بنانے پر مصر ہوگئیں۔

"لیکن اس کا پتلا شوربہ نہیں بنتا، پیاز اور دہی سے بس گاڑھی گریوی بنتی ہے۔" ہم نے صدائے احتجاج بلند کرنا چاہی لیکن قمرالنسا کے ہتھوڑوں کے آگے ہماری کیا چلنی تھی۔

"لو جی...... اتنا سوکھا سالن، بھائی جی، بھابی جی بچے، ارشد، فریحہ (قمرالنسا کے چھوٹے بہن بھائی) اتنے بندے ہیں پورا کیسے ہوگا۔" انہوں نے خوب پیاز اور ٹماٹر اور ڈھیر سارا پانی ڈال کر دیگچے میں طغیانی کا بخوبی بندوبست کیا۔ ہم نے شوربے کے بے کراں سمندر میں کسی آبجو کے مانند تیرتے کوفتے دیکھے تو بے اختیار مسکراہٹ روک نہ سکے۔

"اگر کھانوں کی دنیا میں نیوز چینل ہوتے تو آج کی "بریکنگ نیوز" ہوتی۔ قمرالنسا کے گھر کے ایک دیگچے میں کئی کوفتے زیرِ آب آگئے۔"

☆☆☆

چکن کڑھائی المعروف چکن جلفریزی، چائنیز بھات اور سیلابی کوفتوں کی شاندار کامیابی کے بعد قمرالنسا کا پروگرام کون سا شاہکار پیش کرنے کا تھا ہم دو دن سے سوچ سوچ کر پریشان تھے کیونکہ وہ تمام ڈشز جو ہم نے ان کی دعوت میں بنائی تھیں ان میں سے چند ابھی باقی تھیں اور ہم پریشان تھے کہ ہمارے کھانوں میں مزید کیا ترامیم ہونی باقی تھیں۔

"وہائٹ ہانڈی" کو یقیناً انہوں نے نیلا پیلا ضرور کرنا تھا۔ سوپ میں وہ شاید کارن فلور کو کلف پاؤڈر کہہ کر ڈالنے سے انکار ہی کریں گی اور "رشین سلاد" نے ان کے ہاتھوں اور ذہن کی لیبارٹری سے گزر کر ایرانی، افغانی، جاپانی غرض کہ رشین کے علاوہ سب کچھ ہوجانا تھا لیکن اس بار قمرالنسا نے جو دھماکا کیا شاید اس کی آواز دہلی تک گئی ہو اور سارا انڈیا لرز کر رہ گیا ہو۔ یہ کوئی ترمیم نہیں تھی بلکہ یوں تھا جیسے صدر صاحب اچانک اسمبلی توڑنے کا اعلان کردیں۔

"باجی میں نے اپنے کھانوں کی ترکیبوں کی کتاب چھپوانے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ اللہ باجی میں نے خود بک اسٹال پر دیکھا ہر نیلما، فیروزہ، راشدہ کک بنی ہوئی ہے تو میں کیوں نہ اپنا ٹیلنٹ دکھاؤں اور آپ تو میری ویسے ہی مدد کرتی ہیں۔ معاون کے طور پر آپ کا نام شائع کرواؤں گی سچی۔" وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھیں...اور ہم معاون کے طور پر "قمرالنسا کا دسترخوان" کا "ترمیم شدہ" ایڈیشن چشمِ تصور سے اسٹالوں پر لٹکا ہوا دیکھ رہے تھے۔

صدقہ

حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسولؐ اللہ نے فرمایا......

"صدقہ اللہ تعالیٰ کے غضب کو ٹھنڈا کرتا ہے اور بری موت کو دفع کرتا ہے۔" (جامع ترمذی)

نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

ناولٹ

کانچ سی لڑکی

انجم انصار

دوسرا حصہ

ہر لڑکی خوب صورت ہوتی ہے
ہر لڑکی نازک ہوتی ہے
ہر لڑکی کانچ سی ہوتی ہے
ہر لڑکی حساس ہوتی ہے

اور

ہر لڑکی اپنے والدین کے دل کا ٹکڑا ہوتی ہے۔
کیا ہمارے یہ احساسات صرف اپنی بیٹیوں
کے لیے ہوتے ہیں؟

دوسروں کی بیٹیوں کے لیے نہیں؟

ریاض گھر میں داخل ہوئے تو ان کے چہرے پر زردی سی کھنڈی ہوئی تھی۔ نہاں باپ کے سامنے کھانے کی ٹرے رکھ کر چلی گئی تھی۔ ٹیوشن پڑھنے والوں کا ایک گروپ اس وقت بھی اس کے کمرے میں تھا۔ وہ کتنی ہی دیر ملول سے یونہی بیٹھے رہے۔

نسرین بیگم جب کمرے میں آئیں تو وہ ٹرے ایک جانب کر کے افسردہ سے بیٹھے تھے۔

"ارے، آج تو آپ کی پسند کے کریلے بنے





ہیں اور آپ نے چکھے تک نہیں۔"

"دل نہیں چاہ رہا کچھ بھی کھانے کو۔" ان کے لہجے میں ملال کے رنگ گہرے تھے۔

"آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے نا......؟"

"ہاں، ٹھیک ہوں، مجھے کیا ہونا ہے۔"

"بات تو کوئی ضرور ہے۔" اب وہ شوہر کے مدِ مقابل بیٹھی تھیں۔

"کیا کہوں...... اور کیا کروں؟" ریاض صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"آخر ہوا کیا ہے......؟" نسرین بیگم شوہر کے غم زدہ رویے پر پریشان ہی تو ہو گئیں۔

"نہاں کے لیے میں نے بڑے بھائی سے کہا تھا کہ اپنے سالے کے لیے نہاں کا رشتہ کروا دیں... آخر وہ لوگ اس کے لیے جگہ جگہ لڑکیاں دیکھ رہے ہیں۔"

"تو پھر...... بھائی جان نے منع کر دیا ہوگا؟" نسرین نے کہا۔

"کاش وہ اس وقت منع کر دیتے تو مجھے اتنا دکھ نہ ہوتا۔"

"تو...... کیا بعد میں منع کر دیا؟" نسرین بیگم نے گہری سانس لے کر کہا۔

"ہاں منع تو کیا...... مگر بہت بدتمیزی سے...... بڑی بھابی نے مجھے فون کر کے کہا۔" ریاض بھائی...... میرا بھائی کم تعلیم یافتہ بھی ہے، معمولی شکل کا بھی ہے، اس کی تنخواہ بھی واجبی سی ہے مگر اس کی شادی ہم کسی شریف خاندان کی لڑکی سے کریں گے...... نہاں کا کیا معلوم کہ وہ کسی کی جائز اولاد بھی ہے یا نہیں، اس کو اگر کوئی پھینک کر گیا ہے تو یقیناً وہ ناجائز ہی ہوگی۔"

"آپ نے کہا نہیں کہ ہم نے یہ بچی دو دن کی گود لی ہے اور اس کو پالا ہے، اس کی تربیت کی ہے، یہ ہماری بیٹی ہے اور ہماری بیٹی کے بارے میں یہ جملے کہنے کا حق آپ کو کس نے دیا ہے۔"

"ہاں کہا تھا...... یہ سب کہا تھا مگر اس کے بعد ان کا یہی کہنا تھا کہ گندا خون اپنا رنگ ضرور دکھاتا ہے۔"

"دفع کیجیے...... آپ ان چھوٹے ذہن کے لوگوں کو...... میری نہاں کے لیے تو آپ دیکھیے گا ایک شہزادہ آئے گا، خوب صورت سا، اس کو عیش کروانے والا...... آپ دیکھیے گا کہ وہ اس کے ساتھ کتنی خوش رہے گی۔"

"آمین......" ریاض صاحب پانی کا گلاس منہ سے لگانے سے قبل کہہ رہے تھے مگر ان کے چہرے پر پریشانی کے سائے گہرے تھے۔

☆☆☆

"ماما، اب تو آپ نے دیکھ لیا ناں ریحان کو...... ان کی امی تو دادی جان کی دوست بن گئی ہیں تو پھر آپ ان سے جا کر کہہ کیوں نہیں دیتیں کہ ریحان آپ کو بھی اچھا لگا ہے بلکہ بہت پسند آیا ہے۔" مینا نے ماں کے گلے میں اپنی بانہیں حمائل کرتے ہوئے کہا۔

"مینا بیٹا...... سب سے بڑی بات یہ ہے کہ ریحان ہمارے برابر کا نہیں ہے، بزنس کرنے والوں اور مہینے کے مہینے کمانے والوں کے طرزِ زندگی میں زمین آسمان کا فرق ہوا کرتا ہے، دوسری بات یہ کہ ہم لڑکی والے ہیں، ہم خود جا کر کیوں کہیں کہ ہماری بیٹی سے اپنے بیٹے کی شادی کر دو۔ یہ قدم تو لڑکے والے اٹھایا کرتے ہیں۔"

"ٹی وی کے ڈراموں میں تو لڑکی والے بھی اپنا رشتہ خود لے جایا کرتے ہیں۔" مینا نے بے پروائی سے کہا۔

"ہمارے چینلز کے ڈراموں میں تو ایسا نہیں ہوتا اور جو گھرانے ایسا کرتے ہیں وہ منہ کی کھاتے ہیں۔ کوئی غریب شخص بھی کسی دوسرے سے براہِ راست یہ بات نہیں کرتا کہ ہماری بیٹی سے آپ اپنے بیٹے کی شادی کر لیجیے تو ہم کیسے کہہ سکتے ہیں۔" شائستہ جہاں کا لہجہ تو فکی بھرا تھا۔

"تو پھر میری شادی ریحان سے کیسے ہوگی......؟ ہمارے گھر کے لوگوں کو بڑا بننے کا...... اور بڑا کہلوانے کا شوق ہی کبھی ختم نہیں ہوتا۔ بڑے لوگ بتائے نہیں جاتے...... بڑے لوگ خود دکھا کرتے ہیں، یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سرفراز احمد کا نام صرف اس شہر میں ہی نہیں بلکہ پورے ملک میں معروف ہونے کے ساتھ ساتھ مقبول بھی ہے۔ اگر ایسے میں آپ ریحان کے گھر جا کر ہلکا سا پسندیدگی کا اشارہ بھی دے دیں گی تو وہ لوگ خود دوڑے چلے آئیں گے، ہے ناں دادی...... میں ٹھیک کہہ رہی ہوں نا؟" مینا نے ماما کو سمجھاتے ہوئے اپنی دادی کی طرف امداد طلب نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"مینا کہہ تو ٹھیک رہی ہے۔" دادی جان کا تو واحد شوق تھا کہ اپنی اکلوتی پوتی کو دلہن بنے وہ جلد سے جلد دیکھیں۔

"ٹھیک ہے...... کسی بہانے سے ہم ان کے گھر چلتے ہیں۔" ماما نے...... کچھ سوچ کر کہا۔

"کیسا بہانہ......؟" مینا نے حیرت سے ماما کو دیکھا۔

"یہی کہ مبارک باد ہو آپ ڈینگی سے بچ گئیں۔ مبارک ہو آپ کو اس سردی میں نمونیہ نہیں ہوا۔ مبارک ہو...... ان بارشوں میں آپ کی فصل تباہ نہیں ہوئی۔" شائستہ جہاں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"اے لو...... ماہوار کمانے اور کھانے والوں کے پاس زمینیں کہاں سے آ گئیں...... ان کے ہاں تو مہینے کے حساب سے راشن خریدا جاتا ہوگا۔ تم یہ کیوں بھول گئیں...... وہ لوگ مڈل کلاس کے ہیں...... مگر ان کا لڑکا واقعی اچھا ہے، خوب صورت بھی ہے اور اخلاق کا بھی اچھا ہے۔ غزل کی تقریب والی شب میرا ہاتھ پکڑ کر گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا وہ......" دادی نے ماما سے کہا تو وہ ایک دم خاموش سی ہو گئیں۔

"ہاں ماما ریحان واقعی بہت اچھا ہے، آپ جب انہیں قریب سے جانیں گی تو دل سے تعریف کریں گی۔"

"عقل مند کہتے ہیں کہ بہو اپنے گھرانے سے کم کی لاؤ اور بیٹی اپنے گھر سے بڑے گھر میں دو تو اچھا رہتا ہے مگر مجھے تو یہ سوچ کر ہول آ رہا ہے کہ ایک ہی میری بیٹی...... اور وہ بھی مڈل کلاس فیملی میں بیاہی جائے۔"

"پیسوں والوں کے رشتے آتے ہیں تو تمہاری بیٹی کو سمجھ میں نہیں آتے اگر کوئی لڑکا سمجھ میں آ جاتا ہے تو اس کی ماں اچھی نہیں لگتی تو کسی کی بہن بری لگنے لگتی ہیں۔ اب اگر ہماری مینا کو ریحان اچھا لگ رہا ہے تو ان لوگوں کی ایسی دعوتیں کرو کہ وہ پریشان سے ہو جائیں اور سوچنے لگیں کہ دعوتیں کیا اتنی اعلیٰ کوالٹی کی بھی ہوا کرتی ہیں اور انہیں اتنے عمدہ اور مہنگے تحائف دو...... کہ وہ پاگل ہو جائیں اور یہ یقین کر لیں...... ہم جیسا دیالو انہیں کوئی دوسرا مل ہی نہیں سکتا۔"

"یہ تو کوئی مشکل بات نہیں ہے ماما...... بوکے، کیک کے ساتھ کوئی گفٹ بھی ان کے ہاں بھجوا دیں...... کہ دانش بھائی نے ایک نئی فیکٹری لگائی ہے۔" مینا نے خوش ہو کر دادی کے گلے میں بانہیں حمائل کر لیں۔

"ریحان کے علاوہ کیا...... دوسرا کوئی لڑکا نہیں ملے گا ہمیں...... جو ہم داماد پھانسنے کے لیے ایسی

چالیس چلیں......'' شائستہ جہاں کو ساس اور بیٹی کی باتوں پر غصہ ہی تو آ گیا تھا۔

''مینا تو بچی ہے...... اس کے تو جو منہ میں آتا ہے بک دیتی ہے مگر آپ تو اسے غلط بات پر ٹوکا کریں...... خود ہی اسے الٹی سیدھی باتوں پر شہ دیتی ہیں اور بعد میں مجھ پر چمک کر آتی ہیں کہ میں بیٹی کی تربیت پر کوئی دھیان نہیں دے پاتی۔''

''مگر ماما...... مجھے تو صرف ریحان سے ہی شادی کرنی ہے، صرف ریحان سے!'' مینا کا لہجہ دوٹوک تھا۔

''اور اگر ریحان نے تم سے شادی نہیں کی تو...... یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ وہ کسی کو پسند کرتا ہو یا اس کی ماں کا معیار یا پسند اپنی بہو کے حوالے سے مختلف ہو۔'' شائستہ جہاں نے تو پہلے غصے سے اور مینا کے چہرے پر بدلنے والے تاثرات جو صدمے کی طرف رواں تھے دیکھ کر نرمی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

''ماما...... اگر ریحان نہیں تو کوئی بھی نہیں...... مجھے تو اب تک کوئی پسند ہی نہیں آیا تھا اور اب ریحان کے علاوہ کوئی نہیں...... ہرگز نہیں، میں کسی دوسرے لڑکے سے شادی ہی نہیں کروں گی اور اپنی ساری زندگی ایسے ہی گزار دوں گی۔'' تب کمرے میں داخل ہونے والے سرفراز صاحب یک لخت پریشان سے ہو گئے۔

☆☆☆

''یہ سب کیا ہے بھئی...... کبھی ڈھیر سارے کیک، کبھی مٹھائیاں اور کبھی پھل............ اور پھل بھی اتنے زیادہ کہ ٹوکرے کے ٹوکرے چلے آ رہے ہیں۔ آپ مسز سرفراز کو منع کریں بھئی...... ہماری چھوٹی سی فیملی ہے...... اتنی زیادہ چیزیں کیوں بھیج رہی ہیں وہ۔'' ظہیر حسن نے پریشان ہو کر بیوی سے کہا۔

''میں نے تو پہلی مرتبہ جب ان کے ہاں سے دس مختلف فلیور کے کیک اور آئس کریم کے باؤلز آئے تھے...... تو اسی وقت فون کر کے کہا تھا کہ یہ سب اور اتنا زیادہ تکلف کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ تب وہ بولیں آپ کھائیں...... اپنے مہمانوں کو کھلائیں...... اور اپنے بہن بھائیوں کو کھلائیں کہ انہیں بھی تو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم آپ کی بہن بنے ہیں۔''

''جب وہ آپ کی بہن بنی ہیں تو کیا آپ ان کے ہاں لفافوں میں چیزیں بھیجیں گی...... آپ ان کی طرح یہ سب نبھا پائیں گی' نہیں ناں...... تو ان کو بھی روکیں آپ..... کہ دوستی کا رشتہ ہوں یا بہن بھائیوں کا...... برابر کا ہوتا ہے۔''

''میں یہ سب کہہ چکی ہوں مگر وہ مانتی ہی نہیں ہیں اور کہتی ہیں کہ تم میری چھوٹی بہن جیسی ہو...... اور چھوٹی بہن صرف لینے کا حق رکھتی ہے، دینے کا نہیں۔''

''سوچ لیجیے آپ...... دوستی ہمیشہ اپنے برابر کے لوگوں سے کرنی چاہیے...... ورنہ خوامخواہ کی پریشانیاں لپٹ جاتی ہیں۔''

''مسز سرفراز اور ان کی ساس اخلاق کی اتنی اچھی ہیں کہ میں یہ بات..... آپ سے سچی میں کہہ رہی ہوں کہ اتنے بڑے لوگ ہیں...... مگر ان کی طبیعت میں اتنی سادگی اور محبت رچی ہوئی ہے کہ یہ مقولہ ان لوگوں پر لاگو نہیں ہو سکتا ہے۔ مجھے تو ان لوگوں سے مل کر واقعی بہت اچھا لگ رہا ہے، اتنی عزت دیتی ہیں، اتنی محبت کرتی ہیں...... کہ بعض دفعہ تو یوں لگتا ہے جیسے مجھے اپنی کوئی بچھڑی ہوئی بہن مل گئی ہے۔'' ساجدہ بیگم نے کھلے دل سے تعریف کرتے ہوئے کہا۔

''پھر بھی، بڑے لوگ کے مزاج بادلوں کی طرح ہوتے ہیں...... کبھی تو ہلکی ہلکی رم جھم کی طرح مسحور کُن انداز میں کسی جلترنگ کی طرح لگتے ہیں...... اور کبھی تیز و تند سیلابی ریلے کی طرح سفاک اور گرجتے برستے، بجلی گراتے بادلوں کی طرح قہر ڈھاتے نظر آتے ہیں۔'' ظہیر حسن سامنے آئے رکھے ٹوکرے سے ایک اچھا سا سیب نکال کر کھاتے ہوئے بولے۔

''مگر پانچوں انگلیاں تو یکساں نہیں ہوتیں ناں...... اچھے، برے مزاجوں کے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں ناں......'' ساجدہ بیگم نے چائے کا کپ ان کے سامنے رکھتے ہوئے کہا۔

''ہاں، یہ بات تو آپ صحیح کہہ رہی ہیں...... مگر آپ کو کسی سے بھی ملتے وقت، اپنی باطن کی آنکھ کھول کر رکھنی چاہیے۔''

''کھلی ہوتی ہیں میری آنکھیں...... کالج میں پروفیسر رہی ہوں...... درجنوں لوگوں سے روزانہ ملنے کے تجربے بھی ہیں۔ کون کیسے کیسے گیم کھیلا کرتا ہے، یہ بھی سب جانتی ہوں مگر شائستہ جہاں واقعی ایک بہت ہی نفیس سی خاتون ہیں۔ ان کی ساس ایک وضع دار خاتون ہیں اور بے حد محبت کرنے والی بھی، ان کی پوتی مینا تو بے حد معصوم اور سیدھی سادی سی لڑکی ہے ان سب لوگوں سے مل کر مجھے واقعی اچھا لگ رہا ہے۔''

''اگر آپ کو اتنا ہی اچھا لگ رہا ہے تو سب لوگوں کو اپنے ہاں ڈنر پر بلائیں کہ ہم بھی سب بھی سے مل لیں۔''

''یہی تو میں آپ سے کہنے والی تھی۔'' ساجدہ بیگم نے مسکرا کر اپنے میاں کو دیکھا اور ان کی انگلیاں فون کے بٹن پش کرنے لگیں۔

☆☆☆

''اللہ کا شکر ہے...... آذر کا رشتہ کتنا اچھا ہے...... ماشاء اللہ سے اعلیٰ تعلیم یافتہ، اچھے عہدے پر فائز اور فیملی بھی کتنی اچھی ہے...... ہماری نہاں کا رشتہ کتنی محبت سے مانگا ہے۔'' ریاض صاحب نے سرشار لہجے میں کہا۔

''مجھے تو دلی طمانیت...... اس وقت ہوئی جب ہم نے انہیں یہ بتایا کہ نہاں ہماری لے پالک بچی ہے...... یہ دو دن کی تھی جب ہم نے ایدھی ہوم سے اسے گود لیا تھا۔ اس لیے جو بات کبھی آپ کو کسی دوسرے سے معلوم ہو، ہم خود بتانا چاہتے ہیں تو انہوں نے کہا...... ہم یہ سب جاننے کے بعد بھی آپ سے آپ کی بیٹی کے لیے سوالی بن کر آئے ہیں کہ ہمارے لیے یہ بات زیادہ اہم ہے کہ نہاں کو کس نے پالا ہے، نہاں کی پرورش کس کے ہاتھوں ہوئی ہے میں خوامخواہ ہی پریشان ہوتا رہا......'' ریاض صاحب نے مسکرا کر کہا۔

''میری بیٹی کی شادی جب احمد انٹرپرائز کے منیجر آذر سے ہوتی دیکھیں گے تو خاندان کے سب لوگ حیران رہ جائیں گے۔ خاص طور پر ہمارے بہن بھائی...... جو ہماری خوشیوں میں ہمیشہ روڑے اٹکانے کے عادی رہے ہیں...... اور نہاں کا وجود انہیں خار کی طرح کھٹکتا ہے۔'' نسرین بیگم نے کہا...... اور ریاض صاحب کا چہرہ مسکراتے مسکراتے یکدم سوچوں میں گم ہو گیا کہ ان کے بھی کسی بہن بھائی کو نہاں اچھی نہیں لگتی تھی اور ان سب کا یہی کہنا تھا۔

''خاندان میں بچے کم تھے کیا...... کسی ایک کے خرچے کی ذمے داری اٹھا لیتے...... اور وہ بچہ تمہارا کہلاتا...... یہ کیا کہ غیر کی انجان سی لڑکی...... جس کے بارے میں یہ تک پتا نہیں ہے کہ وہ کسی مسلمان کی اولاد ہے یا ہندو کی...... اس کو پال کر آپ کو کبھی کچھ نہیں ملنے والا...... کہ ایسی لڑکی کی شادی مسئلہ بن

جاتی ہے۔'' ریاض کے کانوں میں اس وقت پرانی باتیں یوں گونج رہی تھیں جیسے وہ کل کی بات ہو۔

''کیا ہوا، آپ نے کھانا کیوں چھوڑ دیا؟''

''خوشی میں...... کیا میں کچھ کھا سکوں گا...... بس آپ اچھی سی چائے بنالائیں۔'' وہ مسکرا کر بیوی سے بولے تو وہ فوراً کچن میں چلی گئیں۔

☆☆☆

اور چند ہی دنوں بعد نہاں کی منگنی آذر کے ساتھ ہوگئی۔ اس کی انگلی میں آذر کے نام کی انگوٹھی دمک گئی، کالج میں سہیلیوں کو پتا چلا تو ان سب نے ٹریٹ مانگی۔

''میں کل کالج کے کیفے میں تم سب کو ٹریٹ دے دوں گی۔'' اس نے اپنی سہیلیوں سے کہا۔

''جی نہیں، یہاں کیفے کی ٹریٹ نہیں چلے گی، ہم کالج سے واپسی پر پزا ہٹ جائیں گے...... اور پزا کھائیں گے۔'' سہیلیوں کے گروپ نے ایک آواز ہو کر کہا۔

''اگر امی نے اجازت دے دی تو ٹھیک ہے، ورنہ کالج کے کیفے میں ہی تمہیں ٹریٹ لینی ہوگی۔''

''تم اچھے طریقے سے کیا اپنی امی کو منا بھی نہیں سکتیں۔'' نہاں سے یہ بات اس کی دوست نجمی نے کہی تھی...... جب ہی تو وہ کالج سے آکر ماں کے کہے بغیر ہر کام کیے جا رہی تھی۔

''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے ناں...... جب سے کالج سے آئی ہو پاگلوں کی طرح کام کیے جا رہی ہو...... نہ ڈھنگ سے کھانا کھایا اور نہ ہی آرام......؟'' استری کرتی ہوئی نہاں کے سامنے سے کپڑے اور استری ہٹاتے ہوئے نسرین بیگم نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''امی آپ سے ایک بات کہنی ہے......'' اس نے کچھ سوچ کر کہا۔

''کیسی بات......؟''

''میری کالج کی سہیلیاں...... کالج سے واپسی پر پزا ہٹ جانا چاہتی ہیں...... اور وہ چاہتی ہیں...... کہ میں ان کے ساتھ جاؤں۔''

''مگر کیوں بیٹا کیا تم نے انہیں بتایا نہیں کہ کالج سے تم سیدھی گھر جاتی ہو...... تمہارے ابو نے صرف کالج جانے کی اجازت دی ہے، اِدھر اُدھر گھومنے کی نہیں۔''

''وہ چاہتی ہیں کہ میری منگنی کی خوشی میں وہ... پزا جا کر پزا کھائیں۔''

''اگر ایسی بات ہے تو تم اپنی سب سہیلیوں کو اپنے گھر بلا لو...... ہم ان کا پسندیدہ پزا آڈر کر کے اپنے گھر منگوا لیں گے...... وہ یہاں سے کھا کر اپنے اپنے گھر چلی جائیں......''

''وہ گھر نہیں آنا چاہتیں...... وہ تو وہیں جا کر کھانا چاہتی ہیں۔'' نہاں نے انہیں بتایا۔

''بیٹا تم عبایا پہنتی ہو، تمہاری منگنی ہو چکی ہے اگر سسرال کے کسی فرد نے تمہیں یوں ہوٹل میں بیٹھ کر اپنی سہیلیوں کے ساتھ گپ شپ کرتے دیکھ لیا تو وہ لوگ تو یہی کہیں گے ناکہ لڑکی تو بہت آزاد خیال ہے...... کالج سے واپسی پر گھومتی گھماتی گھر جانے کی عادی ہے اور میری بیٹی پر کوئی انگلی بھی اٹھائے تو کیا میں یہ سہہ پاؤں گی۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں امی؟'' نہاں نے سوچ کر باوثوق لہجے میں کہا۔ ''غلطی میری ہی ہے، مجھے انہیں اسی وقت منع کر دینا چاہیے تھا جو باتیں ہماری فیملی میں بری سمجھی جاتی ہیں تو مجھے اس کا خود ہی خیال رکھنا چاہیے۔'' تب نسرین بیگم نے نہاں کو بے اختیار گلے سے لگا کر اس کی روشن پیشانی چوم لی۔

☆☆☆

''عجیب لوگ ہیں۔ ہر چیز شکریہ کہہ کر ڈکار جاتے ہیں اور کام کی بات منہ پر نہیں لا رہے۔'' سرفراز صاحب نے مسکرا کر بیوی سے کہا جو چنے کی دال کا حلوہ سینی میں جما کر ریحان کے ہاں بھجوا رہی تھیں۔

''ریحان حلوے شوق سے کھاتا ہے...... کل گاجر کا حلوہ بھجوایا تو ان کی امی کہہ رہی تھیں کہ اس نے بہت شوق سے کھایا تھا۔''

''کب تک تم ان لوگوں کو حلق تک ٹھنساؤ گی، وہ ریحان کا رشتہ...... ہماری بیٹی کے لیے کب لائیں گے؟'' سرفراز صاحب کے لہجے میں خاصی بیزاری سی تھی۔

''مجھے لگتا ہے انہیں ریحان کی شادی کی ابھی کوئی جلدی ہی نہیں ہے۔ میں شادی کے موضوع پر کوئی بھی بات لے کر آؤں وہ رسیاں تڑوانے لگتی ہیں۔'' شائستہ جہاں نے شوہر کو بتایا۔

''عقل مند خاتون ہیں...... کھانا اور چاٹنا تو پسند ہے مگر کسی دوسرے کے کام آنے والی نہیں ہیں۔''

''تو میں کیا کروں، اب اپنے منہ سے تو خود کہنے سے رہی کہ میری مینا تمہارے بیٹے کی عاشق بن گئی ہے۔'' انہوں نے برا سا منہ بنا کر کہا۔

''تم یہ تو کہہ سکتی ہو کہ ہماری مینا کے لیے ان دنوں رشتوں کی بارش ہو رہی ہے اور تم سوچ رہی ہو کہ ان میں سے کوئی رشتہ منتخب کر کے اپنی بچی کے فرض سے فارغ ہو جاؤ۔''

''اگر انہوں نے کہہ دیا کہ ہاں آپ کو ایسا ہی کرنا چاہیے تو پھر؟''

''پھر آپ...... یہ فری کا ہوٹل تو بند کر دیں گی ناں جو روزانہ کچھ نہ کچھ ان کے ہاں اس طرح بھجوایا جاتا ہے...... جیسے ہمارے ہاں ہن برس رہا ہو......'' سرفراز کے لہجے میں تلخی گھلی ہوئی تھی۔

''یہ بات بھی تو آپ کہا کرتے ہیں کہ کسی بھی نئے بزنس میں نقصان کا خانہ پہلے رکھا جاتا ہے اور پھر کسی کی للو چپو کرنے میں ہمارے پاس کوئی کمی تھوڑی ناں ہے! ہمارے ملازم خود پکاتے ہیں اور خود جا کر دے آتے ہیں۔ ایسا کچھ کرنے میں کوئی ہمیں تکلیف تھوڑی ناں ہو رہی ہے اور نہ ہی ہمارے پاس کوئی پیسے کی کمی ہے کہ دس پندرہ ہزار کا روز کا خرچ کرنے سے ہمارا بجٹ آؤٹ ہو جائے گا۔'' شائستہ جہاں نے شوہر کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''مگر مجھے چالاک لوگ کبھی پسند نہیں رہے۔ ریحان کی والدہ اب اتنی اندھی تو نہیں ہیں کہ انہیں ہماری مینا نظر ہی نہیں آرہی ہے۔ وہ ریحان کے لیے لڑکی تلاش کر رہی ہیں تو اُن کی پہلی نظر تو مینا پر ہی پڑنی چاہیے جبکہ انہیں مینا اچھی لگتی ہے اور جب آتی ہیں تو اس پر صدقے واری بھی جاتی ہیں تو پھر ان کی زبان پر مینا کا نام کیوں نہیں آرہا۔'' سرفراز احمد نے اپنے اُلجھے ہوئے خیالات کو سلجھاتے ہوئے کہا کہ ریحان تو انہیں بھی اچھا لگا تھا مگر اس کے گھر کے ماحول سے وہ مطمئن نہیں ہوئے تھے اور وہ انہیں دبا ہوا سا لگا تھا۔ گھر کے افراد تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود لکیر کے فقیر نظر آتے تھے، ان کے بچے اپنے معاملات میں آزاد تھے وہ جو چاہے کیا کرتے تھے مگر ریحان کو کہیں جانا بھی ہوتا تھا تو وہ ماں کو بتا کر جایا کرتا تھا اور آنے کے بعد بھی پہلے ماں کے پاس آتا تھا اور پھر اپنے کمرے میں جاتا تھا۔

''خاتون نے اپنے بیٹے کے گرد خاصا گھیرا تنگ کر رکھا ہے۔'' وہ یہ بات کئی بار مینا سے کہہ چکے تھے۔

''آپ فکر نہ کریں۔ مجھ سے شادی کے بعد ریحان کو میرے سوا کچھ نظر ہی نہیں آئے گا۔'' مینا مسکرا کر کہتی تو وہ مسکرا کر اپنی بیگم کو دیکھنے لگتے کہ یہ تو انہیں

اندازہ تھا مینا جو کہتی ہے وہ کر کے دکھا دیتی ہے۔

☆☆☆

''نہیں امی نہیں...... میں تو کبھی مینا سے شادی نہ کروں۔'' ریحان کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''ابھی شادی کرنے کو کون کہہ رہا ہے...... فی الحال منگنی کر دیتے ہیں سال بھر بعد تمہاری شادی بھی ہو جائے گی۔ تمہارے چچا، تایا بھی باہر سے آ کر شرکت کر لیں گے۔''

''شادی ہو یا منگنی...... میں نے مینا کے بارے میں کبھی اس نظر سے سوچا ہی نہیں۔''

''تو پھر کس کے بارے میں سوچا ہے...... کون ہے وہ......؟'' اور ریحان کے دماغ پر نہاں یکدم چھا سی گئی...... اس کے برابر گاڑی میں بیٹھی ہوئی، کتاب پر نظریں ڈالے اس کے دراز بال ریحان پر اڑ اڑ کر آ رہے تھے اور وہ ان سے بے نیاز تھی۔ گاڑی سے اترتے وقت اس کا بڑا سا دوپٹا اس کی گھڑی میں اٹک گیا تھا تو وہ اسے کھینچتے ہوئے اتر گئی تھی۔ پھر بوتیک میں اس کو دیکھ کر حیران ہوتی ہوئی، نیچی نظروں سے شکریہ کہہ کر ایک دم چلی جانے والی...... سڑک پر گاڑی کے سامنے آ جانے والی۔

''ہونہہ...... میں بھی اتفاقی چیزوں اور اتفاق سے مل جانے والے لوگوں پر کتنا سوچنے لگتا ہوں۔''

''تم نام بتا دو، میں وہیں چلی جاؤں گی۔'' بیٹے کو سوچتا پا کر نسرین بیگم نے بیٹے کو مسکرا کر دیکھتے ہوئے کہا۔

''واقعی......!'' وہ شوخی سے بولا۔

''تو کون ہے وہ شہزادی...... جو میرے بیٹے کو اچھی لگی ہے؟''

''کوئی بھی نہیں۔'' یہ جملہ کہتے ہوئے یکبارگی اسے ہلکی سی چبھن کا احساس ہوا...... مگر یہ صرف چند لمحوں کی بات تھی، اس نے جو یہ سوچا تھا کہ اسے ضرور کھوجے گا اپنی سوچ پر اسے خود ہی حیرت ہو رہی تھی، میں بھی شاید خواہ مخواہ متاثر ہو گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ہنس رہا تھا۔

''تو پھر مینا کے ساتھ منگنی کرنے میں تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔''

''اعتراض تو نہیں ہے...... مگر ان کے گھر کا ماحول ہمارے گھر سے یکسر مختلف ہے۔''

''تمہیں بیاہ کر اُن کے گھر تھوڑی جانا ہے جو تمہیں ان کے گھر پر اعتراض ہے۔''

''مینا بھی کچھ عجیب سی ہے، کبھی مجھے دیکھتی ہے تو ایسے دیکھتی ہے...... جیسے میں کوئی حساب کا پرچا ہوں اور کبھی اپنی نظریں...... میرے جوتوں پر یوں گاڑھ دیتی ہے کہ مجھے یہ خدشہ ہونے لگتا ہے کہ کہیں ان میں تیل تو نہیں نکل آیا ہے۔'' ریحان نے تمسخرانہ سے لہجے میں کہا۔

''مینا بہت پیاری بچی ہے...... بڑے گھرانے کی لڑکی ہونے کے باوجود اپنے آپے میں ہے، اپنی دادی کی تو چہیتی پوتی ہے اور وہ اس کی تعریف کرتے ذرا نہیں تھکتیں......'' نسرین بیگم کے لہجے میں مینا کے لیے پیار ہی پیار تھا۔

☆☆☆

''نہیں بھئی، منگنی ونگنی ہمیں نہیں کرنی۔ نہ ہمیں پسند ہے اور نہ ہی ہمارے ہاں ہوا کرتی ہے، ہم تو اپنی بیٹی کی شادی کریں گے، منگنی ڈھنگنی کے جھمیلے میں نہیں پڑنا چاہیے۔'' سرفراز صاحب نے واضح انکار کرتے ہوئے کہا۔

''مگر ان کا ایک ہی بیٹا ہے، ان لوگوں کے بڑے ارمان ہیں۔'' شائستہ جہاں نے اپنے شوہر کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''ہماری کون سی دس بیٹیاں ہیں ہماری بھی تو ایک ہی بیٹی ہے۔ ہمارے دل میں کیا اس کے لیے کم ارمان ہیں؟'' اب سرفراز صاحب سوالیہ لہجے میں بیوی سے پوچھ رہے تھے۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں...... مینا ہماری اکلوتی بیٹی ہے مگر اللہ نے ہمیں دو بیٹے بھی تو عطا کیے ہیں...... اور ریحان کی تو نہ کوئی بہن ہے اور نہ ہی بھائی......''

''تو پھر ان کی ماں کو تو اپنے بیٹے کی شادی جلد کر دینی چاہیے۔''

''منگنی پہلا قدم ہی کہلاتا ہے جو شادی کی جانب ہوتا ہے۔ دوسری بڑی بات یہ ہے کہ ریحان کے کئی کزنز بیرون ملک مقیم ہیں جو صرف چھٹیوں میں ہی پاکستان آتے ہیں، اب وہ آئندہ سال آئیں گے تب ریحان کی شادی ہو گی...... اس سال تو وہ لوگ آ کر ابھی تو گئے ہیں واپس۔''

''تم منع کر دو...... وہ خود شادی کی بات کرنے آ جائیں گی اگر انہیں ہماری مینا پسند ہے تو ہماری خوشی کو مقدم رکھیں گی۔''

''یہ بات میں نے مینا کے سامنے کہی تھی...... تو اس نے تو رو رو کر اپنا برا حال کر لیا تھا۔''

''تو پھر اب کیا کریں؟'' بیٹی کی حالت جان کر وہ روہانسے ہو گئے۔

''آپ یہ کیوں نہیں مان لیتے کہ ریحان ہماری بیٹی کی پسند ہے، اس کے سوا وہ کسی دوسرے کا نام ہی نہیں سننا چاہتی...... اور وہ لوگ اگر منگنی کرنا چاہ رہے ہیں تو ہم کر لیتے ہیں۔ سال کا کیا ہے، وہ تو تیزی سے گزر جاتا ہے 2011ء ابھی تو شروع ہوا تھا کس تیزی سے ختم ہو چکا ہے اور 2012ء شروع ہو گیا۔''

''آپ نے مینا کو کبھی ٹھیک سے سمجھایا نہیں ورنہ اس کے لیے کوئی رشتوں کا کال تھوڑی ہے۔ ریحان سے کہیں زیادہ اچھے لڑکے ہمارے حلقۂ احباب میں موجود ہیں مگر وہ تو ایسی پاگل ہو گئی ہے کہ ریحان کے سوا اسے کچھ نظر ہی نہیں آتا۔''

''کیا کریں، ضدی تو وہ ہمیشہ کی ہی ہے، جس بات پر بھی اڑ جائے تو باز کہاں آتی ہے۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' سرفراز صاحب ایک گہری سوچ میں پڑ گئے۔

☆☆☆

''کیا...... کیا بکواس کر رہی ہو یا بونگیاں چھوڑ رہی ہو......؟'' شہزاد نے ہنس کر مینا سے کہا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں، آنے والے سنڈے کو میری انگیجمنٹ ہو رہی ہے۔'' مینا نے اپنے گروپ کو انفارم کرتے ہوئے کہا۔

''تم کسی سے انگیجمنٹ کیسے کر سکتی ہو؟'' شہزاد کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

''کیوں نہیں کر سکتی؟''

''منگنی ہو گی تو شادی ہو جائے گی۔''

''ظاہر ہے......''

''تو پھر ہمارے گروپ کا کیا ہو گا؟''

''تو کیا...... میں ساری زندگی یونیورسٹی میں ہی پڑھتی رہتی۔'' شہزاد کی باتیں سن کر مینا کو ہنسی تو آ گئی۔

''شادی کے بعد تم ہمارا گروپ جو چھوڑ دو گی۔''

''گروپ تو کیا...... میں ریحان کے لیے پوری دنیا کو چھوڑ دوں گی۔'' مینا نے ہنس کر کہا۔

''جب ہی تو ہم چاہتے ہیں کہ تم نہ ابھی کوئی منگنی کرو گی اور نہ ہی شادی...... اور یوں بھی تم جیسی لڑکی کو ان جھمیلوں میں پڑنا ہی نہیں چاہیے۔''

''مجھے شادی کیوں نہیں کرنی چاہیے؟'' مینا نے

نیورٹی تان کر پوچھا۔

"یار! تم ہمارے گروپ کی جان ہو، تمہارے بغیر تو یہ گروپ بے آب و گیاہ رہ جائے گا، نہ اس میں کوئی رونق ہوگی اور نہ ہی کوئی تمہاری طرح شاہ خرچیاں کرنے والا ہوگا۔"

"اب میں تمہاری خوشی کے لیے اپنی خوشی سے تھوڑی ناں منہ موڑ سکتی ہوں۔"

"ارے یار! منع کردو تم۔ تمہارے چاہنے والے کیا کم ہیں جو خوامخواہ منگنی کا کھڑاگ پالوگی۔" شہزادو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

"میں تم سب کو انفارم کررہی ہوں، تم سے مشورہ نہیں مانگ رہی۔" مینا نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا...... تو مایا نے شہزادو کو آنکھ کے اشارے سے خاموش ہونے کا کہا مگر مینا...... دیگر لوگوں کا تبصرہ سنے بغیر یونیورسٹی سے جا چکی تھی۔

☆☆☆

"آپ نے ان لوگوں کو کہہ دیا تھا ناں کہ منگنی سادگی سے ہوگی اور ہمارے مہمان بہت زیادہ نہیں ہوں گے، چند قریبی عزیزوں کے علاوہ ریحان کے خاص خاص دوست اور چند آفس فیلو ہوں گے۔" ظہیر حسن نے اپنی بیوی کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

"مگر...... شائستہ باجی تو کہہ رہی تھیں کہ ہم لوگ جتنے چاہے اپنے مہمان لے کر آئیں بلکہ ان کی یہ خواہش بھی ہے کہ ہمیں زیادہ مہمانوں کو لے کر آنا چاہیے۔"

"منگنی سمپل سی ہونی چاہیے...... کیا فائدہ وقت اور پیسہ برباد کیا جائے۔" ظہیر حسن نے بیوی کو سمجھایا۔

"اچھا...... میں انہیں پھر فون کروں گی۔" نسرین بیگم نے میاں کو اطمینان دلایا۔

☆☆☆

اور جب ریحان کے ساتھ ٹوٹل 35 لوگوں کے ساتھ ظہیر حسن اور نسرین بیگم نے سرفراز ہاؤس میں قدم رکھا...... تو ان کے وسیع و عریض لان میں 300 کے قریب مہمان موجود تھے...... جہاں پریس کے فوٹوگرافر کا ایک گروپ تھا اور کئی ٹی وی چینلو کے ارکان بھی اس تقریب کی کوریج کے لیے وہاں پر آئے ہوئے تھے...... صحافیوں کے بیٹھنے کا انتظام علیحدہ تھا۔ ریحان لائٹ اور ڈارک براؤن کرتہ شلوار اور واسکٹ میں ملبوس تھا...... اور بے حد وجیہہ لگ رہا تھا۔

ریحان کے داخل ہوتے ہی بینڈ بجانے والا گروپ خیر مقدمی دھنیں بجانے لگا۔ تمام مہمانوں نے کھڑے ہو کر استقبال کیا۔ سرفراز صاحب نے بڑی محبت سے ریحان کو گلے لگایا تھوڑی دیر میں مینا اپنی سہیلیوں اور اپنے یونیورسٹی کے .... گروپ کے جلو میں اسٹیج پر آئی۔ آج وہ واقعی بے حد حسین لگ رہی تھی۔ ریحان نے اسے پہلی مرتبہ بغور دیکھا تو وہ اسے اچھی لگی۔ نسرین بیگم نے یاقوت کے نگ جڑی خوب صورت سی انگوٹھی اپنی بہو کو پہنائی...... مینا نے ڈائمنڈ بھری رنگ ریحان کو خود پہنائی اور پھر اس کی سہیلیاں اور یونیورسٹی کے لڑکے جوڑے بنا کر ناچنے لگے...... تمام مہمانوں کو یہ بہت اچھا لگ رہا تھا مگر نسرین بیگم کو عجیب سا لگ رہا تھا کہ ان کے گھر کی تقریبات میں اول تو ایسا کچھ ہوتا نہیں تھا...... اور جہاں ہوتا بھی تھا وہاں زنانہ، مردانہ علیحدہ ہوتا تھا۔

اگر خواتین کا گانے یا ناچنے کو دل چاہتا تو وہاں مرد تو کیا کوئی پرندہ پر نہیں مار سکتا تھا مگر مینا کے یونیورسٹی کے لڑکے لڑکیاں ایسے ناچ رہے تھے کہ ان کے آگے فلمی مناظر ماند ہو گئے۔ پھر ان کی آنکھیں

پھٹ جانے کی حد تک کھل گئیں...... جب اپنی سہیلیوں کے کہنے پر یا پروگرام کے مطابق مینا ڈانس کرنے کے لیے اسٹیج پر آئی...... اپنا دوپٹا ایک طرف رکھا...... اور پھر کسی زوردار میوزک پر جو اس نے ناچنا شروع کیا تو ساجدہ بیگم کو تو ایسا لگا جیسے وہ پتھر کی ہوگئی ہیں...... اس کا ساتھ جس طرح شہزادو دے رہا تھا کہ وہ شرمسار سی ہوگئیں اس دھماکے دار پرفارمنس میں پھر مینا کے یونیورسٹی فیلو بھی شریک ہو گئے تھے مگر ظہیر حسن اور ساجدہ بیگم نظریں جھکائے اپنے عزیزوں سے جیسے منہ چھپا رہے تھے۔

"بھائی جان، آپ نے میری فرح کے لیے اس رشتے کی حامی نہ بھرنے کی وجہ یہی بتائی تھی ناں...... کہ میری فرح عبایا نہیں لیتی، حجاب نہیں پہنتی اس لیے مشکل ہوگا...... دو مختلف ماحول میں پلنے والے بچوں کا ایک ساتھ رہنا...... مسائل جنم لینے کا خدشہ ہوسکتا ہے مگر آپ نے اپنی بہو کا انتخاب کرتے وقت شاید پیسے کو مدِ نظر رکھا ہے۔" ظہیر حسن کی بہن ان کے پاس بیٹھی اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

"ونس مور...... ونس مور۔" مینا کا ڈانس ختم ہونے کے بعد تالیاں بج رہی تھیں اور اس سے کسی دوسرے ڈانس کی ریکویسٹ کی جارہی تھی تب پھر چیختا دھاڑتا میوزک بجا۔ نسرین بیگم کا سر جھکتے جھکتے شانوں سے نیچے آگیا تھا...... ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کریں تو کیا کریں۔ اسٹیج پر ان کی ہونے والی بہو ان کے بیٹے کے دوستوں، آفس کے کولیگز کے سامنے شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔

"جورا...... جوری چنے کے کھیت میں۔" وہ ہوشربا رقص کرتے ہوئے مسکرا رہی تھی، شرما رہی تھی۔ ادائیں دکھا رہی تھی، بھاؤ بتا رہی تھی اس کے یونیورسٹی فیلوز کی سیٹیاں ایک عجیب سی چوئیشن پیدا کررہی تھیں تب سامنے سے آتی شائستہ جہاں سے انہوں نے کہا۔

"پلیز آپ...... یہ سب بند کروائیں، ہمیں گھر جلدی جانا ہے۔ ہمارے گھر پر چند مہمان ایسے بھی موجود ہیں جو بیمار بھی ہیں اور ضعیف بھی۔" شائستہ جہاں نے مینا کے ڈانس کے بعد کے دیگر تمام آئٹم فوری طور پر منسوخ کردیے اور ساجدہ بیگم اور ان کے بہن بھائیوں کو سونے کے زیورات بطور تحائف دینے شروع کردیے۔ وہ مہمان جو یہ پروگرام دیکھ کر ناک بھوں چڑھا رہے تھے قیمتی تحائف پا کر مسرور نظر آنے لگے۔ مگر ساجدہ بیگم کے چکر گھر جا کر بھی رکنے میں نہیں آئے۔

"منگنی کی دلہن...... میں نے تو کہیں بھی ناچتی ہوئی نہیں دیکھی...... یہ مینا کو ہوا کیا تھا؟" گھر جا کر بھی ان کا یہ صدمہ کسی صورت کم نہیں ہو رہا تھا۔

"مگر آپ تو کہہ رہی تھیں کہ مینا سیدھی سادی سی لڑکی ہے۔"

"اس کی دادی اپنی پوتی کی سادگی کی تعریفیں کرتی نہیں تھکتی تھیں۔"

"تو ایسی بہو اپنے بیٹے کے لیے آپ کو پسند آئی......؟" ظہیر حسن بیوی سے طنزیہ لہجے میں پوچھ رہے تھے۔

"مجھے تو احساس تک نہیں ہوا کہ وہ لوگ اس قدر ماڈ ہوں گے کہ اپنی بیٹی کو انجانے مہمانوں کے سامنے تک نچوادیا...... اور غیر لڑکے کے ساتھ نچوادیا۔ میں کیا کروں...... میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا جب سے وہاں سے ہو کر آئی ہوں میرا سر درد کے مارے پھٹا جارہا ہے۔" ساجدہ بیگم نے پریشان

ہو کر کہا۔ ''لوگ کیا کہیں گے کہ اپنے اکلوتے بیٹے کے لیے دو سال سے لڑکی تلاش کر رہی تھی...... تو ایسی لڑکی منتخب کی ہے۔ جس میں حیا تک نہیں ہے، میں تو سوچ رہی ہوں کہ جا کر رشتہ ختم کر دوں۔'' ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور لہجہ گلوگیر سا تھا۔

''ہر گھر کا ماحول مختلف ہوتا ہے، وہ لڑکی جب ہمارے گھر آئے گی تو اسے یقیناً اندازہ ہو جائے گا۔'' بیوی کو یوں ہتھے سے اکھڑتا دیکھ کر ظہیر حسن نے انہیں سمجھایا۔

''اگر وہ نہیں ہوئی تو......؟''

''آپ نیک امید رکھیں...... یوں بھی شادی ہونے میں ابھی ایک سال باقی ہے، آپ وقتاً فوقتاً سمجھاتی رہیں گی کہ ہمارے گھر میں کن چیزوں اور کن باتوں کو پسند کیا جاتا ہے۔''

''پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر سا لگ رہا ہے۔ ایسا لگ رہا ہے کہ میں نے اپنے ریحان کے لیے کسی غلط لڑکی کا انتخاب کر لیا۔'' ساجدہ بیگم کے آنسو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، بیٹے کی منگنی کے بعد سے وہ مستقلاً روئے جا رہی تھیں۔

☆☆☆

''عجیب روکھے سے لوگ ہیں، ان کے دو مٹھائی کے ٹوکرے کے جواب میں ہم نے دس مٹھائی کے بڑے والے ٹوکرے بھجوائے ہیں اور دس من مٹھائی پا کر وہاں سے شکریے تک کا فون نہیں آیا اور ملازم تو یہاں تک بتا رہا تھا کہ وہ یہ تام جھام دیکھ کر پریشان ہو گئی تھیں اور کہہ رہی تھیں کہ تم لوگ اتنی ساری مٹھائی کیوں لے آئے ہو...... اس کا تو بانٹنا بھی ایک مصیبت ہوگا، ہمیں مٹھائی بھیجتے ہوئے خوشی ہوئی اور انہیں بانٹنے کی مصیبت لگ رہی ہے۔'' سرفراز صاحب اپنی ماں سے شکایتی لہجے میں کہہ رہے تھے۔

''ان لوگوں نے ایسا دینا دلانا کہاں دیکھا ہوگا۔ یہ تو آدھ پاؤ مٹھائی بانٹنے والا خاندان ہے، ہم نے بانٹنے والے ڈبے بھی ایک، ایک کلو کے بنوا کر انہیں بھجوا دیے...... پریشان تو ہونا ہی تھا۔'' اماں نے تمسخر سے ہنس کر کہا۔

''یہ تو تو فگی کی بات ہے، اپنے خاندان میں فخر سے مٹھائی بانٹیں اور بتائیں کہ یہ ان کے بیٹے کے سمدھیانے سے آئی ہے۔ مٹھائی کھانے والوں کو بھی سواد آ جائے گا کہ ایسی لذیذ میوے سے بھری کھجور کی ٹکیاں انہوں نے کہاں کھائی ہوں گی۔'' سرفراز صاحب کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''ٹھیک کہہ رہے ہو تم...... ان کے خاندان میں بالوشاہی بانٹنے کا رواج ہے یا موتی چور کے لڈو...... جو ہمارے گھر کے نوکر چاکر بھی نہیں چکھا کرتے۔''

''ریحان کی تو لاٹری نکل آئی ہے، ورنہ ہم تو خواب میں بھی نہیں سوچ سکتے تھے کہ اپنی نازوں پلی بیٹی کو کسی مڈل کلاس فیملی میں بیاہیں گے۔''

''تم نے کوٹھی سیٹ کر کے تو دینی ہی ہے وہ شادی کے بعد بھی اپنے ہی حساب سے رہے گی کہ ہماری مینا کو شادی کے بعد مڈل کلاس فیملی کے مسائل کا سامنا کرنا ہوگا۔'' اور سرفراز صاحب کچھ سوچتے ہوئے تائید میں اپنا سر ہلا رہے تھے۔

☆☆☆

''تمام ملنے والوں میں، رشتے داروں میں محلے کے ایک ایک گھر میں مٹھائی بھجوا دی ہے پھر بھی یہ دو ٹوکرے بچ گئے ہیں۔ میں کہاں بھیجوں میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' ساجدہ بیگم پریشان سی ہو گئیں۔

''اُفوہ، اس میں اتنا فکر مند ہونے کی کون سی بات ہے، آپ ایک ٹوکرا اپنے ان عزیزوں کے ہاں بھی بھجوا دیں جن سے دور پرے کی رشتے داری ہے اور خال خال ہی ملنا ہوتا ہے اور باقی مٹھائی کسی بھی دارالعلوم کے بچوں کے لیے بھیج دیجیے۔''

''ہاں، یہ ٹھیک ہے کل مارکیٹ میں مجھے ریاض بھائی ملے بھی تھے، یہاں قریب ہی رہ رہے ہیں...... ان کی بیگم نسرین بھابی مجھے ہمیشہ بہت اچھی لگی ہیں۔ سلیقہ مند اور بے حد اچھی عادتوں کی ہیں۔ پہلے میرے ذہن میں ان کی بیٹی کا خیال آیا تھا۔'' ساجدہ بیگم نے کہا۔

''اچھا...... وہی تو نہیں...... جنہوں نے چند دن کی بچی ایدھی ہوم سے لے کر پالی تھی۔'' ظہیر حسن نے سوچتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہی...... نسرین بھابی مگر میں نے سوچا وہ تو ابھی چھوٹی ہوگی شاید اسکول کی طالبہ...... اور شادی کے لیے لڑکے لڑکی کی عمروں میں اتنا زیادہ گیپ نہیں ہونا چاہیے۔''

''ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ...... جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ لڑکی اگر پندرہ، بیس سال بھی چھوٹی ہو تو کوئی فرق نہیں پڑتا...... وہ بالکل غلط کہتے ہیں۔ بے جوڑ شادیوں میں جنریشن گیپ آ جاتا ہے میاں اور بیوی کی سوچ ہمیشہ متضاد ہوتی ہے۔''

''تو آج سب سے پہلے نسرین بھابی کے ہاں مٹھائی دے آتی ہوں......'' ساجدہ بیگم نے ٹوکری میں مٹھائی کا ڈبا رکھتے ہوئے کہا۔ ''ان سے اسی بہانے مل بھی لوں گی۔''

☆☆☆

''تم ملنے کی بات کرتی ہو...... وہ موبائل پر بات نہیں کرتا۔'' مینا نے اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔

''واٹ...... وہ تم سے موبائل پر بات نہیں کر رہا؟'' شہلا نے حیرت سے چیخ ہی تو اٹھی۔

''ہاں، جب میں نے پہلی مرتبہ فون کیا تو وہ کہنے لگا کہ ابو کے ساتھ نماز پڑھنے جا رہا ہوں مسجد۔''

''کیا...... وہ مسجد میں جا کر نماز پڑھتا ہے؟'' سہیلیوں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں بھئی، باپ، بیٹا مسجد جاتے ہیں اور بڑی باقاعدگی سے جاتے ہیں۔ جب پہلی بار میرے پاپا اور ماما ریحان کے گھر گئے تھے تو شاید وہ مغرب کے وقت پہنچے ہوں گے مگر مہمانوں کے ساتھ بیٹھ کر باتیں کرنے کے بجائے دونوں باپ بیٹا گاڑی میں بیٹھ کر مسجد یوں بھاگے جیسے کوئی ایمرجنسی ہو گئی ہو اور ان کا جانا ضروری ہو۔ کیا تھا کہ وہ بعد میں قضا نماز پڑھ لیتے تو......؟ ان کی امی بھی معذرت کرتے ہوئے نماز پڑھنے چلی گئیں...... ایٹی کیٹس ہر ایک میں تھوڑی ہوتے ہیں پاپا تو ان لوگوں کی اس حرکت کو دیکھ کر ہی مجھے سمجھا رہے تھے کہ ان کی فیملی میں تم جا کر خوش نہیں رہ سکتیں اس لیے اپنی ضد چھوڑو۔''

''بالکل ٹھیک کیا ان لوگوں نے، مہمانوں کی وجہ سے کوئی اپنی فرض نماز تھوڑی چھوڑا کرتا ہے...... اور جو لوگ ایسا کرتے ہیں، وہ بالکل غلط کرتے ہیں۔'' علی ان کے گروپ میں نیا نیا شامل ہوا تھا اور اس کے خیالات بھی ان سب سے مختلف تھے۔

''تو کیا تم دوبارہ اپنے فیانسی کو فون نہیں کر سکتی تھیں؟'' شہلا نے پوچھا۔

''ہاں یار! دو بار نہیں، تین چار بار بلکہ پانچ چھ بار کیا مگر کبھی اس نے کہا اس وقت میں آفس میں مصروف ہوں، میں کھانا کھا رہا ہوں، میں باہر ہوں،

میرے پاس کچھ گیسٹ بیٹھے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔''

''ہوسکتا ہے اس کی بات صحیح بھی ہو مگر اس کو رنگ بیک تو کرنی چاہیے تھی ناں...... آخر تم اس کی منگیتر ہو۔''

''ہاں، ایک مرتبہ فون کر کے صرف یہ پوچھا تھا۔ ''آپ نے مجھے فون کیوں کیا تھا۔ میں نے کہا بس ایسے ہی، کیا کوئی بات کہنی تھی، نہیں پھر او کے کہہ کر اس نے فون کاٹ دیا۔ جیسے اس کو مجھ سے کوئی دلچسپی ہی نہ ہو۔''

''اگر ایسی بات ہے، تو دفع کرو اس منگنی کو تمہارے چاہنے والے کیا کم ہیں۔''

''نہیں یار...... یہ بات نہیں ہے، مجھے جب اس سے اتنی محبت ہے تو میری یہ محبت اس کے دل میں خود جگہ بنا لے گی اور سب سے خاص بات یہ ہے کہ ریحان مجھے اتنا اچھا لگتا ہے کہ اس کے سوا مجھے کوئی دوسرا نظر ہی نہیں آتا اور ہر اچھی چیز ہر اپنی پسند کی چیز جب میرے پاس ہے تو پھر ریحان کیوں نہیں، تم دیکھنا...... مجھ سے شادی کے بعد اسے خود اپنی قسمت پر رشک آیا کرے گا۔'' مینا نے مسکرا کر کہا اور اپنے گروپ کے ساتھ دیگر باتوں میں محو ہوگئی۔ مگر علی اسے حیرت اور تاسف سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پسند کی چیز اور پسند کے لوگ بھی اب حاصل کیے جاتے ہیں۔

☆☆☆

دروازہ نہاں نے کھولا تھا اور ساجدہ بیگم تو اس کی خوب صورتی اور اس کی باتیں سن کر اپنا دل مسوس کر ہی رہ گئیں۔

''نسرین بھابی...... آپ کس کھوہ میں چھپی ہوئی تھیں...... میں تو آپ کی بیٹی کو ابھی اسکول کی طالبہ ہی سمجھ رہی تھی۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ آپ کی بیٹی گریجویشن کر رہی ہے۔''

''لڑکیاں ایک دم ہی بڑی ہو جاتی ہیں کہ پتا نہیں چلتا......'' انہیں ساجدہ کی بات سن کر ہنسی آگئی۔

''سچ کہہ رہی ہوں...... مجھے آپ کی نہاں بہت اچھی لگی...... کاش میں ایک ہفتے قبل آپ کے گھر آگئی ہوتی......'' دل کی بات انہوں نے کہہ ڈالی۔

''نہاں کا رشتہ ماشاء اللہ بہت اچھی جگہ طے ہوا ہے...... اور اس کے گریجویشن کے فوراً بعد ہی میں اس کی شادی کے فرض سے فارغ ہو جاؤں گی۔ اب آپ بتائیں...... آپ نے اپنے بیٹے کی منگنی کہاں کی۔''

''سرفراز احمد...... بہت بڑے صنعت کار ہیں ان کی بیٹی مینا کے ساتھ......''

''ظاہر ہے ...... ہم تو ان لوگوں کو نہیں جانتے...... یقیناً بڑے لوگ ہوں گے۔''

''ہاں بڑے لوگ ہی ہیں، مینا کی تصویر میرے پاس ہے، دیکھیں......'' انہوں نے پرس کی زپ کھول کر انہیں تصویر دکھائی۔

''اچھی ہے آپ کی بہو۔'' چائے کی ٹرے لے کر آتی نہاں نے ٹرے رکھ کر تصویر دیکھی تو حیرت سے کہا۔

''ارے یہ تو مینا ہیں...... ہاں ٹی کے کئی ڈراموں میں کام کر چکی ہیں اور شاید ایک دو اشتہاروں میں بھی آئی ہیں۔''

''کیا...... آج کل بھی کوئی ڈراما ان کا ٹی وی پر آرہا ہے؟''

''آج کل تو نہیں...... مگر چند سال پہلے آیا تھا جو ان کے ڈانس کی وجہ سے بہت مقبول ہوا تھا۔''

''ٹی وی پر ڈانس کیے تھے......؟'' ساجدہ بیگم

کا سر چکرا سا گیا۔

''کیا آپ کو پہلے معلوم نہیں تھا، آپ کے گھر کے ماحول میں اور ان کے ہاں کے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔'' نسرین بیگم نے ان کی اڑتی رنگت دیکھ کر پوچھا۔

''نہیں، میں واقعی کچھ نہیں جانتی تھی۔''

''آنٹی...... اب تو یہ ٹی وی پر بالکل نہیں آتیں، لوگ تو بھول چکے ہوں گے، مجھے تو صرف اس وجہ سے یاد رہ گیا کہ ہمارے انٹر کالج میں فن ویک میں یہ اپنے ڈرامے کی کاسٹ کے ساتھ آئیں تھیں اور میں نے ان کو بے حد قریب سے دیکھا تھا۔ واقعی بے حد پیاری سی ہیں مینا جی۔'' نہاں بات چیت میں دکھ اور تاسف کے اثرات کو زائل کرنے کی سعی کرتے ہوئے بولی مگر ساجدہ بیگم رکیں نہیں فوراً ہی اٹھ گئیں۔ حد تو یہ تھی کہ انہوں نے وہ چائے تک نہیں پی جس کا گھونٹ بھر کر انہوں نے چائے کی تعریف کی تھی۔

نسرین بیگم ان کے جانے کے بعد پریشان سی ہوگئیں...... اور دل میں سوچنے لگیں کہ کہیں ان سے یا نہاں سے کوئی غلطی تو نہیں ہوگئی جو مینا کے بارے میں ایسی باتیں کہہ دیں۔ جن سے ان کو دکھ پہنچا...... اور ہنستی مسکراتی ساجدہ آب دیدہ سی اٹھ کر گئیں۔

☆☆☆

''یہ بات آپ کو ہمیں بتانی چاہیے تھی کہ آپ کی بیٹی صرف گھر کی تقاریب میں ہی نہیں، ٹی وی کے پروگرامز میں بھی ڈانس کیا کرتی ہے۔'' گھر آکر انہوں نے پہلا فون مینا کے گھر کیا، جو مینا کی دادی نے ریسیو کیا تھا۔

''آپ سے یہ کس نے کہہ دیا؟''

''ہمارے رشتے داروں نے بتایا ہے، ریاض بھائی کی فیملی تو تصویر دیکھ کر ہی پہچان گئی کہ یہ ٹی وی اداکارہ ہونے کے ساتھ ماڈل گرل بھی ہیں اور یہ بات میں آپ کو بالکل سچ بتا رہی ہوں ہمارے گھروں میں تو ٹی وی بھی کوئی رغبت سے نہیں دیکھا جاتا۔ ریاض بھائی نے ایدھی ہوم سے چند دن کی لڑکی گود لی تھی مگر اس کی تربیت ایسی کی ہے کہ میں تو حیران رہ گئی عبایا پہنے والی حجاب پہنے والی...... نیک اور پیاری سی بیٹی...... جو کالج میں پڑھنے کے ساتھ ساتھ گھریلو امور میں بھی طاق ہے شادی بیاہ کے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ پہلے ہی سے کھول کر بتا دینے چاہئیں۔''

''افوہ...... ساجدہ بیٹی تم نے تو اپنی رشتے دار کی ذرا سی باتیں سن کر بتنگڑ بنا دیا۔ ایسی باتیں تو اکثر فیملی میں اس وجہ سے کی جاتی ہیں کہ وہ خود اپنی لڑکی وہاں دینا چاہتے ہیں اسی وجہ سے وہ ایسی باتیں کر کے دوسروں کی لڑکیوں کو گرایا کرتے ہیں۔''

''نہیں آنٹی، یہ بات تو ہے ہی نہیں۔ میں آپ سے یہ سچ کہہ رہی ہوں کہ اس منگنی سے پہلے اگر میں نہاں کو دیکھ لیتی تو اسے ہی اپنی بہو بناتی...... کہ وہ ہمارے گھر کے ماحول کے حساب سے تھی مگر نہاں کی منگنی ہو چکی ہے...... اور ان لوگوں کا یہ بات بتانے کا مطلب کسی قسم کی تذلیل کرنا بھی نہیں تھا مگر انہیں حیرت اس بات پر تھی کہ ہم دونوں فیملیز کے رکھ رکھاؤ میں اور زندگی برتنے میں بے حد فرق ہے۔''

''ہمارے گھر میں تو ریحان بیاہ کر نہیں آئے گا ناں...... مینا تمہارے گھر جائے گی تو تم اسے اپنے حساب سے رنگ لینا......'' دادی نے ملائمت سے ہنس کر بات ختم کر دی اور غصے میں کھول کر اپنی بہو پر آئیں۔

''تمہارے سمدھیانے والوں نے چار دن میں ہی اپنی اوقات بتا دی۔ گھٹی ہوئی ذہنیت کے لوگ ہیں، ذرا بھی وسعت نہیں ان کی سوچ میں۔ بہو کو آبے لونڈے جابے لونڈے سمجھنے والا خاندان

ہے۔ وقت ہیں لیا ابھی بھی ہوش کے ناخن لو، میں نے اسی دن بتادیا تھا کہ مینا کا ڈانس دیکھ کر ساجدہ بیگم اور ان کے تمام مہمانوں کے چہرے کا جغرافیہ بگڑ رہا تھا بلکہ وہ تو مینا کے دوستوں کے گروپ کو ایسی نظروں سے دیکھ رہی تھیں جیسے کوئی غنڈوں کے گروپ کو دیکھ رہی ہوں اور ابھی ہماری پوتی رخصت ہوکر ان کے گھر نہیں گئی ہے وہ ہمیں لیکچر سنانے پر اتر آئی ہیں۔ پروفیسر ہوں گی اپنے گھر کی...... آج تو میں نے ان کی بات ہنسی میں برداشت کرلی، آئندہ اگر انہوں نے مجھے کوئی جارحانہ انداز میں فون کیا تو طبیعت صاف کرنے میں دیر نہیں لگاؤں گی۔'' دادی کا جلال کسی صورت کم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔

''اپنی اوقات لوگ بھول جاتے ہیں، یہ تک بھول جاتے ہیں کہ وہ کس سے بات کررہے ہیں اور کیا بات کررہے ہیں۔ ان سے زیادہ حیثیت کے لوگ تو ہمارے ہاں ملازمت کررہے ہیں...... اور آتے جاتے سلام کرکے گزر جاتے ہیں۔''

''اماں...... آپ تو جانتی ہی ہیں کہ یہ سب مینا کی وجہ سے ہی ہورہا ہے۔ میں نے مینا کو منع بھی کیا تھا دبے دبائے ماحول کے لوگ ہیں، یہ تو کسی محفل میں غزل سن کر رغبت سے تالی تک بجانا نہیں جانتے...... تم اگر ڈانس کروگی تو انہیں یہ سب بالکل اچھا نہیں لگے گا۔ یہ تو خوشی کو بھی خوشی کی طرح منانا نہیں جانتے ہیں اس لیے اعتراضات تو ہونے ہی تھے اور اس کے لیے میں پہلے سے تیار بھی تھی۔'' شائستہ جہاں نے ساس کو سمجھاتے ہوئے کہا۔

''تمہیں یہ رشتہ طے کرنے سے قبل ہی انہیں بتادینا چاہیے تھا کہ ہماری لڑکی ان کے چھوٹے سے گھر میں نہیں جائے گی بلکہ اپنے باپ کی دی گئی کوٹھی میں قدم رکھے گی۔''

''اماں آپ کیسی باتیں کررہی ہیں، ریحان کی امی سے اگر میں اس قسم کی باتیں کرتی تو وہ کب کی رسی تڑوالیتیں۔ آپ یہ مت بھولیں کہ ہم انہیں گھیر کر لائے ہیں۔ وہ ہمارے گھر آئیں نہیں بلکہ لائی گئی ہیں...... صرف اور صرف مینا کی وجہ سے۔ شادی ہوجانے دیجیے پھر جو دل چاہے مینا کرے یا ہم کریں ہمیں ان کی پروا تک نہیں ہوگی بلکہ گھاس بھی نہیں ڈالیں گے ہم...... ہمارا ملنا جلنا...... صرف اور صرف اپنی بیٹی اور اپنے داماد سے ہوگا اور ہم اپنے داماد کے اتنے لاڈ اٹھائیں گے کہ وہ نہ اپنی سگی ماں کو بھول جائے تو نام بدل دیجیے گا آپ میرا۔ ہماری بڑی آپا کے چاروں داماد کیسا ان کا کلمہ پڑھا کرتے ہیں اور ان چاروں نے نہ صرف اپنے والدین کو بلکہ بہن بھائی تک چھوڑ دیے ہیں ملنا تو دور کی بات...... وہ انہیں پہچانتے تک نہیں ہیں اور ان سب کے ذہنوں میں ایک ہی بات ہے کہ میرے یہ رشتے دار میری عزت، شہرت سے جلتے ہیں اس لیے مجھے ان سے دور ہی رہنا چاہیے۔'' شائستہ جہاں نے مسکرا کر کہا تو ان کی ساس بھی بے اختیار ہنس دیں۔

☆☆☆

''امی آپ کیوں اتنی پریشان ہورہی ہیں؟''

ریحان کمرے میں داخل ہوا تو ماں کو پلو سے آنسو پونچھتے ہوئے دیکھا تو پاس آکر بولا۔

''بیٹا مجھ سے بہت بڑی غلطی ہوئی کہ مینا جیسی لڑکی سے تمہاری منگنی کردی۔''

''امی لڑکی آپ نے خود ہی پسند کی ہے اب آپ اس میں خود ہی کیڑے نکال رہی ہیں جو ہوگا بعد میں دیکھا جائے گا آپ اس کو اپنے حساب سے ٹریننگ دے دیجیے گا۔''

''تمہارا کیا خیال ہے جس ماحول میں پلی

بڑھی وہ لڑکی ہے اس کو ہم اپنے ماحول میں ڈھال سکیں گے، کبھی نہیں...... ہرگز نہیں۔'' وہ بڑبڑاتے ہوئے بولیں۔

''ساجدہ...... مینا آج کی لڑکی ہے اگر اس نے خوشی میں ناچ گا لیا تو آپ نظر انداز کردیں۔'' ان کے شوہر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''ہماری فیملی کی سب خواتین حجاب اور عبایا پہن کر نکلا کرتی ہیں پردے دار گھرانے کی بہو...... بھری تقریب میں ڈانس کرے گی تو یہ بری بات تو ہے ناں...... ہمارا ایک ہی بیٹا ہے اس کے لیے ہم ایسی بہو لائیں جس پر لوگ انگلیاں اٹھائیں تو کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ یہ رشتہ ہی ختم کردیا جائے۔'' ساجدہ بیگم نے اپنے دل کی بات آخر شوہر کے اور بیٹے کے سامنے کہہ ہی دی۔

''کیسی باتیں کررہی ہیں آپ؟'' شوہر نے حیرت سے بیوی کو دیکھا۔

''میں سچ کہہ رہی ہوں، یہ سب دیکھنے کے بعد میرا دل نہیں چاہ رہا کہ ایسی لڑکی کو میں اپنی بہو بناؤں۔''

''منگنی کرنے کے بعد رشتہ ختم کرنا نامناسب ہوگا لوگ تو ایسے ہی باتیں بناتے ہیں۔'' شوہر نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''امی مجھے مینا سے نہ تو محبت ہے اور نہ ہی نفرت...... مگر منگنی توڑنا کوئی اچھی بات بھی نہیں ہوگی۔'' ریحان نے ماں سے کہا تب ساجدہ بیگم چپ سی ہوگئیں۔

کوئی آیا گیا آتا اور ان کی بہو کے بارے میں کوئی بات کرنے کی کوشش کرتا تو وہ سرعت سے موضوع ہی بدل دیا کرتیں۔

☆☆☆

جسم میں خون بننے کی اوسط رفتار

دل ایک منٹ میں 60 سے 80 مرتبہ دھڑکنے کے دوران 3 سے 5 کوارٹ تک خون پمپ کرتا ہے جسم میں خون بننے کی یہ اوسط رفتار اتنی ہے کہ ایک سال میں 80 فٹ چوڑے اور 165 فٹ لمبے تالاب کو لبریز کرسکتی ہے۔ اگر آپ جسمانی مشقت کا کام کررہے ہیں یا پھر سخت ایکسرسائز کرتے ہیں تو یہ رفتار اور مقدار 3 سے 5 گنا بڑھ سکتی ہے۔ یعنی اس طرح ایک سال میں خون کی اتنی مقدار تیار ہوسکتی ہے جس سے مذکورہ سائز کے 3 سے 5 تالاب بھر سکتے ہیں۔ جس طرح ایک بالٹی پانی نکالنے سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑتا۔ بالکل اسی طرح اگر آپ کے خون کی ایک بوتل بطورِ عطیہ کسی ضرورت مند کے کام آجائے یعنی اس کو زندگی مل جائے تو کیا آپ کی صحت پر کوئی فرق پڑے گا؟ اگر آپ جسمانی طور پر صحت مند ہیں اور آپ کا خون کسی ایسے شخص کے کام آجائے۔ جس کا بہت سا خون کسی حادثے وغیرہ کی وجہ سے ضائع ہوگیا ہو اور جس کی زندگی یا موت کا انحصار خون ملنے یا نہ ملنے پر رہ گیا ہو تو کیا آپ کا یہ عمل صدقہ نہیں کہلائے گا؟

مرسلہ: جمیلہ جمالی، لوہی بلوچستان

شائستہ جہاں نے منگنی کے بعد سمدھیانے والوں کو دعوتوں میں بلانے کی کوشش کی مگر انہوں نے کسی نہ کسی بہانے سے منع کر دیا کبھی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کبھی کہیں ضروری جانا نکل آتا اور کبھی وہ اپنے اور اپنے شوہر کے کولیسٹرول لیول بڑھ جانے کا تذکرہ اس طرح کرتیں کہ جس میں کہیں جا کر دعوتی کھانا نقصان کے زمرے میں آجاتا۔

ریحان کو کبھی اکیلے...... انہوں نے اس وجہ سے نہیں بلایا تھا کہ وہ یہ بات جانتی تھیں کہ نہ تو وہ آئے گا دوسرے اس گھرانے میں یہ بات اچھی نہیں سمجھی جائے گی۔

''عجیب ٹھس سے لوگوں سے پالا پڑا ہے کہ نہ تو خود خوش رہتے ہیں اور نہ ہی کسی دوسرے کو خوش کرنا چاہتے ہیں۔ اکلوتے بیٹے کی ماں کے دل میں اپنی بہو کے لیے ارمان کتنے زیادہ ہوا کرتے ہیں مگر یہاں تو سارے کے سارے اکل کھرے سے نظر آرہے ہیں...'' ساجدہ بیگم کا نہ تو اپنی بہو سے بات کرنے کو دل چاہتا تھا اور نہ ہی وہ اس سے ملنے کے لیے جاتی تھیں۔ حد تو یہ تھی کہ منگنی کے بعد انہوں نے سمدھیانے والوں کو اپنے گھر ایک مرتبہ بھی نہیں بلایا تھا۔

''مینا تیری ساری کی ساری سسرال ایک دم بور ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ ان لوگوں میں تو خوش رہ پائے گی۔ ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا...... سوچ لے، ہاں۔'' وہ اپنے طور پر بیٹی کو ہر ممکن سمجھانے کی کوشش کیا کرتیں۔

مگر مینا کو تو ریحان کے سوا کوئی بھا ہی نہیں رہا تھا۔ ریحان منگنی کے بعد بھی مینا سے کوئی رابطہ نہیں رکھ رہا تھا مگر مینا خوش تھی۔

''شریف لڑکے ایسے ہی ہوا کرتے ہیں، ان کا سارا پیار صرف اپنی بیوی کے لیے ہی ہوا کرتا ہے اور ریحان صرف میرا ہے، صرف میرا......'' تب بیٹی کی یہ بے تکی باتیں سن کر شائستہ جہاں کا خون کھول سا جاتا۔

☆☆☆

کتنے ڈھیر سارے دنوں کے بعد وہ گھر سے نکلی تھیں ورنہ ان کا دل ایسا بجھ سا گیا تھا کہ کہیں جانے کو ہی نہیں چاہتا تھا اپنی کزن کے ہاں جانا بھی وہ کب سے ٹالے چلی جا رہی تھیں۔ آصفہ ان کی سگی خالہ زاد بہن لاہور سے کب کی کراچی شفٹ ہو گئی تھی اور وہ ایک دفعہ بھی اس کے گھر نہیں جا پائی تھیں۔ جبکہ وہ کتنے ہی چکر لگا گئی تھی اور اب تو وہ ناراض ہو کر اپنے گھر بیٹھ گئی تھی...... فون کرنا بھی اس نے چھوڑ دیا تھا اور جب ساجدہ بیگم اس کے ہاں گئیں تو آصفہ کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔

''ساجدہ آپا کیا آپ بیمار رہی ہیں...... آپ کا چہرہ اترا ہوا سا لگ رہا ہے؟'' آصفہ نے انہیں بغور دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بیمار تو نہیں ہوں مگر اپنے آپ کو بیمار محسوس ضرور کر رہی ہوں۔ نہ کھانا اچھا لگ رہا ہے اور نہ کہیں جانا...... جب ہی تو تمہارے گھر آنے میں اتنی تاخیر ہوئی ہے۔''

''اور اس کی وجہ آپ کے بیٹے کی منگنی ہو گی ناں؟'' آصفہ نے بے ساختہ کہا۔

''یہ تم کیوں کہہ رہی ہو؟'' ساجدہ تو پریشان ہو کر پسینے پسینے سی ہو گئیں۔

''آپ کا اور لڑکی والوں کے گھر کا ماحول جو مختلف ہے۔ ایک تو کلاس کا فرق...... دوسرے ماحول کا بھی فرق...... میں تو سوچ رہی تھی کہ مینا آپ کے گھر کیسے رہ پائے گی۔''

''لڑکیاں...... اپنے آپ کو اپنے شوہر کے رنگ میں خود ہی ڈھال لیا کرتی ہیں۔ میرا بیٹا تھوڑی ناں رخصت ہو کر کہیں جائے گا۔'' ساجدہ بیگم نے وہی سبق دُہرا دیا جو ان کے شوہر انہیں باور کروایا کرتے تھے۔

''ایسا مت کہیں آپا...... میری بہو تو اپنے حساب سے چلتی ہے اس نے سسرال کا کوئی رنگ نہیں اپنایا ہے بلکہ اپنے رنگ میں سب کو رنگنا چاہتی ہے جبکہ یہاں تو کلاس کا بھی کوئی فرق نہیں ہے۔''

''وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟''

''اب ساری بہوئیں ہی ایسا کرتی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ ہماری زندگی ہے، ہم اپنے حساب سے بسر کریں گے، ہماری بہو نے بھی ہمارے گھر کا ماحول چینج کر دیا ہے۔ اب تو الٹی گنگا بہہ رہی ہے۔ پہلے ہم لوگ سسرال کے بچے بچے سے ڈر کر رہا کرتے تھے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے اور کہیں ویسا نہ ہو جائے کی تلوار ہر وقت ہمارے سر پر لٹکا کرتی تھی۔ اب تو بہویں ڈر کر نہیں رہا کرتیں بلکہ ڈرا کر رہتی ہیں۔ شوہر سے اپنے کمرے میں لڑیں گی بھی تو ان کے چلانے کی آواز باہر تک آیا کرتی ہے، بیٹے کی نہیں آتی۔'' تب ساجدہ بیگم یہ سوچ کر ملول سی ہو گئیں کہ ان کا گھرانا بھی اپنا صاف وشفاف ماحول کھو دے گا۔

☆☆☆

''لڑکے کی ماؤں کے دماغ خراب اکثر کے دیکھے ہیں مگر ریحان کی ماں کے دماغ تو لگتا ہے کہ ساتویں آسمان پر رہتے ہیں۔ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھ ہی نہیں رہی ہیں، میں نے خود فون کر کے بتا دیا کہ آج ہماری مینا کی سالگرہ ہے، گھر میں ایک چھوٹی سی تقریب ہے، آپ سب لوگ آئیے گا تو فوراً منع کر دیا اور جب میں نے کہا آپ کی بہو کی سالگرہ ہو رہی ہے تو آپ کی بھی خوشی ہے۔ تب بڑے نروٹھے پن سے بولیں...... ''ہمارے ہاں یہ سب بیکار کی خرافات نہیں ہوا کرتیں، ریحان اپنے آفس کے کام سے اسلام آباد گیا ہوا ہے اور ان کے ابو کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے معذرت خواہ ہیں کہ ہمارے گھر سے کوئی بھی نہیں آسکے گا جیسے مہارانی کو دوسرے شہر سے آنا پڑ رہا ہو۔'' دادی جان غصے میں اپنی بہو کو سنا رہی تھیں۔

''اماں بات یہ ہے کہ نہ ہم انہیں پسند کرتے ہیں اور نہ وہ ہمیں...... یہ تو زبردستی کا رشتہ جوڑا گیا ہے...... جب تک چل رہا ہے چلنے دیجیے ورنہ...... مجھے ایسا ہرگز نہیں لگ رہا ہے کہ یہ بیل منڈھے گی...... ہاں۔'' شائستہ جہاں نے ساس کے سامنے اپنے دل کی بات کہہ دی۔

''اگر ایسی بات ہے تو ان سے فوری شادی پر زور ڈالو اور جب شادی ہو ہی جائے گی تو ہمارا ان سے ناتا ہی کوئی نہیں رہے گا۔''

''ہاں' یہ ٹھیک ہے...... میں کل ہی جا کر ان سے بات کرتی ہوں۔'' شائستہ جہاں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''مٹھائی میں لپیٹ کر کڑوی گولی دینا کہ تمہاری بات ان کے حلق سے اتر جائے۔'' ساس نے سمجھایا۔

''آپ فکر نہ کریں، میں اچھے اچھوں کو کیا شیشے میں نہیں اتار لیا کرتی ہوں۔'' لہجے میں زعم تھا۔

''مگر اس دفعہ تمہارا ٹکراؤ ایک بے حد چالاک عورت کے ساتھ ہے، جو دوسروں کے فائدے یا دوسروں کے طفیل پہنچنے والے مفادات تک کو کوئی اہمیت نہیں دے رہی ہے۔''

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں





شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

شیریں حیدر

قسط 10

تم ناحق ٹکڑے چن چن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو

اس ناول میں شیشوں سے مراد صنفِ نازک ہی ہے کہ جس کے ساتھ مرد نے کبھی بھی اور کسی بھی دور میں ایسا سلوک روا نہیں رکھا، جیسا کہ رکھا جانا چاہئیے تھا- تخلیق کائنات سے لے کر اب تک مرد اور عورت کے مابین نت نئے رشتے قائم ہوتے رہے ہیں، یہ رشتے جو محبت اور احترام کے متقاضی بھی ہوتے ہیں، کبھی انہیں یہ محبت اور احترام میسر آتا ہے اور کبھی نہیں... ان دونوں کے مابین ایک ازلی رشتہ ہوس کا ہے، عورت ہمیشہ مرد کا پسندیدہ شکار رہی ہے اور رہے گی- عورت کا احترام عموماً مرد نے جن رشتو، میں کیا ہے وہ ماں، بہن یا بیٹی ہیں... بیوی کم کم ہی احترام کی حقدار ٹھہرتی ہے، وہاں بھی جہاں محبت کے بلندو بانگ دعوے کیے جاتے ہیں- بد قسمتی سے بہت سی ایسی صورتِ حال بھی آجاتی ہیں، جب عورت کا احترام بالکل ہی نہیں کیا جاتا، خواہ وہ ماں ہو، بہن یا بیٹی... مرد پر جب غصہ سوار ہو یا اس کی انا اور ضد کا معاملہ ہو تو سبھی رشتے ناتے پس پشت ڈال دیتا ہے- غصہ مرد کے دماغ پر حکمرانی کرتا ہے تو وہ عورت کو اپنی چٹکیوں میں مسل کر اپنی مردانہ حس کی تسکین کرتا ہے-

آئیں دیکھتے ہیں کہ مردوزن کے اس تعلق میں کون کیا کھوتا ہے اور کیا پاتا ہے

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

مرادنگر نامی گاؤں میں تقسیم ہندوستان سے قبل ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ اکٹھے رہتے تھے، جس طرح پاکستان کے باقی سب حصوں میں تھے۔ چوہدری مراد علی اور نور علی دو بھائی تھے، جن کے دادا کے نام پر اس گاؤں کا نام رکھا گیا تھا۔ فطرتاً دونوں بھائی بالکل مختلف ہیں، مراد علی شریف النفس اور نور علی عیاش طبع۔ مراد علی کی بیوی عابدہ اور تین بیٹے جہانگیر، شجاع اور شیر علی ہیں۔ شجاع عادات میں اپنے چچا پر ہے حتیٰ کہ ایک رات اپنی بھابی رابعہ کی عزت پر ہاتھ ڈالتا ہے، مراد علی بیٹوں میں فساد پڑ جانے کے باعث رابعہ کو یہ بات جہانگیر سے چھپانے کو کہتے ہیں اور جہانگیر، رابعہ اور شیر علی کو شہر منتقل کر دیتے ہیں۔ شہر جا کر رابعہ کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوتی ہے جس کا نام عمران رکھا جاتا ہے۔ نور علی کی بدمزاج بیوی شکیلہ ہے اور بیٹے اکبر اور بابر ہیں۔ نور علی کا بڑا بیٹا اکبر علی ہے جس کے ہاں دو بیٹیوں کے بعد دو جڑواں بیٹیوں کی ولادت ہوتی ہے تو اس کی ماں شکیلہ بیگم، ان بچیوں کے قتل کا حکم ملازماؤں کو صادر کرتی ہے۔ منشی قائم علی چند برس پہلے اپنے گاؤں خوشحال نگر سے اسی گاؤں میں آ گیا تھا۔ معراج نے ڈسپنسری بنائی اور اپنے تجربے سے ان کی مدد کرنے لگی۔ زرتاج سب سے بڑی بیٹی تھی۔ اس سے چھوٹی ماہ تاج کسی درندے کی زیادتی کا شکار ہو گئی اور چھوٹی دو جو کہ جڑواں تھیں، گم ہو گئیں۔ بچیوں کی گمشدگی کو معراج کی غفلت جان کر قائم علی نے اس کو شہر بھیج دیا۔ قائم علی سکون کی تلاش میں ایک کوٹھے پر جا پہنچا۔ ماہ تاج سے زیادتی کرنے والا سہیل ایک آوارہ اور بدکردار نوجوان ہے جو ماں باپ کے باہمی اختلافات کے باعث ذہنی انتشار کا شکار ہے۔ اس نے اپنے ساتھ زبردستی اپنے دوست سلیم کو شریک جرم کر لیا۔ سہیل کا باپ اسلم کردار کا کمزور آدمی ہے۔ قائم علی کی جڑواں بیٹیوں میں سے ایک، جہاں آرا نامی طوائف کے ہاتھ لگتی ہے جس کے پاس اس سے قبل ہر عمر کی چھ لڑکیاں پہلے سے موجود ہیں۔ الماس سب سے بڑی ہے اور اس کا نام فیروزہ رکھا جاتا ہے۔ جہاں آرا کا اپنا سگا بیٹا، دلاور ہے، جسے عرف عام میں دلی کہتے ہیں۔ جہاں آرا اسے پڑھا لکھا کر بڑا آدمی بنانا چاہتی ہے۔ مریم ایک استانی ہے، جس کا آگا پیچھا اس کے محلے میں کسی کو معلوم نہیں۔ اپنی ملازمہ جینا کو وہ یہ بتاتی ہے کہ اس کی کزن سائرہ نے اسے یہ بیٹی دے دی ہے۔ یوں قائم علی کی بیٹیاں، حسن آرا، ستارہ بن کر مریم کے گھر میں اور نین تارا، فیروزہ بن کر جہاں آرا کے گھر میں پروان چڑھ رہی ہیں۔ زرتاج جب چوہدرانی شکیلہ کا حکم سنتی ہے تو خوف زدہ ہو جاتی ہے۔ اسی اثنا میں خبر آتی ہے کہ چوہدری اکبر علی کو سانپ نے ڈس لیا ہے۔ پیدا ہونے والی بچیوں میں سے ایک تھوڑی دیر کے بعد مر جاتی ہے اور اکبر علی کی بیوی فاخرہ کی حالت بھی خراب ہو جاتی ہے۔ زرتاج بے اختیاری میں اس بچی کو اٹھا کر شاکر کے پاس جاتی ہے۔ شاکر گاؤں کا نوجوان سنار ہے اور اس کی بات زرتاج سے تقریباً طے ہے۔ زرتاج شاکر سے کہتی ہے کہ اس بچی کو چھپا لے۔ زرتاج کے علم میں لائے بغیر وہ نور کے تڑکے اس بچی اور اپنا سارا سونا وغیرہ لے کر گاؤں سے شہر کی طرف روانہ ہو جاتا ہے۔ راستے میں بس میں اس کی ملاقات ناہید نامی ایک نوجوان خاتون سے ہوتی ہے۔ بس میں وہ بچی کو سنبھال لیتی ہے اور جب شاکر بس سے اتر کر کچھ لینے کو باہر جاتا ہے تو واپسی پر وہ لڑکی غائب ہوتی ہے۔ بی بی جی گاؤں کی بچیوں کو قرآن کی تعلیم دیتی ہیں۔ ان کا بیٹا عباس اور بیٹی کلثوم...... دو ہی اولادیں ہیں۔ عباس ہندو گھرانے کی ایک لڑکی سے دوستی قائم کر لیتا ہے۔ عباس، دیا کو لے کر بھاگ جاتا ہے تو پنچایت کے فیصلے کلثوم کی شادی ہندوؤں کے نوکر گھوٹو سے کرنے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اسی رات کلثوم کی سہیلی کاجل خودکشی کر لیتی ہے کیونکہ وہ دیا کے بھائی شیکھر کی منگیتر ہے اور گھر والوں کو شک ہے کہ کاجل دیا کی شریک راز تھی، حقیقت بھی یہی تھی۔ اسی رات کی سحر کو بی بی جی فجر کی نماز پڑھتے ہوئے ایسی سجدے میں گئیں کہ اٹھ ہی نہ سکیں۔ کلثوم بھری دنیا میں تنہا رہ گئی۔ سہیل کے فیل ہونے پر اس کا باپ اسے برا بھلا کہتا ہے۔ فاخرہ کا انتقال ہو جاتا ہے۔ دیا نے اسلام قبول کر کے عباس سے شادی کر لی۔ اس کا نام زہرہ ہے اس کے یہاں بیٹی پیدا ہوتی ہے۔ شجاع کے آدمی معراج کے گھر میں گھس کر زرتاج کو لے جانے کی کوشش کرتے ہیں مگر کامیاب نہیں ہوتے۔ موجی، قائم علی سے طلاق کا مطالبہ کر دیتی ہے اور دوسری طرف الماس قائم سے شادی پر زور دیتی ہے۔ ناہید کو اس کا شوہر طلاق دے دیتا ہے۔ کلثوم ماں بننے والی ہے لیکن گھوٹو یعنی جہانداد نہیں چاہتا کیونکہ اگر کلثوم ماں بن گئی تو اس کو کام کرنا پڑے گا۔ اکبر علی کی ملاقات رانی سے ڈیرے پر ہوتی ہے اور وہ اس کو دوبارہ آنے کے لیے کہتا ہے۔ رانی نگی ہے کہتی ہے تو نگی جانے سے انکار کر دیتی ہے۔ رابعہ حویلی آتی ہے تو عمران کی پیدائش کی خوشی میں دعوت کا اہتمام ہوتا ہے، زرتاج وہاں فیضی کو دیکھ کر رابعہ سے اس کے بارے میں پوچھتی ہے۔ ناہید کی بیٹی اور شاکر کی بیٹی کا نام سیما اور ربیعہ رکھا جاتا ہے، ناہید کو انور طلاق دے دیتا ہے۔ سہیل کو اس کا ضمیر ملامت کرتا ہے اس کے ذہن سے سلیم کا تصور محو نہیں ہوتا۔ رابعہ شہر آ کر جہانگیر کو شجاع کی حرکت کے بارے میں بتاتی ہے جس پر جہانگیر غصہ کرتا ہے۔ کلثوم جہانداد کو اندازہ نہیں ہونے دیتی کہ اسے اس کی سازش کا علم ہو گیا ہے۔ نگی رانی کے لیے پریشان ہوتی ہے دلاور، جہاں آرا کی لاکھ کوشش کے بعد گزرتے وقت کے ساتھ اسی رنگ میں رنگ گیا جو ایسے جگہوں پر رہنے والوں کے ہوتے ہیں۔ شاکر گاؤں جانا چاہتا ہے لیکن بچی کی طبیعت خراب ہونے کی وجہ سے جا نہیں پاتا۔ (اب آگے پڑھیں)

"کون سا کام ہے اماں، بتاؤ میں کر دیتی ہوں......" اس نے کاہلی سے کہا، ماں کی طبیعت کو جانتی تھی اس لیے اس وقت اس کی ناراضی مول نہ لے سکتی تھی، یوں بھی اکبر علی سے ملن کا نشہ اب ٹوٹ رہا تھا اور اس کا من پھر اس سے ملنے کو چاہ رہا تھا، ماں کو منائے بغیر گھر سے باہر نہیں نکل سکتی تھی، اس روز بھی اس نے ماں کو کام کے پیسے بھی نہیں دیے تھے، کام کیا ہوتا تو پیسے ملتے۔ اس نے تو فقط اکبر علی کو خوش کرنے کا کام کیا تھا اور اس کے سلسلے میں جو کچھ اسے اکبر علی نے دیا تھا اسے تو وہ خود سے چھپاتی پھر رہی تھی...... اس کی مرحومہ بیوی کے کانوں کے بندے وہ کس طرح پہن سکتی تھی یا کسی کو بتا سکتی تھی کہ اسے کہاں سے ملے تھے اور کیوں......

اس دن سے اب تک وہ راتوں کی تنہائی میں، جب گھر کے سبھی لوگ نیند کی گہرائی میں ہوتے، وہ ان بندوں کو نکال کر انہیں ہاتھ میں پکڑ کر چھو کر محسوس کرتی 'اندھیرے کی وجہ سے انہیں دیکھ تو نہ پاتی تھی مگر اسے ان کا ایک ایک نگ اور موتی یاد تھا...... ان بندوں کو چوہدری اکبر علی کے ہاتھ کے لمس کے بعد اس کے کانوں کا نصیب بننا اسے اس کی اپنی نظروں میں بلند کر دیتا تھا' ان لمحات کو سوچ کر ایک سکون اور خوشی کا احساس اس کے وجود کی گہرائیوں میں اترنے لگتا۔ اسے بار بار چوہدری اکبر علی سے ملاقات کی خواہش ہوتی۔

"تمہیں دیکھ کر تو ہم ہوش ہی کھو بیٹھے ہیں رانی!" اس کے کان کے پاس ہی سرگوشی ہوتی...... "ہمارے دل کی سلطنت کی رانی بن گئی ہو تم رانی!" اسے ایک خوش کن احساس چھو کر گزرتا...... "تم نے ہمیں وہ خوشی دی ہے رانی کہ جس کو ہم اپنی بیوی کے مرنے کے بعد سے ترس ہی گئے تھے!" ایک اور خوشگوار فقرہ اس کے کانوں کو چھوتا...... وہ سب کچھ لٹا کر بھی اس احساس سے بے نیاز تھی کہ وہ کیا کھو بیٹھی ہے۔

اس کا کسی کام میں دل لگتا تھا نہ کسی سے بات کرنے کو، وہ اپنے دل کی الگ دنیا بسائے بیٹھی تھی۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ نگی کو بتائے کہ اسے کون سی دولت مل گئی تھی، اسے اکبر علی کے دل کی مسند پر وہ مقام مل گیا تھا جس کی خواہش کرتے کرتے لڑکیوں کی عمریں گزر جاتی ہیں...... اور وہ لڑکیاں جو اس جیسے نصیب لے کر غریب گھروں میں پیدا ہوتی ہیں، وہ کہاں اس مرتبے کو پہنچ پاتی ہیں مگر ایک بات کا ڈر تھا کہ کہیں وہ اماں سے بات کر دیتی تو اماں اس کا گھر سے نکلنا بند کر دیتی۔ اماں کو خوش رکھنا ضروری تھا تاکہ کسی نہ کسی طرح اکبر علی سے ملاقات کے راستے کھلے رہیں۔

اس کا سرہانہ ہی اس کے سارے رازوں کا امین تھا، اسی سے وہ اپنے دل کی ساری باتیں کرتی، اسی کے پھولوں کی کڑھائی والے غلاف میں اس نے وہ بندے چھپا رکھے تھے، جو اس نے فقط چند لمحوں کے لیے پہن کر اکبر علی کو دکھائے تھے اور اس نے اسے ایسی نظر سے دیکھا تھا کہ وہ خود اپنی نظر میں بھی معتبر ہو گئی تھی۔ اس نے اسے زمین سے اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیا تھا، اس نے کب اکبر علی کی ایسی قربت کا سوچا تھا...... کب اس نے خواب میں بھی سوچا تھا کہ اکبر علی اس ٹاٹ کے ٹکڑے کو مخمل کی طرح بنا دیں گے؟

"مجھے اکبر علی کا ساتھ چاہیے...... چاہے اس کے لیے مجھے کسی بھی حد سے گزرنا پڑے، کسی کا خون کرنا پڑے، ماں باپ کو ناراض کرنا پڑے اس کے لیے مجھے جائز اور ناجائز میں کوئی تمیز نہیں!" وہ بڑبڑائی تھی۔

"یہ تو کیا آدھی رات کو بڑبڑ کر رہی ہے؟" اس کی ماں کی باہر برآمدے سے آواز آئی تو وہ چونک اٹھی اور ان بندوں کو فوراً چھپا لیا۔

''کہیں جو ماں اندر آجاتی تو، اللہ کا شکر ہے کہ بچت ہوگئی ورنہ.....'' اسے سوچ کر بھی جھرجھری آگئی۔

☆☆☆......☆☆☆

ستارہ اب بغیر سہارے کے چلنے لگی تھی، جونہی مریم اسکول سے لوٹتی وہ اس کی طرف لپکتی، مریم اپنی بانہیں وا کرتی اور وہ بھاگ کر ان میں سما جاتی..... مریم کے اندر ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مارنے لگتا، جینا اس کی خوش بختی پر رشک کرتی جسے مریم جیسی محبت کرنے والی ماں ملی تھی۔ دن بھر جینا اس کا خیال رکھتی تھی مگر ذرا جو اس سے کوتاہی ہوئی ہوتی، وہ فوراً شکایت کی صورت مریم تک اپنی توتلی زبان میں پہنچاتی..... ''ماسی نے کیلا نہیں دیا..... ماسی نے میرے منہ پر صابن لگایا.....'' مریم جینا کو مصنوعی انداز میں ڈانٹتی اور اس بات پر مریم کی گڑیا مریم سے لپٹ جاتی۔ ''اماں اچھی، ماسی گندی.....''

''اونہوں بیٹا..... ایسے نہیں کہتے، ماسی بہت اچھی!'' مریم اسے پیار سے کہتی تو وہ اسے بے یقینی سے دیکھتی۔ ''گڑیا بولے گی، ماسی بھی اچھی!''

''ماسی تھوڑی سی اچھی.....'' وہ ہتھیار پھینکنے کے انداز میں کہتی تو جینا اور مریم کی ہنسی نکل جاتی۔

مریم اس کے لیے اچھی اچھی تصویروں والی کتابیں لے کر آتی، کھلونوں سے زیادہ گڑیا کو کتابوں سے دلچسپی تھی۔ اسے بہلانے کے لیے سب سے بہترین کھلونا نئی کتاب ہی ہوتی تھی، اپنی عمر کے حساب سے وہ انتہائی احتیاط سے کتاب کو کھولتی، اس کی ہر ہر تصویر کو غور سے دیکھتی اور مریم سے اس کا نام پوچھ کر اپنے حافظے میں محفوظ کرلیتی۔ مریم کو اس کی دلچسپی سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس میں سیکھنے کی بہت صلاحیت ہے۔

''جو تم نہ ہوتیں جینا تو سچ مانو مجھے اس بچی کو سنبھالنے کے لیے اپنی ملازمت چھوڑنا پڑتی!'' مریم دل سے جینا کا احسان مانتی تھی۔ اس کی بری عادتیں جو بھی ہوں گی سو ہوں گی مگر مریم کو اس پر بہت اعتماد تھا۔ اس کی غیر موجودگی میں وہ اس بچی اور اس کے گھر کا خیال رکھتی تھی اور آج تک کوئی چیز ادھر سے اُدھر نہیں ہوئی تھی، گڑیا کو وہ اسی طرح پیار کرتی تھی جیسے مریم خود کرتی تھی، اس ایک ننھے وجود سے دو عورتوں کی پیاسی ممتا سیراب ہوتی تھی۔ مریم کے سر پر کسی وقت یہ بوجھ آن پڑتا کہ جس وجود سے اس کی ممتا کی تسکین ہوتی ہے، اس کی اپنی ماں کا کیا حال ہوگا! شاید اس کے بہت سے بچے ہوں گے اور وہ اس معصوم کو پھینک گئی ہوگی مرنے کے لیے، ممکن ہے کہ اس کے شوہر نے بیٹی کی پیدائش پر اسے طلاق کی دھمکی دی ہو اور وہ اسے گھر سے لے کر نکلی ہوگی کہ کہیں چھوڑ آئے اور اس کے ہاتھوں سے بچی گر گئی..... شاید بچی گر کر بے حس و حرکت ہوئی ہوگی تو اس کو مرا ہوا سمجھ لیا گیا ہوگا..... ڈاکٹر نے بتایا تھا کہ بچی بارہ چودہ گھنٹے سے زیادہ عرصے تک بے ہوش رہی تھی۔ کبھی اگر جا کر اس جگہ سے پڑتال کروں تو کوئی نہ کوئی سراغ اس کے گھر والوں کا مل ہی جائے گا مگر اگلے ہی لمحے وہ یہ سوچ کر اپنی سوچ کو جھٹک دیتی کہ وہ گڑیا کے بغیر کیسے رہ پائے گی.....

''ویسے میرا مشورہ مانیں مریم باجی!'' جینا نے کہا۔ ''اب یہ سمجھدار ہوگئی ہے، اب اسے آپ اپنے ساتھ اسکول لے جایا کریں، میں تو ویسے بھی گندی ہوں، اس کو تنگ کرتی ہوں۔''

''نہیں، میں نے نہیں اسکول جانا، گھر پر رہنا، ماسی گندی نہیں۔'' وہ رونے لگی اور مریم نے ہنس کر دُہرے ہوتے

ہوئے اسے اپنے ساتھ لگالیا۔

''تنگ نہ کرو جینا ہماری گڑیا کو!'' اس نے منہ بسورتی گڑیا کا بوسہ لیا۔ ''یہ تو اپنی اماں کی جان ہے اور اماں اسے بہت اچھے اسکول میں داخل کروائیں گی!'' اس نے کہا۔

''میں کہیں نہیں جاؤں گی اماں!'' وہ ٹھنکی۔

''اچھے بچے اسکول جاتے ہیں اور پڑھ لکھ کر بڑے لوگ بنتے ہیں!'' گڑیا کو اس نے پیار سے سمجھایا۔

''کل جاؤں گی، آج نہیں!'' اس نے معصومیت سے کہا جیسے کل حالات کوئی مختلف ہوجائیں گے۔

''ٹھیک ہے، جب گڑیا خود کہے گی، تب ہم گڑیا کو اسکول لے کر جائیں گے.....'' مریم نے اس کو تسلی دی۔

''گڑیا جب کہے گی، تب اماں اسکول لے کر جائیں گی.....'' اس نے جینا کو جتلانے والے انداز میں کہا۔

''کتنی ذہین ہے باجی!'' جینا نے کہا۔ ''فوراً بات بنالی ہے اس نے.....''

''بیٹی کس کی ہے آخر؟'' بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا اور جینا اس کا اور وہ جینا کا منہ دیکھنے لگی، جینا تو اس کی سادگی پر حیران تھی مگر اس کا اپنا دماغ جیسے لمحوں میں کہیں اور چلا گیا تھا..... ''کس کی بیٹی ہے یہ آخر.....'' وہ سوچے بنا نہ رہ سکی تھی۔

☆☆☆......☆☆☆

''دیکھیے صاحب.....'' انہوں نے چتون چڑھا کر کہا۔ ''بات سیدھی سی ہے، اگر ہمارا نقصان ہوا ہے تو آپ ہی ہمارے آنسو پونچھ سکتے ہیں فقط!'' ان کا لہجہ کاروباری تھا مگر قائم علی فطرتاً سیدھا آدمی تھا، شہری اور خصوصاً ایسی عورتوں کے چلتر کیا سمجھتا، اسے دل سے اس بات کا دکھ ہوا کہ اس کی وجہ سے جہاں آرا کے مستقبل کی امید دم توڑ گئی تھی۔ یہ احساس نہ صرف اسے جہاں آرا کے رویے نے دلایا تھا بلکہ اس کے اپنے دل میں احساسِ گناہ بھی تھا اور اس کا ازالہ بھی کرنا چاہتا تھا۔

''کھل کر بات کریں آپ.....'' قائم علی نے الجھتے ہوئے کہا۔

''مروت مارے ڈالتی ہے ورنہ بات تو کھل کر ہی کرنی چاہیے!'' ان کے انداز میں بیگانگی سی در آئی تھی جسے وہ بھی محسوس کیے بغیر نہ رہ سکا تھا۔

''اماں جلد بات ختم کرو.....'' دلی نے مداخلت کی، اتنی دیر سے وہ یوں خاموش تھا جیسے وہ وہاں تھا ہی نہیں۔ اسے شاید دخل اندازی نہ کرنے کی ہدایت پر عمل کرنا برا لگ رہا تھا۔ وہی دلی جو کتنی تہذیب سے بات کرتا تھا، اب اپنے ماحول کی کھلی عکاسی کرتا تھا، جب تک اسکول جاتا تھا اس کی بات چیت میں اور اس کی اب کی گفتگو میں زمین آسمان کا فرق آگیا تھا، یہی وہ وجہ تھی کہ جس کی وجہ سے جہاں آرا اسے اس گھر اور اس کی سرگرمیوں اور اس ماحول سے دور رکھنا چاہتی تھیں مگر اپنے ہم جماعتوں کے مسلسل تنگ کرنے سے اس نے اسکول جانے سے صاف انکار کردیا تھا اور وہ جو آنکھوں میں اسے کوئی بڑا آدمی بنانے کے خواب سجائے بیٹھی تھی اس کے سارے خواب کرچی کرچی ہوگئے تھے۔ وہ نہ صرف گھر پر بیٹھ گیا تھا بلکہ وہی بن گیا تھا جو وہ اسے بنانا نہیں چاہتی تھی۔

''اگر لڑکی ہوئی تو ہماری صاحب اور لڑکا ہوا تو بے شک آپ لے لیں.....'' انہوں نے آغاز کیا۔ ''یہ ہماری

پہلی شرط ہے......"

"یہ کیا شرط ہوئی......" قائم علی نے ناراضی سے کہا۔ "اگر میں الماس سے شادی کرتا ہوں تو جو بھی کچھ ہو گا وہ ہمارا ہی ہوگا!"

"کیا تمہارا خاندان اس بات کو قبول کرلے گا؟" انہوں نے طنز سے پوچھا۔ "کیا بتائیں گے آپ اپنے خاندان والوں کو الماس کے بارے میں اور کس طرح اسے وہ مقام دلا سکیں گے جس کی وہ حق دار ہوگی...... آپ کی بیوی ہونے کی حیثیت سے؟"

"وہ میرا مسئلہ ہے!" انہوں نے فوراً کہا۔ "مجھے اپنے خاندان والوں سے کس طرح بات کرنا ہوگی اور کس طرح ان سے نمٹنا ہوگا، اس کے لیے مجھے آپ کی رہنمائی کی ضرورت نہ ہوگی!" جہاں آرا کو یہ بتانے کی انہیں ضرورت نہ تھی کہ ان کا خاندان فقط ایک بیٹی اور ایک ایسی بیوی پر مشتمل تھا جو اُن کے ساتھ بھی نہ تھی۔

"شادی کر کے الماس آپ کی ملکیت تو بن جائے گی مگر وہ رہے گی یہیں پر......" انہوں نے حتمی انداز میں کہا۔ "اس جگہ سے رخصت ہو کر جانے والیاں جلد ہی لوٹ کر آ جاتی ہیں، اس دنیا سے باہر ایک اور دنیا ہے صاحب اس دنیا کے مکینوں کے ظرف اتنے چھوٹے ہیں کہ وہ تائب ہو جانے والی طوائف کی سات نسلوں تک کو طوائف کی اولاد ہی کہتے ہیں...... ہم اپنی بیٹی کو اس رسوائی سے دوچار نہیں ہونے دیں گے!"

"مگر......" قائم علی نے کچھ کہنا چاہا۔

"ہماری آخری شرط یہ ہے کہ آپ شادی سے قبل اپنی جائداد اپنے بچے کے نام لگائیں گے......" انہوں نے منہ پھیر کر کہا۔ "اور ہاں یہ نہ سمجھیے گا کہ ہمیں آپ کی دولت کا لالچ ہے اگر ایسا ہوتا تو ہم یہ جائداد آپ کو الماس کے نام لگانے کو کہتے! اور اگر آپ کو یہ سب شرائط منظور ہوں تو......"

"تو؟" انہوں نے نظر اٹھا کر اس عورت کی طرف دیکھا جو اس وقت ان کے ساتھ ایک مجبور عورت کی حیثیت سے بات کر رہی تھی مگر حقیقت میں وہ خود کو مجبور اور محصور محسوس کر رہے تھے۔

"تو اگلی دفعہ نکاح کا بندوبست کر کے جائداد کے کاغذات ساتھ لے کر آئیں!" انہوں نے جیسے نکاح کا دن مقرر کر دیا۔ "اب آپ جا سکتے ہیں......" وہ اٹھے اور چل دیے "اور ہاں!" انہوں نے مڑ کر دیکھا۔ "ہمیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہونی چاہیے کہ ہماری یہ ملاقات خفیہ ملاقات ہے، الماس کو اس کا علم نہیں ہونا چاہیے......" انہوں نے خاموشی سے اس عورت کے اس مطالبے پر سر ہلایا، جس نے ابھی ان کے سامنے اپنی شخصیت کی کئی پرتیں اتاری تھیں اور باہر کی طرف چل دیے۔

☆☆☆......☆☆☆

"اِدھر آ لڑکی......" انہوں نے اسے پکارا۔ "تو کیا سارا دن دالیں صاف کرتی رہتی ہے، اِدھر آ!" وہ خاموشی سے دال کی پرات رکھ کر اٹھی اور ان کے پاس جا کر کھڑی ہوگئی۔ "کھڑی کیا ہے، یہ تیل پکڑ اور میری کمر پر مالش کر!" وہ متذبذب سی کھڑی اس نیم عریاں شخص کو دیکھ رہی تھی، یہ چوہدری نور علی تھا، وہ کئی بار دوسری ملازماؤں کو یہ فریضہ سرانجام دیتے دیکھ چکی تھی اور دل ہی دل میں اس پر کراہیت محسوس کرتی تھی اور اب وہ خود کو کسی شکنجے میں پھنسا ہوا، بے بس محسوس کر رہی تھی۔

"جی...... میں؟" وہ ہکلائی تھی۔

"تو نہیں تو کیا تیرے فرشتے......" انہوں نے غصے سے کہا۔ "تیرے ہاتھ ٹوٹے ہوئے ہیں کیا؟"

"مگر میں کیسے آپ کو مالش کر سکتی ہوں؟" اس نے ہمت کر کے کہا۔ "آپ کوئی میرے محرم تو نہیں ہیں!" انہوں نے دیکھا کہ صحن میں کام کرتی تمام ملازمائیں بظاہر اپنے کام میں مگن مگر کن انکھیوں سے اسی طرف دیکھ رہی تھیں۔

"ہاہاہاہا......" وہ بے ہودگی سے منہ پھاڑ کر ہنسے۔ "محرم بننا چاہتی ہے تو میری...... بیاہ کر لوں کیا تجھ سے؟" وہ غرائے۔

"نہیں جی، بیاہ تو میرا ہو چکا ہے......" اس نے اتنی سادگی سے کہا کہ صحن میں کام کرتی ہوئی باقی ملازمائیں دوپٹوں کے پلو منہ میں دبا کر کھی کھی کر کے ہنسنے لگیں۔

"اچھا......" انہوں نے اسے گھوری ماری۔ "کس سے ہوا ہے تیرا بیاہ؟" وہ سر سے پیر تک اس کا جائزہ لے رہے تھے۔ "کون ہے تیرا خصم...... میرا مطلب ہے کہ تیرا محرم؟"

"وہ جی......" وہ جھجک کر بولی۔ "جہانداد سے جی!"

"کون جہانداد، کس گھر کا لال ہے، کس گھر کا ہے؟" انہوں نے ماتھے پر بل ڈال کر پوچھا۔

"گھوٹو جی......" ایک ملازمہ نے اس کی مشکل آسان کی، اپنے منہ سے بول کر تو وہ کبھی بھی گھوٹو نہ کہنا چاہتی تھی اور جہانداد کے نام سے اسے جانتا کوئی نہ تھا۔

"اوہو...... گھوٹو......" انہوں نے عجیب سے انداز میں کہا۔ "تو تو حافظ کرم اللہ کی بیٹی ہے؟" انہیں کب شک تھا کہ حافظ کرم اللہ کی بیٹی اتنی خوب صورت اور کمسن ہو سکتی ہے، ورنہ اسے گھوٹو کی بیوی بنانے کے بجائے اپنی بیوی بنانے کی سزا دیتے۔

"جی!" اس نے تھوک نگلتے ہوئے کہا۔

"تو کیا گھوٹو نے تجھ سے کہہ رکھا ہے کہ چوہدری صاحب کو مالش نہ کرنا؟" انہوں نے بے ہودگی سے سوال کیا۔ جس کا جواب اس کے پاس تو یہی تھا کہ گھوٹو اتنا غیرت مند کہاں...... مگر وہ خاموش رہی۔ اسے چوہدری صاحب کا بار بار گھوٹو کہنا۔ ان کے فضول سوالات اور صحن میں کام کرتی ہوئی ملازماؤں کا متوجہ ہو کر دبی دبی ہنسی ہنسنا، سب کچھ اتنا برا لگ رہا تھا کہ وہ اس منظر سے غائب ہو جانا چاہتی تھی۔

"میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے......" اس نے بے سوچے سمجھے بنا کہہ دیا۔

"کیا ہوا تیری طبیعت کو جو مالش کا سن کر اچانک خراب ہوگئی ہے؟" انہوں نے طنز سے کہا۔

"وہ جی دوجے جی سے ہے یہ......" اچانک کسی ملازمہ نے غالباً اس کی جان چھڑوانے کو کہا مگر اس کے بعد جس نظر سے انہوں نے اسے دیکھا، وہ آنکھیں بند کر کے کھڑی کی کھڑی رہ گئی، کاش زمین پھٹ جاتی اور وہ اس میں سما جاتی، کیا ضرورت تھی ان جیسے آدمی کے سامنے اس کی حالت بیان کرنے کی۔

"چل دفعان ہو جا......" انہوں نے حقارت سے اسے دیکھا۔ "مر جا کر اپنا کام کر!" ان کی اتنی نفرت اور اپنی سب کے سامنے ہتک ہوتے دیکھ کر اس کا دل چاہا کہ وہ آئندہ کبھی یہاں کا رخ نہ کرے مگر مرتی کیا نہ کرتی۔ کسی روبوٹ کی طرح وہ مشینی انداز میں چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے چل دی۔ ہمیشہ سے وہ زنان

خانے کے اندرونی حصوں کی طرف کام کرتی تھی، جانے آج اس کی یہ بے عزتی ہونا تھی جو وہ صحن میں کام پر مامور کر دی گئی تھی۔ آنسو اس کی لاکھ کوشش کے باوصف بھی آنکھوں کے اندر نہیں رک رہے تھے، وہ ہونٹ کاٹتے ہوئے جا کر باورچی خانے کے دروازے کے پاس کھڑی ہو گئی، ان آنسو بھری آنکھوں سے وہ چوہدرانی صاحبہ کے سامنے بھی نہیں جا سکتی تھی۔

''کاش...... کاش میرے اللہ تو نے ہی میری کچھ نہ کچھ مدد کی ہوتی، لالہ اتنا غلط کام نہ کرتے یا اماں نہ مرتیں یا میرے لیے سزا کے طور پر گھوٹو کو نہ چنا جاتا مگر اب یہ ساری خواہشات کاش بن کر رہ گئی تھیں...... اس کے نہ چاہنے کے باوجود یہ سب کچھ ہو چکا تھا۔

☆☆☆............☆☆☆

سیما کی حالت اتنی بگڑ گئی کہ شاکر کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، سب سے زیادہ تو یہ فکر ہو گئی تھی کہ اگر بچی مر مرا گئی تو وہ زرتاج کو کیا جواب دے گا، جس نے اس پر اتنی بھاری ذمے داری ایک افتاد کی طرح ڈالنے سے قبل ذرا دیر کو بھی نہ سوچا تھا کہ وہ کس طرح اس کو نبھا پائے گا۔ سلمٰی نے پہلے تو گھریلو ٹونے ٹوٹکے کیے اور اس کی حالت نہ سنبھلی تو شاکر سے کہا کہ اسے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا پڑے گا۔ شاکر خود ہی اس کو لے کر نکلنے والا تھا کہ سلمٰی اس کی مجبوری کو جان کر سعید کو بتا کر ساتھ ہو لی کہ وہ کہاں بچی کو سنبھالتا پھرے گا، جاتے ہوئے اس نے فرید کو بھی ساتھ لے لیا تھا۔

ڈاکٹر نے بچی کو ڈرپ لگا دی تھی اور کچھ دوائیں لکھ کر دی تھیں جو کہ ڈرپ کے ساتھ ہی لگائی جانا تھیں، شاکر نے چٹ لی اور دوائیں لینے چلا گیا۔ بچی کے پاس سلمٰی اور فرید رہ گئے تھے، نماز کا وقت نکل رہا تھا، فرید کو بٹھا کر سلمٰی وضو کر کے نماز پڑھنے لگی۔ شاکر دوائیں لے آیا تو وہ دوائیں ڈرپ میں شامل کر دی گئیں اور آہستہ آہستہ اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ چند گھنٹوں کے بعد اسے اسپتال سے فارغ کر دیا گیا اور ڈاکٹر نے خاص طور پر ہدایت کی تھی کہ اسے ماں کے دودھ کے سوا کچھ اور نہ دیا جائے۔

ناہید کو دو دو بچیوں کو دودھ پلاتے ہوئے دیکھ کر سلمٰی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ خود کمزور ہو رہی تھی، اس لیے اس نے سیما کو تھوڑا سا اوپر کا دودھ دے دیا تھا اور یہی اس کی اس اچانک بیماری کی وجہ بن گئی تھی۔ اس کی اس خود غرضی نے اس بے چاری کو تقریباً مار ہی ڈالا تھا...... ایک بار اس کے دل میں آیا بھی تھا کہ کہیں بچی بیمار ہی نہ ہو جائے مگر ناہید کی صحت کا خیال کر کے ہی اس نے ایسا کیا تھا، اگر جو شاکر کو علم ہوتا تو کیا سوچتا، وہ سوچ کر پچھتائی۔

گھر آ کر بھی بچی کا خاص خیال رکھنا پڑ رہا تھا کیونکہ ایک بار اسے ٹھیک ٹھاک جھٹکا لگ چکا تھا اور اب دوبارہ جو وہ بیمار پڑتی تو شاید سنبھل ہی نہ پاتی۔ اسی وجہ سے شاکر نے اپنا گاؤں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا، کچھ شادیوں کا جیسے موسم شہر میں اتر آیا تھا کہ محرم سے پہلے دھڑا دھڑ شادیاں ہو رہی تھیں اور اس کا کام کافی بڑھ گیا تھا۔ گاؤں میں تو شادیاں فقط فصل کی کٹائی کے بعد ہوتی تھیں جبکہ شہر میں ماسوائے محرم کے سارا سال ہی شادیاں ہوتی رہتیں۔ کام میں اس کی صفائی اور دیانت داری نے جلد ہی اسے سارے بازار میں مشہور کر دیا تھا، چھوٹے پیمانے پر شروع کیا جانے والا کام دنوں میں بڑھ رہا تھا۔

رات تھک ہار کر اپنے بستر پر لیٹتا تو اس کی یاد چھم سے اس کے من آنگن میں اتر آتی اور پھر اسے خبر تک

نہ ہوتی کہ کب صبح ہوئی، وہ اتنا مست ہو کر سوتا کہ بسا اوقات سیما کے رونے سے بھی اس کی آنکھ نہ کھلتی۔

☆☆☆........☆☆☆

"میں سوچ رہا ہوں بابو جی کہ شجاع کو شہر لے جاؤں۔" جہانگیر نے کہا۔ "شہر جائے گا، ماحول کا فرق پڑے گا تو اس کا ذہن تبدیل ہونے میں بھی مدد ملے گی!"

"ہرگز نہیں......" بابو جی کے منہ سے بے اختیاری میں نکل گیا۔

"کیا......؟" وہ حیران ہوا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں بابو جی اور اس میں اتنا طیش میں آنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"نہیں...... میرا مطلب یہ تھا کہ میں چاہتا ہوں کہ وہ میری نظروں کے سامنے رہے، میں اسے اپنی نگرانی میں رکھنا چاہتا ہوں، اسے میرا ذرا سا ڈر تو ہے۔ شہر جائے گا تو اور بھی آزاد سمجھنا شروع ہو جائے گا خود کو!" انہوں نے بات سنبھالی۔

"میں بھی اس پر نظر رکھ سکتا ہوں اور میں بھی اس کی کڑی نگرانی کر سکتا ہوں بابو جی!" جہانگیر نے جرح کی۔

"آپ تو گھر سے نکل ہی نہیں پاتے...... آپ اس کی کیا نگرانی کریں گے!" چوہدری مراد علی اس وقت ایسے پھنسے تھے کہ انہیں سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہیں۔

"تم خود کون سا شہر میں ٹک کر رہتے ہو پتر جو اُس کی نگرانی کرو گے......" انہوں نے کہا۔ "کبھی تم شہر میں ہوتے ہو، کبھی گاؤں آ جاتے ہو!"

"جب میں شہر میں نہیں ہوں گا تو اچھا ہے کہ وہ گھر پر رابعہ کے پاس ہوا کرے گا!" اس نے فوراً جواز پیش کیا۔

"رابعہ کے پاس شیر علی ہے، ہمارے خاص ملازمین ہیں......"

"بابو جی...... شیر علی تو پھر بچہ ہی ہے نا!" اس نے زور دے کر کہا۔

"کیا ہم اس بحث کو پھر کسی وقت کے لیے اٹھا سکتے ہیں؟" انہوں نے حتمی انداز میں کہا تھا، گویا وہ اس موضوع پر مزید بات نہیں کرنا چاہتے تھے، جہانگیر کے ذہن میں الجھن سی تھی، وہ تو سمجھ رہا تھا کہ وہ بات کرے گا اور بابو جی اس کے اس اچھوتے خیال پر خوش ہو جائیں گے مگر بابو جی اس موضوع پر بات کرنے سے کترا رہے تھے...... "کیا وجہ ہو سکتی ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ رابعہ نے بابو جی سے بات کی ہو...... مگر وہ کیسے بات کر سکتی ہے، جب سے وہ شہر گئی ہے اس کے بعد سے اس کی بابو جی سے بات ہی نہیں ہوئی ہو گی۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے اس خیال سے کہا ہو کہ اماں اس بات کی اجازت نہ دیں گی، میرے اور شیر علی کے شہر چلے جانے کے بعد ایک وہی تو رہ گیا ہے ان کے پاس...... ضرور یہی بات ہے۔" اس نے خود کو تسلی دی۔

☆☆☆........☆☆☆

"جان کیوں نہیں چھوڑ دیتے ہو تم میری؟" وہ بہ آواز بلند بول رہا تھا، اس کے بار بار اس طرح کہنے کو وہ فراموش نہیں کر سکتی تھیں۔ شاید وہ سوتے میں بڑبڑا رہا تھا، انہوں نے نفسیات پڑھ رکھی تھی اور سمجھ رہی تھیں کہ کوئی الجھن ہے ان کے بیٹے کے دل میں۔ مگر بارہا پوچھنے پر بھی وہ ٹال مٹول کر دیتا تھا۔

"کیا بات ہے سہیل بیٹا؟" انہوں نے اس کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا کر اس سے پوچھا۔ اندر سے کوئی

جواب نہ پا کر انہوں نے دروازہ ہلکا سا وا کیا تو دیکھ کر حیران رہ گئیں کہ وہ سو رہا تھا اور سوتے میں بڑبڑا رہا تھا، وہ اس کے سرہانے جا کر کھڑی ہو گئیں۔

"تمہیں اللہ کا واسطہ ہے، میری جان چھوڑ دو...... میری غلطی کو معاف کر دو!" وہ پھر کہہ رہا تھا، اس کے سرہانے جلتے ہوئے ہلکی پاور کے بلب کی روشنی میں وہ اس کی آنکھوں کے گوشوں پر چمکتے ہوئے آنسوؤں کو بھی دیکھ سکتی تھیں۔ ان کے دل میں کھنچ سی پڑی، ان کے بیٹے کو کیا دکھ تھا، اس سے کیا قصور سرزد ہو گیا تھا جو کہ اس کو سونے بھی نہیں دیتا۔"

"سہیل......" انہوں نے پھر اسے ہولے سے پکارا مگر وہ ذرا سا کسمسایا، جاگا نہیں۔ انہوں نے اس کے ماتھے کو چھوا، اس پر ہلکی ہلکی پسینے کی نمی تھی، اس ٹھنڈے موسم میں بھی؟ انہوں نے سوچا اور اس کے اوپر کمبل سیدھا کر کے باہر نکل آئیں کیا بات ہو سکتی ہے جو اسے اتنا پریشان کیے ہوئے تھی، پوچھوں گی اس سے۔"

ان کا اپنا اندازہ تھا کہ یہ سراسر اسلم کی سختی کا نتیجہ تھا۔ "کیا تھا کہ اگر وہ فیل ہو گیا تھا...... بہت سے بچے فیل ہوتے ہیں۔ اس کے اتنے قریبی دوست اور مددگار کی عین امتحانات کے قریب ہونے والی موت کا حادثہ اس کے لیے گہرے صدمے کا باعث تھا، یہ بات اس کے باپ کو بھی سمجھنی چاہیے۔ مجھے اس سے کسی وقت اس اہم معاملے پر بات کرنا ہو گی۔ جس بچے کی خاطر ہم نے اپنی زندگیاں عذاب کر ڈالیں، اس بچے کو ہم اگر نہیں سنبھال سکتے، اس کا خیال نہیں کر سکتے، اس کی تربیت نہیں کر سکے تو ہمیں کیا حاصل ہوا؟ خود بھی تہی دست رہے اور اس کی شخصیت کو بھی نامکمل بنا دیا۔"

"پلیز مجھے معاف کر دو!" دروازہ بند ہونے سے پہلے انہوں نے اس کی التجا سنی، انہیں یہ اندازہ کرنے میں دشواری نہ ہوئی کہ اس کا بڑبڑانا اپنے باپ کے لیے نہ تھا۔

☆☆☆........☆☆☆

"بات تو بہت اہم ہے چوہدرانی مگر صرف میرے لیے......" اس نے ان کے قریب ہو کر سرگوشی میں کہا۔

"جلدی کہو بھئی معراج، میرے دل کو تو اختلاج ہونے لگا ہے......" انہوں نے گھبراہٹ زدہ انداز میں کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں کہ آپ خود پر اختلاج طاری کر لیں، بات فقط راز داری کی ہے اور میرا ذاتی معاملہ ہے، اس لیے اگر آپ اجازت دیں تو میں دروازہ بند کر لوں......" معراج نے ان سے درخواست کی، ان کے سر ہلانے پر اٹھ کر دروازہ نہ صرف بند کیا بلکہ اندر سے کنڈا بھی اٹکا دیا تاکہ کوئی اچانک اندر نہ آ جائے۔ انہیں بھلا کیا اندازہ تھا کہ کان بند دروازوں کے ہوتے ہیں، کھلا دروازہ تو شاید ان کے اور چوہدرانی کے مابین ہونے والی گفتگو سے متعلق کسی کو تجسس میں مبتلا نہ کرتا مگر بند دروازہ...... کئی لوگوں کو باہر کان لگانے پر مجبور کر دیتا ہے۔

"اب کہو ذرا جلدی سے......" شکیلہ بی بی نے اس کے بیٹھتے ہی کہا۔

"اصل میں بات میرے گھر کی عزت کی ہے، جس پر کسی نے بری نظر ڈالی ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کے گھر کی پرانی نمک خوار بھی ہوں، ہم غریبوں کے پاس سوائے عزت کے ہوتا بھی کیا ہے؟" اس نے تمہید باندھی۔

"ائے ہئے، سیدھی بات کرو معراج، کیوں ہولائے دے رہی ہو؟" انہوں نے چہرے پر بیزاری کا

لیپ کیا ہوا تھا جیسے......

''بی بی...... ہمارے گھر میں چند دن پہلے کچھ آدمی چھت سے کود کر آئے تھے، میں گھر پر نہ تھی، میری بیٹی سے کہا کہ وہ اس کو مالکوں کے کہنے پر عزت سے لینے آئے ہیں......'' وہ بتا رہی تھیں اور شکیلہ بی بی ہمہ تن گوش تھیں۔ ''اب اس گاؤں میں طاقت ور گھر تو آپ کا ہے یا چوہدری مراد علی کا......''

''کیا کہنا چاہتی ہو تم، کیا تم میرے کسی بیٹے پر الزام لگا رہی ہو؟'' جہانوں کے چھٹے ہوئے بدمعاش بھی اپنی ماں کو شریف لگ رہے تھے۔

''یہ میں نے بھلا کب کہا......؟'' وہ جان بوجھ کر نہ بتا رہی تھی کہ وہ آدمی کس کے بھیجے ہوئے تھے۔

''گاؤں میں سارے غلط کام کیا میرے پتر ہی کر سکتے ہیں......'' ان کے منہ سے کف نکل رہا تھا۔ ''وہ بھی تو ہے ایک...... بے حیا، شجاع......'' معراج نے چونک کر ان کے چہرے کو دیکھا، کیا انہوں نے یونہی بات کی تھی یا اسے کہیں سے سن گن ملی تھی۔ کیا گاؤں میں کسی نہ کسی طرح یہ بات پھیل چکی تھی کہ اس کے گھر میں کچھ لوگ کودے تھے؟ اگر ایسا تھا تو بڑی بدنامی کی بات تھی۔

''چوہدرانی...... آپ خوانخواہ طیش میں آ رہی ہیں......'' معراج نے آہستگی سے کہا۔ ''میں نے ہرگز ایسا نہیں کہا کہ آپ کے بیٹے کے آدمی تھے یا شجاع کے آدمی نہیں ہو سکتے۔ عین ممکن ہے کہ اسی کے آدمی ہوں، میں تو آپ سے فقط یہ درخواست کرنا چاہ رہی تھی کہ میری بیٹی کو اللہ نے ایک بار بچا لیا ہے، آپ تو جانتی ہی ہیں کہ وہ کیسی سیدھی سادی اور شریف بچی ہے......''

''ہاں میں تو جانتی ہوں......'' انہوں نے طنز سے کہا۔ انہیں تو اس سے انتقام کا ایک موقع ہاتھ آیا تھا، اگر تو یہ کام ان کے بیٹوں کا ہے تو وہ ہرگز مداخلت نہیں کریں گی مگر اگر شجاع کی نظر اس پر ہے تو میں اپنے بیٹوں سے کہوں گی کہ شیر کے منہ سے بھی نوالہ چھین کر لانا پڑے تو لے آنا...... میں اس لڑکی کو اپنے قدموں پر جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہوں اور اس کے لیے میں کسی حد تک بھی جا سکتی ہوں...... وہ سوچ رہی تھیں۔ ''تو فکر نہ کر معراج...... تیری بیٹی ہماری بیٹی جیسی ہے، اس کی عزت پر آنچ بھی نہ آنے دیں گے ہم!'' انہوں نے معراج کو یقین دلایا، وہ احسان مندی کے ساتھ اٹھی اور اس سے قبل کہ وہ دروازہ کھولتی، دروازے کے باہر سے کوئی فوراً ہٹ کر پرے ہوا، اس ہٹنے والے کا رخ چوہدری اکبر علی کے کمرے کی طرف تھا۔

☆☆☆............☆☆☆

''شجاع بیٹا......'' عابدہ بیگم نے شجاع کو پیام بھیج کر بلوایا تھا، وہ اس کے ساتھ خاص بات کرنا چاہ رہی تھیں۔ ''میں سوچ بھی نہیں سکتی کہ میرا بیٹا اس حد تک بے پروا ہو سکتا ہے اور اس کے کارندے اتنے بااختیار کہ لوگوں کے گھروں میں چھتوں سے کود کر جانا شروع کر دیں گے......''

''کیا بات کر رہی ہیں آپ اماں؟'' اس نے دنیا بھر کی معصومیت ماں کے سامنے چہرے پر سجائی، اسی معصومیت سے اس کی ماں ہمیشہ دھوکا کھا جاتی تھیں۔ ''میں آپ کی اس ادھوری بات کا مطلب نہیں سمجھا؟''

''مجھے کہیں سے علم ہوا ہے کہ فیضی کسی کے گھر کی چھت پھلانگ کر اس گھر میں اترا ہے......'' لمحے کے ہزارویں حصے میں اسے معاملہ سمجھ میں آ گیا تھا۔ ''بیٹا تمہارے کسی کامے کا کسی گھر میں چھت سے کودنا...... اس

کے لیے نہیں بلکہ تمہارے لیے بدنامی کا باعث ہو سکتا ہے!'' انہوں نے رسان سے کہا۔

''پوچھ لوں گا میں اس الو کے چرخے سے، اتنی جرأت اس کی کہ وہ......'' اس کے لہجے میں وہ غصہ تھا جس سے اس کی ماں بھی ڈرتی تھی۔

''تحمل سے بیٹا، جو آدمی تمہارا جتنا خاص آدمی ہوتا ہے، قریبی اور راز دار ہوتا ہے، اسے دشمن میں مت بدلو کہ ایسا دشمن سب سے خطرناک دشمن ہوتا ہے......'' انہوں نے اس کے کندھے تھپک کر اسے سمجھایا۔

''آپ کہتی ہیں تو میں اسے چھوڑ دوں گا، سمجھاؤں گا اور آئندہ کے لیے خبردار کر دوں گا، ورنہ اماں آپ جانتی ہیں چوہدری شجاع کو......'' اس نے ماں کو تسلی دینے کی خاطر کہا۔

''میں تو کہتی ہوں کہ کچھ وقت گزرے تو اسے نکال دینا......'' انہوں نے کہا۔ ''جو ملازم اتنا منہ چڑھا ہو جائے کہ مالکوں کی مرضی کے خلاف چل پڑے اور ان کی بدنامی کا باعث بنے اس ملازم کے ہوتے ہوئے کسی دشمن کی کیا ضرورت ہے......'' وہ خود بھی الجھی ہوئی تھیں، ابھی ذرا دیر پہلے کچھ کہہ رہی تھیں اور ذرا سی دیر میں ان کی سوچ کیا ہو گئی تھی۔ شجاع دل ہی دل میں اپنی اداکاری کو داد دے رہا تھا، کیسے اس نے اپنی ماں کو بے وقوف بنا ڈالا تھا اپنی باتوں سے۔

وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ ماؤں کے دماغ اتنے کھوکھلے نہیں ہوتے، وہ اپنی اولاد کے حروف اور بین الحروف کو اچھی طرح سمجھتی ہے۔ اپنی ڈھکی چھپی باتوں سے انہوں نے اپنی دانست میں اسے سمجھا دیا تھا مگر وہ تو اس کے پہلے فقرے کی ادائیگی کے وقت اس کی نظر چرانے کی ادا سے ہی سمجھ گئی تھیں کہ فیضی کی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ معراج بی بی کی بیٹی کو اٹھانے کے لیے چھت سے کودتا اگر اس میں شجاع کی رضا نہ ہوتی تو...... وہ بھی کسی مصلحت کے تحت خاموش ہو گئی تھیں، ان کا خیال تھا کہ وہ جہانگیر کو اس معاملے کی خبر کر کے اسے کہیں گی کہ بھائی کو سمجھائے، چوہدری مراد علی سے کہتیں تو معاملہ بگڑ جاتا، وہ تو ہر وقت ویسے بھی اسے عاق کرنے کو تیار بیٹھے ہوتے تھے۔

☆☆☆............☆☆☆

جاوید کی موت کی خبر...... مریم کو سن کر جانے دکھ ہوا تھا یا نہیں، وہ سوچ میں پڑ گئی کہ اسے جانا چاہیے یا نہیں...... جاوید جیسا بھی گھٹیا انسان تھا اور جیسے بھی اس نے اپنا آپ اسے دکھایا تھا مگر اسے تو اگر جانا تھا تو اس لیے جانا تھا کہ سائرہ باجی اس وقت کس تنہائی، غم، کرب اور دکھ کا شکار ہوں گی۔ ان کی تنہائی اور غم کا سوچ کر ہی اس نے پشاور جانے کا ارادہ کیا۔ جینا کو اس نے کچھ ضروری کام سمجھائے جو اس کی عدم موجودگی میں کرنا تھے۔

''اگر آپ کہیں تو میں بھی ساتھ چلوں......'' جینا نے پوچھا۔ ''میں بھی تو اس عظیم عورت کو دیکھوں جس نے اپنے جگر کا ٹکڑا آپ کو دے دیا......'' قریب تھا کہ مریم اس خیال سے اسے ساتھ لے لیتی کہ گڑیا کو سنبھال لے گی، اس کی بات سن کر جیسے ہوش میں آ گئی، اس طرح تو اس کا سارا پول کھل جائے گا، اس نے سوچا اور اسے کام سمجھانے لگی۔

''میں سائرہ آپا سے کہوں گی کہ عدت پوری ہو جائے تو وہ یہاں کا چکر ضرور لگائیں!'' مریم نے اس سے کہا۔ ''اور تم بھی چل پڑیں تو میرے گھر کا خیال کون کرے گا اور باقی گھروں میں کام کا کیا ہو گا تمہارا؟'' مریم

نے اسے کئی بھولے ہوئے کام یاد دلائے۔

''جیسا آپ کہیں باجی مگر اس کے بعد آپ کبھی پشاور گئیں تو میں بھی آپ کے ساتھ ضرور جاؤں گی، سنا ہے وہاں پر کپڑا بہت اچھا اور بہت سستا ملتا ہے......'' جینا نے فہمائشی انداز میں کہا۔

''وہاں پر کپڑا سستا نہیں بلکہ مفت ملتا ہے......'' مریم نے ہنس کر کہا۔

''ہیں......سچ باجی؟'' جینا اس کے اس مذاق کو نہ سمجھ پائی تھی۔

''ہاں!'' مریم ہنسی۔ ''بلکہ منتیں کر کر کے دکان دار گاہکوں کو اپنے پاس بلاتے ہیں کہ آ کر کچھ مفت میں ہی لے لیں......''

''مجھے معلوم ہے کہ آپ مذاق کر رہی ہیں۔'' جینا نے منہ بسورا۔

''اچھا چلو، اب باتیں چھوڑو، مجھے چار بجے والی ریل سے نکلنا ہے......'' مریم نے کہا۔ ''اور آج تو چھٹی ہے، کل مائیکل کو میری یہ درخواست دینا اور کہنا کہ اسکول پہنچا دے!'' اس نے اپنی درخواست لکھ کر ایک لفافے میں ڈالی اور اسے جینا کے حوالے کیا۔

☆☆☆..........☆☆☆

کلثوم کی طبیعت بجائے سنبھلنے کے اور بھی بگڑتی چلی جا رہی تھی، اس کا گھر سے کام کے لیے نکلنا محال ہو گیا تھا، گھوٹو کو اس بات پر بہت طیش آ گیا تھا اور وہ اسے گالیاں دے رہا تھا، وہ خود تو کچھ کھاتی بھی تو وہ اسے ہضم ہی نہ ہوتا تھا۔ گھوٹو کے لیے ایک وقت کا فاقہ کرنا بھی محال تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اس کو گالی گلوچ سے بڑھ کر مار پیٹ تک آتا، وہ اٹھی اور پڑوس سے ایک چھوٹے سے لڑکے کو معراج بی بی کے نام پیغام دے کر بھیجا کہ وہ بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی اور اس کے پاس چل کر آ بھی نہیں سکتی تھی اگر وہ اس کو آ کر دیکھ سکے تو...... بچے نے حرف بہ حرف اس کا پیغام معراج بی بی تک پہنچا دیا تھا اسی لیے تو وہ تھوڑی دیر میں گھبرائی ہوئی سی اس کے پاس تھی۔

صحن میں چارپائی پر بیٹھ کر حقہ گڑگڑاتے ہوئے گھوٹو نے اسے دیکھا اور سلام کر کے منہ پرے کر لیا۔ وہ اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اندر چلی گئی، جہاں کلثوم بستر پر نڈھال پڑی تھی۔ معراج نے اسے دیکھا، خطرے کی کوئی بات نہ تھی، ابکائیوں کی وجہ سے اس کے پیٹ میں درد تھا۔ معراج نے اسے پانی میں گھول کر دوا دی اور باہر آ گئی۔

''تو یہاں پڑا کیا کر رہا ہے، اسے کام پر کیوں بھیجتا ہے، خود کیوں نہیں جاتا تو؟'' معراج بی بی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا تھا۔

''میں کیا کام کروں؟'' اس نے نظر چراتے ہوئے کہا۔

''کچھ بھی کر، باہر نکل تو کئی کام ہوں گے، گھر میں چل کر تو تیرے پاس کام نہیں آنے والا......'' اس نے غصے سے کہا۔

''مجھ سے نہیں ہوتا کام وام......'' اس نے کندھے اچکا کر شانِ بے نیازی سے کہا تو معراج بی بی کا پارہ گرم ہو گیا۔

''کیوں نہیں ہوتا تجھ سے کام، کیا بازو ٹوٹے ہوئے ہیں یا ٹانگیں؟'' اس نے اس کے لتے لیے۔ ''کم

بخت، حرام خور، کس طرح کا مرد ہے تو!''

''دیکھو مائی، میرے منہ لگنے کی ضرورت نہیں ہے زیادہ!'' گھوٹو نے منہ پھیر کر کہا۔

''تیرے منہ......'' معراج نے غصے سے اس کی اچھی خاصی بے عزتی کر ڈالی، وہ غالباً گاؤں کا واحد آدمی تھا جو معراج بی بی کے غصے کو نہ جانتا تھا اور اس کا غصہ ہمیشہ درست وجہ پر ہوتا تھا۔

''رہنے دے ماسی، میں سمجھاؤں گی اس کو!'' کلثوم ہمت کر کے اٹھ کر باہر آ گئی، اسے اندازہ تھا کہ معراج کے غصے کے آگے بند باندھنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔

''کیا سمجھائے گی تو مجھے......'' اس نے مجھے پر زور دے کر کہا۔ ''اس بڈھی کو سمجھا جو میرے گھر میں ہی کھڑی ہو کر مجھی پر برس رہی ہے، ہمت تو دیکھو اس کی!'' اس کے لہجے میں اتنی بدتمیزی تھی کہ معراج بپھر گئی۔

''تیرا گھر ہے یہ، تیرے باپ نے بنوایا تھا؟''

''تو کیا تیرے باپ نے بنوایا تھا؟'' اس نے دوبدو سوال کیا۔ چھتوں پر سے کئی سر اس شاندار مقابلے کو براہِ راست دیکھنے کو ابھر آئے تھے۔

''تم چپ کر جاؤ جہانداد......'' کلثوم نے اس کی منت کی جو معراج کی بزرگی کو بھی اہمیت نہیں دے رہا تھا۔

''میں کیوں چپ کروں۔ زبان نہ اس سالی کی......''

وہ اٹھا، اس سے قبل کہ وہ معراج بی بی تک پہنچتا، کلثوم تن کر معراج بی بی کے سامنے کھڑی ہو گئی، چھتوں سے تماشا دیکھنے والی خواتین اب مزید خاموش تماشائی بنی نہیں رہ سکتی تھیں۔ کئی کود کر اس منظر کا حصہ بننے پہنچ گئیں۔ کسی ایک نے باہر کا دروازہ کھول دیا اور مرد بھی اندر آ گئے اور گھوٹو کو اس طرح گھوٹا کہ اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ وہ اسی معراج بی بی کی منتیں کرنے لگا جس کی زبان کاٹنے کو وہ اٹھا تھا۔

''اگر تو کام کرے گا اور اسے گھر بیٹھنے دے گا تو ہی تیری شنوائی ہے، ورنہ یہ اس محلے کی بیٹی ہے، تجھے یہ سارے لوگ دھکے دے دے کر یہاں سے دفعان کر دیں گے، یہ تیرا نہیں کلثوم کا گھر ہے اور کلثوم کی دو روٹیاں کسی پر بھاری نہیں ہیں......'' معراج بی بی نے مناسب سمجھا کہ اگر اس کے ہوش ٹھکانے آ گئے ہیں تو اس کا فائدہ اٹھایا جائے۔

''کروں گا کام......'' وہ اپنی چوٹیں سہلاتے ہوئے بولا۔ ''جیسا کہو گے کروں گا، بس مجھے اب اور نہ مارنا!''

محلے والے سبھی اس کی حرکتوں سے تنگ تھے اور کلثوم کی ناقدری پر دل ہی دل میں کڑھتے رہتے تھے، ان کا بس نہ چلتا تھا کہ اس معصوم کو اس ظالم کے پنجے سے چھڑوا سکتے اس روز معراج بی بی کے بہانے سب کو اپنی اپنی بھڑاس نکالنے کا موقع مل گیا تھا۔

''اور سن......'' معراج بی بی نے اپنی انگشتِ شہادت اٹھا کر کہا۔ ''اگر تو نے اسے اس کے بعد کوئی الٹی سیدھی دوا لا کر دی کہیں سے تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا اور اگر اسے یا اس کے بچے کو کچھ ہوا تو تیرے ساتھ اس سے بہت زیادہ برا ہوگا......''

''تجھ سے برا اور ہو بھی کون سکتا ہے......'' اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا اور اتنا ڈر گیا تھا کہ ایک لفظ

کہنے کی جرأت نہ کر سکا تھا، اس کا واسطہ ہی بھلا اس گاؤں کے لوگوں سے کب پڑا تھا، ہر وقت تو وہ نشے میں دھت پڑا رہتا تھا۔

"کچھ پھوٹے گا منہ سے یا.....؟" معراج نے اسے گھورا۔

"کہہ جو دیا ہے کہ جس طرح کہو گی، ویسا ہی ہوگا!" اس نے فوراً کہا۔

"میرے کہنے کی اب نوبت آئی تو پھر تجھے چل پتا جائے گا، بہتر ہے کہ اپنی گھر والی کا خیال رکھ ورنہ تیرے ساتھ کتوں سے بدتر سلوک ہو سکتا ہے!" وہ خاموش تھا مگر دل ہی دل میں سوچ رہا تھا کہ اس سارے معاملے کی شکایت چوہدری نور علی سے ضرور کرے گا، کسی کی کیا جرأت کہ وہ میرے گھر کے معاملے میں دخل اندازی کرے......

☆☆☆..........☆☆☆

"کلثوم.....اری او کلثوم!" چوہدرانی کی پاٹ دار آواز سارے میں گونجی تھی۔

"جی وہ تو نہیں آئی......" کسی نے انہیں اطلاع دی تھی۔

"ہیں، وہ کیوں نہیں آئی، میں نے تو کل اسے خاص طور پر کہا تھا کہ وہ آئے تو مجھے ملے؟" انہوں نے چتون چڑھا کر بتانے والی سے پوچھا تھا۔

"جی کل تو آئی تھی اور ٹھیک بھی تھی، جانے......" اس نے بات ادھوری چھوڑ دی تھی مگر اس کے انداز سے ظاہر تھا کہ اسے اس کے نہ آنے کی وجہ معلوم تھی۔

"کیا کچھ کہا کسی نے اس سے، جو وہ آج نہیں آئی؟" انہوں نے دوبارہ سوال کیا۔

"وجج.....جی! کوئی کیا کہے گا اسے......"

"پھر بھی کچھ نہ کچھ تو ایسا ہوا ہوگا نا!"

شکیلہ بی بی بال کی کھال اتارنے والیوں میں سے تھیں اور یوں بھی بات کرنے والی ان کی خاص الخاص مخبروں میں سے تھی، جن کے گھر کے چولھے ہی ان کی اضافی بخشش پر چل رہے تھے۔ "وہ جی چوہدری صاحب......" وہ رکی۔

"کیا کیا چوہدری صاحب نے؟" انہوں نے فوراً سوال داغا۔

"وہ جی ان بے چاروں نے کیا کرنا ہے، وہ تو کہہ رہے تھے......" ملازمہ نے ذو معنی انداز میں بات بھی کر دی اور فوراً پانسہ پلٹا۔

"بہت بے چارے ہیں وہ، اچھی طرح جانتی ہوں میں ان کی بے چارگی کو!" انہوں نے ہنکارا بھرا۔ "ان کی بے چارگی نے ہی تو مجھے یہ دن دکھائے ہیں۔"

"انہوں نے تو جی صرف اس سے یہ کہا تھا کہ انہیں تیل کی مالش کر دے مگر وہ جواب میں کہنے لگی......" وہ سانس لینے کو رکی تو شکیلہ بیگم نے اسے گھورا، انہیں بات کو طول دے کر کرنے والے لوگ بہت ناپسند تھے۔

"کہنے لگی، آپ کون سا میرے محرم ہیں......"

"ہاہاہا......" شکیلہ بیگم کا بے اختیار قہقہہ نکل گیا تھا۔ "خوب کہا اس نے......"

"پر جی بات تو ہمارے چوہدری صاحب نے بھی لاکھوں کی کی تھی!" ملازمہ نے ان کی ہنسی میں شریک ہو کر کہا۔ "چوہدری صاحب کہنے لگے جی، تو چاہتی ہے کہ میں محرم بن جاؤں تیرا......" وہ بھی منہ پھاڑ کر ہنسی تو شکیلہ بی بی کے ماتھے پر تیوری پڑ گئی، انہیں احساس ہوا کہ وہ ملازمہ کو زیادہ لفٹ کروا گئی تھیں اسی لیے وہ اپنی حد پھلانگ گئی تھی۔

"کیا مطلب ہے اس بات کا؟" شکیلہ بی بی نے پوچھا۔

"وہ جی......" وہ گڑبڑا گئی، ابھی تھوڑی دیر پہلے چوہدرانی جی کیسے منہ پھاڑ کر ہنس رہی تھیں، پل میں تولہ پل میں ماشہ......یہی انداز ہوتے ہیں ان بڑے لوگوں کے۔ "مجھے کیا پتا کہ اس کا کیا مطلب ہے۔" اس نے اپنی جان چھڑانا بہتر سمجھا۔

"ایک تو میں اس شخص سے بہت تنگ ہوں، پوتیوں کی عمر کی لڑکیوں پر بھی ڈورے ڈالنے سے باز نہیں آتا، اچھی خاصی کام کرنے والی، خاموش طبع اور ضرورت مند لڑکی تھی بے چاری......" انہوں نے شوہر کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار کیا۔ "تو جانا کسی وقت اس کی طرف اور اسے میرا پیغام دینا کہ مجھے آ کر ملے...... جانے کس طرح گزارہ کرے گی وہ......"

"وہ تو جی دوجے جی سے بھی ہے، اس لیے اس کی طبیعت بھی خراب رہتی ہے!"

"جانتی ہوں میں، اسی لیے تو میں چاہ رہی تھی کہ اس کا گزارہ چلتا رہے!" انہوں نے ایسی نرم دلی کا مظاہرہ کیا جو اس سے قبل کسی نے نہ دیکھا تھا۔

"کمزور سی تو ہے، اس سے کام کاج ہوتا بھی نہیں، یونہی کبھی کہیں گرتی پڑتی ہے......"

"بس میں بھی یہی چاہ رہی تھی کہ اسے گھر بیٹھے کوئی اناج وغیرہ بھیج دیا کریں، کام کاج نہ کرے وہ، اس کا ہم سب پر حق ہے۔ حافظ کرم اللہ کی بیٹی ہے وہ آخر، اس کے باپ اور ماں کے اس گاؤں والوں پر بہت احسانات ہیں، سب کو قرآن کی تعلیم دی ہے انہوں نے......" حقیقت بھی یہی تھی کہ کلثوم کو دیکھ کر، اس کے حالات جان کر انہیں اندازہ ہوا تھا کہ ہندوؤں کی ہمدردی میں ان کے شوہر نے اس بے چاری کے ساتھ زیادتی کر دی تھی، معصوم سی بچی کو اپنے نکھٹو شوہر کو بھی کما کر کھلانا پڑتا تھا، وہ جس کی پرچھائیں بھی کبھی اس کی ماں کی زندگی میں کسی نے نہ دیکھی تھی۔ جس کا حق تھا کہ کوئی اسے چار دیواری کا تحفظ دے، عزت سے روٹی کما کر دے، وہ اپنی زندگی کو کس کسمپرسی سے جی رہی تھی۔

"میں آپ کا پیغام تو اسے دے دوں گی مگر مجھے علم ہے کہ وہ بڑی خود دار ہے، گھر بیٹھے اناج لے کر ہرگز نہیں کھائے گی، چاہے اسے فاقوں مرنا پڑے......" ملازمہ نے کہا۔

"ضرورت بڑے بڑوں کی زندگیوں کے اصول توڑ دیتی ہے!" انہوں نے خلا میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم میرا پیغام تو اس تک پہنچانا، پھر دیکھتے ہیں کہ اس کی مدد کس طرح کی جائے کہ اس کی خودداری بھی قائم رہے......" زرتاج کی خودداری کو پیروں تلے روندنے کی خواہش رکھنے والی شکیلہ بی بی، اسی جیسی ایک اور نوجوان لڑکی کی خودداری کو قائم رکھنے کی بات کر رہی تھیں۔ ان کی خاص ملازمہ اپنی مالکن کے اس خاص انداز کو ایک خاص نظر سے دیکھ رہی تھی۔ فرق صرف اس بات کا تھا کہ زرتاج نے ان کی اور کلثوم نے ان کے شوہر

کی انا کو چوٹ پہنچائی تھی اور اپنے شوہر کو نیچا دکھانے کی خاطر...... ان کی انا کو چوٹ پہنچانے والے کی اس سے زیادہ پذیرائی بھی کر سکتی تھیں۔

☆☆☆............☆☆☆

نگی کو رانی کے اطوار کچھ ٹھیک نہیں لگ رہے تھے اور وہ اس بات پر حیران تھی کہ مائیں تو اولاد کے اندر تک دیکھنے کی صلاحیت رکھتی ہیں تو رانی کی ماں کو کیوں نظر نہیں آتا تھا کہ وہ کن راہوں پر چل رہی تھی۔ گھر سے کام کا کہہ کر نکلنے والی رانی اسے کبھی کبھار کھیتوں پر نظر نہ آتی تو وہ واپسی پر اس کے گھر ضرور پوچھنے جاتی مگر معلوم ہوتا کہ وہ کام پر گئی تھی، معاوضہ بھی لے کر آئی تھی اور پڑی سو رہی ہے۔ اس کی ماں جو ہمیشہ سے گھر داری اور بچے پالنے کی ذمے داری میں مصروف رہتی تھی، اسے کیا علم کہ وہ کس کام کا معاوضہ لا کر اسے دیتی تھی۔

اسے جو چاہیے تھا، وہ اسے مل گیا تھا، اس کی اس خواہش کا وہ کیا خراج وصول کرتا تھا، اسے بھی وہ اپنے لیے اعزاز ہی سمجھتی تھی۔ وہ ایک گھاک شکاری اور یہ ایک معصوم خواہشات کو پالنے والی چڑیا...... جسے یہ بھی اندازہ نہ تھا کہ اپنی خواہش کی تکمیل کی خاطر وہ اپنا قیمتی ترین جوہر بھی لٹا بیٹھی تھی۔ اسے ہر وہ شخص برا لگتا جو اسے سمجھانے کی کوشش کرتا، اس کی سہیلی نگی ہو یا وہ کرخت چہرے والا منشی، جو یہی چاہتا تھا کہ یہ لڑکی بچ جائے...... مگر جسے خود مصیبت میں پھنسنے کا شوق ہو رہا تھا اسے کوئی کیسے بچا سکتا تھا۔ منشی جان گیا تھا کہ گھر سے کام پر آنے والی، اس کے پاس حاضری کے لیے نام لکھوا کر کس وقت اور کس سمت کو چل پڑتی ہے اور اس کے کتنی دیر کے بعد چوہدری اکبر علی کو کوئی ضروری کام یاد آ جاتا تھا۔

منشی نے ہی نگی کو بتایا تھا کہ اس کی سہیلی کیا کر رہی تھی، نگی کو تو یقین ہی نہیں آیا کہ وہ عشق میں اس حد تک اندھی بھی ہو سکتی ہے۔ ”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہو گی، منشی صاحب!“

”جو شکل ایک بار دیکھ لیتا ہوں اسے بھولتا نہیں ہوں، نام چاہے نہ یاد رہے مگر اس کا حوالہ اور تعلق یاد رہتا ہے۔ مجھے تمہارا نام یاد ہے نہ اس کا مگر میں اسے دیکھتا تو تمہارا تصور آتا اور تمہیں دیکھا ہے تو فوراً اسے پہلے یاد آ جاتا ہے کہ تم اور وہ مجھے اکٹھی ملی تھیں......“ اس نے وضاحت کی۔

”میں پوچھوں گی اس سے......؟“ اس کا اب بھی یقین کرنے کو جی نہ چاہ رہا تھا۔

”پوچھ مت......“ اس نے انگلی اٹھا کر کہا۔ ”اسے سمجھا! اس کے بڑھتے ہوئے قدم روک لے، اس سے پہلے کہ اسے ایسے انجام سے دوچار ہونا پڑے، جیسے کہ......“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گیا۔

”میں اس کی اماں سے بات کروں گی!“

”مجھے اس کے باپ کا نام بتا، میں اس سے بات کرتا ہوں!“

”نہیں نہیں...... اس کا ابا تو اس کے ٹوٹے ہی کر دے گا!“ اس نے گھبرا کر کہا۔

”ہر دو صورتوں میں ٹوٹے تو اس کے ہونے ہی ہیں، اپنے باپ کے ہاتھوں یا چوہدریوں میں سے کسی کے ہاتھوں......“ منشی نے ایسا الم ناک انجام بتایا تھا کہ وہ کانپ گئی۔

”کاش تو یہیں پر رک جائے رانی...... کاش تجھے ٹھوکر کھانے سے پہلے ہی عقل آ جائے!“ اس نے دل سے دعا کی۔ ”میں اس کی اماں سے بات کروں گی!“ اس نے منشی سے کہا مگر جب بھی وہ وہاں اس مقصد سے

گئی، رانی کی موجودگی کے باعث بات نہ کر سکی، رانی کی اس سے ناراضی ابھی تک چل رہی تھی، اس کی ناک سے غصہ اترا ہی نہ تھا اور اب تو اسے اور بھی زیادہ غصہ آتا تھا نگی کو دیکھ کر۔ نگی اس کے ماضی کا ایک ایسا باب تھا جسے وہ بھول جانا چاہتی تھی، اسے لگتا تھا کہ اکبر علی کے دل کی مسند پر بیٹھ کر وہ اتنی بلند ہو گئی تھی کہ نگی جیسی لڑکیاں اس کی دوستی کے معیار پر پوری نہ اترتی تھیں۔

☆☆☆............☆☆☆

”بال بال بچ گئے ہیں فیضی مگر دوبارہ تم نے ایسی کوتاہی کی تو پھر مجھ سے رحم کی توقع نہ کرنا......“ شجاع نے فیضی کو اپنی ماں کی ساری گفتگو بتائی تھی اور اسے بتایا تھا کہ اس نے بہ مشکل ماں کے شک کو اب کی بار ختم کیا ہے۔ فیضی کی کیا جرأت تھی کہ وہ ایسا کام اس کے علم میں لائے بغیر کرتا بلکہ اس نے تو اسے اس کام سے روکنے کی بھی کوشش کی تھی اور اس سے کہا تھا کہ اپنے گاؤں سے باہر جو بھی کام وہ بتائے، فیضی بلا جھجک کر دے گا مگر اپنے گاؤں میں اس طرح کا کام کرنا مناسب نہیں اور پکڑ لیے جانے کا احتمال رہتا ہے۔

”اس نے مجھے پہچان لیا ہے، اس کا مطلب ہے کہ وہ اندر سے باہر دیکھ سکتی تھی......“ فیضی نے پُرسوچ انداز میں کہا۔ ”مگر وہ یہ کیسے جان گئی کہ میں فیضی ہوں اور آپ کا خاص آدمی ہوں؟“

”ہیں......“ شجاع چونکا۔ ”یہ خیال تو میرے ذہن میں آیا ہی نہیں، واقعی اگر تم کہتے ہو کہ تم نے کبھی اس کو دیکھا تک نہیں تو پھر وہ تمہیں کیسے جانتی ہے۔ جبکہ وہ اس گاؤں کی ہے بھی نہیں......“

”مجھے ایک شک ہے فیضی!“ اس نے پُراسرار لہجے میں کہا۔

”کس پر جناب اور کیسا شک......؟“ اس نے حیرت سے چوہدری کو دیکھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ کسی اندر کے آدمی نے اماں کو شکایت کی ہے، ورنہ وہ لڑکی تمہیں کیسے پہچان سکتی تھی، وہ کون سا تمہیں جانتی ہے...... چاہے وہ اندر سے درز سے تمہیں دیکھ بھی رہی ہوتی!“ اس نے پُرخیال لہجے میں کہا۔

”بات تو آپ کی سو گہ آنے صحیح لگتی ہے جناب......“ اس کا انداز خوشامدی تھا۔ ”لاتے تو سرکار آپ ہمیشہ دور کی کوڑی ہیں مگر یہ گھر کا بھیدی کون ہو سکتا ہے؟“ فیضی نے مکاری سے سوال کیا۔

”تم جانتے ہو فیضی کہ گھر میں کون ہماری جڑیں کاٹنے میں مصروف رہتا ہے، کس کے مفادات کی بنیاد ہماری مخالفت پر ہے، کون ہے جو خود بابو جی کی نظروں میں اچھا بنا ہوا ہے اور ہمیں ہر وقت ان سے پھٹکار پڑتی رہتی ہے!“ شجاع کا لہجہ شک اور نفرت سے بھرپور تھا۔

”ارے نہیں سرکار...... ماں باپ کی ڈانٹ بھی کوئی ڈانٹ ہوتی ہے، وہ تو ہمارے بھلے کو ہی کہتے ہیں اور آپ تو کیسے خوش قسمت ہیں کہ ماں اور باپ، دونوں کا پیار نصیب ہے آپ کو!“ فیضی نے لہجہ بدل لیا۔ ”ایک ہم ہیں، کیسے بدنصیب کہ نہ ماں کی دعائیں ہیں، نہ باپ کا سایہ...... مگر سرکار آپ ہیں نا ہمارے مائی باپ۔ اللہ سائیں آپ کو سلامت رکھے ہمیں تو کبھی ماں کی کمی محسوس ہوتی ہے نا باپ کی......“ اس کی انہی باتوں کی وجہ سے تو شجاع ہمیشہ چکر میں آ جاتا تھا۔

”بس اب ذرا تو کچھ عرصے کے لیے منظر سے غائب ہو جا......“ شجاع نے نرمی سے کہا۔ ”یوں کر کہ کہیں شہر چند دن رہ کر آ جا، یار تیرے بغیر کام تو اپنا بھی نہیں چلتا مگر یہ کرنا بھی ضروری ہے......“

"جیسا سرکار کا حکم......" اس نے سرتابعداری سے جھکا کر کہا۔ "میں تو آپ کے ڈیرے پر بھی چھپ کر بیٹھ جاؤں تو کسی کی نظر میں کئی دن تک نہ آؤں!"

"نہیں نہیں......" شجاع نے فوراً گھرکا۔ "جیسا کہا ہے، ویسا ہی کر، تو غائب ہو جا، بابو جی نے اپنے کتے چھوڑ دیے تو سب سے پہلے تیری بو سونگھنے وہ میرے ڈیرے پہ ہی آئیں گے اور یوں بھی ڈیرا تو ہر وقت لالہ کی کڑی نظروں میں رہتا ہے، جانے کون ہے جو انہیں اندر کی خبریں دیتا ہے......کوئی ہے ہمارا دشمن فیضی......کوئی ہے ہمارے اندر چھپا ہوا، ہمارا بن کر ہمیں ہی دھوکا دیتا ہوا! مگر جس دن وہ میری پکڑ میں آ گیا اس کا انجام دنیا دیکھے گی......" غیض و غضب سے بولتے ہوئے شجاع کے چہرے کی طرف دیکھ کر فیضی کی ٹانگیں لرزنے لگیں۔

☆☆☆..........☆☆☆

"سرکار شکایت لے کر آیا تھا آپ کے پاس اپنی گھر والی کی......" گھوٹو نے خود پر پڑنے والی چوہدری صاحب کی سوالیہ نظروں سے گھبرا کر کہا۔ "مانتی ہی نہیں میری جناب......"

"تیری نہیں مانتی......میری نہیں مانتی......تو کس کی مانتی ہے؟" چوہدری صاحب نے طنز سے پوچھا۔

"کوئی اور یار ہے اس کا جو اسے پٹیاں پڑھاتا ہے!"

"نہیں سرکار......ایسی بات نہیں ہے۔ ویسے تو میری تابعداری کرتی ہے اور کوئی اور نہیں ہے ایسا......بس ذرا اڑی کرنا شروع کر دی ہے اس نے، کام پر نہیں آنا چاہتی، کہتی ہے تھکاوٹ ہو جاتی ہے!" وہ تو اپنی دانست میں چوہدری صاحب کی ہمدردیاں وصول کرنا چاہ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ چوہدرانی جی سے کہلوا کر ذرا اسے ڈانٹ ڈپٹ کروا دیں گے تو وہ تیر کی طرح سیدھی ہو جائے گی۔

"اگر وہ اڑی کرتی ہے تو بچہ کیسے ہونے والا ہے اس کا؟" چوہدری صاحب نے شک سے اسے گھوری ماری۔ "کیا بچہ......؟"

"نہیں نہیں سرکار......ایسی ہرگز نہیں ہے وہ، وہ بچہ میرا ہی ہے، مجھے پورا یقین ہے۔ مگر اب وہ بچے کو لے کر گھر کا کوئی کام بھی نہیں کرتی اور اس نے سرکار کے گھر پر کام کرنے سے بھی انکار کر دیا ہے......" اس نے جیسے شکایت لگائی۔

"سب سمجھتا ہوں، تیری صفائیاں میں نہیں ماننے والا...... پہلے اسے کہتا ہے کم بخت کہ چوہدری صاحب غیر محرم ہیں، انہیں مالش نہ کرنا......اور جب سمجھا کہ میں تجھے عزت افزائی کے لیے بلانے ہی والا ہوں تو خود ہی آ گیا تو میرے پاس، کسی چور کی اولاد......" انہوں نے منہ سے غصے کے باعث آ جانے والا کف صاف کیا۔

"وہ کیا ہوتا ہے سرکار......غیر محرم؟" اسے عمر بھر ہندوؤں کے گھروں میں رہ کر کہاں محرم اور غیر محرم جیسے الفاظ کا مطلب آتا تھا مگر چوہدری صاحب کو اس کی یہ بات اداکاری لگی اور مزید طیش آ گیا۔

"بتاتا ہوں ابھی تجھے...... بڑا محرم ہے نا تو اس کا، بدبخت تیرا منہ تو ایسا ہے کہ گلی کا کتا بھی تجھے دیکھے تو منہ پھیر کر گزر جائے، محرم اس کا!" غصے میں جو کچھ ان کے منہ میں آتا گیا وہ بولتے چلے گئے۔ "جوتے لگاؤ اس گندی نالی کے کیڑے کو، چلا ہے برابری کرنے، محرم بنا پھرتا ہے!" ان کے حکم کی تعمیل میں گھوٹو پر لاتوں اور مکوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ فریاد لے کر آیا تھا، الٹا چوہدری صاحب کو اسے دیکھتے ہی کلثوم کا وہ انداز یاد آ گیا

اور وہ ہتک جو انہیں ملازماؤں کے سامنے محسوس ہوئی تھی۔

"جوتے مار مار کے اس کا بھرکس نکال دو......محرم کہیں کا!" وہ بڑے بڑے قدم اٹھاتے اندر کو چلے اور وہ اس جرم کی پاداش میں پٹنے لگا جس کا اسے علم ہی نہ تھا، محرم جانے کتنی بری شے کو کہتے ہیں، وہ دل ہی دل میں سوچتا اور ہر ٹھڈے پر بلکتا رہا۔

☆☆☆..........☆☆☆

"وہ اچھا آدمی نہیں تھا مریم!" ان کے لہجے میں دکھ ہی دکھ تھا۔ "اس نے مجھے ساری زندگی اس پہلو سے دکھی رکھا مگر میں نے سب کچھ اولاد کی خاطر برداشت کیا۔ اس کی فطرت میں قناعت تھی ہی نہیں، وہ مجھے خود دوسری عورتوں سے تعلقات کے قصے سناتا تھا مگر کوئی عورت اس کی زندگی میں چند دن سے زیادہ نہ رہتی تھی......"

"حیرت ہے!" مریم نے کہا۔ "اگر وہ ایسے تھے تو انہوں نے آپ کو عمر بھر کیسے رکھا؟"

"جگہ جگہ منہ مارنے والا آدمی اصل میں کہیں کا نہیں ہوتا مریم......اسے کوئی نہ کوئی آسرا چاہیے ہوتا ہے۔ کوئی ٹھکانا، کوئی گھر اور ایک گھر والی بھی!"

"یہ سب کس لیے آپا؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔

"باہر کی عورت مرد کا پیٹ نہیں بھر سکتی، اسے پکا کر کھلاتی ہے نہ کپڑے دھو کر دیتی ہے اور نہ ہی اس کی تھکن سمیٹتی ہے، نہ بات بات پر بے عزتی کرواتی ہے، جس دن مرد کی جیب خالی ہو اس دن وہ اس سے بات بھی نہیں کرتی۔ بیوی اس کی خدمت گار ہوتی ہے، اس کے بچوں کی ماں، اس کی باورچن، دھوبن اور اس کی فرمانبردار کنیز......"

"ویسے اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ کا تجزیہ غضب کا ہے!" مریم نے ان کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"تم بتاؤ یہ بچی کون ہے؟" دن بھر تو بچوں کے سامنے فرصت نہ ملی تھی، رات کو دونوں ایک ہی کمرے میں تھیں اور کھل کر بات کر سکتی تھیں۔

"یہ بچی......" اس نے مسکرا کر انہیں دیکھا۔ "میری ہے......اور مجھے آپ نے دی ہے!"

"ہیں......؟" انہوں نے حیرت سے کہا تو مریم نے انہیں کچھ سچ اور کچھ جھوٹ ملا کر انہیں کہانی بنا کر سنا دی، جس کے مطابق وہ بچی اسے ریل میں کسی غریب اور بیوہ عورت نے دی تھی جو اس بچی کو پال نہ سکتی تھی اور مریم نے وہاں اپنے اڑوس پڑوس میں بتایا تھا کہ یہ بچی اسے سائرہ باجی نے دی تھی۔

"بڑی ذمے داری لے لی تم نے مریم، کوئی اتا پتا تو کرتیں کہ کون عورت تھی، کہیں کسی کی بچی اغوا کر کے نہ لائی ہو یا ناجائز بچی نہ ہو......" انہوں نے خدشے کا اظہار کیا۔

"جائز یا ناجائز ہونے میں بچوں کا کیا اختیار ہوتا ہے آپا......" اس نے رسان سے کہا۔ "بچے تو معصوم ہوتے ہیں اور یوں بھی میں نے پتا کروایا تھا، اس عورت اور اس کے ٹھکانے کے بارے میں!" اسے معلوم تھا کہ سائرہ باجی بال کی کھال اتاریں گی۔ ان سے یہ بھی بعید نہ تھی کہ وہ اس سے اس شخص کا اتا پتا پوچھتیں جس سے اس عورت کا حدود اربعہ معلوم کروایا تھا۔

"مگر جب یہ بچی تمہیں کسی اور عورت نے دی ہے تو پھر اڑوس پڑوس میں یہ بتانے کی کیا ضرورت تھی کہ میں نے تمہیں وہ بچی دی ہے؟" انہوں نے شک بھرے لہجے میں اس سے پوچھا۔

"آپا! لوگوں کو بے مقصد باتوں کے بتنگڑ بنانے کی عادت ہوتی ہے، کئی بے مقصد سوالوں کے جوابات دینے سے بہتر ہے کہ میں انہیں ایسی بات کہہ دوں جس پر لوگوں کے منہ بند ہو جائیں......" اس نے تاویل پیش کی۔

"چلو...... جو تمہیں ٹھیک لگا تم نے اپنے اڑوس پڑوس میں بتا دیا!" ان کی تسلی ہو گئی تھی۔ "اور اچھا کیا کہ مجھے بھی بتا دیا۔ کبھی میں جو اچانک آ جاتی وہاں تو مجھے کیا معلوم تھا کہ تم نے کیا کہانی لوگوں کو سنا رکھی ہے!"

"اللہ نے مجھے بہت پیاری مصروفیت دے دی ہے، اب زندگی کے مصائب کی طرف دھیان ہی نہیں جاتا!" مریم نے ان کے ساتھ لپٹ کر کہا۔

"مریم......"

"ہوں؟"

"تم سے ایک درخواست کرنا تھی؟" انہوں نے ہوا میں جیسے کچھ تلاشتے ہوئے کہا۔

"آپ بڑی ہیں مجھ سے، درخواست کیوں، حکم کریں!" مریم نے ان سے پیار سے کہا۔

"تم انہیں معاف کر دینا......"

"کس کو؟" جتنی دیر میں اسے سمجھ میں آتا، اس کے منہ سے بات پھسل چکی تھی۔

"جانے ان سے کیا کیا غلطیاں اور گناہ سرزد ہوئے ہیں اور جانے کتنے ہی لوگوں کے مجرم تھے وہ، ان میں سے ایک تم ہی ہو جسے میں ذاتی طور پر جانتی ہوں اور کہہ سکتی ہوں کہ انہیں معاف کر دینا تاکہ ان کی سزاؤں میں کچھ تخفیف ہو سکے......"

"مجھے تو اللہ نے بچانا تھا جو میں بچ گئی مگر میرا رشتوں اور ناتوں سے اعتبار بری طرح ٹوٹ گیا تھا، اتنا کہ اگر وہ زندہ رہتے تو میں کبھی بھی پلٹ کر آپ کے گھر نہ آتی، آپ کہتی ہیں تو میں انہیں معاف کرنے کی کوشش بھی کروں گی!" اس نے ان سے وعدہ کیا۔

"تم بہت اچھی ہو...... میں خود کو تمہاری مجرم سمجھتی ہوں اور اگر تم نے دل سے انہیں معاف کر دیا تو میں سمجھوں گی کہ تم نے مجھے معاف کر دیا ہے!"

"ایسے شخص کے لیے آپ کو کیا ضرورت ہے معافیاں طلب کرنے کی جس نے آپ جیسی نیک اور پارسا بیوی کو بے وفائی کے دکھ دیے؟" اس نے حیرت سے اُن کا منہ دیکھا۔

"وہ میرا شوہر تھا، اس کے ساتھ میں نے عمر بتائی ہے...... اس کی برائیاں اپنی جگہ مگر میرے حقوق اس نے اسی طرح ادا کیے ہیں جیسا کہ اس کا فرض تھا۔ وہ میرے بچوں کا باپ تھا اور میرے لیے یہ بات تکلیف دہ ہے کہ وہ جانے کس عذاب میں ہوگا۔" ان کی آنکھوں میں آنسو جھلملانے لگے۔

"آپ دعا کیا کریں آپا، اللہ تعالیٰ آپ کے لیے آنے والے وقت میں اولاد کی طرف سے آسانیاں پیدا کرے......" اس نے خلوصِ دل سے کہا۔ "آپ اولاد کا سکھ دیکھیں، بچوں کی خوشیاں دیکھیں!"

"کاش میں تمہارے سکھ اور خوشیاں بھی دیکھ سکتی...... تم بھی تو میری بیٹی جیسی ہو!" انہوں نے اس کو اپنے

ساتھ لپٹا لیا۔ "تمہاری زندگی میں بہت سے دکھوں کا باعث شاید ہم ہی ہیں......"

"آپ دیکھ رہی نا میری خوشیاں، یہ ہے نا میری زندگی میں آنے والی خوشی جس کی اصل ماں لوگوں کی نظر میں آپ ہی ہیں......" وہ ہنسی۔

"پیاری بچی ہے اور نام بھی تم نے اس کا پیارا رکھا ہے، ستارہ!" انہوں نے سوئی ہوئی بچی کے ماتھے سے بال ہٹائے۔

"گڑیا کہتی ہوں میں اسے پیار سے......" اس نے انہیں بتایا۔

☆☆☆......☆☆☆

"پرویز یار میں تو عجیب سے مسئلے میں پھنس گیا ہوں......" اس نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

"کیا ہو گیا ہے میرے یار؟" اس نے اس سے کہا۔

"یار میں......" اس نے الف سے یے تک ساری بات اسے سنا دی۔ "میں تو بہت برا پھنس گیا ہوں۔ اس سے شادی کروں تو بھی علی اعلان نہیں کر سکتا اور نہ کروں تو وہ خودکشی کی دھمکی دے رہی ہے......"

"یہ تو ہے باؤ...... اور اگر اس نے خود کو کچھ کر لیا تو تمہیں اندازہ نہیں کہ جہاں آرا کے ہاتھ کتنے دراز ہیں، وہ کس طرح تمہیں مشکل میں ڈال سکتی ہے!" اس نے اسے مزید ڈرایا۔ "شادی تو تمہیں اس سے کرنا ہی پڑے گی چاہے بعد میں چھوڑ دینا......" اس غریب کو کیا علم تھا کہ طوائفوں کے دلال صرف دلی جیسے بھائی ہی نہیں ہوتے بلکہ پرویز جیسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اس طرح کے معصوموں کو پھانس کر اپنا حصہ وصول کرتے ہیں۔

"تم کچھ صلاح دو، مجھے تم سے بڑی امید تھی......"

"کہہ تو رہا ہوں کہ شادی کر لو، ایک بار اس کا مطالبہ بھی پورا ہو جائے گا اور اس کے بعد جب دل چاہے اسے چھوڑ دینا......" پرویز نے مکاری سے کہا۔

"تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے کہ یہ بڑی آسان بات ہے، جو اب خودکشی کی دھمکی دے رہی ہے کیا بعد میں......"

"یہ تم مجھ پر چھوڑ دو باؤ اور بے فکر ہو جاؤ......" وہ آنکھ مار کر ہنسا۔ قائم علی کو کچھ عجیب تو لگا مگر کیا...... اسے علم نہ تھا، وہ اپنی سادگی میں پرویز کو پھر اپنا نجات دہندہ سمجھنے لگا تھا۔ ساتھ ہی اس کے دل میں اس بات کا خیال بھی آیا کہ اگر موجی نے اس سے طلاق کا مطالبہ کر دیا ہے تو اسے کہیں نہ کہیں تو شادی کرنی ہی ہے، شاید وہ ایک طوائف کو تائب ہونے میں مدد کر کے نیکی کما سکے۔ شاید قدرت نے اس کے نامۂ اعمال میں اس اچھے کام کو لکھ رکھا ہو......

"تو پھر چلو گے میرے ساتھ، اکلوتے براتی بن کر؟" قائم علی نے سوال کیا۔

"کیوں نہیں...... میرے جگر!" وہ قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔

"ویسے انہوں نے تم سے کوئی ناجائز مطالبہ تو نہیں کیا؟" یہ سوال پوچھ کر اصل میں وہ یہ جاننا چاہتا تھا کہ جہاں آرا نے اس آسامی سے کیا کچھ بٹورا ہے اور کیا اس میں سے اس کو حصہ دینے میں ڈنڈی تو نہیں مارے گی۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

محبت جی کے دیکھو

رخ چوہدری

راشد شادی سے پہلے اپنی سالگرہ بڑے اہتمام سے منایا کرتے تھے۔ کوئی ان کو خوشی سے تحفہ دیتا اور کسی سے وہ زبردستی وصول کر لیتے لیکن آج سے چار سال قبل جب ان کا یوم پیدائش وارد ہوا تو ان کو معلوم نہیں تھا کہ اسی روز ان کی کم بختی نے بھی جنم لیا ہے اور اس کم بختی نے اس وقت راشد میاں کا پیچھا پکڑ لیا جب وہ اپنی سالگرہ اپنے دوستوں کے ساتھ منا کر واپس لوٹ رہے تھے۔

ان کی گاڑی کا معمولی سا ایکسیڈنٹ ہوا تھا جس میں کسی کو بظاہر کوئی چوٹ نہ آئی مگر دل کا درد روگ بن کر عمر بھر کے لیے چمٹ گیا......اور معمولی ایکسیڈنٹ سزا بن گیا......وہ بھی عمر قید کی صورت میں......

ہما بیگم خوب صورتی کے تمام تقاضے پورے کر رہی تھیں یعنی گورا رنگ، دراز قد، لمبے بال۔ جو کہ اپنے بیٹے اور بھائی کے لیے ماں بہنوں کی ڈیمانڈ ہوتی ہے۔ وہ ہما میں موجود تھا......لیکن اس میں سب بڑی خامی یہ تھی کہ وہ ماں اور بہنوں کی نہیں بلکہ خود راشد کی پسند تھی کیونکہ اس معاملے میں وہ ماں بیٹیاں ٹھیک ٹھاک کم ظرف واقع ہوئی تھیں۔ ایک ایسی ہی لڑکی کے لیے اگر وہ مہینوں، سالوں خوار ہوئی ہوں، جوتیاں چٹخائی ہوں، کتنے ہی جھوٹ بولے ہوں، کتنے ہی دل کیوں نہ توڑے ہوں مگر لڑکی ان کو اپنی پسند ہی کی لگتی ہے۔ لیکن اگر وہی لڑکی بیٹے نے یا بھائی نے پسند کی ہو تو وہ حور بھی قصوروار ہوتی ہے اور یہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ بظاہر ہما حسین لڑکی تھی مگر اس میں سب سے بڑا عیب یہ تھا کہ وہ ان کی نہیں راشد کی پسند تھی تو اس کی سزا تو بھگتنی ہی تھی ہما اور راشد کو......سو وہ بھگت رہے تھے۔

کون سا ایسا کام تھا ہما کا جو اس کی ساس اور نندوں کو پسند آ جاتا۔ راشد کی پسند ہونا! اس کی ہر خوبی اور اچھائی پر پانی پھیر دیتا......تو دوسری طرف ہما کو بھی راشد اور راشد کے وسیلے سے ملنے والی جنت نظیر زندگی چاہیے تھی اور ان دونوں ٹیموں میں بنا فٹ بال راشد ٹینشن کا شکار ہو کر بلڈ پریشر کا مریض بن چکا تھا...... وہ دونوں پارٹیوں کو خوش رکھنے کی کوشش میں ہلکان ہو رہا تھا۔

”اچھا! تو پھر بتاؤ ناں کیا کرنا ہے دعوت کا......کیا بنے گا ڈنر میں؟“ راشد گھر میں ہونے والی دعوت پر بننے والے ڈنر کے بارے میں پوچھ رہا تھا جبکہ وہ اسے اگنور کرتی مسلسل اپنے کاموں میں مصروف تھی۔

”ہما! میں تم سے پوچھ رہا ہوں...... کوئی دیواروں سے بات نہیں کر رہا۔“

”تو! میں کیا بتاؤں...... جاؤ اپنی ماں بہنوں سے پوچھو جن کے پلو سے بندھے ہو اب تک......میری حیثیت ہی کیا ہے گھر میں، کتنا اچھا کام کیوں نہ کر دو ماں بیٹی......سو کیڑے نکالتی ہیں۔ بن بیاہی تو بن بیاہی...... بیاہی بھی آن کر سر پر سوار ہو جاتی ہیں......زندگی عذاب کر دی ہے میری۔“

”دیکھو! جو کہنا ہے مجھے کہہ لو مگر سلمیٰ آپا کو کچھ نہ کہنا......ان کی تو قسمت ہی خراب ہے اتنے برے سسرالی ملے ہیں، شوہر وہ بھی اتنا برا ہے۔“

”ہونہہ! مجھے تو جیسے بڑے اچھے سسرالی ملے ہیں، پسند کی شادی کی تھی تو نباہ کریں ناں......“ ہما نے جل کر جواب دیا۔

”تم! نے بھی تو پسند کی شادی کی ہے، تم کیوں چھوٹی چھوٹی باتوں کو ایشو بنا لیتی ہو۔ اب اس روز جس بات پر تم نے اتنا تماشا لگایا تھا...... جب سلمیٰ آپا نے کہا تھا کہ میرے پاؤں سن ہو گئے ہیں کرسی لا دو......تم نے کیا کچھ نہیں سنایا تھا ان کو اور میری برداشت کا جو امتحان لیا وہ الگ...... کیوں کمپرومائز نہیں کرتیں ان باتوں پر جو انتہائی بے ضرر ہوتی ہیں۔“

”ہاں سارے عیب مجھ میں ہی ہیں...... میں ہی بری ہوں...... جب میں اتنی ہی بری تھی تو کیوں بھاگے تھے میرے پیچھے، کیوں خودکشی کی دھمکی دے کر شادی کے لیے مجبور کیا تھا اور اب......“ ہما کا باقاعدہ رونا شروع ہو چکا تھا۔

”ارے یار مان لیا...... ہزار بار مان لیا کہ مجھ سے غلطی ہو گئی اور میری اس غلطی کی جو پہلے محبت



تھی، میری دیوانگی تھی، تم نے اس کی کیا لاج رکھ لی...... کبھی تم نے میری خاطر درگزر سے کام لیا...... کبھی کسی کو میری خاطر معاف کیا، نہیں ناں...... میری اس غلطی کو نہ تم نے معاف کیا نہ ماں بہنوں نے...... دونوں ہی مجھے سزا دینے پر تلی ہو۔“ راشد اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھامے انگوٹھے سے کنپٹی پر دباؤ ڈال کر اندرونی اسٹریس کو کم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”اور، ایک وہ عظمیٰ ہے جس کو گھر بھر نے سر پر چڑھا رکھا ہے، سارا گھر اس کے اشارے پر چلتا ہے۔ کچن میں اس کی حکمرانی ہے۔“

”شٹ اپ! خبردار جو تم نے میری معصوم بہن کا نام بھی لیا ہو، ارے اس بچی نے اپنا دن کا آرام اور راتوں کی نیند برباد کر رکھی ہے ہمارے سکون کے لیے۔ کتنی بے حس اور ناشکری عورت ہو تم کہ پکا پکایا دھلا، دھلایا تمہاری خدمت میں پیش کرتی ہے اس کا شکریہ ادا کرنے کے بجائے اس سے نفرت کرتی ہو چڑتی ہو، جی بھابی...... جی بھابی کہتے اس کی زبان نہیں سوکھتی اور تم اس کی محبت سمجھنے کے بجائے اس سے......“

”سمجھ! ہی تو گئی ہوں...... میں اس کو اور باقی سب کو...... ارے کچن اور گھر کو اس نے اس لیے سنبھال رکھا ہے کہ قبضہ رہے، حکمرانی رہے...... گھر پر اور بھیا کی جیب پر...... ہر وقت تو چپکی رہتی ہے...... بھیا یہ چاہیے وہ چاہیے، صوفے منگانے ہیں...... پردے بدلنے ہیں...... کراکری نئی چاہیے...... جیسے بھیا اسی کی فرمائشوں کے لیے تو کماتے ہیں۔“ ہما کے اندر کا لاوا راشد کو سلگا گیا تو اس نے تکیہ اٹھا کر دیوار سے مارا۔

”احمق! تنگ دل، حریص عورت تمہیں اس کی فرمائشیں تو نظر آتی ہیں کبھی ایک پل کے لیے سوچا کہ یہ سب وہ کس کے لیے کرتی ہے...... اس گھر کے لیے...... گھر کی عزت کے لیے...... اچھا سامان اکٹھا کرتی ہے...... صوفے، پردے...... کراکری جو بھی کرتی ہے اسی گھر کے لیے ہوتا ہے...... اپنی ذات کے لیے تو اس نے آج تک چھوٹی سی فرمائش بھی نہیں کی۔“

”ہونہہ! کیوں کرے وہ فرمائش بغیر فرمائش کے بھیا صاحب دنیا جہان کی چیزیں اس کے قدموں میں ڈھیر کر دیتے ہیں اور دوسری وہ ساسو ماں ہیں ان کو تو مجھ میں کیڑے ہی نظر آتے ہیں کچھ بھی کرلوں...... کھانا بناؤ وہ ان کو پسند نہیں آتا...... کوئی بات کروں اس پر اعتراض ہوتا ہے۔“

”ہاں! تم تو جیسے ان کو بڑا ان کا درجہ دیتی ہو...... ارے ماں ہیں وہ میری اور میرے حوالے سے تمہاری بھی...... مگر تم سمجھو تو...... اُن کی ہر بات کا طنز میں جب تک تم جواب نہ دو تمہاری انا تمہیں کچوکے لگاتی رہتی ہے...... وہ بزرگ ہیں دس بیماریاں ہیں ان کو...... کبھی تو ان کی بات کا وہ مطلب لیا کرو جو اصل میں ہوتا ہے...... تم تو ہمیشہ ان کی بات کا غلط مطلب نکالتی ہو اور ہنگامہ کھڑا کر کے ایک عدالت لگا لیتی ہو...... پھر خود ہی شرمندہ ہو کر منہ چھپاتی ہو...... کہاں تک میں تمہاری وکالت کروں۔“ راشد کا بی پی ہائی ہو رہا تھا مگر بیگم کو پروا کہاں تھی وہ تو بولے جا رہی تھی گویا ساس نندوں سے لڑائی کا سیشن ختم ہو گیا تو دوبارہ نہیں آئے گا۔

”ماں! بہنوں کی وکالت ہی کرتے رہنا تم تو...... یہ بات تمہاری سمجھ میں کیونکہ نہیں آتی کہ تمہارے گھر والوں نے مجھے قبول کیا ہی نہیں۔“

”ہاں! تو تم نے کون سا کوشش کی اس بات کو سمجھنے کی کہ تم ان کی نہیں صرف میری پسند کی حیثیت سے اس گھر میں آئی ہو...... تم ان کو سمجھو...... ان کی پسند و ناپسند کو سمجھو اور اپناؤ...... ارے ماں بہنوں کے دل اتنے سخت نہیں ہوتے کہ بھائی یا بیٹے کی پسند کو نہ اپنائیں مگر تم تو تم ہو...... ذرا جو میری عزت رکھی ہو...... گولی کے جواب میں تم نے میزائل داغ کر اس بات کو سچ کر دیا کہ میں نے غلط فیصلہ کیا ہے گھر والوں کے خلاف جا کر کاش...... کاش تم نے ایسا کچھ کیا ہوتا کہ میں بھی تمہارے سامنے ڈٹ کر کہتا کہ یہ ہے میری پسند میری محبت جس کے آپ اتنے خلاف تھے جس کو اپنانا نہیں چاہتے تھے...... وہ کتنی اچھی ہے، آپ کی کتنی عزت کرتی ہے کتنی فکر ہے اسے آپ سب کی اس گھر کی...... میں تو چاہتا تھا کہ تم اپنی خدمت اور محبت سے اماں کا اور باقی سب کا اتنا خیال رکھتیں کہ سب ہی کہتے کہ ہم غلط تھے جو ہما کی مخالفت کی...... ہما مثالی بہو ہے...... مگر تمہارے دل میں تو اندھیرا ہی اتنا ہے کہ نیکی کی کرن بھی اندر جا کر اس اندھیرے کو مٹا نہیں سکتی۔ اتنی تنگدستی ہے...... تمہارے دل میں رتی برابر بھی وسعت نہیں۔“

”ماں، بہنوں کے لیے تو بھیا صاحب کے خزانوں کے منہ کھلے ہیں وہ بھی اندھا دھند لوٹے جا رہی ہیں۔“ ہما نے پلٹ کر جواب دیا۔

”بکواس بند کرو گی اپنی کہ نہیں...... ان کا پورا حق ہے اس خزانے پر...... کیونکہ اس خزانے کو میرے والدین، بڑی بہنوں اور بھائیوں نے دریافت کیا ہے...... اس کے لیے کتنی محنت کی ہے۔ اپنا دن کا سکون برباد کر کے راتوں کی نیند حرام کر کے اپنی خواہشات اور ضروریات کو مار کر صرف مجھ پر توجہ دی محبت اور اعتماد کیا...... کیا نہیں دیا میرے گھر والوں نے مجھے...... نرسری سے لے کر سی ایس ایس کر کے آفیسر بننے تک کتنے کٹھن مرحلے تھے...... ایک مڈل کلاس گھرانے میں کیا، کیا مسائل ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود میرے اپنوں نے اپنا سب کچھ قربان کر دیا اور اب تم کہتی ہو کہ میں ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤں...... اب جبکہ ان کو میری ضرورت ہے تو ان کو مشکلات میں چھوڑ کر روانہ ہو جاؤں...... سوری، یہ مجھ سے نہیں ہوگا...... انڈر اسٹینڈ۔“ راشد نے گویا سب کی محبت کا حق ادا کر دیا تھا یہ سب کہہ کر مگر وہ نہیں جانتا تھا کہ ایک ایک لفظ کی دھار نے ہما کا دل، چھلنی کر دیا تھا...... وہ تو یہ سمجھتی تھی کہ اس کی زندگی میں صرف وہی اہم ہے کہ وہ اس کی خاطر کوئی بھی فیصلہ کر سکتا ہے کسی کو بھی چھوڑ سکتا ہے...... مگر اس جیسی ہوائی سوچ رکھنے والی لڑکیاں یہ کیوں نہیں سوچتیں کہ گوشت کبھی ناخن سے الگ ہوا ہے اور خون کے رشتے تو رگوں میں زندگی بن کر دوڑ رہے ہوتے ہیں اور جو سو فیصد خالص ہوتے ہیں۔ ایسے رشتوں کو رگوں سے نکال کر پھینک دینا ممکن ہوتا تو اس جیسی بے شمار لڑکیاں یہ من پسند کارنامہ انجام دے کر اپنی ہم خیال لڑکیوں کا آئیڈیل بن چکی ہوتیں۔

”مطلب مجھے اور میرے بچوں کو اسی دوزخ میں جینا ہوگا۔“ زہر لگتی ہے سسرال والوں کی تعریف وہ بھی جب میاں صاحب کریں...... سو ہما نے سسرال کو دوزخ کہہ کر اپنے اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہا...... مگر کہاں...... حسد کی آگ سب کچھ جلا کر راکھ کر دیتی ہے اور پھر بھی نہیں بجھتی ہے۔ اگر میاں صاحب میں ذرا بھی سمجھ ہو تو خون کو فوراً ابال آتا ہے...... جیسے اب راشد کے خون کو آیا تھا۔

”اچھا، یہ...... یہ جنت نظیر گھر دوزخ ہے،

ارے ناشکری عورت اس سے بڑھ کر جنت کیا ہوگی کسی بہو کے لیے کہ...... چوبیس گھنٹے ائر کنڈیشنڈ کمرے میں رہتی ہو...... ٹی وی، فریج کون سی نعمت ہے جو تمہارے اس کمرے میں نہیں۔ بارہ ایک بجے تم سو کر اپنے کمرے سے نکلتی ہو...... کھانا تیار، ناشتا تیار کون سا ایسا سسرال ہے جو ایسی لگژری لائف دیتا ہے اس بہو کو جو کورٹ میرج کر کے آئی ہو پھر بھی اس زندگی کو دوزخ کہتی ہو ناشکری عورت...... کیا کہوں میں تمہیں...... کسی کی معمولی سی بات تم سے برداشت نہیں ہوتی ایک کی دس لگاتی ہو مجھ سے آکر میں نے...... نہیں دیکھا کہ تم نے اماں کی، کسی بہن کی یا بھائی کی بات کو در گزر کیا ہو...... ارے ایسے دوریاں ختم نہیں ہوتیں...... در گزر سے گھر آباد ہوتے ہیں اگر کرنا چاہو تو......"

"ہاں! گھر آباد ہی تو کرنا چاہتی ہوں میں...... اپنا گھر...... جو صرف میرا گھر ہو جہاں میری حکمرانی ہو...... تم کچھ بھی کرلو مجھے یہاں نہیں رہنا...... تم نوکری چھوڑو اور کینیڈا چلو ڈیڈ مما کے پاس، میں اپنے گھر والوں کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں۔" ہما بھی بڑی جی دار تھی مجال ہے جو راشد کی کسی بات پر متاثر ہوئی ہو یا دل پسیجا ہو...... اپنا ازلی تقاضا دہرا دیا۔

"اچھا! میں اپنا ملک، اپنے والدین، بہن، بھائی چھوڑ کر دوسرے ملک میں تیسرے درجے کا شہری بن کر سسرال میں گھر داماد بن کر رہوں۔ واہ کیا انصاف ہے تمہارا۔"

"کیوں! میں اپنے گھر والوں سے جدا ہو کر یہاں نہیں رہ رہی۔" ہما کا شمار بھی کسی قسم کے متاثرین میں نہیں ہوتا تھا...... نہ محبت کے نہ نفرت کے وہ صرف انا کی غلام تھی۔

"تو کوئی احسان نہیں کر رہی ہو...... اپنے ملک میں ہو اور اپنی سسرال میں اپنے شوہر کے ساتھ ایک بہترین زندگی گزار رہی ہو۔"

"واٹ ایور! مجھے یہاں نہیں رہنا...... یہ میری شرط ہے اب تمہارے ساتھ رہنے کی...... ورنہ......"

"ورنہ! کیا کروگی؟"

"میں، بچے لے کر کینیڈا چلی جاؤں گی۔" اپنی جگہ سن ہوتے دماغ کے ساتھ راشد نے ہما کو دیکھا اسے یقین تھا کہ ہما نے جو کہا ہے وہ کر دکھائے گی اگر خاندان بھر کی مخالفت مول لے کر وہ اس کے ساتھ لو میرج کر سکتی تھی وہ بھی کورٹ میں تو وہ سب کچھ کر سکتی تھی...... اور جو وہ کر سکتی تھی کم از کم راشد جیسا باپ اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے اس کی مردانگی نے چپکے سے ہتھیار ڈال دیے...... یہ پدرانہ محبت بھی کیا چیز ہے کہ اس کے بچوں کی ماں غلط بات بھی کہہ رہی ہو تو ماننا پڑتی ہے اسی لیے تو اب اسے لگ رہا تھا کہ اس نے کورٹ میرج کر کے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ ہما جسے اس گھر میں صرف رہنے کی جگہ تو دی گئی، وہ حیثیت اور عزت نہیں جس کی وہ حقدار تھی اور وہی احتجاج لے کر وہ ماں کی عدالت میں بیوی کی وکالت کرنے پہنچا تو ماں تو ماں تھیں انصاف اور ممتا کا ترازو لیے بیٹھی تھیں کبھی بیٹے کی طرف جھک جاتیں تو کبھی بیٹیوں کی طرف۔

"آپا! میں نے صرف پسند کی شادی کی ہے گناہ تو نہیں کیا ناں...... میرا دین مجھے اجازت دیتا ہے پسند کی شادی مگر......"

"ہاں! بس شادی کی حد تک ہی تو تمہیں دین یاد آتا ہے ناں...... ہم سب کے جو دل ٹوٹے ہیں...... جذبات مجروح ہوئے...... کیا، کیا ارمان تھے

تمہاری شادی کے لیے ہمارے دلوں میں یہ کریں گے وہ کریں گے مگر......" سلمیٰ آپا باقاعدہ ساون بھادوں بن کر برس رہی تھیں تو ماں کی آنکھیں بھی بھیگ گئیں...... انہوں نے اپنی بھانجی کو بہو بنانے کا خواب دیکھ رکھا تھا جو کہ ڈاکٹر تھی...... سلمیٰ آپا یہ پوائنٹ جیت گئیں کیونکہ اس بات کا راشد کو بھی شدت سے احساس تھا کہ اس مڈل کلاس گھرانے کا وہ لائق فائق بیٹا تھا جس پر سب نے اپنی محبتیں لٹائی تھیں۔

"اچھا! ٹھیک ہے آپا میں مانتا ہوں کہ مجھ سے غلطی ہوگئی۔ مگر اب تو معاف کردیں۔ اب تو اس کو قبول کرلیں۔"

"قبول! کر تو لیا ہے اور کیسے کریں؟"

"ایسے قبول کیا تو کیا، کیا...... آپا آپ لوگوں نے اسے صرف گھر میں جگہ دی ہے، دل میں نہیں۔"

"میں نے تو تمہیں پہلے بھی کہا تھا راشد میاں کہ اسے اس گھر میں تو جگہ مل جائے گی دلوں میں اسے خود بنانی پڑے گی جگہ...... اپنے لیے گنجائش خود نکالنی پڑے گی...... مگر ہما کے نزدیک تو کسی رشتے کی اہمیت ہی نہیں۔ "ہوکیئر" کا بورڈ ماتھے پر لگائے پھرتی رہتی ہے، مت بھولو کہ اس قسم کی شادیوں میں لڑکی کو خود آگے بڑھنا پڑتا ہے دلوں میں جگہ بنانے کے لیے...... اپنا دل مارنا پڑتا ہے...... اس طرح تو نہیں......" بڑے بھیا نے اپنی نصیحت یاد دلا دی تو وہ بھی چپ ہوگیا کیونکہ ہما خاصی روڈ اور خود سر تھی۔

"یہ بات بھی میں مانتا ہوں بھیا مگر اس طرف سے بھی تو کسی نے نہ ہاتھ بڑھایا نہ قدم...... اگر اس نے کوئی کام کیا تو اسے دھتکار دیا گیا اسے ناپسند کر کے ردی کی ٹوکری میں پھینک دیا گیا...... اگر اس نے ایک بار ہونہہ کیا تو یہاں سے دس بار ہونہہ کیا گیا...... آپ لوگوں نے بھی تو اسے معاف نہیں کیا...... ہم صرف یہ کیوں دیکھتے ہیں کہ صرف ہم کسی کے رویے سے دکھی ہوئے ہیں ہمارا انداز ہمارا رویہ بھی تو دوسرے کی دل آزاری کا باعث ہو سکتا ہے ناں...... وہ بھی ہرٹ ہوتی ہے آپ کے رویے سے، باتوں سے مگر......"

"پھر کیا سوچا ہے تم نے کیونکہ دونوں طرف کی یہ لڑائی گھر کا سکون برباد کر رہی ہے کوئی ایک فیصلہ کروا آر یا پار۔"

"میں نے کیا فیصلہ کرنا ہے بھیا...... نہیں جی سکتا میں آپ لوگوں کے بغیر نہ ان لوگوں کے بغیر...... میں سب کو ایک ساتھ ہنستا بولتا خوش دیکھنا چاہتا ہوں...... اور اماں آپ یہ کام کر سکتی ہیں پل بن سکتی ہیں دونوں کے ملانے کے لیے مگر آپ نے بھی بہن اور بھانجی کا رشتہ جیا، بیٹے کو معاف نہ کیا۔" راشد روسا دیا۔

"تمہاری یہ بے سکونی محبت کی شادی کر لینے کے باوجود یہ بے چینی صرف اماں اور ہمارے ارمان بھرے دل توڑنے کا بھی نتیجہ ہے۔"

"یار! آپا بخش دو مجھے، معاف کردو...... اب تو میں بھی سوچتا ہوں کہ کاش میں ہی صبر کرلیتا...... اپنی پسند کے بجائے آپ کی پسند کی شادی کرلیتا...... خواہ وہ کتنی ہی بری کیوں نہ ہوتی آپ لوگوں کی پسند ہوتی تو آج میں آپ کی عدالت میں یوں بیوی کی وکالت نہ کر رہا ہوتا...... بلکہ آپ لوگ ہی اسے باتیں سنا رہے ہوتے اور مجھ سے بھی شرمندہ ہوتے...... کہ ہم سے تمہارے ساتھ زیادتی ہوگئی...... کاش میں نے خود پر کنٹرول کرلیا ہوتا...... لیکن میں ایسے تمام نوجوانوں سے التجا کروں گا کہ

شادی اپنے گھر والوں کی پسند سے کریں...... ورنہ...... ورنہ زندگی بھر فٹ بال بن کر رہ جائیں گے، اِدھر بھی کک...... اُدھر بھی کک...... اور میچ ڈرا۔'' راشد نے تو سارے عاشقوں پر پسند کی شادی پر پابندی لگادی۔ یہ تجربہ کار لوگ بھی عجیب ہوتے ہیں خود تو تجربہ کرلیتے ہیں دوسروں کو منع کردیتے ہیں۔ بھئی آپ کو یہ الزام اپنے سر لینے کی ضرورت کیا ہے...... لگنے دیجیے ٹھوکر...... ٹھوکر نہیں کھائیں گے تو دونوں پارٹیوں کے دھکے کیسے کھائیں گے۔

''تو ٹھیک ہے، وہ کرو جو اماں اور ہم چاہتے ہیں یعنی سدرا سے شادی۔'' آپا نے انتہائی سفاکی سے یہ فیصلہ سنا دیا تو ایک پل کو راشد کا جی چاہا ادب آداب بھول کر آپا سے پوچھے کہ اگر ان کے ساتھ ایسی صورتِ حال ہوتی تو کیا وہ دولہا بھائی کو دوسری شادی کی اجازت دے دیتیں...... مگر کہاں جی راشد میاں تو چکی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ گئے تھے۔

''اماں! اماں یہ کیسے ہوسکتا ہے......'' چکی سے پھنسی پھنسی راشد کی آواز آئی۔

''ویسے ہی جیسے پہلے ہوا، تم بھی خوش ہم بھی خوش۔'' اماں جو اتنی دیر سے چپ تھیں بولیں تو کفن پھاڑ کر بولیں۔

''دوسری شادی کرلو...... بیٹا...... تم بھی خوش ہم بھی خوش......'' جیسے شادی نہ ہوئی شہد کی میٹھی چاکلیٹ ہوگئی جسے زبان پر رکھتے ہی دونوں پارٹیاں خوش ہوجائیں...... راوی چین ہی چین لکھنے لگے گا۔

''اماں! اماں مت دیں مجھے اتنی بڑی سزا...... ایک کر کے میں جتنا خوش ہوں یہ صرف اللہ ہی جان سکتا ہے آپ لوگ نہیں...... سیدھا...... سیدھا مجھے زہر کیوں نہیں دے دیتے آپ لوگ۔'' ایک اور میٹنگ بغیر کسی رزلٹ کے ختم ہوگئی آئندہ نئی میٹنگ تک۔ بندہ اگر ڈھیٹ ہو تو یہ فارمولا بھی درست ہے کہ جیسے چل رہا ہے چلنے دو...... مگر راشد کی خواہش تھی کہ اس کی بیوی اور ماں بہنوں میں سفارتی تعلقات نہ صرف بہتر ہوجائیں بلکہ محبت اور اپنے پن میں بدل جائیں مگر ایسا ہوتا نظر نہیں آتا تھا۔

❖❖❖❖

''عظمیٰ تم میری بہن بھی ہو اور دوست بھی، بتاؤ میں کیا کروں؟''

''دوسری شادی......'' عظمیٰ شرارت سے بولی۔

''ہاں کیا......'' راشد بے ہوش ہونے کو تھا۔

''ہرگز نہ کریں......'' عظمیٰ نے جملہ مکمل کیا تو راشد کی سانس بحال ہوئی۔

''پھر! کیا حل ہے اس کھچڑی کا؟''

''کھچڑی تو بھیا...... اچار کے ساتھ مزے کی لگتی ہے، دہی اور دودھ ڈال کر بھی۔''

''عظمیٰ......''

''دیکھیں بھائی، یہ گھر گھر کی کہانی ہے کوئی نئی بات تو ہے نہیں، ہر گھر میں ایک آدھ گستاخ لڑکا...... میرا مطلب ہے عاشق، مجنوں، فرہاد، رانجھا ٹائپ نوجوان نکل ہی آتا ہے...... اور وہ وہی کرتا ہے جو آپ نے کیا...... لیکن ایسے کیسز میں لڑکی پر زیادہ ذمے داری آتی ہے کہ اس کی وجہ سے ایک اچھا خاصا سسٹم تہ و بالا ہوگیا ہے تو وہ اپنی محبت، فہم و فراست سے آگے بڑھے سب کے دل جیتے...... پہلے دوسروں کو سمجھے کہ وہ کیا ہیں، کیا چاہتے ہیں اس

کو اپنائے جو وہ چاہتے ہیں...... جب ٹرین چلنے لگے تو گھر والوں کو بتائے کہ میں کیا چاہتی ہوں تو میرا دعویٰ ہے کہ اس خدمت، محبت اور اپنے پن سے سخت سے سخت دل بھی موم ہوجاتے ہیں مگر بھابی تو کورٹ میرج کر کے آئیں، سب کے ارمانوں پر شب خون مارا پھر بھی ''میں'' کی بکل مارے دور دور رہیں...... ایسی لڑکیوں کو ''میں'' سے ''ہم'' کا سفر طے کرنے کے لیے پہلے خود اپنے دل میں جگہ بنا کر سب کو انوائٹ کرنا پڑتا ہے...... پہلے خود میں گنجائش نکالیں...... پھر گنجائش مانگیں...... بھابی تو ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھیں تو باقی سب دس قدم پیچھے ہٹ گئے۔ ہاں البتہ میں اس بات کو بھی مانتی ہوں کہ اگر ہم بھی دل بڑا کر کے بھابی کو اپنا لیتے تو شاید حالات اس نہج تک نہ آتے۔''

''میری! پیاری گڑیا کتنی سمجھدار ہو تم...... کاش تمہاری بھابی اور باقی سب میں بھی تھوڑی عقل ہوتی۔''

''بھائی! بات ہے ظرف کی، درگزر کی جو ہم میں نہیں۔''

''میری جان! اب کیا کروں۔''

''ہوں! مرض خاصا بڑھ گیا ہے...... لہٰذا بھیا اب آپ محبت چیک کریں۔''

''محبت چیک کروں...... مطلب؟'' راشد واقعی نہیں سمجھ پایا تھا۔

''بھیا! ویری سمپل فارمولا...... دونوں پارٹیوں کو آپ سے محبت کا دعویٰ ہے نا تو اُن کے اس دعوے کو اپنی ڈھال بنا کر ان کی محبت چیک کریں جو رزلٹ آئے اس پر عمل کریں۔ دیکھیے انشاء اللہ...... اللہ تعالیٰ بہتری کے راستے پر ڈال دے گا۔ آپ کو اور باقی سب کو۔''

❖❖❖❖

''پھر! کیا سوچا تم نے راشد؟''

''سوچنا، کیا ہے جہاں تم وہاں ہم۔'' راشد نے پروجیکٹ پر کام شروع کردیا تھا۔

''کیا...... کیا...... تم......'' مارے حیرت اور خوشی کے ہما کا منہ اور آنکھیں کھل گئیں، راشد نے ٹافی ریپر سے نکال کر اس کے منہ پر رکھی۔

''اس میں اتنی حیرت کی کیا بات ہے...... پیار کیا ہے نبھانا تو پڑے گا ناں......''

''آئی لو یو......'' فرطِ مسرت سے ہما راشد سے لپٹ گئی۔

''اینڈ آئی ہیٹ یو۔'' راشد نے ناگواری سے اسے خود سے جدا کیا کیونکہ وہ سمجھتا تھا کہ محبت یہ نہیں کہ تقاضا اور ڈیمانڈ مان لی جائے تو محبت نہ مانی جائے تو نفرت۔

❖❖❖

''اماں! میں...... میں آپ کی خواہش پوری کرنے کے لیے تیار ہوں۔'' دوسری طرف جب راشد نے اماں کو دوسری شادی کے لیے رضامندی دی تو وہ اور باقی سب بھی خوشی سے اچھل پڑے۔

''دیکھا...... دیکھا یہ ہے میرا بیٹا...... مجھے یقین تھا میرا بیٹا میری خواہش ضرور پوری کرے گا۔''

''کاش! کاش آپ میری خواہش کو اپنا لیتیں...... تو۔''

''شکر ہے اللہ کا! اب ہم اپنے سارے ارمان نکالیں گے۔ تمہاری شادی کے لیے دیکھے گئے سارے خواب پورے کریں گے، دس دن پہلے ڈھولک رکھیں گے، پہلے تو سوکھے منہ کورٹ میرج کر کے آگئے تھے تم لیکن اب سارے ارمان نکالیں

گے نیگ لیں گے اور......اور......"

"اُف! یہ عورتیں...... کتنی سفاک ہو جاتی ہیں بعض اوقات یعنی کہ اچھی ہیں تو جنت، بری ہیں تو دوزخ۔" اور جنت دوزخ کے درمیان لٹکتا راشد بہت دکھی ہو گیا تھا....اپنی حیثیت اور اوقات جان کر دونوں پارٹیوں کو اپنی اپنی ڈیمانڈ پوری ہونے کی خوشی تھی۔ وہ کتنا دکھی ہے اس کے اندر کیا توڑ پھوڑ ہو رہی ہے، اپنے بے وقعت ہونے کا احساس کس طرح رگوں کو کاٹ رہا ہے یہ نہ بیوی کو احساس تھا جس کی خاطر اس نے گھر والوں کو ناراض کیا اور نہ ہی گھر والوں کو احساس کہ چلو اگر بیٹے سے غلطی ہو بھی گئی ہے تو اسے معاف کر دیا جائے۔

❊❊❊

"لیکن! یہ اس صورت میں ہوگا ہما جب تم میری ڈیمانڈ پوری کرو گی۔"

"ہائے! راشد تم ایک بار ڈیمانڈ کر کے تو دیکھو۔" ہما نثار ہوئی جا رہی تھی، ایک ہی پل میں اس نے زندگی بھر کے خواب دیکھ ڈالے تھے۔ کینیڈا میں راشد کے ساتھ ہمیشہ کے لیے شفٹ ہونے کے خواب تو جواباً وہ اس کی کوئی معمولی سی خواہش تو پوری کر ہی سکتی تھی۔

"بولو! ناں راشد کیا ڈیمانڈ ہے تمہاری؟"

"ڈیمانڈ ...... نہیں ہما دراصل میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش ہے کہ تم کچھ عرصے کے لیے میرے گھر والوں کے ساتھ اس طرح رہو جس طرح میں چاہتا ہوں کہ میری بیوی اس گھر اور اس کے لوگوں کو، میرے رشتوں کو اسی طرح اپنائے جیسے مجھے اپنایا ہے..... خلوص سے محبت سے...... اپنی میرڈ لائف کو ویسے جیے سسرال میں جیسے میں چاہتا ہوں۔"

"بس اتنی سی بات تم فکر نہ کرو میں اس گھر اس کے ماحول اور اس کے رشتوں کو ویسے ہی جیوں گی جیسا تم چاہتے ہو۔ اس طرح محبت سے رہوں گی کہ تم خوش ہو جاؤ گے...... تم میری اتنی بڑی خواہش پوری کر رہے ہو تو میں تمہاری اتنی منی سی خواہش تو پوری کر ہی سکتی ہوں۔ اتنی سی بات پر تم پریشان ہو رہے ہو۔" خوشی اور روانی میں ہما بولے گئی تو راشد اسے دکھ سے دیکھے گیا...... کہ اب یہ بات اسے اتنی منی سی لگ رہی تھی جو پہلے پہاڑ سی لگتی تھی، وہ گہری سانس لے کر اٹھ گیا۔

"اوکے! گڈ لک......" اور جب راشد میاں نے یہ شرط اپنے گھر والوں کے سامنے رکھی تو ان کا بھی یہ جواب تھا۔

"بس اتنی سی بات...... ہم تمہیں شکایت کا موقع نہیں دیں گے...... ہما کو اتنی محبت دیں گے کہ تم خوش ہو جاؤ گے۔"

ایک طرح سے دونوں پارٹیوں نے مان لیا کہ جو کام اُن کے لیے ناممکن تھا...... اب وہ اتنی سی بات بن گیا تھا...... یعنی نہ بیوی نے شوہر کی خاطر اس کے گھر والوں کو قبول کیا تھا اور نہ ہی گھر والوں نے بیٹے یا بھائی کی خاطر بہو یا بھابی کو قبول کیا تھا۔ سب نے اپنے اپنے دلوں کے دروازے بند کر رکھے تھے...... اس کی خاطر تو کسی نے اپنی انا کو تھپکی دے کر نہیں سلایا تھا نہ ہی سرزنش کی تھی کہ نہ ہی یہ کہا تھا کہ کچھ تو اس بدنصیب کا خیال کرو جس سے سب کو محبت کا دعویٰ ہے۔

❊❊❊

اور پھر وہی ہوا جو راشد چاہتا تھا...... اپنے اپنے لالچ میں خواتین نے گھر کے ماحول کو جنت نظیر بنا دیا...... ہما کی جن باتوں پر کبھی گھر والوں کو اعتراض تھا اب لگ رہا تھا کہ نہیں ہما اتنی بھی بری

نہیں...... ہما کی برائیاں اس کی خوبیاں بن چکی تھیں، اس کے اعتراضات اس کے حقوق بن کر پورے ہو رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کھلے دل سے قبول کر لیا گیا تھا...... اور اب احساس ہو رہا تھا کہ اتنا جو ہما کو دھتکارے رکھا شروع میں ہی قبول کر لیا جاتا تو اچھا تھا۔ اسی طرح ہما کو احساس ہو رہا تھا کہ زیادتی تو دراصل اس نے ان لوگوں کے ساتھ کی ایک تو اُن کے پلے پلائے قابل بیٹے کو قابو میں کر لیا اوپر سے رویہ ناقص رہا...... اسے ایک اچھی بہو اور اچھی بھابی بن کر ان کی فیلنگز کو سمجھنا چاہیے تھا...... اسے ساس کی خدمت اور باقی سب کے ساتھ اچھے رویے سے رہنا چاہیے تھا۔ ہل چل تو اس نے ان کی پُرسکون زندگی میں مچا دی تھی۔ آگے بڑھنے میں پہل تو اسے ہی کرنی چاہیے تھی...... اس گھر اور گھر والوں کو ایسے ہی اپنانا چاہیے تھا جیسے راشد کو اپنایا تھا...... یوں آہستہ آہستہ دونوں پارٹیوں کو اپنی غلطی کا احساس ہوا تو فاصلے مٹ گئے نفرت محبت میں بدل گئی۔ یوں جیسے کبھی کوئی اختلاف تھا ہی نہیں۔ آئے دن آؤٹنگ کے پروگرام بنتے، کھانے بنائے جاتے ایک دوسرے کی تعریفوں کے پل باندھے جاتے۔ اب اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ وہ خوشی سے پھولے نہ سماتا...... مگر وہ خالی دماغ اور خالی نظروں سے ان سب کو دیکھتا۔

"بھائی! اللہ کا شکر ہے سب ٹھیک ہو رہا ہے پھر آپ خوش کیوں نہیں؟"

"کیسی خوشی گڑیا؟ یہ سب تو اپنی غرض کے مارے ہوئے ہیں، دونوں پارٹیوں نے اپنی اپنی خوشی کے لیے میری خواہش کو اوڑھا ہے۔ بیوی کی اپنی ڈیمانڈ ہے اس لیے اس نے میری بات مانی اسی طرح گھر والوں نے بھی...... تو پھر میری بہن یہ خوشی جو غرض کے لبادے میں لپٹی ہوئی ہے مجھے کیا سکھ دے سکتی ہے...... ان کے اس ڈرامے میں تو میں یا میری خوشی کہیں بھی نہیں ہے...... بیوی کو بھی مجھ سے محبت کا دعویٰ، گھر والوں کو بھی ...... مگر میں کہیں بھی نہیں...... مجھ سے کسی کو محبت نہیں...... سب اپنی غرض کے غلام ہیں۔" اور یہ احساس راشد کے ہائی بلڈ پریشر کی وجہ بن گیا...... اور انجائنا کے

گھریلو چٹکلے

1- روٹی کو ہلکا اور تازہ رکھنا:

آٹا گوندھتے ہوئے اس میں لیموں کے دو یا تین قطرے ڈالنے سے روٹی بہت ہلکی اور تازہ پکتی ہے اور ذائقے میں بھی کوئی فرق نہیں آتا۔

2- خستہ کُرکُرے چپس:

چپس بناتے وقت آلوؤں کو کاٹ کر جس پانی میں رکھا جائے اس میں نمک ڈال دیں۔ اس کے بعد اس پانی سے نکال کر کسی سفید کپڑے میں آلوؤں کو رکھ کر خشک کر لیں پھر تلیں۔ بہت سفید خستہ اور لذیذ چپس بنیں گے۔

3- نکسیر دور کرنے کے لیے:

اگر ناک سے نکسیر آنا بند نہ ہو تو سرکے میں روئی بھگو کر سونگھنے سے نکسیر فوراً بند ہو جاتی ہے۔

جبین ہاشمی، بھیرہ

درد نے سب کو اس کے گرد جمع کر دیا۔ بیوی الگ رو، رو کر ہلکان ہو رہی تھی اپنی غلطی کا احساس ماں اور بیوی کے لبوں پر دعا بن گیا...... اور ماں بہنوں اور بیوی کی دعائیں راشد کو زندگی کی نوید دے گئیں مگر وہ چپ چپ تھا، نہ اسے بیوی اچھی لگ رہی تھی اور نہ ہی اپنے گھر والے...... مگر بات تو اسے کرنی تھی۔

''میں! میں ہما تم سے اور اماں سے بلکہ آپ سب سے شرمندہ ہوں کہ اپنی غرض کے لیے میں نے آپ لوگوں کو آزما ڈالا...... در اصل میں، میں چاہتا تھا کہ آپ ہما کو قبول کریں اور اس کے لیے گھر کے ساتھ ساتھ دل میں جگہ بنائیں، اسے اس کا حق دیں، عزت دیں...... اور ہما سے بھی میں یہ ہی چاہتا تھا کہ وہ خود کو اس گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ کرے...... آپ لوگوں کی عزت اور خدمت کرے اور ہم سب ایک اچھے اور خوشگوار ماحول میں مل جل کر رہیں اگر اپنی وجہ سے نہیں تو میری وجہ سے ہی کمپرومائز کر لیں ایک دوسرے کو قبول کر لیں۔ مجھ سے محبت کا دعویٰ کرنے والے اس کا ثبوت بھی دیں...... مگر ایسا نہیں ہوا...... آپ لوگوں نے وہ سب کیا جو میں چاہتا تھا مگر اپنی اپنی ڈیمانڈ کے لیے، میرے لیے نہیں۔'' راشد باقاعدہ رونے لگا تو دونوں پارٹیوں نے اس کے ہاتھ تھام لیے۔

''راشد! میرے بیٹے میرے بچے یہ درست ہے کہ میں خود غرض ہو گئی تھی کہ میرا بیٹا جس کو میں نے جنم دیا...... اللہ کی مدد اور مہربانی سے یہاں تک پہنچایا تو میں کیا ہر ماں یہ چاہتی ہے کہ اپنے بیٹے کی شادی اپنی پسند کی لڑکی سے دھوم دھام اور ارمانوں سے کرے۔ یہاں وہ خود غرض بھی ہو جاتی ہے یہ نہیں سوچتی کہ ان کے بیٹے کی بھی تو پسند ہو سکتی ہے، خوشی ہو سکتی ہے۔ بس بیٹا ایسی ہی صورتِ حال میں جب لڑکا وہ کرتا ہے جو تم نے کیا...... یعنی کورٹ میرج تو یہ تم نے مجبوراً کیا...... اگر ہم سب دل بڑا کر لیتے تو شاید یہ صورتِ حال پیدا نہ ہوتی...... ہم بھی انسان ہیں، دل بڑا کرتے کرتے بیٹا بیمار ہو گیا...... اور میری جان...... میرے بچے اتنے عرصے میں ہما نے اور ہم نے یہ بھی جان لیا ہے کہ ہم لوگوں کے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بہت محبت اور گنجائش ہے۔ جسے شاید ہم پہچان نہیں پا رہے تھے۔ آج میں یہ حلفیہ کہتی ہوں کہ ہم ایک دوسرے کو جان گئے ہیں اور آج میں دل و جان سے اپنی بہو کو بہو ہی نہیں بیٹی کی حیثیت سے قبول کرتی ہوں۔ ہما میری بیٹی آؤ میرے پاس......'' اور یوں آخری سین میں ساس نے ساری نفرت ختم کر دی۔

''امی! بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ راشد، غلطی مجھ سے ہوئی ہے میں بھی ان سب کی محبت کو پہچان نہیں سکی۔ میں تو تمہارے بے ہوش ہونے تک اپنی بات پر ڈٹی ہوئی تھی مگر جب تمہاری طبیعت خراب ہوئی تو مجھے لگا کہ میں دنیا میں تنہا ہو گئی ہوں اگر تم نہ رہے تو...... میں اور بچے کیا کریں گے، کیسے جی پائیں گے اس لیے میں تم سے معافی مانگتی ہوں...... اور شرمندہ ہوں کہ اپنی غرض کے لیے میں نے اچھائی کا ڈراما کیا، ان سب کو ضرورتاً سمجھا اور بے حد اچھا پایا...... میں وعدہ کرتی ہوں آج کے بعد سب کچھ تمہاری خوشی کے لیے کروں گی۔ اب مجھے تمہارے گھر والے اتنے ہی عزیز ہیں جتنا کہ تم۔''

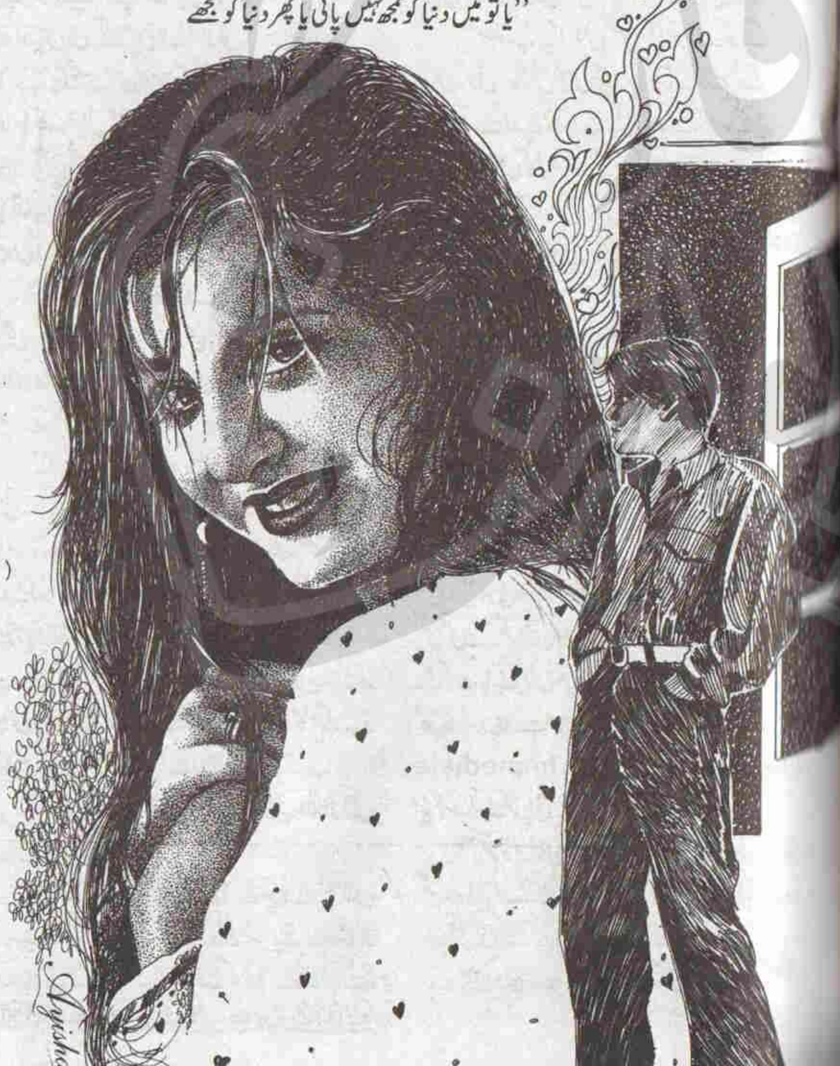
''یا اللہ! تیرا شکر کیسے ادا کروں......'' راشد ساری تکلیف بھول کر مسکرانے لگا۔

گوئیم مشکل

عنیزہ سید

اس نے گلاس وال کے پیچھے ارم کو زعیم عباس سے باتیں کرتے دیکھا اور سر جھکا کر اپنے سامنے رکھے کاغذوں کو دیکھنے لگی۔

''یا تو میں دنیا کو سمجھ نہیں پائی یا پھر دنیا کو مجھے



اپنا آپ سمجھا نہیں آیا۔" وہ سامنے رکھے کاغذات پر لکھے حروف کو خالی نظروں سے دیکھتے ہوئے سوچ رہی تھی۔

"تمہارا نام رانیہ کس نے رکھا؟" اسے ارم کی بات یاد آئی۔ "ملکاؤں اور شہزادیوں والا نام ہے بھئی۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" اس نے جواب دیا تھا۔ "ماں باپ کو اپنے بچے ملکائیں، بادشاہ اور شہزادے، شہزادیاں ہی لگتے ہیں نا۔"

"پتا نہیں اس نام زعیم کے کیا معنی ہیں؟" ارم کو اچانک خیال آیا تھا۔

"پتا نہیں۔" رانیہ نے سوچتے ہوئے جواب دیا تھا۔ "تمہیں اس نام کا مطلب جاننے کا خیال کیوں آیا؟"

"اس لیے کہ مجھے لگتا ہے اردو میں اس نام کا جو بھی مطلب ہو انگریزی میں اس کے لیے Arrogance کا لفظ ہی استعمال ہوتا ہوگا۔" ارم نے مسکرا کر کہا تھا۔

"ارے، یہ تمہیں کیسے لگا۔" رانیہ حیران ہوئی۔

"دیکھتی نہیں یہ کتنا Arrogant شخص ہے، خود پسند، ہائی پروفائل والا۔" ارم نے سرگوشی کے سے انداز میں کہا۔

"اچھا!" رانیہ نے بلاارادہ ہی گردن موڑ کر گلاس وال کے پار اپنے کیبن میں بیٹھے کام کرتے زعیم عباس پر نظر ڈالی۔

"تمہیں نہیں لگتا؟" ارم نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا تھا۔

"پتا نہیں..... " رانیہ نے شانے اچکائے۔ "میں تو جب سے آئی ہوں مجھے اچھے طریقے سے گائڈ کررہا ہے۔" اس نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا بلکہ اگر زعیم عباس مجھے اتنا گائڈ نہ کرتے تو میں شاید دو، چار دن سے زیادہ یہاں سروائیو ہی نہ کرپاتی۔"

"اچھا جب ہی پرسوں تھینک یو سر اور آئی ایم اوبلائجڈ (میں مشکور ہوں) قسم کے جملے پھینک رہی تھیں اس کی طرف۔" ارم کا لہجہ رانیہ کو عجیب سا لگا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا؟" اس نے چونک کر ارم کی طرف دیکھا۔

"مطلب یہ کہ اس شخص کی خوشامد کرکے کوئی خاص گول حاصل نہیں کیا جاسکتا۔" ارم نے بال پوائنٹ سے اپنے بکھرے بال سلجھاتے ہوئے کہا۔

"خاص گول..... " رانیہ کو مزید حیرت ہوئی۔

"ہاں۔" ارم نے معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ "یہی کہ کوئی پرموشن یا کہیں پروجیکشن مل جائے۔"

"ایکسکیوزمی۔" رانیہ ذرا بلند آواز میں بولی۔ "تمہیں کس نے کہا یا تمہیں کیسے لگا کہ میں کسی ایسے گول کو حاصل کرنے کی کوشش کررہی ہوں۔"

"کسی نے نہیں۔" ارم نے بے پروائی سے شانے جھٹکے..... "یہ میرا خیال ہے کیونکہ عموماً ہوتا ہی یہ ہے۔"

"ہوتا ہوگا۔" رانیہ کو ارم کی بات خاصی بری لگی تھی۔ "مگر میں اس سے اس طرح کے کسی مقصد کے تحت بات نہیں کرتی، وہ میری مدد کرتا ہے، مجھے گائڈ کردیتا ہے اور میرا خیال ہے کہ اگر وہ میرا Immediate باس نہ ہوتا تو شاید میں یہاں ایڈجسٹ نہ کرپاتی۔"

"تم تو برا مان گئیں۔" ارم کا لہجہ فوراً بدل گیا تھا مگر وہ زیرلب مسکرا رہی تھی کیونکہ کہنے والی بات وہ کہہ چکی تھی۔

اسی دن سے رانیہ نے زعیم عباس سے گفتگو

میں محتاط رہنا شروع کردیا تھا۔ اس کے اس لیے دیے رہنے کے سے انداز پر زعیم عباس چونکا یا نہیں یہ رانیہ کو پتا نہیں چلا تھا مگر وہ خود اپنے دل میں اس بات پر مطمئن تھی کہ ارم جیسی لڑکی دوبارہ اس سے کوئی ایسی بات نہیں کرسکے گی مگر اس روز ارم کو زعیم عباس کے کیبن میں بیٹھ کر مسلسل باتیں بگھارتے دیکھ کر وہ دنگ رہ گئی تھی اور اس روز اس نے سوچا تھا کہ یا تو وہ دنیا کو سمجھ نہیں پائی یا پھر دنیا اس کو اپنا آپ سمجھا نہیں پائی۔

☆☆☆

رانیہ کو یہ آفس جوائن کیے زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ ایک بڑے چین آف اسکولز کا ہیڈ آفس تھا جس کے نصابی منصوبہ بندی کے شعبے میں اس کا تقرر ہوا تھا۔ اس شعبے کے ماہانہ اور ہفتے واری اسباق کی تیاری کے ذیلی شعبے میں وہ سوشل اسٹڈیز اور ہسٹری کے اسباق کی تیاری میں معاون کے طور پر کام کررہی تھی۔ زعیم اسی شعبے کا ہیڈ تھا۔ رانیہ کے لیے یہ ماحول نیا تھا اور کام ایسا تھا کہ اس میں اس سے بہت سی غلطیاں سرزد ہوجایا کرتی تھیں۔ زعیم عباس نے اس ابتدائی وقت میں اس کی بہت مدد کی تھی۔ رانیہ جن اسباق کی ہفتے واری تقسیم کو مکمل کرکے کمپوزنگ کے لیے بھجواتی تھی ان میں کئی غلطیاں نکل آتی تھیں۔ زعیم پروف ریڈنگ کا کام خود کرتے ہوئے رانیہ کو اپنے سامنے بیٹھا کر کاربن پینسل کی مدد سے ایک ایک غلطی کو نشاندہی کرتا جاتا اور رانیہ شرمندہ ہوتی رہتی۔

"مگر پریشان نہ ہوا کرو۔" سب غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد زعیم اسے کہتا۔ "میں تمہیں ایسے ہی لیتا ہوں جیسے میں خود اس کام میں پہلے دن تھا۔ تجربہ اور مہارت پہلے دن، پہلے ہفتے اور پہلے مہینے میں ہی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ یہ وقت گزرنے کے ساتھ آتے ہیں اگر ہر آنے والے دن میں ہماری غلطیاں پہلے سے کم ہوتی چلی جائیں تو یقیناً ہم تجربہ اور مہارت دونوں حاصل کررہے ہوتے ہیں۔" وہ رانیہ کو تسلی دیتا۔ "لیکن شوق اور محنت کے بغیر کوئی ٹاسک حاصل نہیں کیا جاسکتا۔" ساتھ ساتھ وہ یہ بھی یاد دلاتا۔

رانیہ کو ایسا لگتا کہ زعیم کی رہنمائی میں وہ کم عرصے میں خاصا کام سیکھ جائے گی۔ وہ اپنی غلطیوں پر قابو پارہی تھی، اس کا کام ہر روز پہلے سے بہتر ہورہا تھا اور اب زعیم بھی اس کے کام کی تعریف کرنے لگا تھا۔

"سر آپ یہاں نہ ہوتے تو شاید میں کئی مہینے سر کھپا کر بھی کچھ سیکھ نہ پاتی۔" جس روز اس کے پورے کام میں صرف پانچ غلطیاں نکلیں اس نے سر خوشی کے عالم میں زعیم سے کہا تھا۔ جواب میں زعیم نے صرف مسکرانے پر اکتفا کیا تھا اور اس کی کہی اسی بات کو سن کر ارم نے اسے فوراً جتا دیا تھا کہ شاید وہ زعیم کی تعریف کرکے کوئی فائدہ حاصل کرنا چاہ رہی تھی۔ اس کے بعد اس کا مجموعی رویہ آفس کے اندر خاصا محتاط ہوگیا تھا۔ اسے بہت تگ ودو کے بعد یہ نوکری ملی تھی۔ تاریخ میں ماسٹرز کرنے کے بعد وہ کئی چھوٹے موٹے اسکولوں اور اکیڈمیز میں پڑھانے کے دھکے کھا چکی تھی کہیں بھی مستقل نوکری نہیں ملتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی غلطیوں کو بنیاد بنا کر کھڑے کھڑے نوکری سے برخاست کردینے کا رواج عام تھا اور اس کے معاشی حالات ایک مستقل نوکری کے متقاضی تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد گھر میں بڑی بہن ہونے اور اپنی تعلیم مکمل کرچکنے کے ناتے اسے کام کرنا ہی تھا۔ اس نے کبھی نہیں سوچا تھا کہ اس کو اتنے بڑے ادارے میں نوکری مل جائے گی۔ یہاں تنخواہ اچھی تھی اور کئی مراعات بھی حاصل تھیں۔

یہاں کام کرنا اس کے مستقبل کے کیریئر کے لیے ایک بہت بڑا موقع تھا۔ اس کو ٹیسٹ اور انٹرویو کے بعد سلیکٹ بھی زعیم عباس نے ہی کیا تھا۔ یوں وہ اس شخص کی کئی طرح سے ممنون تھی مگر دل میں مشکور رہنا زیادہ بہتر ہے... سوچ کر اب وہ اس سے صرف ضروری بات ہی کیا کرتی تھی۔

☆☆☆

مگر وہ ایک مختلف دن تھا۔ اس روز وہ اپنا کام ختم کر کے گھر جانے سے پہلے اپنی میز پر بکھری چیزیں سمیٹ کر دراز میں رکھ رہی تھی جب زعیم اپنے کیبن سے نکل کر اس کے ٹیبل کی طرف آیا۔

''کلاس سیونتھ کا منتھلی بریک اپ چیک کیا تھا آپ نے؟'' اس نے خاصے کھردرے لہجے میں رانیہ سے پوچھا تھا۔

''جی سر۔'' رانیہ نے گڑبڑا کر کہا تھا۔

''اس بار کروسیڈز پارٹ ون کا پلینر جانا تھا آپ نے مسلمز ان ساؤتھ ایشیا کے نوٹس بنا دیے۔'' اس نے ہاتھ میں پکڑے کاغذ رانیہ کے سامنے میز پر پھینکتے ہوئے کہا۔

رانیہ نے محسوس کیا کہ ان کاغذوں کو اٹھا کر دیکھتے ہوئے اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔

''آپ کے پاس بریک اپ کی جو کاپی ہے وہ نکالیے۔'' اسے زعیم کی آواز سنائی دی۔ انہی کانپتے ہاتھوں سے اس نے دراز سے وہ کاپی نکالی۔ اس نے دوسرے کے بجائے تیسرے ہفتے کے پلینر کو ہائی لائٹ کر رکھا تھا۔

''آئی ایم ایکسٹریملی سوری سر۔'' الفاظ بہ مشکل رانیہ کے منہ سے نکلے۔ اسے اپنی نظروں کے سامنے زمین گھومتی نظر آ رہی تھی اور اپنی نوکری جواب دیتی محسوس ہو رہی تھی۔ یہ ایک ایسی سنگین غلطی تھی جس پر پچھلی کئی چھوٹی موٹی نوکریوں کی طرح اسے اسی وقت فارغ کیا جا سکتا تھا۔

''قسمت......'' اس کے دل نے کہا تھا۔ ''کس مشکل سے بجٹ سیٹ ہوا تھا گھر کا اور اب پھر وہی دھکے اور خواری۔''

''آپ کو پتا ہے کل یہ پلینر ڈسپیچ ہونا ہے؟'' اس کے کانوں میں ایک بار پھر زعیم کی آواز پڑی مگر اسے لگا اس بار اس میں غصے اور سختی کا عنصر کم تھا۔

''جی۔'' اس کے حلق سے مری ہوئی آواز... برآمد ہوئی۔

''ناؤ......؟'' وہ سوالیہ انداز میں پوچھ رہا تھا۔

اس سوال کا جواب رانیہ کے پاس نہیں تھا۔ وہ ''آپ اسی وقت دوبارہ یہاں سے واپس نہ آنے کے لیے گھر جا سکتی ہیں۔'' یا ''گیٹ لاسٹ'' قسم کے کسی اگلے جملے کی منتظر تھی مگر اس کی نظروں نے دیکھا وہ اس کی میز پر رکھے انٹر کام پر کوئی نمبر دبا رہا تھا۔

''رشید صاحب! آپ اور آپ کا اسٹاف آج ابھی آف نہیں کرے گا۔'' وہ کمپوزنگ ڈیپارٹمنٹ کے انچارج سے کہہ رہا تھا۔

''اور آپ بھی اپنے گھر کال کر دیں کہ آج آپ لیٹ گھر جائیں گی۔'' انٹر کام ریسور رکھنے کے بعد وہ رانیہ سے مخاطب ہوا تھا۔

''لیٹ سر؟'' رانیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا تھا، اس کی آنکھیں اپنی غلطی کی شرمندگی اور نوکری جانے کے خوف سے ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

''جی لیٹ......!'' وہ حتمی لہجے میں بولا۔ ''جب کوئی غلطی ہو جائے تو اس کی درستگی میں وقت تو لگتا ہے۔''

رانیہ نے سر جھکا لیا۔

''آپ کال کریں پلیز اپنے گھر۔'' پانچ منٹ تک اس کے کسی ردِعمل کا انتظار کرنے بعد وہ بولا۔

''سر!'' رانیہ نے نظریں اٹھائیں۔ ''میری امی شاید نہ مانیں۔''

''او کم آن......'' وہ میز پر ہاتھ بجا کر بولا۔ ''بی پروفیشنل مس رانیہ، میں پہلے دن سے آپ کو پروفیشنل ازم اور محنت و لگن کا سبق پڑھا رہا ہوں۔''

''جی سر، جی سر۔'' رانیہ نے اس کے انداز سے گھبرا کر فوراً بیگ سے موبائل نکال لیا۔ امی نے اس کے یہ بتانے پر کہ وہ لیٹ گھر آئے گی کیا کہا سنے بغیر اس نے فون بند کر دیا۔

''دیٹس گڈ......'' زعیم نے کہا۔ ''جسٹ لائیک اے پروفیشنل، زیادہ دیر کا کام نہیں ہے۔'' کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ ''میں آپ کے ساتھ یہ کام خود کراؤں گا، جو پیج مکمل ہو جائے کمپوزرز کو فارورڈ کرتی جائیں، چلیں بیٹھیں۔'' وہ اس کے سامنے چیئر لے کر بیٹھ گیا۔

''آپ نے لنچ کیا تھا، چائے پی تھی۔'' تھوڑا کام کرنے کے بعد جیسے اسے کچھ یاد آیا اور اس کا جواب سنے بغیر ہی وہ کچن کا نمبر انٹر کام پر دبا چکا تھا۔

''چائے پئیں اور کچھ کھا لیں۔'' چائے آنے پر اس نے کام روک کر رانیہ کے سامنے سینڈوچز کی پلیٹ اور چائے کا کپ رکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ تھکے ہوئے ذہن اور خالی معدے کے ساتھ کچھ زیادہ اچھا کام نہیں کر رہی ہیں۔'' رانیہ کسی روبوٹ کی طرح اس کی ہدایات پر عمل کر رہی تھی۔ اس کے ذہن میں صرف ایک بات بار بار گونج رہی تھی کہ اس کی نوکری بچ گئی تھی۔

''بس اتنی سی بات تھی۔'' ڈھائی گھنٹے کے بعد زعیم نے اپنا پوائنٹر روک کر بند کیا۔

رانیہ نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا اور ایک نظر اپنے کمپیوٹر کی اسکرین پر ڈالی۔ جو کام وہ ایک ہفتے کے آغاز میں شروع کرتی تھی اور جسے مکمل کرنے میں اسے چار دن لگ جاتے تھے صرف ڈھائی گھنٹوں میں مکمل ہو گیا تھا۔ کمپوزنگ، پروف ریڈنگ اور کاپی ہونے میں مزید ایک گھنٹا صرف ہوا اور تقریباً ساڑھے چار گھنٹوں میں سب برانچز کو بھیجے جانے والے پارسل تیار تھے۔

''اب آپ گھر جا سکتی ہیں۔'' سب کام مکمل ہونے کے بعد زعیم نے رانیہ سے کہا۔

''جی سر۔'' وہ اسی طرح کسی روبوٹ کے مانند بیگ اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ اس کے پیچھے ہی آفس سے باہر نکلا تھا اور لفٹ میں بھی اس کے ساتھ تھا اگرچہ اس عرصے میں وہ بالکل خاموش رہا تھا۔ بلڈنگ سے باہر آ کر رانیہ نے دیکھا ہر سو روشنیاں جگمگا رہی تھیں اور آسمان پر ستارے بکھرے تھے۔ اس کا دل ایک دم پریشان ہو گیا۔ کام میں مگن اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ اس کے روٹ کی وین اب ملے گی بھی یا نہیں، وہ اپنے مخصوص وقت پر گھر جاتی تھی اور اسے وین کا کبھی کوئی مسئلہ نہیں ہوا تھا۔ سڑک کے کنارے اسٹاپ پر کھڑی وہ سوچ رہی تھی کہ کس سے پوچھے، اس کی سائڈ کو جانے والی اگلی وین کب آئے گی، اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ اسے بہت دیر ہو رہی تھی اور اس کے بیگ میں رکھا موبائل بار بار بج رہا تھا۔ مزید پون گھنٹا گزرنے کے بعد اس کے روٹ کی وین اسٹاپ پر آئی اور گھر پہنچتے پہنچتے رات کے پونے دس بج چکے تھے۔ امی کے دروازہ کھولنے پر اس نے دیکھا ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں اور چھوٹے بہن بھائی خوف زدہ نظروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

"ہمیں نہیں چاہئیں ایسے پیسے۔" امی نے اسے اس رات کھانا دیتے ہوئے کہا تھا۔

"پروفیشنل ذمے داریاں، پروفیشنل رویے، لگن، محنت اور سخت جانی۔" جواب میں رانیہ نے زعیم عباس کے پڑھائے سبق امی کو سنا دیے تھے۔ امی اس کی بات پر ذرا بھی مطمئن نہیں ہوئی تھیں۔ انہیں ڈر تھا کہ ایک روز دیر تک کام کر کے اس نے اپنے باس کو پیغام دیا تھا کہ وہ دیر تک رک کر کام کر سکتی ہے اور اب وہ آئندہ بھی اسے دیر تک روکے گا مگر رانیہ کا خیال تھا کہ وہ اپنی غلطی کی درستگی کے لیے وہاں رکی تھی اور آئندہ ایسی صورتِ حال پیش نہیں آئے گی۔

"جو بھی ہے امی...... بہت کچھ فیس تو کرنا پڑے گا، نوکریاں راستے میں پڑی نہیں ملتیں۔" بحث کے آخر میں اس نے کہا تھا۔ "آج تو بال بال بچ گئی، نکالی جاتی تو پھر سے فٹ پاتھ پر ہوتی۔"

☆☆☆

"میں معذرت خواہ ہوں کہ کل آپ کو دیر تک رکنا پڑا۔" اگلے روز سوشل اسٹڈیز کے ایک ٹاپک پر بات کرتے ہوئے زعیم نے اچانک کہا۔

"وہ میری غلطی تھی سر جس کی وجہ سے مجھے رکنا پڑا۔" رانیہ نے بغیر چونکے جواب دیا بلکہ اس نے نظریں اٹھا کر زعیم کی طرف دیکھا۔ "بلکہ میں آپ کی بے حد مشکور ہوں کہ آپ نے میری غلطی نظرانداز کر دی ورنہ میرا خیال تھا کہ آپ مجھے کھڑے کھڑے فائر کر دیں گے۔" وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

"جب کسی غلطی کو درست کرنے کا موقع موجود ہو تو پھر اس سے بڑی غلطی سے بچا جا سکتا ہے۔" اس نے کہا۔

"اس سے بڑی غلطی؟" رانیہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کو فائر کرنا اس سے بڑی غلطی ہوتی۔" وہ مسکرا کر بولا۔ "ایک اچھا ایڈمنسٹریٹر کبھی بھی جذبات کو خود پر اوور کم (قابو) نہیں دیتا، اگر میرا مزاج ایسا ہوتا تو اس ڈپارٹمنٹ میں بھی باقیوں کی طرح ہائرنگ فائرنگ چلتی نظر آتی رہتی آپ کو۔"

"آپ جو بھی کہیں سر، میں کل اپنی غلطی دیکھ کر فوراً ذہنی طور پر تیار ہو گئی تھی کہ آپ مجھے فارغ کر دیں گے۔" رانیہ نے سادگی سے کہا۔

"تو پھر ہر سال سے بہتر نوٹس کون بنا کر دیتا مجھے؟" وہ ہنس کر بولا۔ "دیکھیے مس رانیہ۔" اگلے لمحے اس نے سنجیدگی اختیار کرتے ہوئے کہا۔ "آپ کو اپنے ٹیلنٹ پر اعتماد ہونا چاہیے۔ اپنے کام کی کوالٹی اتنی اچھی کر لیجیے کہ ہر وقت یہ دھڑکا نہ لگا رہے اب فارغ کی گئی کہ تب......!"

"مگر سر میں نے جو رویہ کل آپ کا دیکھا، پہلے کہیں کام کرتے ہوئے مجھے اس کا تجربہ نہیں ہوا۔" رانیہ کی سوئی وہیں اٹکی تھی۔

"مجبوری تھی، مجھے آپ کو روکنا پڑا۔" اس نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ "میں وہ کام خود بھی کر سکتا تھا مگر آپ کو یہ احساس دلانا ضروری تھا تاکہ آپ آئندہ کام محتاط ہو کر کریں۔"

"ویسے۔" کچھ توقف کے بعد وہ بولا۔ "میں گلٹی فیل کر رہا تھا آپ کو اتنی دیر روکنے پر، کافی رات ہو چکی تھی جب آپ جا رہی تھیں اپنے گلٹ کے احساس کو دور کرنے کے لیے جب تک آپ وین میں سوار نہیں ہو گئیں میں اپنی گاڑی میں بیٹھا روڈ پر ہی کھڑا رہا اور پھر آپ کی وین کے پیچھے لگا آپ کو آپ کے اسٹاپ تک فالو کرتا رہا۔" رانیہ کو جھٹکا سا لگا۔

"سر آپ۔" وہ حیرت کے مارے کچھ بول نہیں پا رہی تھی۔ کل شام سے اب تک زعیم عباس کا امیج اس کی نظروں میں پہلے سے کہیں زیادہ بڑا اور عظیم بن چکا تھا۔

"جب آپ اس محلے کی گلی نمبر 4 کے مکان نمبر 8 میں داخل ہو گئیں تو میں مطمئن ہو کر واپس آ گیا۔" وہ بتا رہا تھا۔

"اتنی کیئر...... اتنا خیال۔" رانیہ کا ذہن سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ وہ کیا جوابی بات کرے، وہ زعیم عباس کی اتنی ممنون ہو چکی تھی کہ اسے آئے روز قدم قدم پر ہونے والی دوسرے لوگوں کی چھوٹی موٹی زیادتیوں کے گلے ایک دم بھول گئے تھے "اگر ایسے لوگوں کے ہجوم میں زعیم عباس جیسا ایک انسان بھی موجود ہے اور اس سے آپ کی ملاقات بھی ہو جاتی ہے تو غنیمت ہے پھر باقی لوگوں کی جبلی بدفطرتیوں کا گلہ نہیں کرنا چاہیے۔ ایک فیصلہ اس نے فوراً سے دل میں کر لیا اس روز سے زعیم عباس اس کے لیے رول ماڈل بن گیا۔ Mentor (معلم) کا درجہ پا گیا اور وہ لاشعوری طور پر اس کی حرکات وسکنات، کام اور گفتگو کو غور سے دیکھنا اور اسے اختیار کرنا شروع ہو گئی۔

☆☆☆

"کچھ لوگوں کو اچھا بننے کا خبط ہوتا ہے۔" کئی دن بعد لنچ کے دوران ارم کا موضوعِ گفتگو پھر سے زعیم عباس ہی تھا۔ "وہ جو نیا لڑکا آیا ہے نا بک مارکنگ کے لیے سلمان۔" وہ رانیہ کو بتا رہی تھی۔ "اس کی چھوٹی بہن لیوکیمیا کی مریضہ ہے، زعیم دو ماہ سے اپنی پے کا ٹین پرسنٹ سلمان کی پے میں ٹرانسفر کروا رہا ہے۔"

"تمہیں کیسے پتا چلا؟" رانیہ کا دل خوش ہوا مگر اس نے حیرت سے ارم سے سوال کیا۔

"خود سلمان نے۔" ارم نے چائے کا کپ منہ سے لگاتے ہوئے کہا۔

"یہ تو بڑی نیکی کا کام ہے۔" رانیہ نے ارم کے لہجے کی چبھن کو محسوس کرتے ہوئے اپنی رائے دی۔

"ہوگا۔" ارم نے یوں کہا جیسے ذرا بھی متاثر نہ ہو۔ "مگر زعیم عباس جیسے لوگ نیکیاں اس لیے نہیں کرتے کہ نیک بنیں بلکہ اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ ان کی تعریفیں کرتے رہیں۔ انہیں اپنے بارے میں "وہ بہت اچھے، بہت نیک، بہت عظیم انسان ہیں" قسم کی باتیں سننے کا خبط ہوتا ہے۔"

"دس از ناٹ فیئر ارم۔" رانیہ کو ارم کی بات بری لگی۔ "جو کسی کی خوبی ہو اس کی تعریف کھلے دل سے کرنی چاہیے اور میں نے کبھی اسے اپنی نیکیوں کا اعلان کرتے نہیں دیکھا۔"

"یہی تو ہوشیاری ہے۔" ارم نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "وہ خاموشی سے نیکی کرتا ہے، جس کے ساتھ کرتا ہے اسے جتا بھی دیتا ہے اور نیکی کروانے والا شخص جب ہر جگہ اس کی تعریف کرتا ہے تو زعیم عباس اپنی جگہ بیٹھا انجوائے کر رہا ہوتا ہے، ایسی سیکرٹ نیکیوں کا Impact بڑا اسٹرونگ ہوتا ہے تم نہیں جانتیں۔" ارم کی بات رانیہ کو سمجھ نہیں آئی تھی اور جو سمجھ آئی تھی اسے ماننے پر اس کا دل نہیں کیا تھا۔ خود اس کے ساتھ زعیم نے بہت بڑی نیکی کی تھی اور اس نے کہیں اس کا ذکر بھی نہیں کیا تھا، ارم کی بات اسی ایک مثال سے غلط ثابت ہو سکتی تھی مگر اس نے زعیم کے حق میں ارم سے بحث نہیں کی۔ اسے ارم کی طنزیہ گفتگو اچھی نہیں لگتی تھی۔

☆☆☆

انہی دنوں اسی ڈپارٹمنٹ میں اسباق کے متن سے متعلق اضافی معلومات پر نوٹس بنانے والی لڑکی سعدیہ کی شادی ہو جانے اور اس کے نوکری چھوڑ جانے کے بعد اس کی سیٹ پر آمنہ آ گئی۔ آمنہ، سعدیہ اور ارم کی نسبت زیادہ ہنس مکھ اور دوست دار لڑکی تھی۔ رانیہ کی چند ہی دنوں میں اس سے اچھی دوستی ہوگئی۔ وہ مہینہ ڈپارٹمنٹ میں تبدیلیوں کا مہینہ ثابت ہو رہا تھا۔ ارم اچانک جاب چھوڑ گئی اور اس کی جگہ ساجدہ آ گئیں جو عمر میں رانیہ اور آمنہ سے چھ سات سال بڑی تھیں، ان کے پاس ایسے ہی کسی تحقیق و تخلیق کے ادارے کا چار پانچ سالہ تجربہ تھا۔ وہ ایک سنجیدہ مزاج لیے دیے رہنے والی خاتون تھیں۔ عمروں کے تفاوت کی وجہ سے رانیہ اور آمنہ انہیں آپا کہہ کر بلاتی تھیں اور ان سے صرف ضرورت کے وقت ہی گفتگو کیا کرتی تھیں۔ رانیہ اب یہاں کام کرنے والوں میں باقیوں کی نسبت زیادہ عرصے سے کام کر رہی تھی اس لیے باقی کئی مواقع پر اس سے رہنمائی لے لیا کرتے تھے۔

''میں آپ کے لیے بہت خوش ہوں مس رانیہ۔'' اس روز جب رانیہ اپنے پلینرز کی منظوری کے لیے اس کے پاس فائل رکھنے گئی تو زعیم نے اسے اشارے سے بیٹھنے کا کہتے ہوئے کہا۔

''آپ نے بہت کم عرصے میں بہت سا کام سیکھا اور اب آپ دیکھیں یہاں آپ کئی لوگوں سے سینئر ہو گئیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ یہ اس کی دیر سے گھر جانے کے بعد اگلے دن والی تفصیلی گفتگو کے بعد پہلی بات تھی جو اس نے رانیہ سے کہی تھی، ورنہ وہ سرسری اور مختصر گفتگو ہی کرتا تھا۔

''سر یہ آپ کی گائیڈنس کا نتیجہ ہے۔'' رانیہ نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے آپ سے بہت سیکھا ہے۔''

''اچھا۔'' وہ جو دانت تلے انگوٹھا دبا کر اس کو دیکھ رہا تھا، مسکرا دیا۔ ''اگرچہ میرے بارے میں لوگوں کا خیال ہے کہ میں بہت انٹروورٹ ہوں، بہت کم بات کرتا ہوں بلکہ۔'' اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ ''بلکہ لوگ عموماً مجھے بہت زیادہ پسند نہیں کرتے۔''

''لوگوں کے بارے میں تو مجھے پتا نہیں سر۔'' رانیہ نے کہا۔ ''میں تو آپ کو ویسا جانتی ہوں جیسے آپ میرے ساتھ ہیں۔ آپ کم گو ہیں، یہ اکثر لوگوں کی عادت ہوتی ہے، بلاوجہ تعریف نہیں کرتے اور اکثر تنقید کر جاتے ہیں۔ سمجھنے والے کے لیے اس میں بڑا پوائنٹ ہے، جو آپ کے رویّے کی اس سختی سے گزر جائے اسے ایک اچھا پروفیشنل کیریئر بنانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

''ہے بی۔'' وہ رانیہ کی بات پر غور کرتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو ایک بہت پرسنل بات بتاؤں۔'' پھر وہ کہنیاں میز پر ٹکا کر ذرا آگے جھکا۔ رانیہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''میں ویسے اپنی پرسنل باتیں کسی سے شیئر نہیں کرتا۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا۔ ''مگر آپ بہت خالص ہیں، آپ جو نظر آتی ہیں آپ دراصل وہی ہیں، آپ میں کوئی impurity نہیں ہے، آپ جیسی انسان سے پرسنل بات شیئر کی جاسکتی ہے۔''

رانیہ اس اعتماد پر حیران تھی مگر اس نے اس بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ منتظر تھی کہ زعیم اسے بتائے وہ کیا پرسنل بات تھی جو وہ شیئر کرنا چاہتا تھا۔

''میں اپنے اندر بہت تنہائی محسوس کرتا ہوں۔'' زعیم نے کہا۔ ''میں تھوڑا سا Neglected بچہ رہا اپنے گھر میں کیونکہ مجھ سے پہلے ایک بھائی موجود تھا اور میرے ایک سال بعد ہی ایک چھوٹی بہن آ گئی۔'' رانیہ کو ذرا دیر کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اس سے اپنی فیملی کی بات کرے گا۔

''درمیان والا بچہ اکثر Neglected رہتا ہے، اسے جان بوجھ کر نظر انداز نہیں کیا جاتا بلکہ بڑے اور چھوٹے زیادہ توجہ کھینچ لیتے ہیں۔ اسی طرح نظر انداز ہو جانے پر میں انٹروورٹ ہو گیا، مجھے اپنی بات کہنے اور زیادہ باتیں کرنے کی عادت نہیں رہی۔''

''کیا آپ اب بھی ایسا ہی محسوس کرتے ہیں اپنے گھر میں؟'' رانیہ نے بے اختیار سوال کیا۔

''اب حالات بالکل ہی بدل گئے ہیں، بڑے بھائی اور چھوٹی بہن دونوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور امی ابو شاید یہ سوچنے لگے ہیں کہ یہ تو اب بڑا اور میچور ہو چکا ہے، اس کو کیا ذرا ذرا سی بات پر بچوں کی طرح ٹریٹ کرنا۔'' وہ مسکرایا۔

''ماں باپ دانستہ کبھی کسی بچے کو نظر انداز نہیں کرتے سر۔'' رانیہ نے کہا۔

''ہاں، ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ۔'' زعیم نے مسکرا کر کہا۔ ''لیکن بچہ خود سے ایک بات فرض کر لیتا ہے۔ وہ ایک فرضی دنیا بسا لیتا ہے اپنے اردگرد، جس میں اس سے زیادہ مظلوم اور کوئی ہوتا نہیں۔''

''آپ نے بھی بسا لی ایسی دنیا؟'' رانیہ نے پوچھا۔

''میں نے ایک ایسی دنیا بسا لینے کے ساتھ ساتھ ایک اور کام بھی کیا۔''

''وہ کیا سر؟'' رانیہ نے سوالیہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے لاشعوری طور پر امی، ابو کی ہر خواہش، ہر توقع سے بغاوت کرنا شروع کر دی۔''

''وہ کیسے سر؟''

''میرے امی، ابو دونوں ڈاکٹر ہیں۔ میرا بھائی اور بہن بھی ڈاکٹر ہیں مگر میں امی ابو کی خواہش کے باوجود دانستہ اس لائن پر نہیں چلا۔ میں ریسرچ اور تعلیم کی طرف چلا گیا۔ میرے والدین کو اس بات کا دکھ ہے۔''

''لیکن یہ لائن بھی تو بری نہیں۔'' رانیہ نے کہا۔

''ہاں۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ ''مگر ان کی خواہش کے برعکس ہے، میں ہمیشہ ان کی خواہش کے خلاف چلا۔'' اس نے رانیہ کی طرف دیکھا۔

''مجھے کون سے کپڑے پسند ہیں، مجھے کیا کھانا ہے، مجھے کون سے رشتے دار پسند ہیں، میرے دوستوں میں کون کون لوگ شامل ہونے چاہئیں، میں ہر معاملے میں وہ کرتا رہا جو امی، ابو کو پسند نہیں آتا تھا۔''

''یہ کوئی اچھی بات تو نہیں ہے سر۔'' رانیہ نے بے اختیار کہا۔

''ہمیئر یو آر۔'' اس نے انگلی سے رانیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''دیکھا، یہاں میں پکڑا گیا۔'' وہ مسکرایا۔ ''یہ بات میں نے آپ کو سنائی ہی اس لیے تھی کہ آپ مجھے اپنا رول ماڈل قرار دینے سے پہلے مجھے اچھی طرح جان لیں۔ رول ماڈلز زندگی کے کسی پہلو سے متعلق بھی کسی کو مایوس نہیں کرتے مگر آپ نے دیکھا میری شخصیت کا یہ پہلو کتنا مایوس کُن ہے۔''

''پرفیکٹ تو کوئی بھی نہیں ہوتا سر۔'' رانیہ نے نیچی آواز میں کہا۔

''پرفیکشن تو خیر ناممکن بات ہے، میں تو صرف

رول ماڈل ہونے کی بات کر رہا ہوں۔“

”سر میں اس کام میں آپ کو اپنا رول ماڈل مانتی ہوں جو آپ نے مجھے سکھایا۔“ رانیہ نے وضاحت کی۔

”یہ کوئی بڑی بات نہیں۔“ وہ بے نیازی سے بولا۔ ”جو کام ہم سیکھ جاتے ہیں وہ کسی دوسرے کو سکھانا کوئی بڑی بات نہیں۔“

”آپ انکساری سے کام لے رہے ہیں سر۔“ رانیہ نے فوراً جواب دیا۔ ”استاد اور راہ نما ہونے کے لیے صرف سیکھا ہوا ہونا ہی کافی نہیں ہوتا، سکھانے اور رہنمائی کرنے کے اصول اور طریقے بھی آنے چاہئیں جو آپ کو آتے ہیں۔“

”بس میرا دل یہ چاہتا ہے کہ میں کسی کے کام آسکوں، اگر کسی کی زندگی میں کسی کے کام میں میری وجہ سے آسانی پیدا ہو سکے، میں کسی کو کسی مشکل سے نکال سکوں تو مجھے خوشی ہوتی ہے لیکن وہی میری انٹروورٹ شخصیت مجھے اس بات میں بھی ناکام بنا دیتی ہے۔“

”وہ کیسے سر؟“ رانیہ نے پوچھا۔

”میں خود کسی سے پوچھ نہیں سکتا کہ تمہیں کیا مسئلہ ہے اگرچہ مجھے اندازہ ہو بھی رہا ہو کہ میرے قریب کسی شخص کو کوئی مسئلہ ہے۔ میں اتنا کلوز رہتا ہوں کہ کسی کو میرے قریب آکر اپنی بات کہنے کا حوصلہ نہیں ہوتا، کوئی خود سے میرے ساتھ اپنی پریشانی شیئر نہیں کر سکتا کیونکہ میں اپنے دروازے ہمہ وقت بند رکھتا ہوں، یہ اتفاق ہی ہوتا ہے کہ کسی کی ایسی پریشانی اور ضرورت پر میرا دھیان، میری نظر پڑ جائے جس میں، میں اس کے کام آسکتا ہوں تو میں ضرور کرتا ہوں۔“

”یہی آپ کی سب سے بڑی خوبی ہے سر، بغیر جتائے بغیر بتائے، آپ دوسروں کے کام آجاتے ہیں۔“

”مگر میں اپنی زندگی کو Meaningful بنانا چاہتا ہوں۔“ وہ رانیہ کی بات ان سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”زندگی کا کوئی مقصد ہونا چاہیے۔ آپ نے وہ شعر تو سنا ہی ہوگا۔

ہیں لوگ وہی جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

میں نے تقریروں میں، مقالوں میں، اسباق میں، اسکولوں کی دیواروں پر یہ شعر کئی مرتبہ لکھا ہوا پڑھا ہے مگر اکثر لوگ اسے اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں جبکہ میں اس شعر کی عملی تفسیر بننا چاہتا ہوں۔“

”جی سر۔“ رانیہ اس کی گفتگو سے اتنی متاثر ہو چکی تھی کہ اس کے چہرے اور آنکھوں میں زعیم کے لیے ستائش ہی ستائش تھی۔

”مگر شاید میں یہ مقصد کبھی حاصل نہ کر پاؤں۔“ وہ اچانک سر جھٹکتے ہوئے بولا۔ ”خیر...... یہ رہا آپ کا پلین اور یہ رہا نیکسٹ بریک اپ۔“ پھر وہ فوراً اسے کام کی بات پر آگیا۔

رانیہ نے فائل میں کاغذ سمیٹے اور اٹھ کر جانے لگی۔

”سنیں مس رانیہ۔“ وہ دروازے کے قریب پہنچی ہی تھی کہ اسے پیچھے سے زعیم کی آواز آئی۔ اس نے مڑ کر دیکھا، زعیم کے ہاتھ میں ایک چٹ تھی جو وہ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔

”یہ کیا ہے سر؟“ رانیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے ایک نظر چٹ پر ڈالی، دوسری زعیم کے چہرے پر۔

”یہ میرا پرسنل نمبر ہے۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”زندگی میں کبھی کہیں اگر آپ کو لگا کہ میں آپ کے

کام آسکتا ہوں تو مجھے ضرور بتائیے گا اس نمبر پر ٹیکسٹ میسج بھیج کر یا کال کر کے، آپ کے کام آکر مجھے حقیقی خوشی حاصل ہوگی۔“ رانیہ دنگ رہ گئی۔ زعیم کا آفس کا نمبر بھی بہت کم لوگوں کے پاس موجود تھا اور اسے وہ پرسنل نمبر دے رہا تھا۔

”تھینک یو سر۔“ آگے بڑھ کر زعیم سے وہ چٹ لیتے ہوئے رانیہ کے ذہن میں ایک عجیب سی الجھن تھی۔ وہ اسے یہ نمبر کیوں دے رہا تھا۔ زعیم کے کیبن سے باہر نکل کر ایک دفعہ پھر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ وہ اپنی ٹیبل پر بکھرے کاغذوں کو پڑھنے میں مشغول تھا اور اس کا چہرہ بے تاثر تھا۔

☆☆☆

زعیم کی یہ گفتگو رانیہ کے لیے الجھن تو لائی مگر اس کے ذہن و دل کے کسی گوشے میں ایک عجیب اور انجانا سا احساس بھی جگا گئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ اپنے ساتھ کام کرنے والوں سے کچھ مختلف تھی اور منفرد بھی۔ اسی لیے تو زعیم عباس جیسے انٹروورٹ بندے نے اسے اپنی پرسنل باتیں سنانے کے قابل سمجھا اب وہ اکثر منتظر رہتی کہ زعیم عباس آتے جاتے یا پھر کام پر بات کرتے ہوئے پھر کوئی ایسی بات کرے گا جس سے اس کے منفرد اور مختلف ہونے کے احساس کو مزید طاقت ملے گی مگر اس دن کے بعد سے اس کا رویہ اس کے ساتھ بھی ویسا ہی تھا جیسے آفس میں کام کرنے والے دوسرے لوگوں کے ساتھ تھا۔

انہی دنوں گوتم بدھ کی زندگی اور نظریات پر ڈسکشن اور نوٹس بنانے کے دوران اسے ساجدہ آپا کے قریب آنے کا موقع ملا۔ ساجدہ آپا گوتم بدھ پر ایک مقالہ لکھ چکی تھیں اور زعیم عباس نے ہی رانیہ کو ہدایات دی تھیں کہ وہ آٹھویں کلاس کے ہسٹری کے اسباق میں گوتم بدھ والے سبق پر ساجدہ آپا سے معلومات حاصل کرے۔ ساجدہ آپا اس کے خیال کے برعکس ایک نرم گفتار اور اچھی رہنما ثابت ہوئیں۔ ان سے باتوں کے دوران رانیہ کو پتا چلا کہ وہ کس قدر مشکل زندگی گزار رہی تھیں۔ ان کے شوہر نے بچہ نہ ہونے کے باعث انہیں دو سال پہلے طلاق دے دی تھی اور اب وہ اپنے معذور والدین کے ساتھ رہ رہی تھیں۔ ان کے بھائی والدین کو معذوری کی حالت میں اکیلا چھوڑ کر اپنی اپنی زندگیوں میں مگن تھے۔

”میں صبح اماں، ابا کے تمام ضروری کاموں سے فارغ ہو کر ضرورت کی ہر چیز ان کے قریب رکھ کر آتی ہوں۔“ ساجدہ آپا نے اسے بتایا تھا۔ ”آف ٹائم میں مجھے اسی لیے واپس گھر بھاگنے کی جلدی ہوتی ہے کہ اماں، ابا اس وقت تک ہی اکیلے رہ سکتے ہیں، میں اسی لیے کوئی میٹنگ اٹینڈ نہیں کر پاتی۔ صبح بھی کبھی کبھار پانچ، دس منٹ لیٹ ہو جاتی ہوں اور باس کے غصے اور ناراضی کا شکار رہتی ہوں۔“ وہ بے بسی سے مسکراتے ہوئے بتا رہی تھیں۔

”ارے، وہ تو بہت نرم دل ہیں، آپ نے اُن کو اپنا مسئلہ بتایا نہیں؟“ رانیہ نے کہا۔

”کوئی نہیں سنتا رانیہ، ان لوگوں کو کام چاہیے ہوتا ہے کسی کی مجبوری سے انہیں کیا لینا دینا۔“ ساجدہ آپا بتا رہی تھیں۔ ”میں بتا کر اپنی بات ہلکی نہیں کرنا چاہتی۔“

”مگر زعیم صاحب ایسے نہیں ہیں۔“ رانیہ نے کہنا چاہا۔

”میں کئی جگہوں پر کام کر چکی ہوں رانیہ! مجھے سب کے رویوں اور شخصیتوں کا اندازہ ہے، کون کیا اور کیسا ہے۔“ ساجدہ آپا نے اس کی بات کاٹی۔ ”تم

ابھی بچی ہو، زندگی کو ایکسپلور کر رہی ہو، تمہارے اندازے ابھی پختہ نہیں ہوئے۔'' ساجدہ آپا کی اس بات نے رانیہ کو ایک بار پھر الجھا دیا۔

''یا تو میں دنیا کو نہیں سمجھ پائی یا پھر دنیا خود کو مجھے سمجھا نہیں پا رہی۔'' ساجدہ آپا جیسی سمجھدار اور میچور خاتون کی بات کی بھی نفی نہیں کی جا سکتی تھی اور زعیم عباس کی گفتگو کو بھی ذہن سے جھٹکا نہیں جا سکتا تھا۔

☆☆☆

اسے اس جگہ کام کرتے دو سال گزر گئے، اس کا چھوٹا بھائی عمران سافٹ ویئر انجینئرنگ کر رہا تھا اور اس کا فائنل ایئر مکمل ہونے کو تھا۔ اس سے چھوٹا سلمان آرمی میں جانے کی تیاری کر رہا تھا۔ مشکل دن آہستہ آہستہ آسان دنوں میں تبدیل ہو رہے تھے۔ آمنہ کے آفس چھوڑ دینے کے بعد سلیم خان نے اس کی جگہ لے لی تھی۔ خود رانیہ اسی ڈپارٹمنٹ میں زعیم عباس کی براہِ راست اسسٹنٹ کی سیٹ تک ترقی کر چکی تھی، اس کی تنخواہ بڑھ گئی اور مراعات اور الاؤنسز بھی۔ زعیم عباس اندرونِ ملک کے علاوہ بیرونِ ملک بھی سیمینارز اور لیکچرز ڈیلیور کرنے لگا تھا۔ فرنچائزڈ برانچز میں سالانہ ورکشاپس میں رانیہ، زعیم عباس اور دوسرے شعبوں کے منتخب لوگوں کے ساتھ اکثر دوسرے شہروں میں بھی جانے لگی تھی، اس دوران اس نے غور کیا زعیم کا انداز اور کام اسی کے عہدے کے برابر کام کرنے والے لوگوں سے زیادہ بہتر ہوتا تھا۔ وہ لینگویجز، سوشل اسٹڈیز اور ہسٹری پر لیکچر دیتا تھا۔ اس کا ہوم ورک مکمل اور غلطیوں سے پاک ہوتا تھا، لیکچر سے متعلق اضافی ایجوکیشنل ٹولز اپ ڈیٹڈ ہوتے تھے اور وہ اپنی ٹیم کے ہر رکن کی ہر ضرورت اور آرام کا بہت خیال رکھتا تھا۔

''اس بندے میں لیڈر شپ کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔'' ایک ایسے ہی ورکشاپ کے دوران ٹی بریک میں میتھس ڈپارٹمنٹ کے اسسٹنٹ ہیڈ نے رانیہ کو بتایا تھا۔ ''یہ جاب یہ پوسٹ اس کا ایک عارضی پڑاؤ ہے۔ اس کی اصل منزل کہیں آگے اور بہت بلند ہے۔'' وہ کہہ رہے تھے۔ ''میں نے ان سالوں میں خود اپنی آنکھوں سے اس کو ہیرا بننے کے عمل سے گزرتے دیکھا ہے۔ He is an excellent manager۔''

رانیہ اب تک زعیم کے بارے میں متضاد آرا سننے کی عادی ہو چکی تھی۔ خود وہ بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اس وقت جس مقام پر تھی یہاں تک اسے پہنچانے میں بہت سا کردار زعیم عباس کا ہی تھا۔ وہ اکثر اپنے بیگ کی چھوٹی جیب میں رکھی اس چٹ کو دیکھا کرتی جس پر زعیم عباس کا پرسنل نمبر لکھا تھا۔ اس نے اس نمبر پر کبھی کوئی پیغام بھیجا تھا نہ کال کی تھی مگر اس کے لیے وہ نمبر جن کا وہ بال تھا جسے دھوپ میں رکھتے ہی جن حاضر ہو جاتا تھا، اس نے کبھی کوشش نہیں کی تھی مگر اسے یقین تھا جیسے ہی کبھی ضرورت پڑنے پر وہ اس نمبر پر کوئی...... پیغام بھیجے گی یا کال کرے گی زعیم عباس اس کی مدد کو آن حاضر ہوگا۔

☆☆☆

تیسرے سال کے وسط میں زعیم عباس کو کسی بین الاقوامی ادارے میں ریسرچ کا موقع مل گیا۔ وہ اس پر بہت خوش تھا بقول اس کے اس اسکالر شپ کو حاصل کرنے کے لیے وہ کئی سال سے کوشش کر رہا تھا۔ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کا مطلب تھا کہ زعیم عباس اب اس آفس کو چھوڑ کر جا رہا تھا۔ رانیہ کا دل ان دنوں بجھا بجھا رہتا تھا، اس کے مزاج پر ایک

نامعلوم سی اداسی چھانے لگی تھی۔ زعیم نے ادارے کو جاب چھوڑ دینے کا نوٹس دے دیا تھا اور وہ ایک ماہ کے اندر یہاں سے جانے والا تھا۔ رانیہ کو اچانک محسوس ہوا تھا کہ زعیم کی غیر محسوس سرپرستی اور موجودگی کے بغیر وہ ایک دن بھی یہاں کام نہیں کر پائے گی۔ اس پر اچانک انکشاف ہوا تھا کہ زعیم عباس نے اپنی تمام خوبیوں اور خامیوں سمیت اس کے دل پر خاموش قبضہ کر رکھا تھا، کب سے یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ ان دنوں آفس میں اور واپس گھر آ کر بھی صبحوں، دوپہروں، شاموں اور رات کے کئی پہروں میں اس نے کئی بار اپنا سیل فون اس نیت سے نکالا تھا کہ وہ زعیم کے پرسنل نمبر پر Please don't go یا Don't leave me alone کا میسج بھیجے گی اور اس کے دل کے تیقن کے عین مطابق زعیم عباس اپنی خواہش اور خوشی کو آگ لگا کر محض اس کے لیے رک جائے گا۔ مگر نہ جانے کیوں اس کی انگلیاں ایسا کوئی میسج ٹائپ کرنے کی ہمت نہ کر پائیں اور گزرتے وقت کے ساتھ آفس میں زعیم کا آخری ورکنگ ڈے آ گیا۔ اس روز وہ اپنے اسٹاف کے ایک ایک ممبر سے خصوصی طور پر ملا اور اپنی انٹروورٹ طبیعت کے برعکس اس نے ہر ایک سے اپنے کسی دانستہ نادانستہ غلط رویے اور بھول چوک پر معافی بھی مانگی۔ رانیہ کی ٹیبل پر بھی وہ کافی دیر رکا اور اسے گزرے وقت کے کئی چھوٹے چھوٹے واقعات یاد دلاتا رہا۔

''چلیں پھر مس رانیہ! وش یو گڈ لک آل ویز۔'' پھر وہ اُدھر سے رخصت ہوتے ہوئے بولا۔ رانیہ نے جھکے سر کو ہولے سے ہلایا۔ وہ سر اٹھا کر اسے دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے ڈر تھا وہ اس کی آنکھوں میں موجود پانی دیکھ لے گا۔

جاتے جاتے وہ پھر رکا۔ ''آپ کو ایک بار اپنا ذاتی نمبر اس امید پر دیا تھا کہ شاید کوئی خوش رنگ، حوصلہ افزا پیغام آپ کی طرف سے آئے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں یا آپ کے کسی مسئلے میں آپ کی کچھ مدد کر سکتا ہوں مگر آپ تو مجھ سے بھی زیادہ انٹروورٹ ثابت ہوئیں۔'' وہ کہہ رہا تھا اور رانیہ نے لمحے بھر کے لیے نظر اٹھا کر اسے دیکھا تھا۔ ''مجھے افسوس رہے گا کہ میں اس قابل نہیں تھا۔''

رانیہ کی نظروں نے زعیم کے جاتے قدموں کا پیچھا کیا۔ اس کی سانس جیسے سینے میں ہی اٹک کر رہ گئی تھی۔ کچھ توقف کے بعد اس نے اپنے بیگ میں رکھی وہ چٹ دیکھی جس پر زعیم کا ذاتی نمبر لکھا تھا۔ ''اب اس نمبر کو بدل جانا ہے، اب یہ چٹ کس کام کی۔'' اس نے سوچا اور اس چٹ کو مروڑ کر واپس بیگ میں پھینک دیا۔

☆☆☆

وقت کچھ اور آگے کھسکا۔ عمران اپنی جاب میں سیٹ ہو گیا اور سلمان کو فوج میں کمیشن مل گیا۔ امی کو رانیہ کی شادی کی فکر دن رات ستانے لگی۔ وہ کئی جاننے والوں سے اس کے رشتے کے لیے بات کر چکی تھیں۔ رانیہ کو نہ جانے کیوں یہ موضوع اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس روز بھی امی یہی موضوع چھیڑے بیٹھی تھیں۔ انہوں نے اس کے لیے کوئی ایسا رشتہ دیکھا تھا جو انہیں پسند بھی آیا تھا۔

''لڑکا عمر میں تو بڑا نہیں مگر اس کے ساتھ یہ ٹریجڈی ہوئی کہ اس کی پہلی بیوی کا انتقال ہو گیا۔'' وہ عمران کو بتا رہی تھیں۔ ''رانیہ کی عمر بھی تو بڑھنے لگی ہے۔ لڑکے میں اس ایک خامی کے علاوہ کوئی خامی نہیں۔'' وہ کہہ رہی تھیں۔ رانیہ بری طرح چڑ گئی، اس روز وہ ساجدہ آپا کے ابا کے انتقال کی تعزیت کر

کے آئی تھی۔ ساجدہ آپا کے ابا کا انتقال ان کی امی کے انتقال کے صرف دو ہفتوں بعد ہو گیا تھا۔ ساجدہ آپا ان پے در پے صدمات سے بری طرح متاثر تھیں۔ وہ مسلسل ایک ماہ سے چھٹی پر تھیں، تنہا رہ جانے کا غم، نئے باس کی بدمزاجی کے سامنے کا خوف اور ماں باپ کی ابدی جدائی کے دکھ پر بین کرتی ساجدہ آپا کی آوازیں اس کے ذہن و دل میں گونج رہی تھیں۔ ساجدہ آپا کے حالات نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ اوپر سے امی کی گفتگو اسے سب کچھ یکدم بہت برا لگنے لگا اور وہ کمرے سے اٹھ کر باہر آ گئی۔ اسے لگ رہا تھا امی یہ رشتہ جس کا وہ ذکر کر رہی تھیں کر کے چھوڑیں گی۔ اس کا دل دکھی تھا اور اداس بھی۔ بیتے ہوئے مشقت اور خواری کے دن اسے رہ رہ کر یاد آ رہے تھے۔ وہ اس مشقت اور بہن بھائیوں کے لیے محنت کی زندگی سے نکلی تو پتا چلا کہ دیر ہو چکی ہے اس کی عمر نکلی جا رہی ہے اور ایسے میں کسی طلاق یافتہ، رنڈوے، بچوں کے باپ کا رشتہ بھی آئے تو غنیمت سمجھنا چاہیے۔ اس نے زندگی کی تلخ حقیقتوں کا تجزیہ کرتے کرتے شدتِ غم سے آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ میرا پرسنل نمبر ہے۔ زندگی میں کبھی کہیں اگر آپ کو لگا کہ میں آپ کے کام آ سکتا ہوں تو مجھے ضرور بتائیے گا۔ اس نمبر پر ٹیکسٹ میسج بھیج کر یا کال کر کے آپ کے کام آ کر مجھے حقیقی خوشی ہو گی۔'' انہی سوچوں میں غلطاں اس رات اچانک اسے عرصے پہلے کسی کی کہی بات یاد آ گئی۔

''ایک بار آپ کو اپنا ذاتی نمبر اس امید پر دیا تھا کہ شاید کوئی خوش رنگ، حوصلہ افزا پیغام آپ کی طرف سے آئے کہ میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں یا آپ کے کسی مسئلے میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں مگر آپ تو مجھ سے بھی زیادہ انٹروورٹ ثابت ہوئیں۔ مجھے افسوس رہے گا کہ میں اس قابل نہیں تھا۔'' رانیہ کو دوسری بات یاد آئی۔ اس نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنا بیگ الماری سے نکالا۔ جس کے ایک کونے میں مڑی تڑی وہ چٹ جوں کی توں رکھی تھی جیسی اس نے پھینکی تھی۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے وہ نمبر اپنے سیل میں محفوظ کیا اور پھر اس پر ایک لمبا ٹیکسٹ میسج ٹائپ کر کے بھیج دیا، یہ ایک ایسا میسج تھا جسے کبھی کسی تک نہیں پہنچنا تھا نہ ہی اس کا کبھی کوئی جواب آنا تھا مگر رانیہ کے دماغ سے نہ جانے کیوں جیسے ایسا کرنے کے بعد بوجھ سا اتر گیا تھا اور دل جیسے ہلکا ہو گیا تھا اور مطمئن بھی۔

☆☆☆

محمود اکبر ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ وہ پینتیس سال کا ایک سنجیدہ مزاج مگر محبت کرنے والا شخص تھا۔ شکل صورت اور رہن سہن کے لحاظ سے بھی اس میں کوئی کمی نہیں تھی۔ اس کی بیوی شادی کے ڈیڑھ سال بعد کسی حادثے کا شکار ہو کر چل بسی تھی۔ محمود نے بیوی کے انتقال کے بعد کئی سال دوسری شادی نہیں کی تھی۔ پھر اس کی بہن نے اسے شادی کر لینے پر مجبور کر دیا اور رانیہ کو بھابی بنا کر لے گئی۔ محمود نے رانیہ کو مستقبل کے سنہری خواب دکھائے نہ ہی رومان سے بھرپور کوئی گفتگو کی مگر وہ ایک اچھا شوہر ثابت ہوا۔ اس کے مزاج میں نرمی تھی اور وہ ایک سمجھ دار شخص تھا۔ رانیہ برسوں کی مصروف زندگی سے نکلی تو محمود کے گھر میں زندگی اسے بہت آسان اور اچھی لگنے لگی تھی۔ محمود ایک اچھی جاب کر رہا تھا اور اس کی تنخواہ خاصی معقول تھی۔ اس کے پاس ذاتی گھر تھا اور اپنی گاڑی بھی۔ رانیہ نے خود کو بہت جلد نئی زندگی کے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا۔ شادی کے ایک سال بعد ہی اللہ تعالیٰ نے رانیہ کو بیٹے جیسی نعمت سے نواز دیا اور وہ زندگی میں مزید مصروف ہو گئی۔ تیسرے سال محمود کو اس کی کمپنی کی طرف سے کمپنی

کے ہیڈ آفس بھیج دیا گیا اور وہ لوگ اسلام آباد شفٹ ہو گئے۔ یہاں رانیہ کو گھر کے اندر کے کاموں کے علاوہ باہر کے بھی کئی کام خود نمٹانا پڑتے تھے۔ اس روز وہ ماہانہ خریداری کے سلسلے میں میکرو شاپ میں موجود تھی جب اسے الیکٹرک اپلائنسز کے پورشن میں ایک مانوس سا چہرہ نظر آیا۔ وہ بے اختیار اُدھر کو بڑھی۔ گرے پینٹ اور بلو کارڈیگن میں ملبوس وہ شخص یقیناً زعیم عباس تھا۔

''سر آپ۔'' رانیہ نے کانپتی آواز میں کہا تھا۔

اس نے سر اٹھا کر رانیہ کی طرف دیکھا تھا۔ اس کی ذہین آنکھیں سنہرے فریم کی عینک کے نیچے چھپی تھیں۔ اس نے ہاتھ سے اپنی عینک کا زاویہ درست کیا اور کچھ یاد کرنے کے بعد وہ جیسے پہچان گیا۔

''آہا، مس رانیہ، واٹ اے سرپرائز۔'' وہ مسکرا دیا۔ رانیہ کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے خون اچانک اس کی رگوں میں بہت تیز رفتاری سے گردش کرنے لگا تھا۔

''آپ یہاں، کیسے؟'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''کیا ہو رہا ہے آج کل، کیسی ہے زندگی؟''

''اور میرا دل چاہ رہا ہے تم سے پوچھوں کیسے ہو زندگی کیونکہ زندگی کی ایک حقیقت تم ہو، ایسی حقیقت جو اتنے سالوں میں ایک لمحے کے لیے بھی میرے ذہن اور دل سے نکلی نہیں، وہ شخص جسے میں چاہنے کے باوجود بھلا نہیں پائی۔ میرے دل سے کبھی یہ خیال جاتا ہی نہیں کہ کاش وہ میسج جو تمہیں بھیجا تھا تم تک پہنچ جاتا تو شاید زندگی مختلف ہوتی بالکل مختلف۔'' وہ سوچ رہی تھی۔ ''اور دل کا کیا ہے، دل تو ہر طرح کی خوش فہمی میں مبتلا رہ سکتا ہے۔''

''میں یہیں رہتی ہوں سر۔'' یہ سب کہنے کے بجائے اس نے خود کو کہتے سنا۔

''گڈ۔'' وہ مسکرایا۔ ''اور یہ بچہ؟'' اس نے پرام میں بیٹھے قاسم کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ میرا بیٹا ہے سر۔'' رانیہ نے جواب دیا اور پھر سوالیہ نظروں سے زعیم کی طرف دیکھا۔ ''آپ سر! آپ کب واپس آئے؟''

''میں۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں ایک سال سے یہاں ہوں، ان فیکٹ مس رانیہ میں اپنی زندگی کے تمام اطمینان اور خوشی کے لیے آپ کا ممنون ہوں۔''

''میرا......؟'' رانیہ نے چونک کر سوال کیا۔

''ایک منٹ رکیے۔'' اس نے اپنی پینٹ کی جیب سے اپنا موبائل فون نکالا اور اس کی کیز دباتا کچھ چیک کرنے لگا۔ ''وہ یہاں محفوظ ہے۔'' وہ شاید خود کو بتا رہا تھا۔ ''ہاں'' پھر جیسے اس نے کچھ ڈھونڈ لیا۔ ''یہ دیکھیے۔'' اس نے موبائل کی اسکرین رانیہ کی طرف کی۔ ''یہ آپ کا وہ میسج ہے جس کے لیے بہت پہلے آپ سے میں نے ریکویسٹ کی تھی۔''

رانیہ نے آگے بڑھ کر موبائل کی اسکرین دیکھی۔ روشن اسکرین پر وہ میسج چمک رہا تھا جو اس کے خیال میں نہ کسی تک پہنچنا تھا اور نہ ہی جس کا جواب آنے کی کبھی کوئی امید تھی۔

''سر آپ کو یہ میسج مل گیا تھا؟'' رانیہ کی آواز میں واضح ارتعاش تھا۔

''اتفاق سے۔'' وہ مسکرا دیا۔ ''جن دنوں آپ نے یہ میسج بھیجا انہی دنوں میں نے اپنے پاکستان نمبر کی رومنگ کھلوائی تھی اور سب کو انٹرنیٹ ایس ایم ایس سے جواب دیا کرتا تھا۔ آپ کا طویل انتظار کے بعد آنے والا میسج مجھے ملا اور میں دل ہی دل میں آپ کا بے حد مشکور ہوا۔''

''مشکور۔'' رانیہ جو اس انکشاف پر بری طرح چونک چکی تھی کہ زعیم کو وہ میسج مل گیا تھا، اس کے مشکور ہونے پر مزید چونکی۔ ''آپ نے اس میسج کا جواب ہی نہیں دیا سر۔'' اس کا دل نئے سرے سے غم

میں مبتلا ہونے لگا۔

''میں نے آپ کو واپس کال کرنے کی کوشش کی مگر آپ کا نمبر بند مل رہا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''مگر آپ نے میری خواہش کو یاد رکھتے ہوئے اپنی امی کے آپ کی شادی کر دینے کے اصرار کے ساتھ ساتھ جس طرح ساجدہ کی تلخ زندگی کا ذکر کیا، میں اس کے لیے آپ کا بے حد مشکور ہوں۔''

رانیہ نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے زعیم کی طرف دیکھا۔

''آپ نے اپنے میسیج کے اینڈ پر یہی لکھا ہے نا کہ سر اگر آپ اپنی زندگی کو Meaning ful اور Purpose ful بنانا چاہتے ہیں تو جان لیجیے کہ کسی کو آپ کی اشد ضرورت ہے۔ کوئی ایسا جس کو آپ جیسے شخص کا ساتھ مل جائے تو وہ زندگی کی تمام تلخیوں کو ہمیشہ کے لیے بھول جائے۔'' زعیم نے ایک بار پھر موبائل اسکرین پر روشن میسیج اس کو دکھاتے ہوئے کہا۔

''میں اگلے مہینے کی فلائٹ سے ہی پاکستان آ گیا اور ساجدہ سے رابطہ کر کے اس سے ملا۔ میرے والدین کو ساجدہ کی عمر اور حالات پر اعتراض تھا مگر As you know۔'' وہ مسکرایا۔ ''میں ہمیشہ سے باغی روح ہوں، میں نے ان کو قائل کر ہی لیا کہ وہ ساجدہ سے میری شادی کر دیں۔ یوں ہماری شادی ہفتوں نہیں دنوں میں ہو گئی یوں......'' وہ چٹکی بجاتے کہہ رہا تھا۔ ''میں آپ کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا۔ مگر آپ کے گھر اس لیے نہ جا سکا کہ وقت کم تھا اس وقت میرے پاس اور آپ کے سیل کا جو نمبر میرے پاس تھا وہ مسلسل بند مل رہا تھا۔ پھر ہم واپس چلے گئے اور میں بھی ٹھہرا ایک عام سا انسان، زندگی کی مصروفیت میں الجھ کر بھول ہی گیا کہ آپ کو شکریہ کہنا مجھ پر ادھار ہے۔''

اس میسیج کو بھیجنے کے دو ہی ہفتے بعد رانیہ کو یاد آیا اس کی شادی ہو گئی تھی اور اس نے اپنا نمبر بدل لیا تھا۔ اس کا دل ڈوبنے لگا اس نے قریب پڑی شیلف کا سہارا لے کر خود کو سنبھالا۔

''میں ساجدہ کے ساتھ بہت اچھی زندگی گزار رہا ہوں۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ ''اور ہاں۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔ ''ہماری ایک بیٹی اور ایک بیٹا بھی ہے جو ابھی حال ہی میں پیدا ہوا، میں آج کل ریسرچ کے ایک بڑے ادارے کو ہیڈ کر رہا ہوں، یہ میرا کارڈ ہے۔'' اس نے جیب سے کارڈ نکال کر رانیہ کو دیتے ہوئے کہا۔ ''کبھی آئیں نا ہماری طرف بلکہ ضرور آیئے گا۔'' وہ کہہ رہا تھا۔

"Thanks once again for giving a meaning, a purpose to my life"

وہ جانے سے پہلے بولا۔ ''میں نے کہا تھا نا آپ بہت خالص ہیں، آپ میں کوئی impurity نہیں، آپ پر اعتماد کر کے زندگی کے پرسنلز آپ سے شیئر کیے جا سکتے ہیں۔ میں جانتا تھا کہ آپ دوسروں کے Sentiments اور ان کے دکھوں اور خوشیوں کا خیال کرنے والی لڑکی ہیں۔ آپ بھی ''آتے ہیں جو کام دوسروں کے'' کی عملی تصویر ہیں۔ مس رانیہ Its great of you۔'' وہ سلیوٹ کرنے کے سے انداز میں اسے سلام کرتے ہوئے لمبے لمبے ڈگ بھرتا کسی دوسرے پورشن کی طرف مڑ گیا۔

اور اس کے جاتے ہی رانیہ پر بھی عمر بھر تقریروں میں، مقالوں میں، اسکولوں کی دیواروں پر لکھے جانے والے اس شعر کا اصل مفہوم پہلی مرتبہ واضح ہو گیا تھا۔

▲▲▲

اگر؟

رضوانہ پرنس



''امی آج احتشام صاحب مع اپنی فیملی کے ہمارے گھر آ رہے ہیں۔ پلیز ڈنر کا بہت اچھا انتظام کر لیجیے۔'' آذر بہت گھبرائے ہوئے انداز میں فون پر زاہدہ کو یہ اطلاع دے رہا تھا اور زاہدہ بیگم کے تو جیسے یہ خبر سنتے ہی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

''ارے پاگل تو نہیں ہو گئے ہو تم آذر، دوپہر کے بارہ بج چکے ہیں سمجھو آدھا دن تو نکل ہی گیا۔ میں کیسے شام تک ڈھنگ کا انتظام کر پاؤں گی۔ فریج

میں بھی زیادہ گوشت وغیرہ نہیں ہے۔ بہت سامان کی ضرورت ہوگی۔ تم ان لوگوں کو کل کے لیے کہہ دو۔"

"افوہ امی، یہ میں نہیں کر سکتا۔ ویسے بھی احتشام صاحب اپنی بیگم اور بیٹی کو صرف آپ سے ملوانا چاہ رہے تھے۔ ان کا کھانے پر آنے کا بالکل پروگرام نہیں تھا، وہ تو میں نے خود اصرار کر کے انہیں ڈنر پر انوائٹ کرلیا۔" آذر کی اس بات نے تو گویا جلتی پر تیل کا کام کیا۔

"حد کردی تم نے آذر... کچھ تو عقل سے کام لیا ہوتا۔ بھلا ان کے شایانِ شان کیسے میں چند گھنٹوں میں اتنا انتظام کر سکتی ہوں۔ کچھ تو اپنی اور میری عزت کا خیال کرلیا ہوتا۔" انہوں نے بے حد الجھ کر آذر کو ڈانٹا تو وہ بھی ماں سے خفا ہوگیا۔

"امی بجائے اس کے کہ آپ میری اس پریشانی کو دور کرنے میں میری مدد کریں، الٹا مجھے صلواتیں سنائے جارہی ہیں۔ ارے انہوں نے اتنا اچانک مجھے اپنے آنے کی خبر سنائی کہ میں شاکڈ ہی رہ گیا۔ پہلی بار وہ لوگ ہمارے گھر آرہے ہیں اگر میں کھانے کے لیے اصرار نہیں کرتا تو ان لوگوں پر ہمارا کتنا برا امپریشن پڑتا۔ امی احتشام صاحب آج تک اپنی کمپنی میں کام کرنے والے کسی بھی آفیسر کے گھر نہیں گئے۔ آپ سمجھنے کی کوشش کیوں نہیں کررہی ہیں کہ خوش قسمتی خود چل کر ہمارے گھر آرہی ہے لیکن آپ محض کھانے کو لے کر اس سے منہ موڑ رہی ہیں۔" آذر کو اتنا اپ سیٹ دیکھ کر زاہدہ بیگم کو بھی اس کی بات کی اہمیت کا احساس ہوا۔

"لیکن بیٹا مجھے بالکل بھی سمجھ میں نہیں آرہا کہ تمہارے باس اور ان کی فیملی کے لیے میں اتنی بڑی دعوت کا انتظام کیسے کر پاؤں گی۔ تمہارے کوئی دوست وغیرہ آرہے ہوتے تو اور بات تھی۔" انہوں نے بڑی بے بسی سے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"امی آپ یوں کریں سمرانہ کو فون کریں اور اسے فوراً گھر آنے کو کہیں بلکہ اس کو جو چیزیں منگوانی ہیں وہ لسٹ فون پر ہی لکھوا دیں وہ لیتے ہوئے آجائے گی۔ ماسی کو بھی آج روک لیجیے۔ سو دو سو روپے رات کو جاتے وقت ایکسٹرا اس کے ہاتھ میں تھما دیجیے گا۔ میں بھی آفس سے تین بجے ہی اٹھ جاؤں گا۔ پھل، کولڈ ڈرنکس اور سویٹ ڈش کے طور پر آئس کریم اور مٹھائی وغیرہ لیتا آؤں گا۔" آذر نے بڑی تفصیل سے انہیں اس پورے پروگرام سے آگاہ کیا۔

"لیکن آذر اگر سمرانہ کی اپنی کوئی مصروفیات ہوئیں تو پھر؟" زاہدہ بیگم نے اپنا اندیشہ ظاہر کیا۔

"ارے واہ اپنے اکلوتے اور چہیتے بھائی کے لیے وہ اتنا بھی نہیں کر سکے گی کیا؟ آپ دیکھیے گا وہ فوراً آجائے گی بلکہ امی آپ کیف کو بھی کہہ دیجیے گا ڈنر کے لیے۔ اچھا ہے میرے بہن بہنوئی سے بھی مل لیں گے وہ لوگ۔"

"اچھا ٹھیک ہے بس دعا کرو سب انتظام ٹھیک ٹھاک ہو جائے۔" فون بند کرتے ہوئے وہ کافی پریشان نظر آرہی تھیں۔

"ارے واہ آج تو ہمارا گھر کھانوں کی زبردست خوشبوؤں سے مہک رہا ہے۔ پیٹ بھرا ہونے کے باوجود پھر سے بھوک چمک اٹھی ہے۔" آذر نے ہاتھ میں پکڑے شاپرز ٹیبل پر رکھتے ہوئے کافی اونچی آواز میں کہا جسے سن کر سمرانہ مسکراتے ہوئے کچن سے باہر آگئی جبکہ زاہدہ بیگم سالن بھوننے میں مصروف رہیں۔

"السلام علیکم بھائی، اتنی دیر کیوں لگا دی آپ نے۔ ساڑھے پانچ بج رہے ہیں؟"

"ارے واہ، ہماری پیاری سی بہنا آہی گئی۔ میں پہلے ہی امی سے کہہ رہا تھا کہ ایسا ہو ہی نہیں سکتا کہ کوئی پرابلم ہو اور سمرانہ اسے حل کرنے نہ آئے۔" آذر نے محبت سے اسے اپنے شانے سے لگا کر اس کے سر پر پیار کرتے ہوئے کہا۔

"اور پرابلم بھی اگر اتنی خوب صورت ہو تو پھر بھلا میں کیسے نہ آتی۔" وہ شاپر میں سے آئس کریم کے پیکٹ نکال کر فریج کی طرف جاتے ہوئے شوخی سے بولی تو آذر کھلکھلا کر ہنس دیا۔

"ارے نہیں بہنا، پرابلم زیادہ حسین نہیں ہے، ہاں اس کی وجہ سے مستقبل بہت خوب صورت ہو سکتا ہے۔" اس کا انداز کافی معنی خیز تھا۔ سمرانہ آئس کریم کے پیکٹ فریج میں رکھ کر واپس پلٹی۔

"ویسے سچ بھائی مجھے تو آپ کی قسمت پر رشک آرہا ہے۔ پاکستان کی اتنی بڑی کمپنی کے آپ مالک بن جائیں گے، میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔"

"سمرانہ ابھی سے اتنے اونچے اونچے خواب مت دیکھو۔ ابھی تو منزل بہت دور ہے دیکھو، کہیں میں آدھے راستے میں ہی نہ کھو جاؤں۔" اس کے لہجے میں چھپی ایک بے نام سی مایوسی کو سمرانہ نے اچھی طرح سے محسوس کیا۔

"ارے بھائی آپ کو فکر کرنے کی کیا ضرورت ہے بھلا۔ آپ کی شخصیت کے جادو سے میں نے تو کبھی کسی کو بچتے نہیں دیکھا۔ بچے جوان، بوڑھے سب ہی لمحوں میں آپ کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ آپ کی پرسنالٹی آپ کے بات کرنے کا دلچسپ انداز آپ کی برجستگی جیسے سب پر سحر بن کر چھا جاتی ہے۔ میرے سسرال میں تو آپ سب ہی کے بے حد فیورٹ ہیں اور پھر اپنے باس کی ہی مثال لے لیں۔ وہ جو بقول آپ کے اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتے تھے آپ سے اس قدر امپریس ہوگئے ہیں کہ آپ کو اپنا داماد بنانے کے لیے باؤلے ہوئے جارہے ہیں۔" سمرانہ نے کچھ اتنے مزے سے لفظ باؤلے کہا کہ آذر بے ساختہ ہنس دیا۔ بہت پیار سے اس نے اپنی لاڈلی بہن کو دیکھا۔

"سمرانہ اگر یہ بات اتنی آسان ہوتی تو احتشام صاحب اتنا پریشان نہ ہو رہے ہوتے۔ وہ اپنی اکلوتی بیٹی کو بے پناہ چاہتے ہیں تبھی تو اس کی ضد کے آگے بے بس ہیں۔ وہ تو شادی کا نام سنتے ہی ہتھے سے اکھڑ جاتی ہے۔ ہر آنے والے رشتے پر اس نے رو رو کر حشر ڈھا دیا ہے۔ بھوک ہڑتال پر چلی جاتی ہے وہ۔ آج احتشام صاحب نے مجھے آفس میں بلا کر کھل کر بات کی اور ان کا یہاں آنا اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔"

"کس قسم کی بات آذر؟" کچن سے نکلتے ہوئے زاہدہ بیگم کے کانوں میں بھی اس کے جملے پڑے اور وہ مارے تجسس کے دو قدموں میں ہی اس کے نزدیک چلی آئیں۔ ان کے اتنی تیزی سے اپنے قریب آنے پر سمرانہ اور آذر کو اپنی ہنسی روکنے پر اختیار ہی نہ رہا۔ ☆☆☆

احتشام صاحب کا بزنس کی دنیا میں بہت بڑا نام تھا۔ ان کی کمپنی کی شہرت پورے ملک میں پھیلی ہوئی تھی بلکہ اب تو وہ اس کی ایک برانچ لندن میں بھی کھولنے کا پلان بنا رہے تھے۔ ان کی کمپنی میں جاب ملنا کافی مشکل کام تھا۔ آذر جب اپنی جاب کے سلسلے میں ان کی فرم میں انٹرویو دینے گیا تھا تو اہم پوسٹ ہونے کی بنا پر احتشام صاحب نے فائنل انٹرویو خود اس سے لیا تھا۔ آذر ان کا شاندار آفس،

ان کی بارعب پرسنالٹی دیکھ کر کافی امپریس اور نروس بھی ہو رہا تھا اور دل ہی دل میں اپنے سلیکٹ ہونے کی دعائیں مانگ رہا تھا۔ اس وقت اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا کہ جس کمپنی میں وہ جاب حاصل کرنے آیا ہے قدرت اسے اسی کمپنی کا مالک بنانے کا سوچ رہی ہے۔ یہ سچ ہے کہ زندگی اپنے جادو کے پٹارے میں انسان کے لیے ایسے ایسے جادوئی لمحات چھپا کر لاتی ہے جو اسے ششدر کر دیتے ہیں لیکن بے بسی کی بات یہ ہے کہ وہ اس جادو کے پٹارے میں جھانکنے کا مجاز نہیں۔

آذر کو اس کمپنی میں جاب کرتے ہوئے اب تقریباً تین سال ہونے والے تھے۔ اس عرصے میں وہ اپنی انتھک محنت، بے پناہ ذہانت، شاندار پرسنالٹی اور دل موہ لینے والی نیچر کے باعث احتشام صاحب کے دل میں ٹھیک ٹھاک گھر کر چکا تھا۔ یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ شریف، محنتی اور ایماندار نوجوان جس نے اپنی محنت اور ذہانت سے ان کی کمپنی کا نام مزید روشن کرنے میں کافی اہم کردار ادا کیا تھا بلکہ یہ کہنا غلط نہ تھا کہ اس کے آنے کے بعد ان کے بزنس میں جیسے چار چاند لگ گئے تھے۔ احتشام صاحب کو جیسے اپنا گرویدہ ہی بنا ڈالا تھا۔ تانیہ کے لیے انہیں اس سے بہتر کوئی اور شخص نظر آ ہی نہیں رہا تھا حالانکہ بہت اونچے اونچے گھرانوں سے اس کے لیے رشتے آ رہے تھے لیکن احتشام صاحب کا دل نہ جانے کیوں کسی کے لیے بھی راضی ہونے کو نہیں کرتا تھا۔ عجیب سے وسوسے انہیں ڈرانے لگتے، تانیہ ان کی اتنی بڑی جائداد اور ان کے بزنس کی اکلوتی وارث تھی۔ سانولی سلونی اور نازک سی تانیہ میں جیسے ان کی جان تھی اور وہ ڈرتے تھے کہ صرف جائداد کے لالچ میں کوئی ان کی بیٹی کا ہاتھ تھام کر بعد میں اسے کسی اذیت سے نہ دوچار کر دے۔ لیکن آذر سے ملنے کے بعد انہیں یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے اللہ نے اسے ان سے صرف تانیہ کے لیے ملوایا ہے اور یہ سیلف میڈ اچھے خاندان کا نوجوان ان کی تانیہ کو ہمیشہ خوش رکھ سکتا ہے۔ وہ ان کے معیار کی کسوٹی پر پورا اتر رہا تھا لیکن پھر بھی وہ لاکھ چاہنے کے باوجود کوئی بھی قدم اٹھانے سے گریزاں تھے۔ اسی لیے آج انہوں نے آذر کو اپنے کمرے میں بلوا کر اس کے سامنے جیسے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔

”بیٹا آج میں نے تمہیں اپنے آفس میں اس لیے بلایا ہے تاکہ میں تم سے کچھ ضروری باتیں ڈسکس کر سکوں لیکن یہ بزنس میٹنگ نہیں ہے بلکہ گھر کے ایک قریبی فرد کی طرح میں تم سے کچھ ذاتی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔“

”جی احتشام صاحب کہیے، میں سن رہا ہوں۔“ وہ بہت سعادت مندی سے بولا جبکہ دل میں بہت خوب صورت لے میں گھنٹیاں بجنی شروع ہو گئی تھیں۔ وہ کوئی بچہ تو نہیں تھا جو اُن کا مطلب نہیں سمجھتا۔ ویسے بھی آذر پر احتشام کی خاص نظرِ کرم اب کسی سے ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی۔ ابھی کچھ عرصے قبل احتشام صاحب نے اسے اپنی ویڈنگ اینورسری پر بلا کر جیسے اسے ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ کیونکہ انہوں نے اس سے قبل کبھی اپنے گھریلو فنکشنز میں آفس سے کسی کو انوائٹ نہیں کیا تھا۔ وہیں آذر کی ملاقات پہلی بار تانیہ سے ہوئی تھی۔ سانولی رنگت کی تانیہ عام سی شکل صورت کی ہوتے ہوئے بھی کافی پُرکشش سی لگ رہی تھی۔ شاید اس میں اس کی دولت کا بھی کمال تھا۔ اسٹائلش قیمتی ڈریس، نفیس جیولری اور بے حد سلیقے سے کیے گئے میک اپ کے علاوہ اس کے سیاہ چمکتے ہوئے گھنے بالوں کے بے حد خوب

صورت اسٹائل نے اس کی شخصیت کو کافی حسین لُک دے دیا تھا۔ احتشام صاحب نے بہت شاندار الفاظ میں اپنی بیگم اور بیٹی سے اس کا تعارف کروایا۔ بیگم صبا احتشام بہت شفقت اور خوش دلی کے ساتھ اس سے ملیں لیکن تانیہ کے انداز میں اس کی سرد مہری اور لاتعلقی کافی صاف نظر آ رہی تھی بلکہ دوسرے الفاظ میں اس نے آذر کو جیسے نو لفٹ کا بورڈ دکھا دیا تھا۔ آذر کو اس کی یہ بے رخی بھی اچھی لگی کیونکہ احتشام صاحب اور ان کی بیگم کا التفات اسے بتا رہا تھا کہ یقیناً یہ سانولی حسینہ اس کی قسمت کو بدلنے کے لیے اس کی زندگی میں آنے والی ہے۔ اسی شام باتوں باتوں میں بیگم صبا احتشام نے اس سے اس کی شادی کے متعلق بھی پوچھا تھا تب اس نے بڑی سادگی سے انہیں بتایا تھا کہ عام نوجوانوں کی طرح اس کا کوئی آئیڈیل نہیں ہے اور نہ ہی اب تک اس کی زندگی میں کوئی لڑکی آئی ہے کیونکہ ابھی تک وہ صرف اپنا کیریئر بنانے پر توجہ دے رہا تھا ہاں البتہ اب وہ اپنی امی کے اصرار پر شادی کے متعلق غور ضرور کر رہا ہے۔ حالانکہ اس کی 50 فیصد باتیں جھوٹ پر مبنی تھیں۔ وہ اپنی امی کی بتائی ہوئی کتنی ہی لڑکیوں کو ریجیکٹ کر چکا تھا کہ اس کی حسن پرست طبیعت کسی پر مائل ہی نہیں ہوتی تھی لیکن آج وقت اور مہلت نے اس کی حسن پرستی پر مستقبل کا رنگین جگمگاتا پردہ ڈال کر ایک عام سی سانولی سلونی لڑکی کو اس کا آئیڈیل بنا دیا تھا۔ بیگم صبا احتشام اس کے جواب سے کافی متاثر ہوئی تھیں جبکہ احتشام صاحب تو اس کے خیالات سن کر اس پر تقریباً صدقے ہی ہو گئے تھے کہ ایک فلمی ہیرو کی ساری خوبیاں اپنے اندر سمو کر اس نے ایکٹنگ کا اتنا شاندار نمونہ بھی تو پیش کیا تھا اور اس ایکٹنگ کا ایوارڈ اسے آج شاید احتشام صاحب دینے والے تھے تبھی تو بطورِ خاص اسے اپنے آفس میں بلا کر اتنی اچھی تمہید باندھ کر انہوں نے بات شروع کی تھی۔

”آذر تم میرے دل کی گہرائیوں میں جا کر ایک ایسے اونچے مقام تک جا پہنچے ہو جو سب سے اونچا ہے۔ بیٹا میں تمہیں تین سال سے پرکھ رہا ہوں۔ مجھے تمہارا کردار، تمہاری نیچر، تمہاری محنت، آگے بڑھنے کی لگن، تمہارا سیلف میڈ ہونا کون سی خوبی ہے جو تم میں نہیں ہے۔ سب سے بڑھ کر تم لالچی نہیں ہو۔ دولت کی ہوس نہیں ہے تم میں۔ کتنے مختلف ہو تم آج کل کے نوجوانوں سے۔“ احتشام صاحب کی باتیں ایک پھوار کی طرح اس کے دل کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھیں۔ یہی تو اس کی شخصیت کا کمال تھا، اس کی جادوگری تھی جو سامنے والے کو اپنے ٹرانس میں لے لیتی تھی۔ وہ دل کا سچ مچ برا نہیں تھا لیکن کچھ پانے کے لیے جھوٹے خوب صورت رنگوں سے اپنی شخصیت کو بہت خوب صورت روپ دینا اس کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔

”آذر مجھے تم میں وہ تمام خوبیاں نظر آتی ہیں جو میں اپنے داماد میں دیکھنا چاہتا ہوں۔ میرا کوئی بیٹا نہیں ہے لیکن مجھے پوری امید ہے کہ تم میری زندگی کی اس بہت بڑی کمی کو ایک بیٹا بن کر پورا کر سکتے ہو۔ میں اکثر سوچا کرتا تھا کہ خدانخواستہ اگر مجھے کچھ ہو گیا تو میرے بزنس کو کون سنبھالے گا۔ صبا ایک گھریلو خاتون ہیں اور میری بیٹی اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود بزنس میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتی۔ پتا نہیں اس کے نصیب میں کیسا شوہر لکھا ہو لیکن تم جیسے قدرت کی طرف سے ایک ایسی روشنی بن کر میری زندگی میں آئے ہو جس کے اجالے میں مجھے اب تمام راستے بہت صاف اور واضح نظر آ رہے ہیں۔“

احتشام صاحب بڑے جذب سے کہہ رہے تھے اور آذر نا قابلِ یقین نظروں سے بس انہیں چپ چاپ دیکھے جا رہا تھا۔ اسے جس بات کا گمان تھا وہ اتنی جلدی حقیقت کا روپ دھار لے گا یہ اس نے سوچا نہیں تھا۔

''بیٹا کیا تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض ہے؟'' احتشام صاحب شاید اس کی خاموشی کو اس کا انکار سمجھے تھے۔ آذر ہڑبڑا کر جیسے ہوش کی دنیا میں واپس آگیا۔

''جی نہیں احتشام صاحب' یہ تو میری خوش قسمتی ہوگی کہ میں آپ جیسے عظیم انسان کی فرزندی میں آجاؤں۔ یقین جانیں اگر میری کہیں منگنی بھی ہوگئی ہوتی تو میں آپ کی خواہش پر اسے بھی ختم کر دیتا۔ آپ کے اندر میں نے لاشعوری طور پر اپنے پاپا کو ڈھونڈا ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں بچپن میں ہی اپنے پاپا کی محبت سے محروم ہوگیا تھا اور یہ محرومی قدم قدم پر مجھے ستاتی رہی ہے لیکن آپ کی محبت آپ کی شفقت اور آپ کی حوصلہ افزائی ایک باپ کی طرح جیسے مجھے جینے کا حوصلہ دیتی ہے۔'' شدتِ جذبات سے آذر کی آنکھوں میں سچ مچ آنسو آگئے۔ احتشام صاحب نے نم آنکھوں سے اس کی جانب دیکھا۔ اس وقت وہ انہیں مزید اپنے دل کے قریب ہوتا ہوا محسوس ہوا...... بالکل ایک بیٹے کے مانند۔

''تم بھی مجھے اپنے بیٹے جیسے لگتے ہو آذر اور مجھے پوری امید ہے کہ تم میرے خاندان میں شامل ہو کر اسے مکمل کر دو گے لیکن بیٹا جیسا کہ میں نے تم سے پہلے بھی ذکر کیا تھا کہ تانیہ کو شادی کے نام سے ہی نفرت ہے۔ اسے مرد ذات پر اعتبار ہی نہیں۔ اس نے بچپن میں اپنی خالہ کو شادی کے دو ماہ بعد ہی طلاق لے کر گھر واپس آتے ہوئے دیکھا ہے کیونکہ رابعہ کے شوہر نے اس سے چھپا کر ایک اور شادی بھی کی ہوئی تھی۔ ان دو ماہ میں اس نے رابعہ کے ساتھ بہت ہی برا سلوک کیا اور شادی کا راز کھل جانے پر مزید ڈھیٹ بن کر اس پر ظلم کی انتہا ہی کر دی۔ جب ہم لوگ اس کو وہاں سے لے کر آئے ہیں تو وہ پہچانی نہیں جا رہی تھی۔ چہرے اور جسم پر اس کی مار کے بے تحاشا نشان تھے۔ وہ چونکہ بیاہ کر دوسرے شہر گئی تھی اس لیے ہم لوگوں کو اس پر گزرنے والی قیامت کا پتا ہی نہیں چلا۔ وہ تو اس دن بہت مار کھانے کے بعد موقع پا کر اس نے گھر فون کر دیا۔ تب سب یہاں سے بھاگے۔ تانیہ تو اس کی حالت دیکھ کر بے حد سہم گئی تھی۔ بعد میں رابعہ کافی نفسیاتی ہوگئی تھی۔ اس نے تانیہ کے دل میں مردوں کے خلاف بے پناہ نفرت بٹھا دی بلکہ جیسے اس کا برین واش ہی کر دیا۔ کچھ سال قبل رابعہ کی خودکشی نے تانیہ کے ذہن پر مزید برا اثر ڈالا ہے وہ شادی کا نام سنتے ہی رو رو کر حشر ڈھا دیتی ہے۔ بیٹا میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم اپنے کردار اپنی ذہانت سے اس کے دل میں بکھرے اندھیروں کو روشنی میں بدل دو گے۔''

''احتشام صاحب آپ نے مجھے جو ذمے داری سونپی ہے انشاء اللہ میں اسے نبھانے کی پوری کوشش کروں گا بس آپ مجھ پر یقین رکھیں۔'' آذر کا بے حد کانفیڈینٹ لہجہ احتشام صاحب کے دل میں خوشیوں اور امیدوں کے بے شمار پھول کھلا گیا تھا۔

❖❖❖

''بیٹا مجھے تو حیرت ہو رہی ہے کہ احتشام صاحب نے اتنے بڑے بڑے گھروں کے رشتے چھوڑ کر آخر تمہارا انتخاب کیوں کیا ہے؟'' زاہدہ بیگم نے خوشی آمیز الجھن کے ساتھ آذر کی جانب دیکھا۔

انہیں سچ مچ یقین نہیں آرہا تھا کہ اتنا بڑا آدمی ان کے بیٹے کے سامنے ایسے جھک بھی سکتا ہے۔

''ارے امی آج کل زمانہ کتنا خراب ہے، کیا آپ یہ نہیں جانتیں؟ احتشام صاحب کو تو بھائی کے روپ میں ایک ایسا ہیرا نظر آگیا ہے جسے انہوں نے ان تین سالوں میں ٹھیک ٹھاک طریقے سے پرکھ کر اپنی بیٹی کے تاج میں لگانے کا فیصلہ کیا ہے۔'' سمرانہ نے بڑے فخر اور پیار سے اپنے بھائی کی طرف دیکھا تو وہ مسکرا دیا۔

''واہ سمرانہ کیا ڈائیلاگ مارا ہے تم نے' لگتا ہے، خوب افسانے پڑھے جا رہے ہیں۔'' آذر نے ہنستے ہوئے اسے چھیڑا۔

''نہیں بھائی، میں حقیقت بیان کر رہی ہوں اور پھر ہمارا خاندان بھی تو کسی سے کم نہیں۔ پاپا اچھی خاصی جائداد چھوڑ کر گئے تھے ہمارے لیے۔ امی اتنے اچھے کالج میں پروفیسر ہیں۔ میری سسرال بھی ٹھیک ٹھاک ویل آف ہے سب سے بڑھ کر آپ میں جو کوالٹیز ہیں وہ انہیں کہیں اور مل ہی نہیں سکتیں۔ یہاں تو 90 فیصد۔ لوگ صرف ان کی دولت ہڑپ کرنے کے چکر میں ہوں گے۔ تانیہ ان کی اکلوتی بیٹی اور وارث جو ہے......'' تانیہ کی بات پر زاہدہ بیگم نے گہری نظروں سے آذر کی جانب دیکھا۔

''آذر میرے خیال میں تمہارے لیے بھی تانیہ سے زیادہ احتشام صاحب کی اتنی بڑی کمپنی کا مالک بن جانا زیادہ اہمیت رکھتا ہے ورنہ بقول تمہارے تانیہ بس قبول صورت ہے جبکہ میں تمہاری حسن پرست نیچر سے واقف ہوں۔'' زاہدہ بیگم کی اتنی کھری بات پر آذر نے جز بز ہو کر ان کی طرف دیکھا جبکہ سمرانہ کو بھی ان کا کڑوا سچ کچھ اچھا نہیں لگا۔

''امی آپ بھی کمال کرتی ہیں۔ یہ تو احتشام صاحب اپنی مرضی اور خوشی سے بھائی کا رشتہ چاہ رہے ہیں اور پھر اگر قدرت خود ہی بھائی کو اتنا برائٹ اور شاندار مستقبل دینے کے درپے ہے تو ایسی خوش قسمتی کو ٹھکرانا بے وقوفی ہی ہوتی ہے۔'' سمرانہ کچھ برا مان کر بولی تو آذر بھی چپ نہ رہ سکا۔

''امی پلیز آپ میری نیت پر شک نہ کریں۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس رشتے میں میرا شاندار مستقبل بھی چھپا ہوا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ میں احتشام صاحب کی اس شفقت، محبت اور اس اعتماد کا قرض بھی اتارنا چاہتا ہوں جو ان تین سالوں میں انہوں نے مجھے دیا ہے۔ انہیں ڈر ہے کہ کوئی لالچی اور بدنفس انسان ان کی بیٹی کو جو پہلے ہی مردوں سے خائف ہے کسی دکھ اور اذیت سے نہ دوچار کر دے۔''

''لیکن بیٹا جس رشتے میں تھوڑی سی بھی غرض آجائے وہ زیادہ پائدار نہیں ہوتا۔ تمہیں اس شادی سے پہلے تانیہ کے لیے سچے جذبات اپنے دل میں سمونے ہوں گے۔ یقین جانو بیٹا یہ فطری سی بات ہے کہ میں نے اپنے بیٹے کے لیے ہمیشہ اونچے اونچے خواب دیکھے اور آج اللہ ان خوابوں کی بہت شاندار تعبیر بھی دکھلا رہا ہے لیکن خدا گواہ ہے اگر تانیہ میری بہو بن کر آئی تو میں اسے سچے دل سے اپنی بیٹی کی طرح ویلکم کروں گی اس میں اس کی دولت و امارت کا کوئی دخل نہیں ہوگا۔'' زاہدہ بیگم کی آنکھیں جھلملا سی گئیں۔

''امی اس رشتے میں احتشام صاحب، ان کی بیگم، آپ کی' سمرانہ اور میری سب کی خوشی شامل ہے اور اتنے سارے لوگوں کی خوشیوں کا دارومدار صرف تانیہ کی ایک ہاں پر ہے۔ جس کے لیے میں نے احتشام صاحب سے وعدہ بھی کیا ہے۔ سو اس وعدے کو نبھانے کے لیے آپ کو اور سمرانہ کو میری مدد کرنی ہو

گی۔'' آذر اٹھ کر ان کے بالکل نزدیک بیٹھ گیا۔

''کیسی مدد بیٹا؟'' زاہدہ بیگم نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا۔

''امی ہم سب کومل کر تانیہ کے دل سے وہ گرہ کھولنی ہے جس نے اسے شادی اور مردوں سے متنفر کیا ہوا ہے۔ اس کے لیے بے ضرر جھوٹ اور مصلحت سے کام لے کر اگر ہم احتشام صاحب اور ان کی بیگم کی پریشانی اور الجھن کو ختم کر کے ان کو سکون دے سکتے ہیں تو اس میں کوئی گناہ نہیں۔'' سمرانہ اور زاہدہ بیگم کی سوالیہ نظریں بے اختیار اس کی جانب اٹھی تھیں۔

❖❖❖

''اوہ گاڈ آنٹی میں نے اتنا مزے دار کھانا کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں بھی نہیں کھایا۔ سچ آپ نے تو کمال ہی کر دیا۔ گرین ٹی کا کپ اٹھاتے ہوئے کومل نے ایک بار پھر زاہدہ بیگم کی کسی بات پر ان کے ہاتھ کے پکے ہوئے کھانوں کی تعریف کی تو سمرانہ نے مسکرا کر اسے یاد دلایا۔

''دیکھیے آپ پھر زیادتی کر رہی ہیں۔ اس ڈنر کو تیار کرنے میں میرا بھی کافی ہاتھ ہے لیکن آپ میرا نام ہی نہیں لے رہیں۔'' کومل بے اختیار ہنس دی۔

''ارے بھئی میں بار بار بھول جاتی ہوں لیکن سمرانہ ہم لوگ تقریباً ہم عمر ہی ہیں، یہ آپ جناب کا تکلف ہم لوگوں کے درمیان نہیں آنا چاہیے۔ ویسے تمہارے ہاتھ کی بنائی ہوئی بریانی کا واقعی کوئی جواب نہیں تھا۔'' کومل کی تعریف پر سمرانہ نے ہنستے ہوئے اپنے فرضی کالر جھاڑے تو سبھی مسکرا دیے۔ آذر کی نظریں لمحہ بھر کو کومل کے گلابی حسین چہرے پر اٹھیں اور پھر وہ احتشام صاحب کی طرف متوجہ ہو کر ان سے کوئی بات کرنے لگا لیکن اس ایک نظر میں جیسے اس نے کومل کے چہرے کا سارا حسن اپنی آنکھوں میں سمو لیا۔ اللہ نے شاید اسے چھٹی والے دن بہت ہی فرصت سے بنایا ہے اس نے دل ہی دل میں سوچا تھا۔ پہلی ہی نظر میں جیسے وہ اس کے دل میں اتر گئی تھی۔ بڑی بڑی قاتل آنکھوں کی چمک ستاروں کو ماند کر رہی تھی۔ رنگت ایسی جیسے کسی نے دودھ میں گلابیاں ملا دی ہوں۔ اتنی شفاف اور بے داغ اسکن تو شاید مس ورلڈ کی بھی نہ ہو۔ آذر نے یہ رائے بھی دل ہی دل میں دی تھی۔ اس کا قیامت خیز فگر تو اس کا ایمان لوٹے لے رہا تھا۔ ڈیپ ریڈ سوٹ میں اپنے براؤن بالوں کی پونی ٹیل بنائے وہ ہنستی کھلکھلاتی جیسے اس کے سارے گھر کو جگمگا رہی تھی۔

جب احتشام صاحب کی کار ان کے گھر کے گیٹ کے سامنے رکی تھی تو آذر تیزی سے ان کی کار کے نزدیک ان کو ریسیو کرنے پہنچا تھا تو فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ہوئے احتشام صاحب شاید ڈرائیور کو کچھ ہدایات دے رہے تھے جبکہ پچھلا دروازہ کھول کر جو ہستی سب سے پہلے اتری اس نے ایک لمحہ کو آذر کو مبہوت سا کر دیا لیکن دوسرے ہی لمحے وہ جلدی سے احتشام صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا جو دروازہ کھول کر باہر اتر رہے تھے لیکن اس کا سارا دھیان اس حسینہ کی جانب تھا جسے وہ آج پہلی بار دیکھ رہا تھا۔ کومل کے بعد یکے بعد دیگرے تانیہ اور بیگم صبا احتشام بھی نیچے اتر آئے۔

''آذر اس سے ملو، یہ میری بہت لاڈلی بھانجی کومل ہے۔'' احتشام صاحب نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا تو کومل نے فوراً ہی ٹوکا۔

''ماموں آپ ہمیشہ ادھورا تعارف کرواتے ہیں۔''

''ارے ہاں، سوری بیٹا میں بھول گیا۔ آذر یہ تانیہ کی سب سے عزیز ترین دوست ہے۔ ان دونوں کی دوستی اتنی گہری ہے کہ اس دنیا میں اس کی مثال مل ہی نہیں سکتی۔ کیوں کومل اب تو ٹھیک ہے نا؟'' احتشام صاحب نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا تو اس نے بڑی ادا سے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے تانیہ کا ہاتھ تھام لیا جو آسمانی خوب صورت ڈریس میں اچھی تو لگ رہی تھی لیکن کومل کے حسن کے شعلے جیسے تانیہ کی ساری خوب صورتی کو جلا کر خاک کیے دے رہے تھے۔ آذر نے بہ مشکل تمام اپنے آپ کو کمپوز رکھنے کی کوشش کی کہ اپنا امیج بھی تو اس فیملی کے سامنے قائم رکھنا تھا۔ جس آئیڈیل کی تلاش میں اس نے اتنی لڑکیوں کو ریجیکٹ کیا تھا، وہ آئیڈیل کب، کہاں اور کس سچویشن میں اسے نظر آیا تھا۔ اس وقت وہ لوگ کھانے کے بعد لیونگ روم میں بیٹھے گرین ٹی پیتے ہوئے گپ شپ کر رہے تھے۔ زاہدہ بیگم، آذر کی ہدایت کے مطابق اس وقت اپنے ایک رشتے کے بھائی کا قصہ چھیڑ بیٹھی تھیں جن کی بیوی ان سے بے وفائی کر کے اور بینک سے ان کا سارا پیسہ نکال کر اپنے سابقہ محبوب کے ساتھ بیرونِ ملک فرار ہو گئی تھی اور ان کا بھائی اس صدمے کی تاب نہ لا کر دماغی توازن کھو بیٹھا تھا۔ یہ قصہ سچائی پر مبنی تھا اس لیے وہ اسے بیان کرتے ہوئے سچ مچ ملول ہو گئیں۔

''امی پلیز اس وقت یہ قصہ سنا کر آپ خوامخواہ ہی اپنے اتنے اچھے موڈ کو خراب کر رہی ہیں اور پھر آپ کے مہمان کیا سوچیں گے کہ ہمیں گھر بلا کر اپ سیٹ کر دیا۔'' آذر نے تسلی دینے والے انداز میں ان کے کاندھے پر ہاتھ رکھا تو احتشام صاحب نے فوراً ہی آذر کو ٹوکا۔

''ارے نہیں آذر، یہ سب تو زندگی کی تلخ حقیقتیں ہیں جن سے نظریں چرانا ممکن نہیں۔ ہمارے خاندان میں بھی اسی سے ملتا جلتا ایک قصہ رونما ہو چکا ہے۔'' پھر انہوں نے مختصراً تانیہ کی خالہ کا قصہ سنا ڈالا۔

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں احتشام بھائی۔ یہ دنیا اچھے اور برے دونوں ہی لوگوں سے بھری ہوئی ہے۔ کہیں عورت ناگن بن کر ایک مرد کے اعتبار اس کی خوشیوں کو ڈس جاتی ہے اور کہیں مرد بھیڑیا بن کر ایک عورت کی زندگی کو تباہ و برباد کر دیتا ہے اس کی ذات کے چیتھڑے اڑا دیتا ہے۔'' زاہدہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔

''دیکھا بھائی آپ اسی لیے شادی جیسے مقدس فریضے کو دھوکے کا نام دیتے تھے نا کہ آپ کو عورت ذات پر اعتبار نہیں رہا تھا۔ اب دیکھیں احتشام انکل کی فیملی میں ایک مرد نے کیسے کیسے ظلم ڈھا کر صبا آنٹی کی بہن کو خودکشی کرنے پر مجبور کر دیا۔'' سمرانہ نے فوراً ہی پلان کے تحت اپنے جملے بھی اس گفتگو میں شامل کیے جو بلاشبہ تانیہ کو سنانے کے لیے کہے گئے تھے۔

تانیہ نے بے اختیار نظریں اٹھا کر آذر کی جانب دیکھا جو سر جھکائے نہ جانے کن سوچوں میں گم تھا۔ پھر بظاہر باتوں ہی باتوں میں سمرانہ اور زاہدہ بیگم نے آذر کی پرسنالٹی کے اتنے خوب صورت رنگ ان لوگوں کے سامنے بکھیرے کہ تانیہ بہت لاتعلق سے انداز میں بیٹھے ہوئے آذر کی جانب بار بار متوجہ ہوتی رہی جبکہ کومل کی چمکتی آنکھیں بھی کئی بار اس پر مرکوز ہوئیں لیکن آذر بہت ڈیسنٹ انداز میں زیادہ تر احتشام صاحب یا بیگم صبا سے محوِ گفتگو رہا حالانکہ دل بار بار ایک شریر بچے کے مانند کومل کو دیکھنے کی ضد کرتا رہا، جسے بہلا کر وہ جبراً احتشام صاحب کے چہرے کی طرف متوجہ رہا۔

❖❖❖

”ڈیئر ڈائری، تانیہ سے میری کئی ملاقاتیں ہو چکی ہیں۔ میں نے اپنی ذہانت اور اپنے رویّے سے اس کے ذہن کی سلیٹ سے شادی اور مردوں کے خلاف اس کی شدید نفرت کو خاصی حد تک مٹا دیا ہے۔ اس کی بے اعتباری کو میری محبت نے ایک اعتبار سا بخش دیا ہے۔ ہم دونوں میں اکثر اس موضوع پر بحث بھی ہو جاتی ہے اور اس میں جیت مابدولت کی ہوتی ہے۔ وہ میری باتوں کو بہت مسحور ہو کر سنتی ہے اور قائل بھی ہو جاتی ہے۔ احتشام صاحب اس کے بدلتے ہوئے خیالات سے بہت ہی خوش ہیں اور میرے بے حد شکر گزار بھی۔ مجھے میری منزل بہت نزدیک آتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ مجھے ایک شاندار مستقبل جیسے قدرت ایک پلیٹ میں سجا کر پیش کر رہی ہے۔ اور میں اس پلیٹ کو لوٹانے کی حماقت کبھی بھی نہیں کروں گا۔ یہ سچ ہے کہ تانیہ میری آئیڈیل نہیں ہے لیکن پھر بھی وہ ہزاروں میں نمایاں نظر آتی ہے۔ اگر پیسہ ہے تو عام سی لڑکی بھی اپنے آپ کو حسین عورتوں کی صف میں لاسکتی ہے اور تانیہ تو ویسے بھی اٹریکٹیو لڑکی ہے۔ کل امی مجھے سمجھا رہی تھیں کہ شادی کے بعد جب تمہیں سب کچھ حاصل ہو جائے تو تانیہ سے تب بھی ویسے ہی محبت کرنا جس پر اعتبار کر کے وہ تمہاری زندگی میں شامل ہونے جا رہی ہے۔ اس کا اعتبار اس کا بھرم کبھی نہیں توڑنا ورنہ وہ بہت بری طرح سے ٹوٹ جائے گی۔ تم احتشام صاحب کے اس بھروسے کا جو وہ تم پر ایک بیٹے کی طرح سے کر رہے ہیں ہمیشہ بھرم رکھنا۔ امی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں، میں اس کمپنی کا مالک بعد میں اور تانیہ کے دل کا مالک پہلے رہوں گا۔ میں کبھی بھی اس کی ذات کو ریزہ ریزہ نہیں ہونے دوں گا۔ بس دل میں ایک کسک سی ہے، کاش میری اس کی کزن کومل سے ملاقات نہ ہوئی ہوتی۔ وہ ہو بہو میرے خوابوں کا عکس ہے۔ میں نے ہمیشہ ایسے ہی جیون ساتھی کا تصور کیا تھا لیکن صد افسوس وہ مجھے بہت غلط ٹائم پر ملی ہے۔ میں احتشام صاحب اور تانیہ سے جو کمٹمنٹ کر چکا ہوں اسے میں توڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ میری پیاری ڈائری تم اس بات کی گواہ رہنا۔“

آخری جملہ لکھتے ہوئے آذر نے ڈائری بند کر دی کیونکہ زاہدہ بیگم اس کو کھانے کے لیے آواز دے رہی تھیں۔

❖❖❖

”سنو آذر آج تانیہ اپنے ہاتھوں سے کچھ چائنیز ڈشز بنا رہی ہے۔ اس نے خاص طور پر تمہیں آج ڈنر پر انوائٹ کیا ہے۔ تم سات بجے تک آجانا۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اگر آذر نے وہ ڈشز پاس کر دیں تو پھر وہ اگلی بار تمہاری امی اور بہن، بہنوئی کو بھی یہ ڈشز اپنے ہاتھ سے بنا کر کھلائے گی۔“ احتشام صاحب نے آج صبح ہی اسے تانیہ کی طرف سے یہ انوی ٹیشن دیا تھا۔ پھر دوپہر تک تانیہ کی کال آگئی تو آذر کو اپنی اہمیت کا احساس ہونے لگا۔ اتنے بڑے آدمی کی اکلوتی بیٹی اپنے ہاتھ سے اس کے لیے کھانا بنا رہی تھی وہ دل ہی دل میں مغرور ہونے لگا۔

شام کو اس نے امی کو فون کر کے اپنے ڈنر پر جانے کا بتاتے ہوئے انہیں اپنے دیر سے آنے کا بتایا اور آفس سے سیدھا ہی احتشام صاحب کے بنگلے پر جا پہنچا۔ کیونکہ آج کام کا زیادہ لوڈ ہونے کی وجہ سے اسے آفس میں کافی دیر ہو گئی تھی۔ ابھی وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہی ہوا تھا کہ سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی کومل کو دیکھ کر وہ ایک دم ٹھٹک گیا۔ دل کی دھڑکنیں بے اختیار تیز ہو گئیں۔ ڈارک بلیو لانگ اسکرٹ اور بلاؤز میں اس کا حسین فگر قیامت ڈھا رہا تھا اور گوری رنگت چاند کی طرح چمک رہی تھی۔

”آئیں آذر صاحب تشریف رکھیے۔“ اپنی مترنم آواز میں اس نے آذر کو جیسے حواسوں میں لاتے ہوئے کہا تو وہ کچھ کھسیا کر جلدی سے صوفے پر بیٹھ گیا بس کچھ ہی لمحے لگے تھے اسے اپنے آپ کو کمپوز کرنے میں۔

”سوری کومل صاحبہ! اصل میں آپ کو یوں اچانک دیکھ کر میں حیران رہ گیا تھا۔ ویسے کافی اچھا سرپرائز دیا ہے آپ نے۔“

”تھینکس آذر صاحب۔“ اس نے اتنے دلکش انداز میں آذر کا شکریہ ادا کیا کہ اسے اپنا دل سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ تبھی جلدی سے اپنا دھیان بٹاتے ہوئے اس نے کومل سے پوچھا۔

”یہ تانیہ کہاں ہیں نظر نہیں آرہیں۔ کیا کچن میں بزی ہیں؟“

”تانیہ آپ کے آنے سے پانچ منٹ پہلے ہی احتشام ماموں اور ممانی کے ساتھ اپنی ایک دوست کو دیکھنے اسپتال گئی ہے۔ ابھی ابھی اس کے ایکسیڈنٹ کی خبر ملی تھی تانیہ کو۔“ اس طلاع پر اس نے کچھ پریشان ہو کر کومل کی جانب دیکھا۔

”اوہو یہ تو برا ہوا۔ کیا بہت سیریس کنڈیشن ہے ان کی دوست کی؟“

”ہاں کافی چوٹیں آئی ہیں لیکن خطرے سے باہر ہے وہ لیکن بہرحال تانیہ کا جانا ضروری تھا۔ اس نے آپ سے بہت معذرت کی ہے اور مجھے تاکید کر کے گئی ہے کہ جب تک وہ نہیں آجاتی میں آپ کو کمپنی دوں۔ ویسے وہ لوگ بس تھوڑی ہی دیر میں آتے ہوں گے۔“ وہ سامنے والے صوفے سے اٹھ کر اس کے بالکل نزدیک والے صوفے پر بیٹھ گئی۔ اس کے لباس سے اٹھتی مسحور کن خوشبو جیسے آذر

کے حواسوں پر چھانے لگی۔

"آذر آپ جانتے ہیں کہ کچھ ہی دنوں میں احتشام ماموں آپ کی اور تانیہ کی شادی کا باقاعدہ اعلان کرنے جارہے ہیں۔ اسی سلسلے میں شاید وہ کل آپ کی امی سے مل کر سب پروگرام طے کرنے آپ کے گھر جائیں گے۔" کومل کی آواز میں کچھ اداسی سی محسوس کرتے ہوئے آذر نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا۔ دونوں کی نگاہیں پل بھر کو ملیں اور اس ایک پل میں کومل کی آنکھوں نے بہت کچھ کہہ ڈالا۔ آذر نے کنفیوز ہو کر آنکھیں چرا لیں۔ عجیب سی سچویشن سے دوچار ہو رہا تھا وہ اس وقت۔ کومل جو پہلی ہی نظر میں اس کے دل کے اندر تک اتر گئی تھی اور جسے پا کر اسے دنیا کی ہر خوشی مل سکتی تھی وہ جو اس کی مکمل آئیڈیل بھی آج اپنی خاموش نظروں سے اس سے کہہ رہی تھی کہ وہ بھی اس کی دنیا میں آکر اسے مکمل کر دینا چاہتی ہے۔

"آذر آپ کے پاس ابھی بھی وقت ہے۔ زندگی بہت خوب صورت ہے اسے اپنی مرضی سے اگر جیا جائے تو اس کا حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ آپ مجھے بہت اچھے لگے ہیں آذر... اور آج قدرت نے ہمیں تنہائی کا یہ موقع فراہم کر کے جیسے ہمارا فیور کیا ہے۔ ابھی تانیہ کے آنے میں کچھ وقت ہے، پلیز آپ ایک بار پھر سوچ لیں ورنہ احتشام انکل کوئی فیصلہ کر لیں گے۔ میرے پاس گرین کارڈ ہے۔ ہم اپنی زندگی امریکا میں گزاریں گے، آپ وہاں میرے پاپا کا بزنس سنبھالیے گا اور ہم ایک دوسرے کے سنگ زندگی کا پل پل انجوائے کریں گے۔" کومل نے جذباتی ہو کر اپنے کبوتر جیسے گورے گورے ہاتھ اس کے ہاتھوں پر رکھ دیے۔

آذر کی قوتِ گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی۔ زندگی تو تانیہ کے ساتھ بھی بہت خوب صورت گزر سکتی تھی لیکن کومل کا ساتھ تو جیسے جنت مل جانے کے مترادف تھا۔ امریکا جیسے ملک میں جمے جمائے بزنس کو بہ آسانی چلا کر کومل کے سنگ ایک بہت حسین اور رنگین زندگی کے مزے لوٹنے کا اتنا شاندار موقع گنوانا اس کے نزدیک بہت بڑی حماقت تھی لیکن پھر احتشام صاحب سے کیے ہوئے وعدے کا کیا ہوگا، کیا تانیہ یہ فریب کھا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مردوں سے متنفر نہ ہو جائے گی۔ یہ خیال ذہن میں آیا تو اس نے بہت بے بسی سے کومل کی جانب دیکھا۔

"آذر آپ کیا سوچ رہے ہیں۔ پلیز جو فیصلہ بھی کرنا ہے فوراً کریں۔ امریکا کی حسین فضاؤں میں آپ کو میرے ساتھ جینا ہے یا پاکستان کے خشک ماحول میں تانیہ جیسی لڑکی کے ساتھ زندگی گزارنا ہے۔ آپ ابھی اور اسی وقت تانیہ کو فون کر کے اپنا فیصلہ سنا دیں اور پھر اس کے آنے سے پہلے یہاں سے چلے جائیں باقی میں سنبھال لوں گی۔" کومل نے گھڑی دیکھتے ہوئے کچھ عجلت سے کہا تو آذر بے اختیار کھڑا ہو گیا۔ جیب میں سے موبائل نکالنے کے لیے ہاتھ ڈالا لیکن پھر ایک دم اس نے پتا نہیں کیا سوچا اور تیزی سے مین دروازے کی جانب چل دیا۔

"ٹھہر جاؤ آذر۔" اچانک ہی احتشام صاحب کی آواز پر دروازہ کھولتے ہوئے آذر نے بے حد شاکڈ انداز میں پلٹ کر پیچھے دیکھا تو سامنے تانیہ، بیگم صبا اور احتشام صاحب کھڑے مسکرا رہے تھے جبکہ کومل بھی تانیہ کے شانوں پر اپنے بازو حمائل کیے اسے شوخ نظروں سے دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک لمحے کو ششدر سا کھڑا انہیں دیکھتا رہ گیا۔

"ادھر آؤ میرے بچے، آج تم نے میرا مان رکھ کر مجھے سب کے سامنے سرخرو کر دیا۔" احتشام

صاحب نے آگے بڑھ کر نم آنکھوں کے ساتھ اسے گلے لگا لیا۔ آذر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا۔ ساری بات اس کی سمجھ میں آنے لگی تھی جبکہ تانیہ کے چہرے پر بکھری معصوم سی خوشی بھی وہ صاف محسوس کر رہا تھا۔

"بیٹا اس شادی کو طے کرنے سے قبل تانیہ کو پوری طرح سے مطمئن کرنے کے لیے ہمیں یہ چھوٹا سا ڈراما کرنا پڑا۔ تانیہ کا خیال تھا کہ شاید تم اس امتحان میں فیل ہو جاؤ گے کہ اتنی خوب صورت لڑکی کے ساتھ اتنا رنگین اور حسین پیکیج کسی بھی نوجوان کا ایمان متزلزل کر سکتا ہے لیکن مجھے تم پر پورا بھروسا تھا۔ دیکھا تانیہ! دنیا میں آذر جیسے باوفا، ایمان دار اور اسٹرانگ کیریکٹر کے لوگ ابھی موجود ہیں۔ مجھے امید ہے کہ اب تم سچی خوشی اور صاف دل کے ساتھ اپنی نئی زندگی کی ابتدا کرو گی۔" آخری جملے انہوں نے بڑے فخریہ انداز میں تانیہ کو دیکھتے ہوئے کہے تھے جس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے شرما کر گردن جھکا لی۔

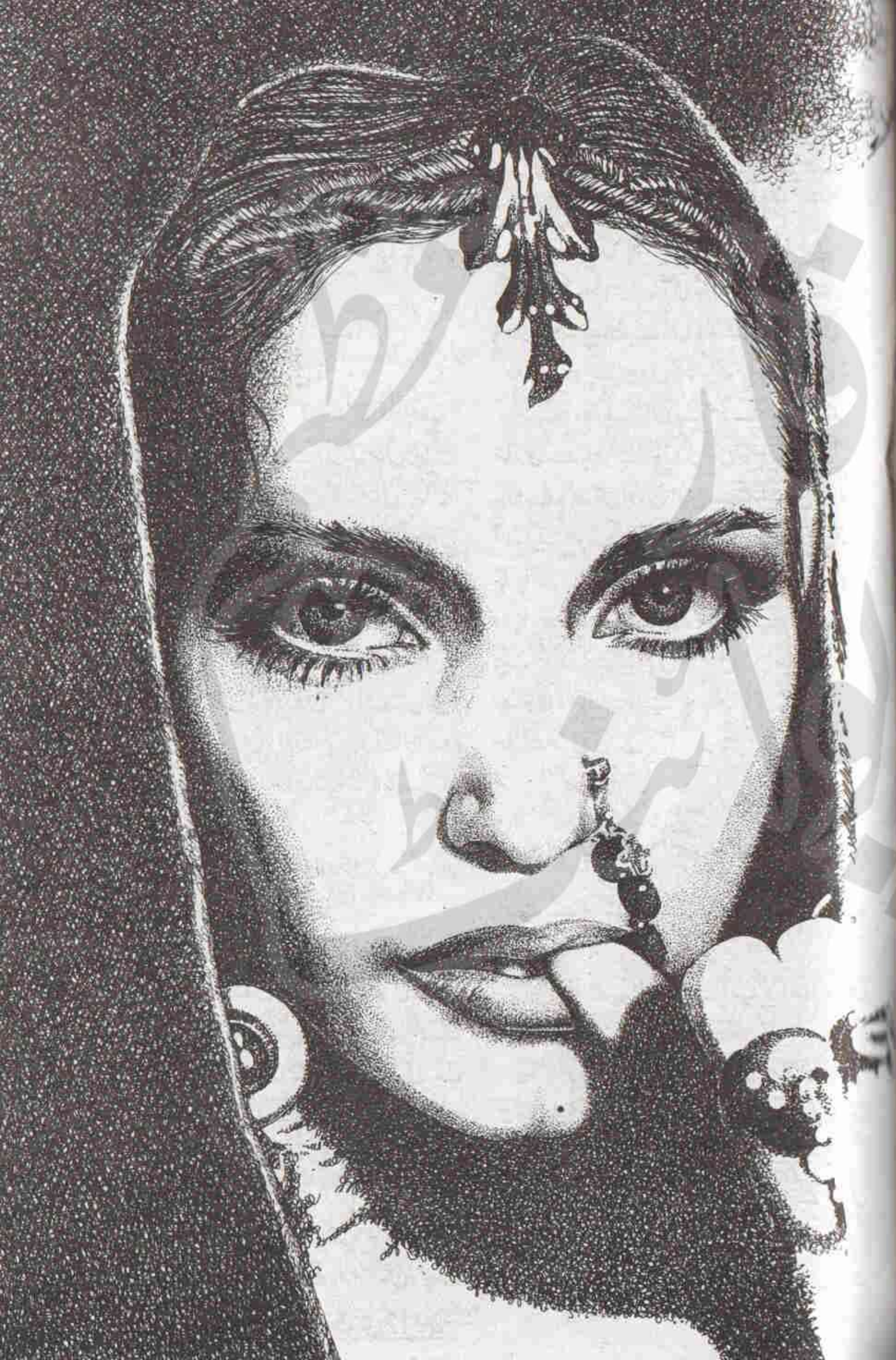
"ماموں میری ایکٹنگ کی تو کوئی داد ہی نہیں دے رہا۔" کومل نے مصنوعی خفگی سے انہیں گھورا تو صبا بیگم نے پیار سے اس کا ماتھا چوم لیا۔

"اللہ تمہیں ہمیشہ ارباز کے ساتھ خوش رکھے تم دونوں کی جوڑی سلامت رہے۔"

"جیجا جی حیران مت ہوں۔ ارباز میرے ہزبینڈ کا نام ہے۔ انشاء اللہ اپنی شادی پر ان سے مل لیجیے گا، آج کل وہ بزنس کے سلسلے میں اسلام آباد گئے ہوئے ہیں۔" وہ جو ہونقوں کی طرح اب بھی حیران پریشان سا ان لوگوں کے درمیان کھڑا تھا کومل کی بات پر جبراً مسکرا دیا لیکن وہ اس امتحان میں سرخرو ہو گیا تھا، اس بات کا یقین اسے خود نہیں آرہا تھا۔

❖❖❖

"ڈیئر ڈائری، آج تم سے باتیں کرتے ہوئے میرا بدن کانپ رہا ہے۔ اُف خدایا آج مجھ سے کتنی بڑی غلطی ہونے جارہی تھی۔ امی ٹھیک ہی کہتی ہیں انسان کو اپنا ہر کام صاف نیت کے ساتھ کرنا چاہیے۔ لالچ صرف اور صرف زندگی میں پچھتاوا اور پریشانیاں ہی لاتا ہے۔ آج اگر میں اپنے خیالات کو عملی جامہ پہنانے میں کامیاب ہو جاتا تو تانیہ کو ہمیشہ کے لیے کھونے کے ساتھ ساتھ اپنی جاب اور شاندار فیوچر سے بھی ہاتھ دھو بیٹھتا۔ اپنی امی سے بھی نظریں ملانے کے قابل نہ رہتا۔ احتشام صاحب کی نظروں میں میری عزت دو کوڑی کی ہو کر رہ جاتی۔ میری زندگی پھر سے زیرو پر آکر رک جاتی۔ یا اللہ تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تو نے مجھے بال بال بچا لیا بلکہ میری عزت سب کی نگاہوں میں دُگنی کر دی جس کے جواب میں تیرے حضور میں بھی سچے دل سے معافی مانگتے ہوئے وعدہ کرتا ہوں کہ تانیہ کے بھروسے کو کبھی بھی نہیں توڑوں گا۔ آج مجھے تو نے بہت بڑا سبق دیا ہے جو مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ تانیہ کے چہرے پر بکھری خوشی اور احتشام صاحب کی آنکھوں میں میرے لیے چمکتا ہوا وہ مان ہمیشہ کے لیے میرے دل میں ٹھہر گیا ہے۔ ڈیئر ڈائری پتا ہے جب کومل نے مجھ سے فوراً ہی تانیہ کو فون کرنے کو کہا تھا تب میں نے تانیہ کو فراموش کرتے ہوئے بے اختیار جیب سے موبائل نکالنا چاہا تو مجھے یاد آیا کہ موبائل تو میں کار میں چھوڑ آیا ہوں۔ میں موبائل لینے تیزی سے باہر کی جانب جا ہی رہا تھا کہ پھر کایا ہی پلٹ گئی۔ سوچو ڈیئر ڈائری اگر میں موبائل کار میں نہ بھولتا تو......"



ناولٹ

حد

نمرہ احمد



سیاہ آہنی گیٹ کے سامنے رک کر اس نے گردن اونچی کر کے دیکھا۔ گیٹ کی سیاہ سلاخوں کے پیچھے پتھروں سے بنی طویل روش تھی، جس کا اختتام اونچے ستونوں سے مزین برآمدے پہ ہوتا تھا۔ ستونوں پر سے ہوتے ہوئے اس کی نگاہیں اوپر اٹھتی گئیں۔ وہ خوب صورت برآمدہ ایک بلند و بالا محل نما کوٹھی کا حصہ تھا جس کے سامنے کی اونچی سفید چھت مخروطی تھی۔ اس کے عقب میں نیلا آسمان دکھتا

تھا۔

اس نے ڈوربیل کے ساتھ جڑی تختی پھر سے پڑھی۔

”سینیٹر خانوادہ جہانگیر شاہ۔“ اور انگلی گھنٹی پر رکھ دی۔ گیٹ کے ساتھ اندر کی طرف بنی چوکی کی کھڑکی سے گارڈ نے جھانکا۔

”کون ہیں آپ اور کیا کام ہے؟“

”سینیٹر جہانگیر شاہ اندر ہیں؟“

”آپ کام بتائیں۔“ گارڈ کا لہجہ روکھا تھا۔

”آپ جا کر مسز شاہ سے کہیں کہ منال جہانگیر شاہ آئی ہے، میرا نام یاد رکھیے گا۔ منال جہانگیر شاہ۔“ آخری الفاظ ادا کرتے ہوئے اس کے لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ چھوگئی۔ گارڈ نے قدرے الجھن سے زیرِ لب اس کا نام دہرایا، پھر فون کا ریسیور اٹھایا۔ وہ سینے پر ہاتھ باندھے فرصت سے لان کا جائزہ لینے لگی جو روش کے دونوں اطراف میں پھیلا تھا۔ سفید محل، سبز گھاس، اور اوپر نیلا آسمان ۔ وہ زمین کا نہیں، عدن کا ٹکڑا لگتا تھا۔ دفعتاً گارڈ نے پھر چوکی کی کھڑکی سے جھانکا۔

”بی بی صاحبہ آپ کو اندر بلا رہی ہیں۔“ ساتھ ہی آٹو میٹک آہنی گیٹ کھلتا چلا گیا۔

وہ اسی طرح سینے پر ہاتھ باندھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی روش پر آگے بڑھنے لگی۔ روش کے پتھروں پہ اس کی ہیل کی ٹک ٹک گونجنے لگی۔ برآمدے سے اندر کھلنے والے لکڑی کے دروازے کے ساتھ کھڑے باوردی ملازم نے اسے آتے دیکھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ سپاٹ چہرہ لیے اندر داخل ہوئی۔

لاؤنج بہت پُرتعیش انداز میں سجایا گیا تھا۔ بھاری مخملیں پردے، قیمتی صوفے، نرم قالین، چھت سے لٹکتے کانچ کے فانوس، دیواروں پہ آویزاں بیش قیمت پینٹنگز۔ نرم قالین پہ اس کے جوتوں کی آواز ختم ہوگئی تھی، وہ آہستگی سے چلتے ہوئے بڑے صوفے پر بیٹھی شہلا جہانگیر کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

شہلا کڑی نگاہوں سے اسے ہی دیکھ رہی تھیں۔ سلک کی بلیو ساڑی میں ملبوس، نفاست سے بالوں کو اونچے جوڑے میں باندھے، لمبی صراحی دار گردن سے چپکا ہیروں کا نازک سا ہار، کانوں میں آویزے، وہ ایک شان سے صوفے پر بیٹھی تھیں۔ ساڑی سے باہر جھلکتے بازو کی کہنی کو صوفے کے ہتھے پہ ٹکائے ہاتھ میں اورنج جوس سے بھرا گلاس پکڑ رکھا تھا۔ ایک نظر میں شہلا نے اوپر سے نیچے تک اس لڑکی کا جائزہ لے ڈالا۔ سادہ سی شلوار قمیص، کندھے پر دوپٹا، دوسرے شانے سے لٹکتا قدرے بڑا سا ہینڈ بیگ، شولڈر کٹ سیاہ بال اور بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، وہ بہت اعتماد سے سینے پر ہاتھ باندھے ان کے سامنے کھڑی تھی۔

”کون ہو تم؟“

”منال جہانگیر شاہ۔“

”تم نام بتا چکی ہو، آگے بتاؤ کون ہو تم؟“ نخوت سے سر جھٹکتے ہوئے شہلا نے گلاس لبوں سے لگایا۔

”کیا میرے نام سے آپ کو اندازہ نہیں ہوتا؟“

”تم یہ کہنا چاہتی ہو کہ تم جہانگیر شاہ کی کوئی تیسری بیوی ہو؟ اگر تم یہی کہنا چاہتی ہو تو کہہ ڈالو، مجھے شاک نہیں لگے گا۔“ وہ ہولے سے مسکرا دی۔

”بہت باخبر لگتی ہیں اپنے شوہر کے اعمال سے۔“

”میں نے کہا نا لڑکی، مجھے تمہاری اس بات سے کبھی شاک نہیں لگے گا کیونکہ میں جانتی تھی وہ کبھی نہ کبھی مجھے بتائے بغیر شادی کرلے گا۔“

”اور گناہ؟ وہ گناہ کرنے سے قبل آپ کی اجازت لیتے ہیں؟“

”شٹ اپ!“ وہ ایک دم دہاڑیں۔

”اپنی انرجی بچا کر رکھیں مسز شاہ، ابھی آپ کو بہت دفعہ مجھے شٹ اپ کال دینی پڑے گی۔“

”مختصر بات کرو۔“

”شیور، آپ جہانگیر شاہ سے کہیں، مجھے میرا حصہ دے دیں، اور اپنا نام بھی۔“ شہلا کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔

”جہانگیر کیوں تمہیں کچھ دے؟ تمہارا کیا تعلق ہے اس سے؟ شادی کا وعدہ کر رکھا ہے اس نے کیا؟“ منال نے ہولے سے نفی میں سر ہلایا۔

”کیا میری آنکھیں بھی آپ کو کچھ نہیں بتاتیں، مسز شاہ! میری آنکھوں میں دیکھیں اور سنیں، میں جہانگیر شاہ کی بیٹی ہوں، ان کے ایک پرانے گناہ کا ثبوت۔“

گلاس شہلا کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ چھنا کے کی آواز آئی اور قالین پر کرچیاں بکھر گئیں۔

”اب شاک لگا آپ کو؟ حالانکہ میں یہ سب آپ کو بتانا نہیں چاہتی تھی...... بدقسمتی سے میں اپنے آپ سے بہت پیار کرتی ہوں، اور ان کے اتنے بڑے راز کو کھولنا میرے لیے کتنا تکلیف دہ ہے، آپ اندازہ بھی نہیں کرسکتیں لیکن میں مجبور ہوں۔ میری وہ ماں جس سے میرے باپ نے کبھی شادی نہیں کی وہ [illegible] بھر پہلے مرگئی ہے۔ مجھے جہانگیر شاہ کی دولت نہیں چاہیے، مجھے وہ عزت اور نام چاہیے جو میرا حق ہے اور جس سے اتنے برس میں محروم رہی۔“

”نہیں!“ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ”تم جھوٹ بول رہی ہو۔“

”مجھے معلوم تھا مجھ پر پہلا الزام جھوٹ کا ہی لگے گا۔ سو جو ثبوت مل سکے وہ ساتھ ہی لائی ہوں۔“ اس نے کندھے سے پرس اتار کر کھولا اور ایک فائل اندر سے نکالی۔

”اس میں تیئس برس قبل اسی شہر کے ایک اسپتال کا بل ہے جو میری پیدائش پر جہانگیر شاہ نے ادا کیا تھا۔ اور بذریعہ چیک پے منٹ کا سارا ریکارڈ ہے۔ آپ اپنے شوہر کے اکاؤنٹ نمبر کو تو پہچانتی ہوں گی۔“ اس نے فائل ان کے سامنے میز پر رکھی اور سیدھی ہوئی۔ ”اس میں ان تمام چیکس کا ریکارڈ بھی ہے جو دس برس پہلے تک میری ماں کو جہانگیر شاہ کی طرف سے تنخواہ کے علاوہ ماہانہ جاتے تھے۔ اس سے قبل وہ بطور ایک ورکر آپ کے شوہر کی فیکٹری میں کام کر رہی تھیں۔ اس میں میری ڈی این اے رپورٹ بھی ہے جو سامنے رکھ کر آپ اپنے شوہر کا ڈی این اے ٹیسٹ کروا سکتی ہیں۔ میں اپنا برتھ سرٹیفکیٹ اس لیے نہیں لائی کیونکہ اس پر میری ماں نے غلط نام لکھوایا تھا، شاید میرے باپ کے کہنے پر۔“

وہ جو سفید چہرہ لیے میز پر رکھی فائل کو دیکھ رہی تھیں، ایک دم آگے بڑھیں اور فائل اٹھائی، پھر وحشیانہ انداز میں صفحے پلٹنے لگیں۔ جیسے جیسے وہ پڑھتی جاتی تھیں ان کا رنگ سفید پڑتا جاتا تھا۔

”شہلا...... شہلا......“ کوئی سیڑھیوں سے اترتا ہوا انہیں پکار رہا تھا۔ وہ دونوں بیک وقت پلٹیں۔ قیمتی تھری پیس سوٹ میں ملبوس کلائی پر گھڑی باندھتے، جہانگیر شاہ سیڑھیاں اتر رہے تھے، وہ خاصے دراز قد اور ہینڈسم تھے، کنپٹیوں سے سفید ہوتے بال، قابلِ رشک صحت اور بڑی بڑی سیاہ

آنکھیں۔ شہلا نے کبھی ان آنکھوں کو اتنے غور سے نہیں دیکھا تھا جتنا وہ آج دیکھ رہی تھیں۔

”تم شام میں تیار رہنا، میں ڈرائیور......“ الفاظ ان کے لبوں پہ رہ گئے، وہ آخری سیڑھی پہ ٹھٹک کر رکے، ایک نظر منال کو دیکھا، اور پھر شہلا کو۔

”یہ کون ہے؟“ انہوں نے آنکھوں کی زبان میں پوچھا۔

”تمہاری کوئی ورکر تھی جس کی بچی کی ڈلیوری کا بل تم نے بھرا تھا؟“ وہ غصے سے بل کھاتی فائل ہاتھ میں لیے کھڑی ہوئیں۔

”کون؟“ جہانگیر شاہ کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔ منال نے پلٹ کر ان کو دیکھا اور بولی۔

”بلقیس مراد...... جو آپ کی فیکٹری میں کام کرتی تھیں، جو ایک مہینے قبل ٹی بی سے مر چکی ہیں۔“ وہ بری طرح چونکے۔

”بلقیس کی ڈیتھ ہو گئی؟“ الفاظ ان کے لبوں سے پھسلے، اور شہلا کو ان کے سارے جواب مل گئے۔ وہ آگے بڑھیں اور فائل ان کے سینے پر دے ماری۔

”ہاں بلقیس کی ڈیتھ ہو گئی ہے اور وہ تمہارے لیے تمہارے گناہوں کا ثبوت چھوڑ گئی ہے، بی بی جان کہتی تھیں تم سدھر گئے ہو، تم پارسا بن گئے ہو، مگر نہیں جہانگیر شاہ، تم کبھی سدھر ہی نہیں سکتے تھے۔“ وہ ایک دم چلانے لگیں۔

”کیا کہہ رہی ہو؟“ انہوں نے حیرت بھری ناگواری سے زمین پر گری فائل اٹھائی اور اسے کھولا۔

”ہاں میں نے بلقیس کا بل بھرا تھا، مگر اس میں کیا قباحت ہے؟ ہاں ٹھیک ہے یہ چیک بھی میں نے اس کو بھجوائے تھے مگر وہ ضرورت مند تھی۔“ وہ صفحے الٹاتے حیرت سے کہہ رہے تھے۔ شہلا نے تڑپ کر انہیں دیکھا۔

”وہ ضرورت مند اس لیے تھی کہ وہ تمہاری رکھیل تھی؟ اور یہ اس کی بیٹی منال تمہاری ناجائز اولاد۔“ ایک جھٹکے سے جہانگیر شاہ نے سر اٹھایا۔

”میری اولاد؟ کیا بکواس ہے یہ؟“ وہ اسے دیکھ کر گرجے، جو قدرے فاصلے پر کھڑی تھی۔

”میں اپنا نام اور مقام لینے آئی ہوں سر یا شاید مجھے آپ کو پاپا کہنا چاہیے جیسے آپ کے بچے کہتے ہوں گے۔“ وہ بولی تو اس کی آواز میں صدیوں کی تھکن تھی۔

”کیا بک رہی ہو؟ میں تمہیں جانتا تک نہیں ہوں۔“ انہوں نے فائل پوری قوت سے زمین پر دے ماری۔

”مگر تم بلقیس کو تو جانتے ہو جہانگیر...... تمہارے چہرے پر اس کا نام سن کر آنے والے تاثرات ہی مجھے سب سمجھا گئے ہیں، تم نے اچھا نہیں کیا جہانگیر! اتنا بڑا گناہ؟“

”شہلا...... شہلا میرا یقین کرو یہ لڑکی جھوٹ بول رہی ہے۔“ ان کا غصہ اب پریشانی میں ڈھلنے لگا تھا...... ”یہ میری جائداد کے پیچھے ہے، اسکینڈل بنا کر مجھے بلیک میل کرنا چاہتی ہے۔“

”مجھے آپ کی جائداد نہیں چاہیے۔“ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔ ”مجھے صرف آپ کا نام، آپ کا پیار چاہیے، آپ جانتے ہیں میں آپ کی بیٹی ہوں پھر آپ مجھے اپنا کیوں نہیں لیتے؟“

”بند کرو بکواس اور نکل جاؤ یہاں سے گارڈ، گارڈ غیاث!“ وہ غصے سے کانپتے نوکروں کو آوازیں دینے لگے تھے۔ منال نے گالوں پر لڑھکتے آنسو ہتھیلی کی پشت سے پونچھے، جھک کر زمین پر گری فائل اٹھائی، اور سر جھکائے دروازے کی سمت چل دی۔

”اگر آج کے بعد تم مجھے اس گھر میں دکھائی دیں تو میں تمہاری جان لے لوں گا، اتنا بڑا الزام لگاتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آئی؟ بلقیس پر کتنے احسان کیے میں نے اور تم مجھے یہ صلہ دے رہی ہو؟ ناؤ گیٹ لاسٹ۔“ وہ سر جھکائے، فائل سینے سے لگائے، ہاتھ بڑھا کر دروازہ کھولنے ہی لگی تھی۔

”رکو لڑکی!“ شہلا تیزی سے آگے بڑھیں۔

”جی؟“ ڈور ناب پر ہاتھ رکھے، منال نے پلٹ کر ڈبڈبائی آنکھوں سے دیکھا۔

”تم کہیں نہیں جاؤ گی، اگر تم اسی شخص کی بیٹی ہو تو یہیں رہو گی، جب تک فیصلہ نہ ہو جائے۔“

”شہلا! یہ لڑکی فراڈ ہے، تم کیا کر رہی ہو؟“

”میں نے کہا نا جہانگیر، یہ لڑکی تب تک اس گھر میں رہے گی جب تک یہ ثابت نہیں ہو جاتا کہ یہ تمہاری بیٹی ہے یا نہیں، تم اس طرف آؤ۔“ وہ آگے بڑھیں اور کلائی سے منال کو تھامے قریباً کھینچتے ہوئے راہداری کی طرف لے گئیں۔

جہانگیر شاہ غصے سے پیر پٹخ کر دروازے کی جانب بڑھ گئے۔ زندگی میں پہلی دفعہ انہیں یہ کوٹھی شہلا کے نام کر دینے پر پچھتاوا ہوا تھا۔ شدید پچھتاوا۔

☆☆☆

اس نے آہستہ سے ورق کا کنارہ موڑا، پھر قرآن مجید کو بند کیا، اور نرمی سے آنکھوں سے لگایا۔ دور درختوں پر چڑیاں بولنے لگی تھیں، اس سہانی صبح وہ برآمدے میں بچھے تخت پر بیٹھی تلاوت سے فارغ ہوئی تھی اور اب احتیاط سے قرآن پاک کو غلاف میں لپیٹ رہی تھی۔ سفید دوپٹے کے ہالے میں دمکتے اس کے چہرے پر عجیب چاشنی بکھری تھی۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں غلاف کی ڈوری پر جھکی تھیں جس کو اس کی نازک مومی انگلیاں باندھ رہی تھیں، ماتھے سے جھولتی بھوری گھنگھریالی لٹ گال سے ٹکرا رہی تھی۔

”مہر ماہ!“ ڈوری باندھتی اس کی انگلیاں تھمیں، اس نے آہستہ سے گردن موڑی۔ طویل برآمدے کے اس پار باغیچے کی گھاس پر رضا کھڑا تھا۔ مہر ماہ کا دل زور سے دھڑکا۔ ہر طرف بہار سی اتر آئی تھی، اس نے آہستہ سے غلاف میں لپٹے قرآن کو برآمدے کی دیوار میں بنے شیلف میں رکھا، اور دوپٹے کو پہلے سے زیادہ پھیلاتی اس کی طرف بڑھی۔

”السلام علیکم! کیسے ہیں آپ؟“ وہ برآمدے کے ستون کے ساتھ آ کھڑی ہوئی۔ رضا نیچے گھاس پر کھڑا تھا۔ سیاہ شلوار قمیص پہنے، کندھوں پر شال ڈالے، سنجیدہ وجیہ چہرہ، اور خوب صورت آنکھیں جو جہانگیر شاہ کے گھر کی عورتوں کو دیکھ کر خود بخود جھک جایا کرتی تھیں۔

”اللہ کا شکر ہے، آپ ٹھیک ہیں؟“ اس نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلا دیا۔ رضا کے سامنے وہ یونہی الفاظ کھونے لگتی تھی۔

”بی بی جان کدھر ہیں مہر ماہ؟“

”اندر ہیں۔ خیریت؟“ اسے وہ ذرا پریشان لگا تھا۔

”نہیں، خیریت نہیں ہے۔ آپ بی بی جان کو بلا دیں، مجھے ان سے ضروری بات کرنی ہے۔“

”آپ اندر آ جائیں۔“ اس نے راستہ چھوڑ دیا۔ وہ حد سے زیادہ تکلف اور احتیاط کا قائل تھا۔

جب بھی شہر سے آتا، گھنٹوں حویلی کے برآمدے میں کھڑا رہتا اور جب تک بلایا نہ جاتا، وہ اندر قدم رکھنے کا عادی نہ تھا لیکن اب کے وہ ایک طرف ہوئی تو وہ تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گیا۔

ایسی کیا ضروری بات ہے جو وہ فون پہ کرنے کے بجائے خود چلا آیا ہے؟ مہر ماہ کو ایک نئی پریشانی نے آن گھیرا۔ وہ لب کاٹتی ہوئی اس کے پیچھے ہولی۔

وہ بی بی جان کے کمرے کے باہر دروازے پہ دستک دے رہا تھا۔ مہر ماہ کی طرف اس کی پشت تھی۔

''آجاؤ مہر ماہ۔'' بند دروازے کے پیچھے سے آواز آئی۔

''میں ہوں، رضا۔''

''ارے رضا، آؤ آؤ۔'' رضا نے دروازہ دھکیلا۔ وہ چر رکی آواز کے ساتھ کھلتا چلا گیا۔

مہر ماہ کو اندر جانا مناسب نہیں لگا۔ وہ وہیں دیوار کی اوٹ میں کھڑی ہو گئی۔ اس کی سماعت ان دونوں کی گفتگو پہ مرکوز تھی۔

''کیسے آنا ہوا صبح ہی صبح، رضا؟'' دروازے کی درز سے اس نے دیکھا، وہ ادب سے ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''مجھے شہلا بی بی نے بھیجا ہے۔''

''خیریت؟'' بی بی جان کی آواز میں پریشانی در آئی۔

''بولو رضا!'' وہ کافی دیر خاموش رہا تو بی بی جان کو کہنا پڑا۔

''عجیب سی بات ہے بی بی جان۔''

''تم کہہ ڈالو۔''

''آج شہلا بی بی کے پاس ایک لڑکی آئی ہے، اپنا نام منال بتاتی ہے اور ...... اور کہتی ہے کہ وہ جہانگیر شاہ کی بیٹی ہے۔''

مہر ماہ نے بے اختیار سینے پر ہاتھ رکھا۔

''کیا کہہ رہے ہو رضا؟ کون ہے وہ؟ کون ہے اس کی ماں؟''

''وہ کہتی ہے اس کی ماں سے جہانگیر شاہ نے شادی نہیں کی تھی، مگر خرچہ پانی دیتے رہے ہیں۔''

''رضا!'' بی بی جان اتنے کرب سے چلائیں کہ در و دیوار ہل گئے۔

''جہانگیر کیا کہتا ہے؟'' بہت دیر بعد وہ بول پائی تھیں۔

''وہ انکار کر رہے ہیں۔''

''تو شہلا کیا چاہتی ہے؟''

''شہلا بی بی نے اسے گھر رکھ لیا ہے، اور وہ چاہتی ہیں کہ آپ آئیں اور کوئی فیصلہ ہو تاکہ اس لڑکی کو اس کا حق ملے اگر وہ سچی ہے تو اور اگر وہ جھوٹی ہے اسے سزا دی جائے۔'' وہ ان کے سامنے سر جھکائے بیٹھا تھا۔

''تم تو ڈاکٹر ہو رضا، تم تو جہانگیر کا پورا اسپتال سنبھالتے ہو، تم بتاؤ، کیا ایک ہی ٹیسٹ سے دودھ کا دودھ پانی کا پانی الگ نہیں ہو جائے گا؟'' ان کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''بالکل ہو جائے گا اور وہ لڑکی اس کے لیے تیار ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں اس معاملے کو خود دیکھتی ہوں۔ وہ کسی اور کا گناہ میرے بیٹے کے سر تھوپ رہی ہے، جہانگیر چھپ کر شادی تو کر سکتا ہے مگر ایسا گناہ نہیں۔ تم شہلا سے کہو وہ بے فکر رہے، مجھے یقین ہے جہانگیر بے قصور ہے۔''

''بہت بہتر!'' وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بی بی جان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔

''تم مجھ سے کچھ چھپا رہے ہو رضا؟''

''نہیں بی بی جان۔''

''تمہیں تب سے جانتی ہوں جب تم ایک سال کے تھے۔ جب رکھی نے مرتے وقت تمہیں میرے حوالے کیا تھا۔'' انہوں نے ایک پرانی مزارعن کا نام لیا۔ ''تب سے تم ہمارے پاس رہے ہو رضا، اب تم مجھ سے کچھ چھپا نہیں سکتے۔ بولو، کیا بات تمہیں پریشان کر رہی ہے۔''

''بی بی جان ...... آپ جانتی ہیں شہلا بی بی نے اس لڑکی کو گھر میں کیوں رکھ لیا ہے؟''

''جانتی ہوں، شہلا کو جہانگیر پر شک کرنے کی بری عادت ہے۔''

''نہیں بی بی جان۔'' اس نے تاسف سے نفی میں سر ہلایا تو وہ چونکیں۔

''پھر؟''

''اس کی آنکھیں ...... اس لڑکی کی آنکھیں بڑی بڑی اور سیاہ ہیں، وہ بہت شناسا لگتی ہیں۔'' وہ کہہ کر رکا نہیں اور تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

سینے پر ہاتھ رکھے، دیوار کا سہارا لیے کھڑی مہر ماہ پتھر ہو گئی تھی۔

☆☆☆

مس منال!'' بٹلر غیاث نے اس کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا، وہ جو اکڑوں بیٹھی، گھٹنوں پر سر رکھے ہوئے تھی، چونک کر سیدھی ہوئی۔

''کم اِن۔'' دروازہ آہستہ سے کھلا ...... سامنے باوردی بٹلر مودب سا کھڑا تھا۔

''میم آپ کو ڈائننگ ہال میں بلا رہی ہیں۔ ڈنر کا ٹائم ہو گیا ہے۔''

''ٹھیک ہے، میں آتی ہوں۔'' وہ آہستہ سے اٹھی، پیروں میں سلیپر ڈالے اور سنگھار میز کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اس کا سامان ڈرائیور کو بھیج کر شہلا جہانگیر نے صبح ہی منگوا لیا تھا جو اس نے ساتھ والی خالہ فیروزہ کے پاس رکھوایا ہوا تھا۔ اماں کے مرنے کے بعد جب مالک مکان نے گھر خالی کروایا تھا تو وہ خالہ فیروزہ کے پاس ہی رہتی رہی تھی۔

اس نے آئینے میں خود کو دیکھا، سادہ لان کا سوٹ، کندھوں تک کٹے بال اور صاف، شفاف سا چہرہ، وہ اس گھر کے مکینوں سے کتنی مختلف لگتی تھی۔ کیا وہ بھی اس کو قبول کر پائیں گے؟ سر جھٹک کر وہ آئینے کے سامنے سے ہٹی۔

ڈائننگ ہال کی چھت سے لٹکتے فانوس جگر جگر چمک رہے تھے۔ سارے میں ان کی روشنی پھیلی تھی۔ بڑی سی آبنوسی ڈائننگ ٹیبل کی سربراہی کرسی پر جہانگیر شاہ براجمان تھے۔ سادہ شلوار قمیص میں ملبوس، وہ چاولوں سے بھری پلیٹ پر رائتا ڈال رہے تھے۔ ان کے دائیں ہاتھ پہلی کرسی پر شہلا بیٹھی تھیں وہ پلیٹ میں چمچ چلاتی، جیسے بے چین سی بیٹھی تھیں۔ دوسری جانب ایک اٹھارہ انیس برس کی لڑکی بیٹھی کھانا کھا رہی تھی، جینز اور ٹاپ میں ملبوس، اس کے لمبے لمبے بالوں میں پنک، ریڈ اور گرین کلر کی ایکسٹینشن لگی تھیں۔ چند لٹوں کی پتلی پتلی چوٹیاں بھی بنائی ہوئی تھیں، کلائی میں پتھروں سے بھرے بہت سارے کڑے تھے۔ اس کے سیاہ ٹاپ کے اوپر بڑا سا ڈھانچہ بنا تھا جو سگریٹ پی رہا تھا، وہ یقیناً جہانگیر اور شہلا کی چھوٹی بیٹی سوہنی تھی۔ اس کے ساتھ اکیس بائیس برس کا لڑکا بیٹھا تھا۔ اس نے بھی بالوں کا اوٹ پٹانگ گھنگرالا سا اسٹائل بنا رکھا تھا۔ وہ جہانگیر کا اکلوتا بیٹا حسنین تھا۔ وہ جانتی تھی۔

''السلام علیکم!'' اس نے دھیمے سے لہجے میں سلام کیا تو سب چونک اٹھے۔

سوہنی حسنین کے چہرے پر حیرت بھری

الجھن ابھری۔ انہوں نے پہلے باپ کو دیکھا جو ناگواری سے منال کو دیکھ رہے تھے اور پھر ماں کو جو شاید بے چینی سے اسی کا انتظار کر رہی تھیں۔

''آؤ منال!'' انہوں نے اپنے ساتھ والی کرسی کھینچی تو وہ سر جھکائے اس پر بیٹھ گئی۔

''تم ابھی تک ادھر ہو؟'' جہانگیر شاہ نے دبے دبے غصے سے پلیٹ پرے دھکیلی۔

''یہ اب یہیں رہے گی، جب تک فیصلہ نہیں ہو جاتا۔''

''بٹ ہو اِز شی؟'' سوہنی نے ناپسندیدگی سے اس کو دیکھا۔

''تمہاری بہن!'' ساتھ ہی شہلا نے ایک شعلہ بار نگاہ جہانگیر پر ڈالی۔

''واٹ؟'' وہ دونوں شاکڈ رہ گئے۔

منال نے جھکا سر مزید جھکا لیا۔

''یہ سب بکواس ہے، یہ لڑکی فراڈ ہے، میں اس کو جانتا تک نہیں ہوں، میں کہتا ہوں نکل جاؤ تم یہاں سے۔''

''یہ کہیں نہیں جائے گی، اچھا ہے تمہاری اولاد کو بھی پتا چلے اپنے باپ کی عیاشیوں کا۔ سوہنی، سنی، یہ تمہارے باپ کی کسی پرانی محبوبہ کی ناجائز اولاد ہے، تمہاری بہن...... اس کی شکل بتا رہی ہے کہ یہ کون ہے، باقی ڈی این اے ٹیسٹ سے سب کلیئر ہو جائے گا۔''

''مائی فٹ!'' وہ تلملا کر اٹھے، پلیٹ زور سے اچھالی تو وہ شیشے کے جگ سے جا لگی۔ جگ لڑھکا اور سارا پانی نیچے بہہ گیا۔ وہ غصے سے بڑبڑاتے ہوئے باہر نکل گئے۔ سوہنی اور حسنین اجنبی نظروں سے منال کو دیکھ رہے تھے۔

''خیر تم لوگ کھانا کھاؤ، اور تم بھی کھاؤ منال۔'' مگر وہ دونوں اسی طرح ہاتھ چھوڑے بیٹھے رہے۔

''یہ ہماری بہن نہیں ہے مام۔'' حسنین نے کانٹا پلیٹ میں واپس رکھ دیا۔

''اور میری ایک ہی بہن ہے، مہر ماہ۔'' سوہنی نے اپنی پلیٹ پرے کھسکائی۔

''سوہنی ٹھیک کہہ رہی ہے مام، ہم مہر ماہ کے علاوہ کسی کو اپنی بہن نہیں مانتے۔'' منال نے ڈبڈبائی آنکھوں سے ان دونوں کو دیکھا اور پھر شہلا کو۔

''یہ بھی تمہاری ویسی ہی بہن ہے جیسے مہر ماہ ہے۔''

''نو وے مام...... مہر ماہ کی مدر سے پاپا نے شادی کی تھی، آپ سے بھی پہلے، وہی ان کی بیٹی ہے...... ہم اور کسی کو بہن نہیں مان سکتے۔'' حسنین کرسی دھکیلتا اٹھ کھڑا ہوا۔

''آپ ہمیشہ پاپا پہ شک کرتی رہی ہیں کہ کبھی نہ کبھی ان کی کوئی ناجائز اولاد نکل آئے گی، اسی لیے آپ اس کی بات مان رہی ہیں، ورنہ یہ ہمارے پاپا کی بیٹی کہیں سے نہیں لگتی......''

''اس کی آنکھیں دیکھو...... حسنین۔'' شہلا نے کہنا چاہا مگر وہ کچھ سننے کو تیار نہ تھا۔

''دنیا بھری پڑی ہے بڑی بلیک آئیز والی لڑکیوں سے مام...... فار گاڈ سیک، یوز یور برینز!'' وہ سر جھٹک کر باہر نکل گیا۔ سوہنی بھی ناک سکیڑتی اس کے پیچھے چلی گئی۔

''تم کھانا کھاؤ، اگر تم سچی ہو تو میں تمہیں تمہارا حق دلوا کر رہوں گی اور ان بچوں کی فکر مت کرنا...... سوہنی، حسنین اور مہر ماہ، ان تینوں کا آئیڈیل ان کا باپ ہے، تم کھانا شروع کرو۔'' وہ نخوت سے سر جھٹک کر کہہ رہی تھیں۔ منال نے آہستہ سے چاولوں

کی ڈش اپنے قریب کی، اور پلیٹ میں چاول نکالنے لگی۔ میز کے کنارے پر لڑھکے جگ سے پانی اسی طرح نیچے فرش پر گر رہا تھا۔

☆☆☆

''بی بی جان!'' اس نے ہولے سے دروازے پہ دستک دی، پھر اسے ذرا سا دھکیلا۔ وہ اپنے پلنگ پہ بیٹھی تھیں، دروازے کی جانب پشت تھی۔ سفید کڑھائی والے بڑے سے دوپٹے میں لپٹا ان کا معمر وجود مہر ماہ کو سوگوار لگا تھا۔ وہ رضا کے جانے کے بعد سے یونہی کمرے میں بند تھیں۔ کھانے کے لیے باہر بھی نہیں آئی تھیں اور جو ٹرے اس نے اندر بھجوائی تھی وہ یونہی ان چھوئی واپس آ گئی...... اس کا دل دکھا تھا۔

''کھانا لگ گیا ہے بی بی جان...... کچھ تو کھا لیں، آپ نے دوپہر میں بھی کچھ نہیں کھایا۔'' وہ فکرمندی سے کہتے ان کے قریب چلی آئی اور سامنے سے آ کر ان کا چہرہ دیکھا تو وہ واقعی بہت سوگوار لگ رہا تھا۔

''میں کھا لوں گی مہر ماہ، تم یہیں بھجوا دو۔''

''جیسے دوپہر میں آپ نے کھا لیا تھا، ہے نا؟''

''مجھے بھوک نہیں ہے بچے۔'' اسے لگا انہوں نے عینک کے پیچھے ضعیف آنکھوں میں اتر آنے والی نمی اندر اتاری ہے۔

''بی بی جان...... میری پیاری بی بی جان...... یا وہ جیسے سوہنی کہتی ہے، مائی ڈیئر گرینی...... ایسے اداس کیوں بیٹھی ہیں؟'' وہ پنجوں کے بل ان کے سامنے زمین پر آ بیٹھی اور ہاتھ ان کے گھٹنوں پہ رکھ دیے۔

''بس طبیعت ذرا سی خراب ہے۔''

''اور یہ رضا کے آنے کے بعد ہی ہوئی ہے نا۔'' انہوں نے چونک کر اسے دیکھا تو وہ رسان سے مسکرا دی۔

''مجھے دیواروں کی اوٹ سے باتیں سننے کی بری عادت ہے بی بی جان۔''

''تو نے سب سن لیا؟'' وہ جیسے پریشان ہوئیں۔

''سن بھی لیا تو کیا ہوا؟ مجھے یقین ہے بابا جان بے قصور ہیں، یہ ان کے خلاف کوئی سازش ہے۔''

''پر مجھے کیوں یقین نہیں ہے؟''

''کیونکہ رضا نے کہا تھا، اس کی آنکھیں بالکل بابا جان جیسی ہیں۔''

''اس کے بعد میں کیا یقین کروں مہری؟'' ان کی آنکھوں میں نمی در آئی۔

''یقین رکھیں بی بی جان، کیونکہ اس سے کچھ ثابت نہیں ہوتا، رضا نے تو شاید ہی کبھی بابا جان کی آنکھیں غور سے دیکھی ہوں، ہر وقت تو اپنے جوتوں کو دیکھتا رہتا ہے۔''

''ارے پگلی!'' وہ ہولے سے ہنس دیں۔ ''وہ تو بس عورتوں کے سامنے جھکائے رکھتا ہے ورنہ تمہارے بابا جان کے ساتھ تو وہ برسوں سے ہے۔ اس کی ماں جب اس کو حویلی میں چھوڑ کر مری تھی تو وہ سال بھر کا تھا اور اب اٹھائیس کا ہو گا۔ برسوں کا ساتھ ہے اس کا اور جہانگیر کا۔ اسپتال نہیں سنبھالتا، بلکہ زمینوں کے بھی بہت سے معاملات دیکھتا ہے۔ اس سے زیادہ جہانگیر کسی پہ بھروسا نہیں کرتا، آج تک اسے مزارع کی اولاد نہیں سمجھا، بلکہ بیٹوں کا سامان دیا ہے، بھلا وہ جہانگیر کی آنکھیں نہیں پہچانتا ہو گا؟''

''آپ سے بڑھ کر پھر بھی نہیں پہچان سکتا۔ جب تک آپ خود نہ دیکھ لیں، کوئی فیصلہ نہ کریں۔''

''اب کون سے فیصلے رہ گئے ہیں مہر ماہ!''

انہوں نے دوپٹے کے پلّو سے آنکھوں کے کنارے پونچھے۔ ”میرا برسوں کا مان خاک میں مل گیا، کتنے فخر سے میں شہلا کو یقین دلاتی تھی کہ وہ رخسار والا قصہ بس من گھڑت ہے مگر اس نے کبھی یقین نہیں کیا، اور اب تو وہ خود کو حق بجانب سمجھے گی اگر بات سچ ہوئی تو لوگ سمجھیں گے وہ رخسار والی بات بھی ٹھیک تھی۔“

مہر ماہ کو یاد تھا رخسار والا قصہ، وہ کئی دفعہ شہلا کی زبانی سن چکی تھی۔ اب بی بی جان نے پھر سے ذکر کیا تو شہلا کی آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

”تمہاری ماں فیروزہ کے چالیسویں پہ ہوا تھا یہ سب۔ رخسار فیروزہ کی ماموں زاد تھی۔ جہانگیر سے ہمیشہ سے شادی کی خواہش مند تھی۔ خیر چالیسویں کے روز جب حویلی مہمانوں سے بھری پڑی تھی، اوپر جہانگیر کے کمرے سے شور بلند ہوا۔ سب دوڑے دوڑے گئے تو رخسار بال بکھیرے، لباس پھاڑے چلاّ رہی تھی۔ اس نے جہانگیر پر دست درازی کا الزام لگایا تھا۔ اس وقت تو جہانگیر غیظ وغضب دکھا کر کہ یہ خود اس کے کمرے میں گھس کر اسے پھنسانے کے لیے ڈراما کر رہی ہے، معاملہ رفع دفع کر دیا۔ مگر بعد میں خوب خوب باتیں بنیں پھر فیروزہ کے انتقال کے سال بھر بعد جب تم ڈیڑھ برس کی تھیں، جہانگیر نے مجھ سے شادی کی تو میں نے چند ملازموں کی زبانی یہ قصہ سنا۔ بی بی جان تو تب سے یہی کہتی آئی ہیں کہ رخسار نے یہ سب ڈراما اس لیے کیا کہ شرمندگی کے مارے جہانگیر سے اس کی شادی کرادی جائے گی مگر مجھے سیریسلی ابھی تک یقین نہیں آیا۔“

”اب شہلا سے کیسے نگاہ ملا پاؤں گی میں؟“ بی بی جان کی آواز پہ وہ چونکی پھر ہولے سے سر جھٹکا، سفید دوپٹا اس کے نرم بھورے بالوں سے پھسل کر شانے پہ آ گرا تھا۔

”آپ بابا جان پہ بھروسا رکھیں، کسی اجنبی کی بات پہ اپنے بیٹے کو کٹہرے میں نہ کھڑا کریں۔ سب معاملہ صاف ہو جائے گا۔ آپ بے فکر ہو کر شہر جائیں ...... پیچھے حویلی میں، میں کافی ہوں۔“

”وہ تو میں جانتی ہوں۔“ وہ نم آنکھوں سے مسکرائیں۔ ”اللہ تیرے نصیب اچھے کرے، اللہ تیرا بہترین جوڑ بنائے......“ اس کے سر پہ ہاتھ پھیر کر انہوں نے دعا دے ڈالی۔ مہر ماہ کی نگاہیں جھک گئیں، اس نے دھیرے سے شانے پہ ڈھلکا آنچل اٹھا کر سر پر رکھا۔ بی بی جان کی دعا پہ نہ جانے کدھر سے اس کی آنکھوں میں رضا کا عکس لہرایا تھا۔

☆☆☆

میوزک کا بے ہنگم شور سوہنی کے کمرے سے بلند ہو رہا تھا۔ جے لو کا کوئی نمبر پورے والیوم سے اندر بج رہا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا مگر آواز گویا سارے گھر میں گونج رہی تھی۔ سیڑھیوں سے اتر کر حسنین نے رک کر بند دروازے کو دیکھا، پھر آگے بڑھ کر زور سے دروازہ بجایا۔

”سوہنی...... بند کرو یہ شور!“ دروازہ ہنوز بند رہا اور موسیقی بلند۔

”ہوہنی...... مجھے تم سے بات کرنی ہے...... گاڈ سیک، پہلے اس کو تو بند کرو۔“ اب اس نے خاصے زور سے دروازہ پیٹ ڈالا تو اندر سے آواز ذرا ہلکی کی گئی پھر کھٹاک سے دروازہ کھلا۔

”کیا ہے؟“ وہ دروازے کا ہینڈل پکڑے کھڑی تھی۔ جینز پہ سلیولیس ٹاپ پہنے جس پر کوئی اوٹ پٹانگ سی تصویر بنی تھی، گردن اور کلائیوں کے گرد پتھروں کی مالائیں لپیٹے، لمبے بالوں میں اسی طرح چٹیا اور ایکسٹینشنز لگائے، وہ سوالیہ نگاہوں سے

اسے دیکھ رہی تھی۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے، بٹ فرسٹ اس کو بند کرو۔“ حسنین جھنجلا کر آگے بڑھا اور اسٹیریو بند کیا۔ کمرے میں ایک دم سکون سا چھا گیا۔

”اب اِدھر آ کر بیٹھو۔“ اس نے دروازہ بند کیا پھر ہاتھ سے پکڑ کر سوہنی کو کارپٹ پہ رکھے کشن پر بٹھایا اور دوسرا کشن کھینچ کر سامنے خود بیٹھا۔

”مگر کیا بات ہے؟“

”تمہیں لگتا ہے کوئی بات نہیں ہے؟ دو دن سے وہ ہمارے گھر میں رہ رہی ہے اور ہم یوں ہیلپ لیس سے بنے بیٹھے ہیں؟“

”تو کیا ہاتھ سے پکڑ کر نکال باہر کریں؟ یو نو واٹ سنی، میں یہ بھی کرنے کو تیار ہوں۔ آئی رئیلی ڈونٹ وانٹ این ادر سسٹر!“ اس نے اپنی چھوٹی سی ناک سکیڑی۔

”ممی ایسے نہیں کرنے دیں گی، ہمیں اس کا کوئی دوسرا اسلوشن نکالنا پڑے گا۔“

”اور وہ کیا؟“

”ہم ڈسکس کر کے کسی نتیجے پر پہنچ سکتے ہیں۔“ چند لمحے کے لیے خاموشی چھا گئی، پھر سوہنی سوچتے ہوئے بولی۔

”سنی، تمہیں لگتا ہے کہ وہ ہمارے ڈیڈ کی بیٹی ہے؟“

”وہ جتنی کانفیڈینٹلی اپنی ڈی این اے رپورٹ لے آئی ہے، اس سے تو ہوسکتا ہے کہ وہ واقعی پاپا کی بیٹی ہو۔“

”سنی!“ سوہنی نے حیرت سے پلکیں جھپکائیں۔ ”تمہیں پاپا پہ ذرا بھی ٹرسٹ نہیں ہے؟“

”ہے مگر...... اوکے دیکھو سوہنی، اگر وہ پاپا کی بیٹی ہے بھی تو اس سے میرے دل میں موجود پاپا کی محبت اور رسپیکٹ بالکل بھی کم نہیں ہوگی اور تب بھی میں اسے یہ ثابت نہیں کرنے دوں گا کہ وہ واقعی ان کی بیٹی ہے۔ فار گاڈ سیک کتنا اسکینڈل بنے گا، میڈیا میں آ جائے گا، میں اپنے فرینڈز کو کیسے فیس کروں گا۔“

”مگر میں نہیں مانتی کہ وہ ان کی بیٹی ہے، وہ ان کی طرح بالکل نہیں لگتی۔“

”خیر سوہنی، تم اور مہر ماہ بھی پاپا کی طرح نہیں لگتے، مہر ماہ اپنی امی پہ گئی ہے اور تم بالکل ممی کی کاپی ہو۔ شکل سے کچھ پروو نہیں ہوتا۔“

”ایک منٹ، تم پہلے یہ کلیئر کرو کہ تم پاپا کی سائڈ ہو یا منال کی؟“

”میں صرف اپنی اور تمہاری سائڈ پہ ہوں، پاپا نے اپنی لائف گزار لی ہے اور رہیں ممی ...... تو ممی ہمیشہ سے پاپا کا کوئی افیئر پکڑنا چاہتی تھیں۔ وہ منال کی اتنی کیئر اس لیے نہیں کر رہی ہیں کہ وہ پاپا کی بیٹی ہے بلکہ اس لیے کہ وہ ان کے ہاتھ میں ایک سولڈ پروف ہے جس کے ذریعے وہ اپنی ایگو کو سیٹسفائی کر سکتی ہیں۔ پیچھے رہ گئے میں اور تم اگر یہ اسکینڈل پریس یا میڈیا تک پہنچ گیا تو ممی پاپا کو فرق نہیں پڑے گا، بلکہ صرف ہم دونوں کو پڑے گا، ہم لوگوں کو فیس کیسے کریں گے؟“

”اور گرینی؟ واٹ اباؤٹ ہر؟“ سوہنی نے ابرو اٹھائی۔

”گرینی سے مجھے کوئی امید نہیں ہے، وہ انصاف کرنا چاہیں گی اور آئی ایم شیور کہ اگر منال ہماری بہن پروو ہو گئی تو وہ سب سے پہلے اسے قبول کریں گی۔“

”پھر ہم کیا کریں سنی؟“ وہ مایوسی سے چہرے کے اطراف میں جھولتی پتلی سی چٹیا کو انگلی سے لپیٹ

رہی تھی۔

''ہم اس کو اتنا روڈ بی ہیویئر دیتے ہیں، اس کی بات بات پر اتنی انسلٹ کرتے ہیں کہ وہ خود ہی بددل ہو کر یہاں سے چلی جائے۔''

''تمہیں نہیں لگتا کہ وہ اس سب کے لیے خود کو مینٹلی ریڈی کر کے آئی ہوگی؟''

''کوشش تو کرتے ہیں، اس کے علاوہ ہم کیا کر سکتے ہیں؟''

''اور مہر ماہ؟ وہ بھی کچھ نہیں کر سکتی کیا؟''

''وہ کیا کر سکے گی؟'' وہ الٹا حیران ہوا۔

''اس کے پاس ہر مسئلے کا حل ہوتا ہے سنی، بچپن سے اب تک جب بھی ہمیں کوئی پرابلم ہوتی ہے، ہم بالکل پھنس چکے ہوتے ہیں، ہم اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ ہمیشہ ہماری ہر پرابلم ایک اسمائل کے ساتھ ٹھیک کر دیتی ہے۔''

''آئی ہوپ کہ اب بھی وہ سب ٹھیک کر دے۔'' حسنین نے سر ہاتھوں میں گرالیا۔ سونی اسی طرح سوچتے ہوئے چوٹی کو انگلی پہ لپیٹ رہی تھی۔

☆☆☆

راہداری ویران پڑی تھی، مہر ماہ کسی سوچ میں گم دوسری جانب سے چلتی آرہی تھی۔ دور بی بی جان کے کمرے سے آوازیں آرہی تھیں وہ یقیناً بانو سے اپنا سامان پیک کروا رہی تھیں، جب بھی انہیں شہر جانا ہوتا، ملازموں کی یونہی شامت آئی رہتی۔ وہ راہداری کے وسط میں آرکی، ساتھ ہی اونچا سا ٹیلی فون اسٹینڈ پڑا تھا۔ اس نے ایک سوچ میں ڈوبی نگاہ ٹیلی فون پر ڈالی، پھر آہستہ سے اپنی نازک انگلیوں سے ریسیور اٹھایا۔ کوٹھی کا نمبر اسے زبانی یاد تھا۔ ریسیور کان سے لگائے، وہ نگاہیں جھکائے، شہادت کی انگلی سے ایک ایک بٹن پریس کرنے لگی۔ دوسری جانب گھنٹی بجنے لگی تھی۔ وہ گہری سانس لیتی انتظار کرنے لگی۔

''ہیلو؟''

''السلام علیکم غیاث بھائی؟'' وہ آواز پہچان گئی تھی۔

''وعلیکم السلام، مہر ماہ میڈم!'' وہ شاید آواز نہیں پہچانا تھا، بس احترام سے بھرا انداز پہچانا تھا جس میں صرف وہ نرمی سے بولنے والی لڑکی اسے پکارا کرتی تھی۔

''جی میں گاؤں سے مہر ماہ بول رہی ہوں، حسنین گھر پر ہوگا؟''

''ایک منٹ، میں کال ملاتا ہوں۔'' لائن میں ہولڈ کا میوزک بجنے لگا پھر حسنین کی آواز ابھری۔

''ہیئے، مہر ماہ...... کیسی ہو؟''

''میں ٹھیک ہوں حسنین، تم ٹھیک ہو؟'' وہ نرمی سے مسکرائی۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں، بلکہ نہیں ہوں۔'' اس کی آواز میں اداسی در آئی۔

''پریشان لگ رہے ہو۔''

''تم جانتی ہو گھر میں کیا ہو رہا ہے؟''

''ہاں کچھ سنا تو ہے پر اتنی چھوٹی سی بات پہ اتنے پریشان کیوں ہو؟''

''یہ چھوٹی سی بات ہے مہر ماہ؟''

''یہ تو ایک دو دن میں حل ہو جانے والی بات ہے، بی بی جان آرہی ہیں نا، سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس نے اپنے ازلی نرم انداز میں تسلی دی۔

''گرینی آرہی ہیں؟ کب؟''

''کل صبح چلیں گی یہاں سے' پانچ گھنٹے کا تو

سفر ہے۔"

"مگر وہ کیا کریں گی؟ مجھے لگتا ہے وہ الٹا اس لڑکی کی حمایت ہی کریں گی۔"

"بری بات حسنین، لوگوں کے بارے میں برا گمان نہیں کرتے، تم کیوں فکر کرتے ہو؟ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

"مگر کتنا بڑا اسکینڈل بن سکتا ہے، کین یو امیجن؟"

"کچھ نہیں ہوگا، تم بے فکر رہو۔"

"تم...... تم اتنی پُرسکون کیسے رہتی ہو مہر ماہ؟ یہاں گھر کا ماحول اتنا ڈپریسڈ بنا ہوا ہے، اور تم ہمیشہ کی طرح اتنی کام (پُرسکون) ہو؟"

"کیونکہ میں اللہ پر بھروسا رکھتی ہوں حسنین، اللہ ہمیں کبھی رسوا نہیں کرے گا، تم بھی یقین رکھو، سوہنی بیٹھی ہے؟"

"وہ فرینڈز کے ساتھ ہینگ آؤٹ کر رہی ہوگی، ابھی گھر میں تو نہیں ہے۔"

"چلو اس سے پھر بات ہو جائے گی، میں فون رکھ رہی ہوں۔"

"اوکے اپنا خیال رکھنا۔" اس نے آہستہ سے ریسور کریڈل پہ رکھ دیا۔ بی بی جان کے کمرے سے ابھی تک آوازیں آ رہی تھیں، وہ دوپٹا ماتھے سے آگے سرکاتی اس طرف چل دی۔

☆☆☆

وہ کارپٹ پہ اکڑوں بیٹھی، گھٹنوں پر ٹھوڑی رکھے ہوئے تھی، کندھوں پہ گرتے سیاہ بالوں کو ڈھیلے سے کیچر میں باندھ رکھا تھا۔ چہرے پہ سوچ کی گہری پرچھائیں تھی۔ ایک دم دروازہ بنا دستک کے کھلا، اور شہلا کا سراپا دکھائی دیا، خوشبو کا ایک جھونکا اندر آیا تھا۔

"منال......!"

"جی......" اس نے تیزی سے سر اٹھایا پھر خود بھی کھڑی ہوگئی۔

"میں ایک ڈنر پر جا رہی ہوں، رات دیر سے واپسی ہوگی، تم کھانا سب کے ساتھ ڈائننگ روم میں ہی کھانا، اوکے؟" قیمتی ساڑی میں ملبوس، نک سک سے تیار وہ بہ عجلت ہدایات دے رہی تھیں۔

"اوکے۔" اس نے ہولے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"میم!" شہلا جانے کے لیے پلٹیں تو وہ پکار اٹھی۔ وہ رکیں پھر ناگواری سے گردن موڑی۔

"بولو۔" انہیں واضح طور پر اپنا روکا جانا پسند نہیں آیا تھا۔

"آپ کو میرا یقین ہے؟" اس کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں۔

"میرے پاس یہ ڈسکس کرنے کا لیے ٹائم نہیں ہے، فار گاڈ سیک۔" وہ سر جھٹک کر ٹھک ٹھک چلتی دور ہوگئیں۔

ان کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ اپنے کمرے سے نکلی۔ طویل راہداری میں جگہ جگہ بتیاں چمک رہی تھیں، وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی، اِدھر اُدھر دیکھتی آگے بڑھنے لگی۔ ایک دروازے کے آگے پردہ گرا تھا، اس نے وہ جالی دار نفیس سا پردہ ہاتھ میں لے کر ایک طرف سرکایا تو سامنے ڈرائنگ روم آگیا۔ پُرتعیش، بڑا سا ڈرائنگ روم، دیوار پہ اونچی کھڑکیاں، نرم قالین، چھت سے لٹکتے فانوس، وہ ایک طلسم ہوشربا کے اندر تھی۔ کسی معمول کی سی کیفیت میں وہ آگے بڑھی۔ سینٹر ٹیبل کے وسط میں کرسٹل کا ایک ڈیکوریشن پیس رکھا ہوا تھا، سفید کانچ کی گڑیا جو رقص کر رہی تھی۔ بیلرینا۔ اس نے احتیاط

سے بیلرینا اٹھائی اور چہرے کے سامنے لائی۔ وہ کانچ کچھ اس مہارت سے تراشا ہوا تھا کہ ہر زاویے سے روشنیاں پھوٹ رہی تھیں۔

"کیا کر رہی ہو تم اِدھر؟" کوئی دروازے کے قریب زور سے چلایا تھا۔ گھبرا کر اس کے ہاتھ سے گڑیا چھوٹ گئی۔ ایک زوردار چھناکا ہوا اور شیشے کی سینٹر ٹیبل سے ٹکرا کر کانچ ہر سو بکھر گئے۔

"یو ایڈیٹ! بچ!" سوہنی وحشیانہ انداز میں آگے بڑھی اور زور سے اس کے چہرے پر تھپڑ مارا۔ گال پر ہاتھ رکھے وہ دو قدم پیچھے کو لڑھکی۔

"تم نے میری بیلرینا توڑ دی، مائی گاڈ، تم نے میری بیلرینا توڑ دی۔ تمہاری ہمت کیسے ہوئی اس کو چھونے کی؟" کانچ کے ٹکڑے میز پر بکھرے ہوئے تھے اور سوہنی غصے سے پاگل ہو رہی تھی۔

"نہیں، آئی ایم سوری، میں غلطی سے......" وہ گال پر ہاتھ رکھے قدم قدم پیچھے ہو رہی تھی۔

"آئی وِل کِل یو، تم...... تمہاری اتنی ہمت کہ تم ہمارے گھر میں گھومو پھرو۔" وہ ٹوٹی گڑیا کو دیکھ کر پاگل ہوتی دوبارہ اس کی طرف بڑھی کہ کسی نے دونوں کلائیوں سے اسے پکڑ کر روکا۔ وہ تیورا کر گھومی۔ پیچھے رضا کھڑا تھا۔

"رضا بھائی...... اس نے میری......"

"ششش...... سوہنی...... بچے...... آرام سے...... آرام سے...... بیلرینا اور آ جائے گی، اس طرح اس کو مارو تو نہیں۔" اس نے رسان سے سمجھاتے ہوئے اسے کلائیوں سے پکڑے صوفے پر بٹھایا پھر پلٹ کر منال کو دیکھا جو چہرے پر ہاتھ رکھے بھیگی خوفزدہ آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"بی بی اگر شہلا بی بی کی مہربانی سے آپ اس گھر میں داخل ہو ہی گئی ہیں تو براہِ کرم خود کو اپنے کمرے تک محدود رکھیں، یوں گھر میں گھومنے پھرنے کا آپ کو قطعاً کوئی حق نہیں ہے۔" سوہنی کے سامنے زمین پہ پنجوں کے بل بیٹھے وہ گردن موڑے سرد لہجے میں اس سے مخاطب تھا۔

"مگر...... میڈم نے کہا تھا کہ مجھے سب کے ساتھ کھانا...... میں...... غلطی سے مجھ سے گڑیا گری...... میں......"

"آپ کو علم ہونا چاہیے کہ جو گڑیا آپ نے توڑی ہے وہ سوہنی بی بی کی پانچویں سالگرہ پہ ان کو ان کے والد نے انگلینڈ سے لا کر دی تھی اور اس کی قیمت پانچ لاکھ سے کم آج بھی نہیں تھی۔" سوہنی، رضا کی ڈھارس ملنے سے ذرا سنبھلی تھی، مگر منال کو دیکھتی آنکھوں سے ابھی تک شرارے پھوٹ رہے تھے۔

"اس کو قیمت کا مت بتائیں رضا بھائی، اس کچی آبادی میں رہنے والی لڑکی نے کبھی پانچ لاکھ خواب میں بھی نہیں دیکھے ہوں گے۔"

"ہاں، ہاں، نہیں دیکھے میں نے پانچ لاکھ۔" وہ گال سے ہاتھ ہٹا کر گھٹی گھٹی سی چلائی۔ "اور میں دیکھ بھی کیسے سکتی تھی پانچ لاکھ؟ میرا باپ تو مجھے اس کچی آبادی میں ہی چھوڑ کر بھول گیا تھا۔ جانتی ہو سوہنیا بی بی، ہمارے گھر کی چھت برسات میں ٹپکتی تھی، جب بارش ہوتی تو میں اور ماں سردی میں پڑی بھیگتی رہتیں، اور پھر کئی دن بخار میں پھنکتی رہتیں مگر ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں تھا کیونکہ میرا باپ اس وقت انگلینڈ میں اپنی جائز اولاد کے لیے لاکھوں کے تحفے خرید رہا تھا۔ میں نے پانچ لاکھ روپے کبھی نہیں دیکھے مگر میں نے بھوک دیکھی ہے، بیماری، غربت اور خوف دیکھا ہے، میں نے اپنی ماں کو خون کھانستے کھانستے مرتے دیکھا ہے مگر...... مگر میرے باپ نے کبھی اکٹھے پانچ لاکھ ہمارے ہاتھ پر نہیں

رکھے۔'' سونی اور رضا گویا شاکڈ سے اسے دیکھ رہے تھے جو دیوار کے ساتھ لگی کھڑی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے رخساروں پر لڑھک رہے تھے جہاں سونی کے تھپڑ کا نشان ابھی تک موجود تھا۔ پھر ایک دم وہ تیزی سے آگے بڑھی اور ان کے سامنے سے گزرتی باہر نکل گئی۔ سونی یک ٹک میز پر بکھرے کانچ کو دیکھ رہی تھی مگر رضا نے پلٹ کر اسے جاتے ضرور دیکھا تھا۔

☆☆☆

بانو اور کمدار سامان کے بیگ اور شاپرز پیراڈو میں رکھ رہے تھے۔ ڈرائیور مودب سا دروازہ کھولے ایک طرف کھڑا تھا مگر بی بی جان ابھی اندر نہیں بیٹھی تھیں۔ وہ باہر برآمدے کے ستون کے ساتھ مہر ماہ کے ساتھ کھڑی تھیں۔

''میں پیچھے سے سنبھال لوں گی بی بی جان، آپ بے فکر ہو کر جائیے۔'' سفید دوپٹے کے ہالے میں اس کے دمکتے چہرے پر وہی ازلی نرم سی مسکراہٹ بکھری تھی۔ وہ عموماً سفید رنگ پہنا کرتی تھی۔ لمبی قمیص اور نیچے پاجاما یا شلوار۔

''تمہاری وجہ سے تو بے فکری رہتی ہے مہر ماہ، ورنہ میں حویلی چھوڑ کر کب جایا کرتی ہوں، میرے ہوتے ہوئے بھی تو تُو ہی کرتی ہے سب۔'' وہ بہت سوگوار سی تھیں۔ لرزتے ہاتھوں میں پکڑی تسبیح کے دانے مسلسل گراتی، بہت کرب بھرے مان سے کہہ رہی تھیں۔

''آپ اللہ کا نام لے کر جائیں۔ مجھے یقین ہے یہ بابا جان کے خلاف کوئی سازش ہے۔ اللہ ہمیں رسوا نہیں کرے گا۔'' اس نے ان کے نخ ہوتے، بوڑھے ہاتھ تھام لیے۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' وہ اس کے ہاتھ پکڑے، دھیرے دھیرے گاڑی کی طرف قدم بڑھانے لگیں۔

''آپ اتنی بے یقین کیوں ہیں بی بی جان؟ میں تو بے یقین نہیں ہوں۔''

''تُو تو ہمیشہ ہی پُر یقین رہتی ہے، تیرے جیسی امید اور توکل میں اب کہاں سے لاؤں؟'' وہ ان کو سہارا دے کر گاڑی میں بٹھانے لگی تھی۔

''آپ اللہ سے توکل مانگیں، وہ آپ کو دے گا۔ آپ اس سے یقین مانگیں وہ آپ کو وہ بھی دے گا۔''

''تو میرے لیے، جہانگیر کے لیے، سب کے لیے دعا کرنا مہر ماہ۔'' وہ اندر بیٹھ چکی تھیں، مہر ماہ ان کے کھلے دروازے کے ساتھ کھڑی تھی۔

''میں تو ہمیشہ دعا کرتی ہوں، بس آپ بے فکر ہو کر جائیں۔''

''پیچھے حویلی تیرے ذمّے ہے، میرے بعد بھی تو تُو نے ہی حویلی اور گاؤں کے معاملات سنبھالنے ہیں۔ جہانگیر تو دو تین ماہ بعد ہی ادھر آپاتا ہے۔ میرے بعد تو ہی وادی کی سردارنی ہوگی مہر ماہ۔''

''اتنا آگے کی فکر نہ کریں، اللہ بہتر کرے گا۔'' اس نے نرم مسکراہٹ کے ساتھ دروازہ بند کیا۔ بند شیشے کے اس پار بی بی جان کا ضعیف، مضمحل چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ ڈرائیور گاڑی ریورس کرنے لگا تھا۔ پہیے پیچھے کو جانے لگے، دھول کا ایک غبار اٹھا، اس کے پیچھے کہیں بی بی جان کا چہرہ گم ہو گیا۔ گاڑی باہر نکل گئی۔ آہستہ آہستہ گرد چھٹنے لگی۔ مہر ماہ ستون سے ٹیک لگائے سوچتی نگاہوں سے کھلے گیٹ کو دیکھے گئی۔

☆☆☆

''کیوں سب مجرموں کی طرح مجھ سے آ آ کر

صفائیاں مانگتے ہیں؟ شہلا کا تو قصہ ہی الگ ہے مگر آپ...... بی بی جان آپ تو میرا یقین کر لیتیں۔'' ان کے سامنے صوفے پر بیٹھے جہانگیر بالکل ٹوٹے پھوٹے لگ رہے تھے۔ ان کی نگاہوں میں بے حد شکوے تھے۔

''اگر یہی بات ہے تو وہ لڑکی کیوں اتنے کانفیڈنس سے ڈی این اے ٹیسٹ کی بات کر رہی ہے؟ بی بی جان، میں صرف شک کے باعث یہ سب نہیں کہہ رہی، کہیں نہ کہیں دال میں کچھ کالا تو ہے۔'' سامنے والے صوفے پر ٹانگ پہ ٹانگ رکھے بیٹھی شہلا جہانگیر تڑپ کر بولی تھیں...... جواباً جہانگیر نے ایک شعلہ بار نگاہ ان پر ڈالی۔

''میرا باپ بھی نہیں کرائے گا ڈی این اے ٹیسٹ۔''

''دیکھا...... دیکھا بی بی جان...... اگر یہ اتنا ہی پارسا ہے تو ٹیسٹ کیوں نہیں کروا لیتا؟'' وہ چمک کر بولیں۔ بات بی بی جان کے دل کو لگی۔ انہوں نے رخ جہانگیر کی طرف کیا۔

''تم کیوں نہیں کراتے ٹیسٹ بیٹا؟''

''بات ٹیسٹ کی نہیں ہے بی بی جان، آپ لوگوں کو مجھ پر اتنا تو یقین ہونا چاہیے تھا کہ یوں غیروں کی باتوں میں آ کر مجھ پر شک نہ کرتے۔ کیا کوئی بھی منہ اٹھا کر چلا آئے، مجھے اپنا باپ بتائے، تو میں صفائیاں دیتا ٹیسٹ کراتا پھروں گا؟ مائی فٹ۔'' شہلا نے محض ایک جتاتی نظر ان پر ڈالی، اور ہولے سے سر جھٹکا۔

''مگر جہانگیر، کسی نہ کسی طرح اس سارے معاملے کا فیصلہ تو ہونا ہے۔ اگر یہی واحد راستہ ہے تو ایسا کر لینے میں کیا برائی ہے؟''

''آپ سمجھتی کیوں نہیں ہیں بی بی جان، اگر بات باہر نکل گئی تو میرا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ کتنی بدنامی ہوگی۔''

''یہ تو تمہیں اس بلقیس سے بدکاری کرنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا۔ شہلا زیادہ دیر چپ نہ رہ سکیں۔

''اوہ یو شٹ اپ!'' وہ دہاڑے تھے۔

''شہلا یہ لڑائی کا وقت نہیں ہے۔'' بی بی جان نے خفگی سے انہیں دیکھا۔ ''جاؤ اس لڑکی کو ادھر بلاؤ، اور رضا کو بھی۔''

''رضا کو بھی؟'' شہلا کو ذرا حیرت ہوئی، پھر سر جھٹک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ رضا کے ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا تھا۔ وہ برسوں سے ان کا وفادار ملازم تھا۔ اب نہ صرف جہانگیر کا اسپتال سنبھالتا تھا بلکہ رہتا بھی کوٹھی کے ایک بیرونی کمرے میں ہی تھا۔

''آپ نے رضا کو کیوں بلوایا ہے؟'' شہلا کے جانے کے بعد وہ ذرا حیرت سے بی بی جان کی جانب مڑے۔

''وہ ہمارا راز دار ہے جہانگیر، اگر وہ تمہارا ٹیسٹ کرے یا کروائے تو بات کبھی باہر نہیں نکلے گی۔ بولو، اب بھی تمہیں کوئی اعتراض ہے؟'' انہوں نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے پھر بھینچ لیے البتہ چہرے پر ناگواری بکھر گئی تھی۔ ہیل کی ٹک ٹک کی آواز آئی تو بی بی جان نے دیکھا۔ شہلا واپس آ رہی تھیں۔ ان کے پیچھے ایک لڑکی تھی۔ سادہ سے لباس میں ملبوس، شفاف چہرہ اور بڑی بڑی آنکھیں...... وہ ڈری سہمی یا گھبرائی ہوئی نہیں لگتی تھی بلکہ اس کے چہرے پر خاصا اعتماد تھا۔ انہوں نے اس کی بڑی بڑی آنکھوں کو غور سے دیکھا۔ وہ بڑی تھیں، سیاہ بھی تھیں، مگر وہ جہانگیر کی آنکھوں جیسی نہیں تھیں۔ مہر ماہ ٹھیک کہتی تھی۔ اس دنیا میں بہت سی لڑکیوں کی بڑی

بڑی سیاہ آنکھیں ہوں گی، کیا اس سے وہ سب باباجان کی بیٹیاں بن جاتی ہیں۔

''بیٹھولڑکی۔'' انہوں نے رعب دار مگر روکھے انداز میں مقابل صوفے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ خاموشی سے صوفے پر آبیٹھی اور اب جیسے منتظر نگاہوں سے بی بی جان کو دیکھ رہی تھی۔ وہ واقعی جہانگیر کی آنکھیں نہیں تھیں۔

''تم جانتی ہو ہمارے قانون میں اس طرح کے بہتان کی سزا کیا ہے؟''

''جانتی ہوں۔''

''پھر بھی تم نے میرے بیٹے پہ بہتان لگایا؟''

''آپ اپنی وادی کی سردارنی ہیں، اور آپ کی وادی علاقہ غیر میں ہے، آپ کا وہاں اپنا قانون ہے، آپ روز بیسیوں مقدمے نبٹاتی ہیں، آپ میری آنکھوں میں دیکھیں اور بتائیں، کیا بہتان باندھنے والوں کے چہرے اتنے پُرسکون ہوتے ہیں۔'' لمحے بھر کو ڈرائنگ روم میں خاموشی چھا گئی، رضا بہت آہستہ سے منال کے صوفے کی پشت پر آکھڑا ہوا تھا مگر ابھی کوئی اس کی طرف متوجہ نہ تھا۔

''میں اِدھر تمہاری باتیں سننے نہیں آئی لڑکی۔'' انہوں نے ناگواری سے ٹوکا مگر لہجہ کمزور تھا۔

''میں جانتی ہوں کہ آپ فیصلہ کرنے آئی ہیں، تو کیجیے بی بی جان، میں تیار ہوں۔''

''فیصلے کے لیے یا سزا کے لیے؟''

''دونوں میں سے اسی کے لیے جس میں انصاف ہو، اگر مجھے جہانگیر شاہ کی دولت چاہیے ہوتی تو میں عدالت میں جاتی مگر مجھے عزت چاہیے، نام اور پیار چاہیے۔ اسی لیے آپ کے گھر آئی ہوں، مجھے آپ سے عدل کی امید ہے بی بی جان، عدل کیجیے، یہ بُھلا کر کہ میرا باپ آپ کا بیٹا ہے، عدل کیجیے۔''

''مائی فٹ، میں تمہارا باپ نہیں ہوں۔'' جہانگیر تلملائے۔

''تو ثابت کیجیے، ٹیسٹ کروائیے، میں تیار ہوں، ہر ٹیسٹ، ہر امتحان سے گزرنے کے لیے۔'' وہ پُراعتماد تھی۔

''لڑکی تمہیں کیسے پتا ہے کہ یہ تمہارا باپ ہے؟ اگر اس کے اور تمہاری ماں کے درمیان کچھ تھا بھی تو وہ تمہاری پیدائش سے قبل تھا۔''

''وہ جو بھی تھا، وہ کئی سال چلتا رہا تھا اور یہ ہر ماہ کا خرچہ پانی بھی دیا کرتے تھے۔ یہ میرا قیاس نہیں ہے، ماں بھی اقرار کرتی تھیں، اور یہ بھی پہلے کرتے تھے۔''

''شٹ اَپ یو بِچ۔'' وہ چلاّئے۔ ''جھوٹی، مکار، اداکارہ، بند کرو یہ ڈراما۔'' منال کی آنکھیں جھلملانے لگیں' اس نے سر جھکا لیا۔

''آرام سے جہانگیر...... اگر یہ ڈراما کر رہی ہے تو وہ کھل ہی جائے گا...... رضا۔''

''حکم، بی بی جان۔'' وہ مودب سا ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔

''تم جہانگیر اور اس لڑکی کے ٹیسٹ کرواؤ گے اور تم جانتے ہو یہ بات باہر نہیں نکلنی چاہیے۔''

''جو حکم بی بی جان۔'' اس نے ایک نگاہ جہانگیر پہ ڈالی جو مضطرب سے ہو گئے تھے۔

''مگر بی بی جان، خواہ مخواہ......''

''یہ میرا حکم ہے جہانگیر......'' ان کا انداز اٹل تھا۔ ''اور لڑکی، تم میری بات کان کھول کر سنو...... تم اس کے بعد ہماری وادی کی سردارنی کا ہر فیصلہ قبول کرو گی۔ ہم عدل کرتے ہیں، اس کا تو تمہیں یقین ہوگا۔''

''جی ہاں۔'' اس نے سر اٹھایا اور ہتھیلی کی پشت سے آنسو پونچھے۔ ''مجھے وادی کی سردارنی کا ہر فیصلہ قبول ہوگا۔''

☆☆☆

''پرسوں شام تک ٹیسٹ کی رپورٹ آجائے گی، مہر ماہ، میرا دل بہت خراب ہو رہا ہے۔'' اس رات وہ بستر میں لیٹی، فون کا ریسیور کان سے لگائے اس سے بات کر رہی تھیں۔

''آپ کو اللہ پہ یقین نہیں ہے بی بی جان؟''

''اللہ پہ ہے، جہانگیر پہ نہیں ہے۔''

''بی بی جان!'' اسے صدمہ لگا تھا۔

''میں کیا کروں مہر ماہ، مجھے بہت خوف آرہا ہے۔''

''مگر آپ تو کہتی ہیں کہ اس کی آنکھیں بابا جان جیسی نہیں ہیں۔''

''لیکن اس کا انداز...... وہ مجھے خوف دلاتا ہے۔''

''وادی کی سردارنی ایک لڑکی سے ڈر گئیں؟''

''مجھے بُری گھڑی سے ڈر لگتا ہے مہری۔''

''اچھا آپ نے دوا کھالی؟'' اس نے دانستہ موضوع بدل دیا۔

''ہوں، بس اب سونے ہی لگی تھی۔''

''دودھ پی کر سوئیے گا۔'' وہ فون بند کرنے سے قبل ہدایات دینا نہیں بھولی تھیں۔ انہوں نے مسکرا کر ریسیور رکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔

چند ثانیے ہی گزرے تھے کہ ان کے کمرے کا دروازہ ہولے سے کھلا۔ ذرا سی درز سے جہانگیر نے اندر جھانکا۔ وہ بے خبر سو رہی تھیں۔ انہوں نے دروازہ اسی آہستگی سے بند کر دیا۔ راہداری کے دوسرے سرے پر گیسٹ روم تھا جس میں بہت قریبی مہمان ہی ٹھہرائے جاتے تھے۔ وہ بے آواز قدموں سے چلتے اس تک گئے اور بنا دستک کے دروازہ کھولا۔ منال آئینے کے سامنے کھڑی بالوں میں برش پھیر رہی تھی۔ آہٹ پر چونک کر پلٹی۔

''آپ؟'' اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا۔

''ہاں میں!'' انہوں نے سرد لہجے میں کہتے دروازہ بند کیا اور ایک حقارت بھری نگاہ اس پر ڈالتے کرسی پر بیٹھے۔

''سامنے آؤ اور مجھ سے بات کرو۔'' وہ برش رکھ کر دھیرے دھیرے چلتی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

''جی؟''

''کتنے پیسے چاہئیں تمہیں؟ بولو!'' انہوں نے ہاتھ میں پکڑی چیک بک کھولی اور قلم کا ڈھکنا اتارا۔

''تو آپ مجھے خریدنے آئے ہیں؟''

''بکواس بند کرو، مجھے میری ماں کے سامنے ذلیل کر کے تمہیں کیا ملا؟ اب اپنا یہ تماشا ختم کرو۔ جو رقم چاہیے اس میں بھر لو، اور اپنا بوریا بستر سمیٹ کر دفان ہو جاؤ۔''

''لیکن ابھی تو ڈی این اے ٹیسٹ کی رپورٹ بھی نہیں آئی۔''

''بھاڑ میں گیا ڈی این اے ٹیسٹ...... میں نہیں مانتا کسی ٹیسٹ کو۔''

''مگر دنیا مانے گی اور آپ کو بھی ماننا پڑے گا۔'' وہ نڈر ہو کر کہہ رہی تھی۔

''اپنی قیمت بتاؤ؟''

''بیٹی، بیٹی تسلیم کر لیں مجھے، اس سے زیادہ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔''

''مائی فٹ! نہیں ہو تم میری بیٹی، کچھ نہیں لگتیں تم میری۔'' وہ پیر پٹختے کھڑے ہو گئے۔ ''اب میں

بھی دیکھتا ہوں تم کیا کرسکتی ہو، میری بیوی نے میرے ہاتھ باندھ رکھے ہیں ورنہ میں تمہیں اپنے کتوں کے آگے ڈال دیتا۔'' ایک غصیلی نگاہ اس پر ڈال کر وہ باہر نکل گئے۔

''اُف!'' منال گہری سانس لیتی بیڈ پر گرگئی۔

☆☆☆

وہ ہاتھ میں موبائل پکڑے کوئی بٹن دبا رہا تھا، ٹوں ٹوں کی آواز خاموش لاؤنج میں گونجنے لگی۔ اس نے فون کان سے لگالیا۔ تیسری گھنٹی پہ کال اٹھالی گئی۔

''السلام علیکم؟'' مہر ماہ کی آواز کسی جلترنگ کی طرح سنائی دی۔

''ہیۓ مہر ماہ...... میں حسنین۔'' وہ ٹہلتا ہوا مضطرب سا کہہ رہا تھا۔ ''رضا بھائی رپورٹس لینے گئے ہیں، بس آتے ہی ہوں گے۔''

''اتنے پریشان کیوں ہو؟''

''کیا تم نہیں ہو؟ یہاں ہم انتظار کی سولی پر اٹکے ہوئے ہیں، سب ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہیں، بس میں سائڈ پر آکر تمہیں کال کررہا ہوں۔''

''کیا ایک ٹیسٹ سے سب پتا چل جائے گا؟''

''ہاں مہر ماہ، رضا بھائی نے یقین دلایا ہے کہ سب پتا چل جائے گا مگر مجھے بہت گھبراہٹ ہورہی ہے اور گرینی تو بہت ہی پریشان ہیں۔''

''اوہو، تم انہیں تسلی دو۔'' وہ حسبِ توقع پریشان ہوگئی۔ ان کو ڈھارس دلاؤ کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' دفعتاً باہر کار کا ہارن بجا، حسنین نے رک کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رضا کی کار ڈرائیو وے پر چلتی آرہی تھی۔

''رضا بھائی آگئے ہیں میں چلتا ہوں، جو بھی رزلٹ آیا تمہیں کال کرکے بتاؤں گا۔'' فون بند کرکے وہ ڈرائنگ روم میں آگیا۔

بڑے صوفے پر بی بی جان خاموش سی بیٹھی تھیں۔ ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے مسلسل گررہے تھے۔ ان کے ساتھ سوہنی ہتھیلیوں پر چہرہ گرائے بیٹھی تھی۔ ایک طرف سنگل صوفے پر شہلا مضطرب سی پہلو بدل رہی تھیں۔ ان کے مقابل صوفے پر جہانگیر براجمان تھے۔ بیزاریت ان کے چہرے سے عیاں تھی۔ کونے میں ایک کرسی پہ وہ سپاٹ چہرہ لیے بیٹھی تھی۔ وہ جو اس سارے فساد کی جڑ تھی۔ حسنین نے بے اختیار سوچا، اور بی بی جان کے دوسری طرف آکر بیٹھ گیا۔

قدموں کی آواز سنائی دی، سب منتظر سے جالی دار پردے کو دیکھنے لگے۔ دفعتاً اس کے پیچھے رضا کا وجود دکھائی دیا پھر اس نے ہاتھ سے پردہ ہٹایا۔

''آؤ رضا۔'' بی بی جان کی تسبیح کے دانے مزید تیزی سے گرنے لگے تھے۔

وہ ہاتھ میں رپورٹس کا خاکی لفافہ تھامے..... جہانگیر شاہ کے صوفے کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس کے چہرے پہ کچھ تھا جو بی بی جان کا دل دہلا رہا تھا۔

''کیا کہتی ہیں رپورٹس؟'' شہلا رہ نہیں سکیں۔

رضا نے ایک نظر کونے میں بیٹھی منال کو دیکھا، پھر لفافے سے چند کاغذ نکالے۔

''میں نے سیمپل تین لیبارٹریز میں دیے تھے۔'' وہ نگاہیں جھکائے مؤدب سا کھڑا کہہ رہا تھا۔ ''آپ دیکھ سکتے ہیں، اگر یہ والی لکیریں یوں ملیں تو......'' وہ ایک رپورٹ دکھاتا کہنے لگا، مگر بی بی جان نے ٹوک دیا۔

''تفصیلات چھوڑو، یہ بتاؤ کہ کیا یہ لڑکی جہانگیر کی بیٹی ہے؟'' وہ خاموش ہوگیا، ایک نظر جہانگیر کو

دیکھا جو ضبط کی انتہاؤں پہ تھے اور پھر سر جھکا دیا۔

''حقیقت تو اللہ بہتر جانتا ہے، میں آپ کا ادنیٰ سا ملازم ہوں بی بی جان، حکم کی تعمیل کی ہے ان رپورٹس کے مطابق...... ان کے مطابق یہ باپ اور بیٹی ہیں۔'' اور بی بی جان کو لگا، چھت پھٹ گئی ہے۔ ڈرائنگ روم میں سناٹا چھا گیا، موت کا سناٹا، رضا نے آہستگی سے رپورٹس میز پر رکھ دیں۔

''میں نے کمدار اور اس کی بیٹی کے نام پہ رپورٹس تیار کی ہیں۔ آپ بے فکر رہیں، بات باہر نہیں نکلی، نہ نکلے گی، آپ چاہیں تو دوبارہ کہیں اور سے ٹیسٹ کروالیں۔ آگے جو آپ کا حکم ہو، میں حاضر ہوں۔''

اب بھی کوئی کچھ نہ بولا۔ شہلا دنگ بیٹھی تھیں۔ جہانگیر گویا سکتے میں تھے اور بی بی جان...... ان کا رنگ نچڑ چکا تھا...... سفید، لاش کے مانند چہرہ لیے وہ یک ٹک رضا کو دیکھ رہی تھیں۔

''اب بتائیے، وادی کی سردارنی کا کیا فیصلہ ہے، اس کے بعد سردارنی کا جو فیصلہ ہوگا مجھے منظور ہوگا۔'' وہ رندھی ہوئی آواز میں پوچھ رہی تھی۔

آئی ہیٹ یو پاپا...... آئی ہیٹ یو......'' دفعتاً سوہنی اٹھی اور چلائی اور ہچکیاں روکتی باہر بھاگی۔

جہانگیر ابھی تک سکتے میں تھے، شہلا بھی کچھ کہنے کے قابل نہیں رہی تھیں۔ حسنین بھی گم صم سا ہوگیا تھا۔

''بتائیں بی بی جان...... سردارنی کا کیا فیصلہ ہے؟'' بی بی جان نے آہستہ سے نگاہوں کا زاویہ اس کی طرف موڑا۔

''جمعے کو حویلی میں بات ہوگی، پرسوں جمعہ ہے، فیصلہ حویلی میں ہوگا، تم سب اور یہ لڑکی، سب چلنے کی تیاری کرو۔'' پھر وہ آہستہ سے اٹھیں اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دروازے کی جانب بڑھنے لگیں۔ حسنین فوراً سہارا دینے کے لیے آگے بڑھا مگر انہوں نے اس کا ہاتھ جھٹک دیا۔ شہلا کا سکتہ ان کے وہاں سے نکلتے ہی ٹوٹا تھا۔

''ساری زندگی تم مجھے دھوکا دیتے آئے ہو، اب اور نہیں جہانگیر، میں ڈیڈی کے پاس لندن جارہی ہوں، خلع کا نوٹس بھی تمہیں جلد مل جائے گا۔ سنی تم اور سوہنی اگر چلنا چاہو تو ٹھیک، نہیں تو بھاڑ میں جاؤ میری طرف سے۔'' وہ تن فن کرتی دہلیز پار کرگئیں۔

جہانگیر اسی طرح بے حس و حرکت بیٹھے تھے۔

حسنین آہستہ سے وہاں سے نکل آیا اور مہر ماہ کو فون ملایا۔

''کیا بنا حسنین؟'' وہ بے تاب، منتظر بیٹھی تھی۔

''سب تباہ ہوگیا مہر ماہ...... سب ختم ہوگیا......'' اس کی آواز رندھنے لگی تھی۔

''مگر کیا ہوا ہے؟''

''وہ پاپا کی بیٹی ہے، رپورٹ نے تصدیق کردی ہے۔'' چند لمحوں کے لیے فون لائن مردہ ہوگئی، بے سانس، بے آواز...... خاموش......

''مہر ماہ؟''

''ہاں، میں اِدھر ہوں، ٹھیک ہوجائے گا سب، بی بی جان نے کیا کہا؟''

''جمعے کو فیصلہ ہوگا۔ یہ گھر کا معاملہ ہے گھر میں ہی حل ہوگا۔ منال نے کہا ہے کہ وہ وادی کی سردارنی کا ہر فیصلہ قبول کرے گی۔''

وہ لاؤنج میں کھڑا تھا۔ اسے سامنے شہلا کے بیڈروم کا آدھا کھلا دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ الماریوں کے پٹ کھلنے بند ہونے کی آوازیں...... بیگ کی زپ چڑھانے کی آواز...... ساتھ میں اونچی

بڑبڑاہٹیں......

''ممی گھر چھوڑ کر جارہی ہیں، وہ خلع لے رہی ہیں۔''

''اور سوہنی؟''

''وہ کہتی ہے اسے پاپا سے نفرت ہے، مہر ماہ ہم کیا کریں؟ ہمارا تو پورا گھر بکھر گیا ہے، مجھے پتا ہے سوہنی اب پاپا کی ضد میں ممی کے ساتھ چلی جائے......'' ایک دم وہ بولتے بولتے رکا۔ اسے کسی کے گرنے کی آواز آئی تھی۔

''کیا ہوا حسنین؟''

''ایک منٹ ٹھہرو!'' تبھی راہ داری کی دوسری طرف آوازوں کا شور بلند ہوا تھا۔ فون اس کے ہاتھ سے پھسل پڑا۔ وہ بدحواس سا اس طرف بھاگا تھا۔

''ہیلو! ہیلو؟'' مہر ماہ پریشانی سے اسے پکار رہی تھی۔

☆☆☆

بے چینی سے برآمدے میں ٹہلتے اس کے پیر شل ہوگئے تھے مگر وہ سینے پر بازو باندھے مسلسل ٹہل رہی تھی۔ سفید گرم شال سر پر تھی، اور ہاتھ میں تسبیح......اس کے لب ساتھ ہی وِرد کر رہے تھے۔

حسنین سے اس کی پھر بات نہیں ہو پائی تھی۔ بابا جان کو فون کرنے کی اس کی ہمت نہ پڑی تھی۔ سوہنی کا موبائل آف تھا۔ بس ایک رضا سے بات ہوئی تھی جس نے صرف ''ہم شام تک حویلی پہنچ جائیں گے۔'' کہہ کر فون بند کر دیا تھا۔

شام کی نیلاہٹیں گہری ہونے کو آئی تھیں، چرند پرند اپنے اداس گیت گنگناتے آشیانوں کو لوٹنے لگے تھے۔ وہ کب سے زنان خانے کے برآمدے میں چکر کاٹ رہی تھی۔ دل میں عجیب عجیب سے وسوسے آرہے تھے۔ تبھی گیٹ کے پار ہارن بجا...... وہ چونک اٹھی۔ یکے بعد دیگرے دو گاڑیاں اندر داخل ہوئی تھیں...... آگے بابا جان کی پیراڈو تھی جس سے وہ فوراً نکلے تھے۔ ساتھ ہی باقی دروازے کھول کر شہلا، حسنین، اور سوہنی باہر آئے تھے۔ وہ سب تیزی سے اس کی طرف بڑھ رہے تھے، مگر وہ پچھلی گاڑی کو دیکھ رہی تھی جس میں سے رضا کے پیچھے ایک لڑکی نکلی تھی۔ سیاہ شال اوڑھے، لب بھینچے، سپاٹ چہرہ لیے، وہ اِدھر اُدھر گردن موڑتی اطراف کا جائزہ لے رہی تھی۔

''مہر ماہ!'' حسنین اس کے قریب آرہا تھا۔ اس کے چہرے پر صدیوں کی تھکن تھی۔ اور ایک دم...... بالکل ایک دم سے اسے کسی انہونی کا احساس ہوا۔

''حسنین! بی بی جان کہاں ہیں؟'' اسے اپنی آواز کسی کنویں سے آتی سنائی دی تھی۔ اسی پل کھلے گیٹ میں ایک سفید ایمبولینس داخل ہوئی...... وہ سن سی ہوگئی۔

''مہری...... بی بی جان فوت ہوگئی ہیں۔'' وہ رو رہا تھا۔ وہ پتھر کا بت بنی ایمبولینس کو دیکھ رہی تھی۔ جس سے جہانگیر اور رضا اسٹریچر نکال رہے تھے۔

''مہر ماہ...... مہر ماہ...... گرینی......'' سوہنی روتے ہوئے اس کے گلے سے آن لگی۔ وہ یک ٹک بنا پلک جھپکے اسٹریچر کو دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

فجر کے بعد بی بی جان کا جنازہ پڑھا کر ان کو دفنا دیا گیا، وہ وادی کی سردارنی تھیں، ان کی وفات پہ پوری وادی جمع ہوگئی تھی۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر دل رو رہا تھا۔

وہ جنازے کے بعد ویران سی دالان میں بنے چبوترے پہ بیٹھی تھی، آنسو لڑیوں کی صورت میں اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے، وہ اس کی ماں جیسی تھیں، دوست جیسی اور باپ جیسی تھیں، اسے لگ رہا تھا صدمے نے اسے ڈھے دیا ہے، وہ شاید کبھی جڑ نہ پائے، اس کی سب سے بڑی ڈھال اور سہارا ختم ہوگیا تھا۔

''مہری......'' جہانگیر دھیرے سے اس کے ساتھ آبیٹھے تھے۔ اس نے بھیگی آنکھیں ان کی طرف اٹھائیں......وہ برسوں کے بیمار لگ رہے تھے۔

''ہم ان کے لیے بہت دعا کیا کریں گے بابا جان...... اس سے ان کی روح کو سکون ملے گا۔'' وہ اپنا دکھ بھول کر انہیں دلاسا دینے لگی۔

''مگر مجھے کبھی نہیں ملے گا، وہ مجھ سے ناراض گئی ہیں مہری۔''

''اس دنیا کی ناراضیاں یہیں تک ہوتی ہیں بابا جان...... جان کنی کے بعد ہر روح کو اپنی نجات کی فکر ہوتی ہے، ہم ان کے لیے دعا کرتے رہیں گے۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' اس نے ہولے سے ان کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھا۔

''تمہاری امیدیں ہمیشہ زندہ رہتی ہیں مہری...... ورنہ مجھے لگتا ہے اب زندگی میں کچھ بھی نہیں بچا۔''

''ایسے نہ سوچیں بابا جان...... میں ہوں نا آپ کے پاس۔'' اس نے بہت اعتماد سے ان کا ہاتھ دبایا۔ انہوں نے بے یقینی سے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''تمہیں میرا یقین ہے منال کے معاملے میں؟''

''اس معاملے کا فیصلہ جب ہوگا، تب دیکھا جائے گا۔'' اس کا انداز مبہم تھا۔

''فیصلہ تو ہوگیا ہے مہر ماہ...... کیا تم نہیں جانتیں کہ رپورٹس......''

''فیصلہ! ابھی نہیں ہوا، فیصلہ جمعے کو حویلی میں ہوگا۔''

''بی بی جان نہیں رہیں، اب......''

''کیا آپ نہیں جانتے کہ بی بی جان نے اپنے بعد مہر ماہ کو وادی کی سردارنی بنانے کا کہا تھا؟ یہ ان کی وصیت تھی، وادی کی سردارنی کو چننے کا حق صرف انہی کو تھا اور انہوں نے آپ کے اوپر مجھے چنا تھا۔ میں اس وادی کی نئی سردارنی ہوں بابا جان، کیا آپ نہیں جانتے؟'' وہ عجیب سے لہجے میں بولی تو وہ چونک کر اسے دیکھنے لگے، وہ ایک دم اس مہر ماہ سے مختلف لگ رہی تھی جسے وہ جانتے تھے قطعاً اجنبی اور غیر شناسا۔

''ہاں، میں جانتا ہوں لیکن اب فیصلہ کرنے کے لیے کیا بچا ہے؟ وہ لڑکی تو سارے ثبوت جمع کر کے لے آئی ہے۔ بی بی جان کی وجہ سے شہلا رک گئی مگر میں جانتا ہوں وہ ان کے چالیسویں کے بعد مجھ سے خلع لے کر چلی جائے گی۔ سوہنی میری شکل نہیں دیکھنا چاہتی۔ حسنین مجھ سے نگاہیں نہیں ملاتا اور......''

''اور مہر ماہ پھر بھی کہتی ہے کہ فیصلہ ابھی ہونا ہے۔'' وہ اٹل لہجے میں کہتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''جمعے کی نماز کے بعد، دوپہر دو بجے، بڑے کمرے میں سب کو اکٹھا کیجیے۔ فیصلہ تب ہی ہوگا۔'' کسی ملکہ کی طرح حکم صادر کر کے وہ مڑی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی برآمدے کی جانب بڑھ گئی۔ جہانگیر شاہ شش و پنج میں مبتلا بیٹھے اسے جاتا دیکھتے رہے، وہ کیا کرے گی، انہیں کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

☆☆☆

مہر ماہ نے کہا تھا، فیصلہ وہ جمعے کو ہی کرے گی، اوراس نے ٹھیک کہا تھا، نہ کسی کی کوئی دلیل سنی نہ حیل و حجت، ہر ایک کو بس حکم سنایا۔ نماز کے بعد بڑے کمرے میں جمع ہو جاؤ پھر کسی کے پاس بحث کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔ یہ وہ ہر وقت حلاوت سے مسکراتی مہر ماہ نہیں تھی، یہ سپاٹ ،بارعب چہرے والی وادی کی سردارنی تھی۔ اس کے آگے جہانگیر شاہ بھی کچھ بول نہیں پائے تھے۔

جمعے کی نماز کے بعد ایک ایک کر کے سب بڑے ہال میں آنے لگے۔ حسنین شلوار قمیص اور شال اوڑھے چپ چاپ ایک صوفے پہ آبیٹھا۔ ساتھ ہی سوہنی بجھی بجھی سی بیٹھی تھی۔ زبردستی کی اوڑھی بڑی سی کڑھائی والی سیاہ چادر میں اس کا چہرہ زرد لگ رہا تھا، اس کے دوسری طرف شہلا براجمان تھیں۔ رواج کے مطابق دوپٹا ان کے بھی سر پہ تھا مگر چہرے پہ بے پناہ کڑھن تھی۔

مقابل صوفے پر جہانگیر شاہ بیٹھے تھے۔ وہ ہاتھ میں پکڑے موبائل پر مسلسل بٹن دبا رہے تھے۔ شاید وہ شہلا یا سوہنی کی طرف نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کے صوفے کے پیچھے رضا کھڑا تھا۔ ہاتھ باندھے، سر جھکائے، مودب سا۔ سربراہی اونچی کرسی خالی تھی۔ اس پہ بی بی جان بیٹھا کرتی تھیں مگر آج اس پر مہر ماہ کو بیٹھنا تھا۔

چوکھٹ میں ذرا سی آہٹ ہوئی اور دھیرے سے منال چلتے ہوئے اندر آئی۔ اس کے لیے جہانگیر کے صوفے کے ساتھ ہی صوفہ رکھا گیا تھا۔ کسی نے اسے سر اٹھا کر دیکھنے کا تکلف بھی نہیں کیا۔

وہ چپ چاپ اس صوفے پر آبیٹھی۔ اب وہ سربراہی کرسی کے بالکل مقابل تھی۔

دفعتاً ہال کا بغلی دروازہ کھلا۔ بہت سی گردنیں اس جانب کو مڑیں، مہر ماہ چوکھٹ عبور کر کے اندر آرہی تھی۔ بی بی جان کی سفید شیشوں کے کام والی بڑی سی شال میں خود کو سموئے، وہ سپاٹ چہرہ لیے اپنی کرسی پہ آبیٹھی۔ ہال میں گہرا سناٹا چھا گیا۔ سب سانس روکے اس کو دیکھ رہے تھے۔

”منال...... یہی نام ہے تمہارا؟“ اس کی آواز پورے کمرے میں گونجی۔

”جی۔“ منال نے آہستہ سے سر اثبات میں ہلایا۔

”کیا تم نے وادی کی سردارنی کا فیصلہ قبول کرنے کا یقین دلایا تھا؟“

”جی۔“ اس کی آواز میں عجب بغاوت تھی۔

”ٹھیک ہے، آج فیصلہ ہوگا اور شرعی حساب سے ہوگا۔“ اس نے انگلی سے ایک طرف اشارہ کیا۔ سب کی نگاہیں اس طرف اٹھیں۔ وہاں ایک کونے میں شیلف بنا تھا، جس کے اوپری خانے میں غلاف میں لپٹا قرآن مجید پر رکھا تھا۔ منال کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔

”میں قرآن پہ ہاتھ رکھ کر قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔“

”میں بھی تیار ہوں۔“ جہانگیر نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا تھا۔

”منال ...... تم جاؤ اور وضو کر کے آؤ، پھر قرآن مجید کو ادھر سامنے اٹھا کر لاؤ۔“ اس نے دونوں کی بات کا جواب نہیں دیا، بس سپاٹ نگاہوں سے منال کر دیکھتے ہوئے حکم سنایا۔

وہ سر ہلا کر اٹھ گئی، کمرے میں یونہی خاموشی چھائی رہی یہاں تک کہ وہ واپس آئی تو اس کا چہرہ، ہاتھ، آستینوں کے کنارے گیلے تھے۔ دوپٹا سر پر تھا اور قرآن پاک ہاتھ میں۔ وہ اپنے صوفے پر بیٹھی

نہیں، بلکہ وہیں کھڑے کھڑے ایک ہاتھ میں قرآن پکڑے، دوسرے کو اس کے اوپر رکھا۔

”میں اللہ کے نام کی قسم اٹھاتی ہوں کہ......“

”میں نے تم سے قسم اٹھانے کو نہیں کہا۔“ مہر ماہ نے تیز لہجے میں اسے روکا۔

”پھر؟“ منال کی آنکھوں میں الجھن ابھری۔

”تم اپنی بات دُہراؤ۔“

”جہانگیر شاہ کے میری ماں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے۔ جس کا اعتراف یہ دونوں میرے سامنے کر چکے ہیں، یہ مجھے اپنی بیٹی بھی تسلیم کرتے تھے اور خرچہ پانی بھی دیتے تھے مگر ماں کے مرنے کے بعد مجھ سے اعراض برتنے لگے۔“ منال تیزی سے بولی۔

”یعنی کہ تم جہانگیر شاہ کو زنا بالرضا کا ملزم ٹھہراتی ہو؟“

”جی!“ وہ پر اعتماد تھی۔ مہر ماہ نے چہرہ جہانگیر کی طرف موڑا۔

”جہانگیر شاہ، کیا آپ کے اس لڑکی کی ماں کے ساتھ ناجائز تعلقات تھے؟“

”نہیں!“ ان کا لہجہ سخت تھا۔

سوہنی نے منہ پھیر لیا اور شہلا زیر لب کچھ بڑبڑائیں۔ مہر ماہ نے چہرہ واپس منال کی جانب پھیرا۔

”یہ انکار کر رہے ہیں۔“

”آف کورس، یہ انکار ہی کریں گے مگر میرے پاس بھی سارے ثبوت ہیں۔ ان کے وہ تمام چیکس، اسپتال کے بل، میرا ڈی این اے ٹیسٹ اور......“

”بی بی ہم کسی ڈی این اے ٹیسٹ کو نہیں مانتے۔“ مہر ماہ نے ناگواری سے اسے جھڑکا۔

”آپ ڈی این اے ٹیسٹ کو نہیں مانتیں؟“ منال کے چہرے پر حیرت ابھری۔

غزل

اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے
منزل کے لیے دو گام چلوں اور سامنے منزل آجائے

اے دل کی خلش چل یونہی سہی چلتا تو ہوں ان کی محفل میں
اس وقت مجھے چونکا دینا جب رنگ پہ محفل آجائے

ہاں یاد مجھے تم کرلینا آواز مجھے تم دے لینا
جب راہِ محبت میں کوئی در پیش جو مشکل آجائے

اے جذبۂ کامل چلنے کو تیار تو ہوں پر یاد رہے
اس وقت مجھے بھٹکا دینا جب سامنے منزل آجائے

اب کیوں ڈھونڈوں وہ چشمِ کرم ہونے دے ستم بالائے ستم
میں چاہتا ہوں اے جذبۂ غم مشکل پسِ مشکل آجائے

شاعر...... بہزاد لکھنوی

مرسلہ: رفعت مبین رفی، کراچی

”میں نہیں، اللہ کی کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔“

”مگر اس وقت تو یہ سہولت نہیں تھی اور سائنس......“

”بی بی یہ دنیا سائنس نے نہیں بنائی، تمہارے اور میرے رب نے بنائی ہے اور یہ کتاب جس رب کا کلام ہے کیا اس کو نہیں معلوم تھا کہ کبھی یہ سہولت میسر ہوگی؟ اس کے باوجود ہمارے دین میں حدود کے مقدمے کے فیصلے میں ڈی این اے ٹیسٹ کا کوئی تصور نہیں ہے۔“

”مگر......“

”تم بتاؤ، کیا تم اپنی بات پر قائم ہو؟“

”یس آف کورس!“

”یعنی کہ تم بضد ہو کہ یہ شخص زانی ہے؟“

”جی بالکل!“ اس نے شانے اچکائے۔

”ٹھیک ہے، میں تمہارا الزام مان کر اس شخص پر سو کوڑوں کی حد نافذ کرتی ہوں مگر تم اللہ کے حکم کے مطابق ان چاروں کو لے آؤ۔“

”کن چاروں کو؟“

”ان چار گواہوں کو جنہوں نے جہانگیر شاہ کو تمہاری ماں کے ساتھ گناہ کی حالت میں دیکھا ہو۔“ منال نے الجھ کر اسے دیکھا۔

”کون سے چار گواہ؟ میرا مطلب ہے میرے پاس...... آئی مین، ان کو تو کسی نے نہیں دیکھا۔“

”کیا تمہارے پاس چار گواہ نہیں ہیں؟“ مہر ماہ کے چہرے پر مصنوعی حیرت ابھری۔

”مہر ماہ بی بی، ایسے کام چار لوگوں کے سامنے نہیں ہوتے بلکہ رات کے اندھیروں میں، بند دروازوں کے پیچھے ہوتے ہیں۔“

”مگر چار گواہ تو تم نے لانے ہیں منال، ورنہ تم اس شخص کی بیٹی ثابت نہیں ہوگی۔“

”میری ڈی این اے رپورٹ۔“

”جہنم میں گئی تمہاری ڈی این اے رپورٹ۔ میں نے کہا نا، ہمارے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ چار گواہ منال، چار گواہ لاؤ۔ جنہوں نے ان دونوں کو واقعتاً حالتِ غیر میں دیکھا ہو۔“

”میں چار گواہ کہاں سے لاؤں؟“ وہ پریشان سی کھڑی تھی۔ ”یہ تو پاسیبل ہی نہیں ہے کہ کسی کے گناہ کے وقت چار لوگ اکٹھے ہو کر دیکھیں، اگر چار لوگ ہوتے تو کیا وہ ان کو روکتے نہیں؟ ایسا کہاں ہوتا ہے مہر ماہ بی بی؟“

”یہ میرے رب کا فیصلہ ہے منال...... چار گواہ لاؤ تو میں تمہیں اس شخص کی بیٹی قرار دے دوں گی۔“

”او کے فائن۔ آپ اپنے والد کو بچانا چاہتی ہیں، ٹھیک ہے۔ نہ قرار دیں مجھے ان کی بیٹی۔ نہیں ہیں میرے پاس چار گواہ۔“

”سوچ لو۔“

”سوچنا کیا، جب نہیں ہیں گواہ تو میں کیا کروں؟“

”ٹھیک ہے پھر فیصلہ واضح ہے۔“

”کیا؟“ وہ ٹھٹکی۔ کہیں کچھ غلط تھا۔

”قذف...... تم قذف کی مجرمہ ثابت ہوتی ہو۔ تم نے ایک پاک دامن شخص پر زنا کی تہمت لگائی ہے۔ تمہیں اسّی (80) کوڑے لگائے جائیں گے۔“

”واٹ؟ میں جھوٹ نہیں بول رہی۔ میں...... میں قسم اٹھانے کو تیار ہوں۔“ اس کے چہرے کا رنگ پہلی دفعہ پھیکا پڑا تھا۔

”رضا، یہ کوڑا اٹھاؤ۔“ مہر ماہ نے رضا کو اشارہ کیا۔ وہ دم بخود کھڑا تھا۔ چونک کر مہر ماہ کو دیکھنے لگا۔

”رضا میں نے کہا یہ کوڑا اٹھاؤ۔“ مہر ماہ کی آواز میں سختی در آئی تھی۔ سوہنی اور حسنین سانس روکے ابھی تک اسی کوڑے کو دیکھ رہے تھے۔ رضا دھیرے سے آگے بڑھا اور کیس میں رکھا کوڑا اس کے ہینڈل سے اٹھایا۔ سیاہ چمڑے کا لمبا سا ہنٹر...... ہال کمرے میں موت کا سناٹا چھا گیا تھا۔ وہ اب کوڑا اٹھائے الجھی سوالیہ نگاہوں سے مہر ماہ کو دیکھ رہا تھا۔

”تم شرائط سے واقف ہو رضا۔ کوڑا مارتے وقت تمہاری کلائی تو حرکت کرے مگر بازو اوپر نہ اٹھایا جائے۔“

رضا نے خائف نگاہوں سے اسے دیکھا اور منال کا رنگ نچڑ چکا تھا۔

”نہیں مہر ماہ بی بی...... آپ مجھے یہ سزا نہیں دے سکتیں۔“

”رضا، تم اسے پورے اسّی (80) کوڑے لگاؤ گے۔ شروع کرو۔“ رضا نے کوڑے کو حرکت دینی چاہی مگر اس کے ہاتھوں میں واضح لرزش اتر آئی تھی۔

”نہیں رضا آپ مجھے نہیں مار سکتے...... میں اپنا دعویٰ واپس لے لوں گی...... پلیز۔“ وہ خوف زدہ سفید چہرہ لیے منت کرنے لگی تھی۔

”یہ بات تمہیں بہتان باندھنے سے پہلے سوچنی چاہیے تھی۔ شروع کرو رضا۔“

رضا کا چہرہ پسینے میں بھیگ چکا تھا۔ وہ بے چارگی و بے بسی سے کبھی ہاتھ میں پکڑے کوڑے کو دیکھتا، کبھی منال کے سفید پھٹک چہرے کو۔

”رضا میں نے کہا شروع کرو۔“ مہر ماہ کی سخت آواز بلند ہوئی تو وہ آگے بڑھا اور بازو بغل سے جدا کیے بغیر بس کلائی کو گھمائے پوری قوت سے ہنٹر منال کی کمر پر مارا۔ وہ ایک زوردار چیخ کے ساتھ بلبلا کر گھٹنوں کے بل گری۔

”نہیں...... مجھے مت مارو پلیز۔“ وہ رونے لگی تھی۔

”ایک......“ مہر ماہ نے بند مٹھی میں سے شہادت کی انگلی نکال کر بلند کی۔ رضا نے بے بسی سے اس کو دیکھا، رحم یا ترس کی آس پہ مگر مہر ماہ کا چہرہ برف کی طرح سرد تھا۔

اس نے شکستگی سے کلائی کو گھمایا اور زوردار ضرب منال کے کندھوں کے پچھلے حصے پر لگی۔ اس کی دردناک چیخیں فضا میں بلند ہوئی تھیں۔

”نہیں...... پلیز...... مجھے مت مارو۔ میں چلی جاؤں گی یہاں سے، کچھ نہیں بگاڑوں گی تم لوگوں کا پلیز۔“

”دو!“ مہر ماہ دو انگلیوں کا اشارہ کیے اب منتظر

دعوت نامہ کچھ یوں بھی ہو سکتا ہے

ہماری موروثی ادب نوازی کا اثر ہمارے بھتیجے صاحب پر بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ گاہے بہ گاہے اکثر اپنے ہم مذاق دوستوں میں جوہر دکھاتے رہتے ہیں۔ ابھی کچھ دن گزرے ان کے بچپن کے ساتھی نے ان سے فرمائش کی کہ ہمارے بیٹے کی شادی کارڈ کا مضمون تم لکھو گے مگر انداز ذرا ہٹ کر لطیف پیرائے میں ہو موصوف کی رگِ ظرافت پھڑک اٹھی جو آمد ہوئی وہ کچھ یوں ہے۔

مکرمی آداب!

امید ہے آپ اور اہلِ خانہ خوش باش ہوں گے۔ عرضِ احوال ہے کہ نورچشمی سمیر فاروقی الحمدللہ جواں ہو گئے لہٰذا کھونٹے سے باندھنے کی ضرورت پڑ گئی۔ اب آپ سے کیا پردہ کھونٹا ہماری آدھی گھر والی شائستہ تحسین کہ احسن زبیر کی سموچی گھر والی ہیں کے گھر سے مل گیا۔ احسن زبیر اور ہم ایک ہی زلف کے اسیر ہیں۔ بہو رانی ان کی بیٹی اور ہماری لاڈو ”کنزیٰ“...... معاملاتِ نکاح و رخصتی بہ رغبت و رضامندیٔ فریقین طے پا گئے...... ولیمہ مسنون کا اہتمام انشاءاللہ 24 جولائی علی گڑھ لان کراچی میں کیا گیا ہے...... اس تقریبِ سعید میں آپ کی شرکت ضروری ہے اول اس لیے کہ آپ کی دعائیں درکار ہیں، دوئم اس لیے کہ دانے دانے پر لکھا ہے کھانے والے کا نام اور دانے کا وافر بندوبست ہوگا رات دس بجے آپ نہیں آئیں گے تو احتجاجاً ہم بھی نہیں کھائیں گے اور دانے ضائع ہو جائیں، آئیے گا ضرور انتظار رہے گا۔

تحریر سید محمود علی، مرسلہ: تسنیم منیر علوی

سی رضا کو دیکھ رہی تھی۔

جہانگیر شاہ کے چہرے پر بھی اتنی ہی سختی تھی جتنی مہر ماہ کے چہرے پر تھی۔ البتہ سوہنی، حسنین اور شہلا شاکڈ سے ساری کارروائی دیکھ رہے تھے۔

رضا کی آنکھیں سرخ پڑنے لگی تھیں۔ بمشکل ہمتیں مجتمع کر کے اس نے ہاتھ گھمایا اور لہرا کر ہنٹر اس کی کمر پر مارا۔ پھر بِنا وقفے کے تین دفعہ اس نے ضرب لگائی، پھر تھک کر مہر ماہ کو دیکھا۔

''ابھی سے تھک گئے رضا؟ ابھی تو چہتر (74) کوڑے اور بھی مارنے ہیں۔''

''پلیز...... پلیز۔'' منال اسی طرح رو رہی تھی۔

رضا نے سختی سے آنکھیں میچیں اور ہنٹر لہرایا۔ منال کا رنگ خوف سے لٹھے کے مانند سفید پڑ چکا تھا۔ وہ ہنٹر لہراتے دیکھ کر ہی چیخنے لگی، اور بالآخر سوہنی ضبط کھو بیٹھی۔

''رحم...... مہر ماہ...... رحم کریں اس پر۔ وہ مر جائے گی۔'' اس نے ہاتھ جوڑ دیے۔ مہر ماہ نے ناگواری سے سوہنی کو دیکھا۔

''کیا ابھی تم نے سنا نہیں کہ اللہ نے تمہیں حدود کی سزا کے وقت مجرموں پر رحم کھانے سے منع کیا ہے؟''

''مگر مہر ماہ...... یہ واقعی پاپا کی......''

''ایک لفظ تم نے مزید کہا سوہنی تو اس بہتان کا بوجھ تم بھی اٹھاؤ گی اور یہی اسّی (80) کوڑے میں تمہیں بھی لگواؤں گی۔'' اور سوہنی کا تو گویا سانس خشک ہو گیا۔ وہ ادھ کھلے منہ کے ساتھ واپس جا بیٹھی۔

''تم اپنا کام جاری رکھو رضا...... تاکہ یہاں بیٹھے ہر شخص کو معلوم ہو کہ کسی پر تہمت لگانا بچوں کا کھیل نہیں ہوتا۔ بیٹھے رہو حسنین، اور یہ سزا دیکھو تاکہ زندگی میں کبھی تمہیں بھی کسی پر تہمت لگانے کی ہمت نہ ہو۔'' حسنین جو دلبرداشتہ ہو کر اٹھنے والا تھا، اس کی تنبیہہ پر بے بسی سے دوبارہ بیٹھ گیا۔

رضا کے ہاتھ اب لرز رہے تھے، اس نے بمشکل کلائی گھمائی تو ہنٹر لہرا کر منال کے دائیں شانے پر آ پڑا۔ وہ بلک بلک کر رو دی۔

''مجھے چھوڑ دو...... مجھے جانے دو۔'' مگر مہر ماہ اسے نہیں سن رہی تھی، وہ انگلیوں پر کوڑے گن رہی تھی۔

''سات۔''

رضا نے آنکھیں بند کر لیں اور پوری قوت سے ہنٹر آگے سے لہرایا۔ اب کے وہ منال کے گھٹنے پر لگا۔

''چھوڑو...... چھوڑو مجھے......'' وہ ہذیانی انداز میں چلّاتی کھڑی ہوئی تھی۔ ''تم مجھے نہیں مار سکتے، تم مجھے نہیں مار سکتے۔'' وہ لڑکھڑاتی ہوئی آگے بڑھی اور وحشیانہ انداز میں رضا کا گریبان پکڑ کر جھنجوڑا۔

''تم نے...... تم نے کہا تھا سب ٹھیک ہو جائے گا۔ تم نے کہا تھا بی جان رپورٹس پر یقین کر لیں گی۔ تم نے کہا تھا بی جان فوراً جائداد میں سے حصہ الگ کر دیں گی۔ اور اب...... اب تم مجھے مار رہے ہو؟ مہر ماہ بی بی...... یہ سب اس نے...... اسی نے کیا ہے......'' وہ اس کا گریبان پکڑے چلّا رہی تھی۔

رضا پتھر کا بت بنا کھڑا تھا، کوڑا کب اس کے ہاتھ سے فرش پر جا گرا تھا، اسے پتا بھی نہ چلا۔

''اس نے کہا تھا کہ شہلا بی بی شاہ پر شک کرتی ہیں۔ اگر میں ان کی ہمدردی لے لوں تو...... اور اس نے کہا تھا کہ یہ تب ہی مجھ سے شادی کرے گا جب میں شاہ کی بیٹی ثابت ہو کر شاہ کی جائداد کا ایک حصہ حاصل کروں۔ سارا منصوبہ اسی کا تھا۔ اس نے کہا تھا میری آنکھیں شاہ سے ملتی ہیں اور شاہ نے ترس کھا کر مری ماں کی بہت مدد کی تھی۔ شاہ مجھے بیٹی نہ تسلیم کرے، تب بھی اگر بی جان کو میرا یقین آ گیا تو فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔ اسے پتا تھا جہانگیر شاہ اپنی رپورٹس اس کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں نہیں دیں گے۔ مجھے جانے دو مہر ماہ بی بی۔ مجھے چھوڑ دو۔ مجھے معاف کر دو۔'' منال رو رو کر کہہ رہی تھی اور...... سب پھٹی پھٹی نگاہوں سے رضا کو دیکھ رہے تھے جو پتھر کا بت بنا کھڑا تھا۔ سوائے مہر ماہ کے، جو اسی سپاٹ تاثرات والے چہرے کے ساتھ بولی تھی۔

''تم پہلے ہی قذف کا ارتکاب کر چکی ہو۔ اب تمہاری گواہی تب ہی قبول ہوگی جب تم اپنے الزام کو جھٹلاؤ گی۔''

''میں جھٹلاتی ہوں، میں جھٹلاتی ہوں۔ میں نے جھوٹ بولا تھا۔ یہ ہم دونوں کا منصوبہ تھا۔ دولت کے لیے...... پیسے کے لیے...... رضا کے لیے۔'' وہ سسکیوں کے درمیان بے ربط فقرے ادا کر رہی تھی۔

''بجل...... میرو......'' مہر ماہ نے تحکم سے آواز لگائی۔ فوراً دو ملازم حاضر ہوئے تھے۔

''رضا صاحب کو لے جاؤ، ان کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے اور سلیمہ مائی کو بھیجو۔ اس لڑکی کو بقیہ کوڑے وہی لگائے گی۔ اس کی سزا ابھی ختم نہیں ہوئی، اور ایسا کر کے میں تمہیں آخرت کی سزا سے بچا رہی ہوں منال۔'' منال گھٹنوں کے بل فرش پر گر گئی۔ اس کا سر جھکا تھا اور وہ بے طرح سے رو رہی تھی۔ بت بنے رضا کو وہ دونوں ملازم اپنے ساتھ لے گئے تھے۔

''میرے خدایا...... تو کیا یہ سب جھوٹ تھا؟''

سوہنی کا سکتہ اب ٹوٹا تھا۔ اس نے بے اختیار دونوں ہاتھوں سے سر تھام لیا۔

''ہاں سوہنی، اور کاش تمہاری ماں نے تمہیں یہ سکھایا ہوتا کہ جب بھی کوئی کسی پر بدکاری کی تہمت لے کر آئے، تو اس کی شکل کی شباہت یا ڈی این اے ٹیسٹ کے بجائے چار گواہ مانگو۔'' مہر ماہ نے ایک جتاتی نگاہ شہلا پر ڈالی جو ندامت سے سر جھکائے بیٹھی تھیں۔ سامنے بیٹھے جہانگیر شاہ کے چہرے پر ڈھیروں حزن و ملال کے ساتھ اطمینان بھی تھا۔ برأت کا اطمینان۔

''مائی سلیمہ کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ کام میں بھی کر سکتا ہوں۔'' حسنین ایک دم اپنی جگہ سے اٹھا اور زمین پر گرا کوڑا اٹھا لیا۔ منال نے رحم طلب نظروں سے اسے دیکھا اور ہاتھ جوڑ دیے۔

''ترس مت کھاؤ حسنین، اور کلائی گھما کر کوڑے مارو۔ دھیان کرنا تمہارا بازو بغل سے جدا نہ ہو۔ اور اللہ کی حد نافذ کرتے ہوئے تمہیں اس پر ترس نہیں کھانا چاہیے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ اللہ کے بارے میں مہر ماہ کو کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں ہے۔ تمہیں بھی نہیں ہونی چاہیے۔''

''نہیں ہے...... مجھے کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہیں ہے اور مجھے رحم بھی نہیں آ رہا۔ یہ اسی سزا کی مستحق ہے مہر ماہ۔ اس کے ایک بہتان نے میری بی بی جان کی زندگی چھین لی ہے۔ اسے بھی پتا چلنا چاہیے کہ کسی پر تہمت لگانا چھوٹی بات نہیں ہوتی ہے۔'' ایک نفرت انگیز نگاہ اس پر ڈال کر حسنین نے کلائی گھمائی۔ منال نے کرب سے آنکھیں میچ لیں۔ وہ واقعی اس سزا کی مستحق تھی۔

''آٹھ...... نو...... دس۔'' مہر ماہ بہت سکون سے اپنی گنتی مکمل کر رہی تھی۔ منال کی سسکیاں ہال کمرے میں گونج رہی تھیں۔

گڈ مارننگ بیڈ مارننگ

سکینہ فرخ

نیند کی وادیوں سے بیداری کے چٹیل میدانوں تک کا سفر میں نے کچھ عجیب وغریب قسم کی آوازیں سنتے ہوئے طے کیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی خاتون تیز لہجے میں کسی کو کھری کھری سنا رہی ہے...... جب آنکھیں کافی حد تک کھلنے میں کامیاب ہوئیں تو اندازہ ہوا کہ ٹی وی چل رہا ہے اور یہ آواز اس کے اندر سے برآمد ہو رہی ہے...... ہوش وحواس کی دنیا میں آتے آتے اور نیند کے خمار سے پوری طرح آزاد ہونے میں مجھے چند لمحے اور لگے۔

”میں کہاں ہوں......؟“ ایک نظر اطراف میں ڈالی تو خود کو ایک سجے سجائے مہکتے ہوئے کمرے میں پایا، یہ کمرا میرے پھیلے ہوئے بے ترتیب اور فضول سے کمرے سے بالکل مختلف تھا، اچانک ہی کسی کی چوڑیوں کی کھنک بھی ماحول کا حصہ بن گئی، میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا...... سامنے بیٹھی ہوئی نازنین پر نظر پڑتے ہی مجھے سب کچھ یاد آگیا...... کل ہی تو میرے سہرے کے پھول کھلے تھے، مطلب شادی خانہ آبادی ہوئی تھی اور یہ شادی کے بعد پہلی روشن صبح تھی۔ میں نے مسکرا کر دلہن کی طرف دیکھا جو میری اچھل کود اور ہونق پن کا مظاہرہ دیکھ کر قدرے حیران نظر آرہی تھی۔ جان جائے گی آہستہ آہستہ کہ صبح اٹھنا میرے لیے کتنا مشکل کام ہے، جاگنے کے بعد آدھے گھنٹے تک تو میں اپنی گمشدہ یادداشت واپس لانے کے لیے بیڈ پر اینڈتا ہی رہتا ہوں اس کے بعد دھیرے دھیرے مجھے باتیں یاد آتی ہیں، خیر یہ تو بعد کی بات ہے...... میری مسکراہٹ کا جواب دلہن نے شرما کر دیا۔

”جاگ گئے آپ......؟“ اس کا شرمایا لجایا لہجہ میرے کانوں میں جلترنگ بجانے لگا...... نئی نویلی کا لحاظ کرتے ہوئے میں یہ کہنے کے بجائے کہ جاگا تو نہیں جگایا گیا ہوں، فقط یہی کہہ پایا۔

”ہاں میں جاگ گیا ہوں۔“

”تو اٹھیے ناں...... مارننگ شو شروع ہو چکا ہے...... مارننگ شو دیکھتے ہیں ناں آپ......؟ ہر چینل سے صبح صبح اتنے مزے کے مارننگ شوز آتے ہیں......“ وہ پُرجوش لہجے میں بولی۔

”مارننگ شو......؟“ میں نے حیران ہو کے ٹی وی کی طرف دیکھا جہاں ایک محترمہ لہک لہک کر مسلسل کچھ کہے ہی جا رہی تھیں، وہ انہی کی آواز زیر و بم تھا بلکہ صرف بم تھا جو میرے اوپر گرا کے مجھے جبری طور پر بیدار کیا گیا۔

”آپ مارننگ شو نہیں دیکھتے؟“ اُدھر سے حیرت کا اظہار ہوا۔

”بچپن میں کارٹون دیکھتا تھا...... اب وقت مل جائے تو اسپورٹس کے پروگرام دیکھ لیتا ہوں مگر مارننگ شو یا ایوننگ شو کے بارے میں میری معلومات ناقص ہیں۔“ میں نے اعتراف کرتے ہوئے کہا۔

”اوہو...... خیر کوئی بات نہیں، اب میرے ساتھ دیکھیے گا تو آپ کو پتا چلے گا آپ اب تک کتنا دلچسپ پروگرام مس کرتے رہے ہیں۔ میں مارننگ شوز بہت شوق سے دیکھتی ہوں، جب کالج جایا کرتی تھی تو رات میں ری پیٹ ٹیلی کاسٹ دیکھا کرتی تھی اور اب تو روز لائیو دیکھا کروں گی وہ بھی اپنے کمرے میں آرام سے بیٹھ کر۔ سچی کتنا مزہ آئے گا۔“ وہ بچوں کی طرح خوش ہو کے بولی۔

کمرے میں صرف ٹی وی ہی نہیں بلکہ فرنیچر، فریج اور اے سی بھی اس کے جہیز کا تھا اور اسے پورا حق حاصل تھا کہ وہ ان چیزوں کو جیسے چاہے استعمال کرے، میں سر پہ ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔

”مگر میں تو روزانہ آفس میں ہوں گا اس وقت تو......“

”کوئی بات نہیں جب تک چھٹی ہے تب تک تو دیکھ سکتے ہیں ناں...... یہ دیکھیں یہ میری سب سے پسندیدہ ہوسٹ ہے شائستہ خان شارق، اس کے سارے فینز اسے پیار سے شانو کہتے ہیں۔ میں ہر صبح صرف اس کا شو دیکھتی ہوں۔“ میں نے ٹی وی اسکرین پر انتہائی بھڑک دار لباس، بھاری جیولری اور ہیوی میک اپ سے آراستہ اس خاتون کو دیکھا جو



لہک لہک کر کچھ فرما رہی تھیں مگر اُن کا کوئی جملہ میرے پلے نہ پڑا...... عجیب بے ربط سی گفتگو تھی۔

''اُف اتنا مزہ آیا کہ آپ کو بتا نہیں سکتی، کل بڑے دنوں کے بعد شارق ہم سب کو گھمانے سی سائڈ لے گئے، پھر پزا کھلایا اور اس کے بعد شاپنگ بھی کروائی۔ گڈو تو بے حد خوش تھا مگر ببلی بے چاری کو زکام ہوگیا، کچھ طبیعت میری بھی خراب ہے، گلا بیٹھا ہوا ہے خیر کوئی بات نہیں گلا بیٹھا ہوا ہے تو کیا ہوا، میں خود تو کھڑی ہوئی ہوں آپ کے سامنے ...... ہاہاہا۔'' وہ ہنستے ہوئے دُہری ہوگئیں۔ ''اور ہاں ایک بات اور میرے اس سی سائڈ ٹرپ کی تصویریں اگر آپ کو دیکھنی ہوں تو نیٹ پر دیکھی جا سکتی ہیں، بچے بڑے کیوٹ لگ رہے تھے اور شارق، وہ تو ہیں ہی اسمارٹ اور اپنی کیا بات کروں آپ کے سامنے ہی ہوں۔'' وہ اٹھلائیں۔

''کیا یہ پروگرام کی ہوسٹ ہیں...... یہ تو اپنی ہی روداد سنائے جا رہی ہیں، بھئی کسی کو اس سے کیا کہ انہوں نے اپنے گھر میں کیا کیا......؟'' میں حیران ہو کے بولا۔

''کتنا نیچرل انداز ہے، پہلے کی طرح بناوٹی پروگرام اب نہیں ہوتے جس میں میزبان رٹے رٹائے جملے بولا کرتے تھے۔'' بیگم صاحبہ کو ہماری بات پسند نہیں آئی۔

''تو آپ لوگ ایس ایم ایس کرتے رہیے گا، یاد رکھیے جتنے زیادہ ایس ایم ایس اتنے ہی زیادہ جیتنے کے مواقع...... اور بھئی جب گفٹ اتنا زبردست ہو تو آپ کا رسپانس بھی تو ایسا ہی ہونا چاہیے...... تو ملتے ہیں اب ایک چھوٹی سی بریک کے بعد۔''

''ناشتا کریں گے آپ؟'' نئی نویلی بیگم صاحبہ مسکرا کے ہماری طرف پلٹیں۔

چھٹی کے دن صبح سویرے ناشتے کا خیال ہی روح فرسا تھا...... چھٹی اور وہ بھی شادی شدہ دنوں کی پہلی پہلی صبح۔

''ارے نہیں، آپ آرام سے اپنا شو دیکھیں، ناشتا وغیرہ تو ہوتا ہی رہے گا، ویسے بھی آپ نئی نویلی دلہن ہیں......'' ہم نے موقع غنیمت دیکھ کر انہیں کچھ یاد دلانا چاہا۔

''نہیں، نہیں اس سے کیا فرق پڑتا ہے اور اب تو بریک آگئی ہے، میری امی ان بریکوں کے دوران ناشتا ہی کیا کھانا تک بنا لیا کرتی ہیں اور جو کبھی میں صبح میں کالج کی چھٹی کی وجہ سے گھر میں ہوتی تھی اور یہ پروگرام دیکھ رہی ہوتی تھی تو میں پہلی بریک کے دوران باتھ روم جا کر فریش اپ ہوتی تھی اور اگلی بریک کے دوران ناشتا کر لیا کرتی تھی، آخر یہ بے چارے اتنی بریکیں اور کس لیے دیتے ہیں، اسی لیے ناں کہ ہم اپنا ضروری کام اس دوران نبٹا لیں، بڑے سمجھدار لوگ ہیں۔''

''اوہو، واقعی یہ تو بڑی سمجھداری کا کام ہے اور آپ بھی بے حد سمجھدار ہیں۔'' ہم نے اپنی نیند سے بوجھل ہوتی ہوئی پلکوں کو بہ مشکل تمام اٹھاتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ آپ ہمیں آپ، آپ کیوں بولے جا رہے ہیں، سیدھی طرح نام لیں نا ہمارا۔ ضوفشاں تبسم، ویسے آپ ضوفی بھی کہہ سکتے ہیں۔'' ضوفی مسکرائیں۔

''تو پھر تم بھی مجھے میرے نام سے بلاؤ، فیضان......'' میں نے بے تکلفی کا مظاہرہ کیا۔

''اوکے...... میں آپ کو فیضو بلاؤں گی...... ٹھیک ہے ناں، ویسے بھی میرا دم گھٹتا ہے تکلف برتنے سے۔'' وہ خوش ہو کے بولی۔

''فیضو......'' میرے حلق میں کوئی چیز پھنسنے لگی...... اس نام کے صوتی اثرات انتہائی غیر رومانوی تھے۔

''اوہو وقفہ ختم ہوگیا......'' ضوفی دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوگئی۔

''ویلکم بیک ناظرین...... تو اب آپ بے چینی سے انتظار کر رہے ہوں گے ہمارے آج کے گیسٹ کا...... جی ہاں بالکل آج کا دن نام کیا ہے ڈاکٹر وجاہت آفندی کے ...... بہت بہت خوش آمدید ڈاکٹر صاحب کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت نکال کے دوبارہ ہمارے شو میں آنے کی زحمت کی، پچھلی مرتبہ آپ سے کافی سیر حاصل گفتگو ہوئی مگر جو تشنگی رہ گئی تھی ہم وہ آج دور کرنے کی کوشش کریں گے، ویسے کیسے ہیں آپ......؟'' شانو نے ایک سانس میں جملہ بلکہ پیراگراف مکمل کیا۔

''جی الحمدللہ، میں ٹھیک ہوں۔'' ڈاکٹر صاحب سنجیدگی سے بولے۔

''ڈاکٹر صاحب جب آپ پچھلی بار آئے تھے تو آپ نے بلو سوٹ پہنا ہوا تھا، آج بھی آپ کے سوٹ کا رنگ نیلا ہی ہے...... تو کیا کوئی خاص بات ہے جو آپ ہمیشہ یہی کلر پہنتے ہیں یا آپ کو یہ رنگ ہی بہت پسند ہے؟'' ڈاکٹر صاحب جھینپے انداز میں کرسی پہ پہلو بدل کر رہ گئے...... انہوں نے اس عقلمندانہ سوال کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

''چلیں چھوڑیں نہ بتائیں، یہ بتائیں کہ آج کل وائرل انفیکشن پھیلے ہوئے ہیں، جس کو دیکھو بیمار پھر رہا ہے، ڈاکٹروں کا کاروبار تو خوب چل رہا ہوگا، آپ کے پاس بھی ڈھیروں مریض آ رہے ہوں گے۔'' شانو نے اپنی دانست میں مذاق کیا ہوگا مگر ڈاکٹر صاحب قدرے برا منا گئے اور محض کندھے اچکا کے موصوفہ کو گھور کے رہ گئے۔

''اوہو، ڈاکٹر صاحب آپ تو کسی سوال کا جواب ہی نہیں دے رہے ہیں، کہیں صبح صبح بھابی سے لڑ کے تو نہیں آئے ہیں، بھئی میرا تو یہی کہنا ہے کہ میاؤں کو ہمیشہ بیویوں سے بنا کر رکھنی چاہیے۔ ان کی فرمائشیں پوری کرتے رہنا چاہیے، انہیں شاپنگ کروانا اور باہر کھلانا بہت ضروری ہے، شکر ہے شارق میری ہر بات مانتے ہیں، نہیں مانیں گے تو جائیں گے کہاں......؟ اس بار میری فرمائش پر وہ گرمیوں کی چھٹیوں میں ہمیں انگلینڈ لے کر جانے والے ہیں، ان کی بڑی خالہ ہوتی ہیں نا وہاں اس لیے رہنے اور کھانے کا مسئلہ تو ہوگیا حل، اب رہا ٹکٹ تو وہ بھئی ہمیں اپنی جیب سے ہی لینا پڑے گا۔ آپ بتائیں آپ کا کہاں جانے کا پروگرام ہے، بھئی ڈاکٹروں کے تو مزے ہوتے ہیں دواؤں کی کمپنیاں مفت میں سیریں کرواتی ہیں بس ان کی دواؤں کے نام زیادہ سے زیادہ مریضوں کے نسخوں پر لکھیں اور پوری دنیا گھوم آئیں، میرے چچا بھی ڈاکٹر ہیں، اس سال وہ سنگاپور جا رہے ہیں۔'' شانو خوشی سے بولیں۔ اس بار ڈاکٹر صاحب کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔

''معاف کیجیے گا میں ان بے ضمیر ڈاکٹروں میں سے نہیں ہوں جو اپنے مفاد کی خاطر مریضوں کا خون چوستے ہیں اور انہیں گھٹیا معیار کی مہنگی اور غیر ضروری دوائیں محض اس لیے زبردستی تجویز کرتے ہیں کہ انہوں نے اس دوا کی کمپنی سے کوئی مالی فائدہ حاصل کیا ہوتا ہے، یہ شوق آپ کے چچا اور ان کے جیسے ڈاکٹروں کو ہی مبارک ہو۔'' وہ ہتھے سے اکھڑ گئے۔

''ارے، ارے...... ناراض مت ہوں، میں تو

مذاق کررہی تھی ......" شانو گھبرا گئیں۔ "ایک بریک آگئی ہے...... آپ انتظار کریں ہم ابھی آتے ہیں۔" شانو کو اب ڈاکٹر صاحب کو منانا بھی تو تھا۔ ضوفی ٹی وی کا والیم بند کرتے ہوئے پھر میری طرف متوجہ ہوئی۔

"صحیح تو کہا تھا بے چاری نے، ڈاکٹر صاحب خوامخواہ ناراض ہوئے۔"

"بھئی وہ ایسے نہیں ہوں گے، ہر فیلڈ میں اچھے برے دونوں اقسام کے لوگ جمع ہوتے ہیں، ہم محض چند بے ایمان لوگوں کی وجہ سے اسی فیلڈ کے ایماندار لوگوں یا اس فیلڈ کو برا کہنے لگیں تو یہ جائز بات نہیں۔" میں نے سیدھی سی بات کی۔

"ہاں کہتے تو آپ ٹھیک ہیں مگر بات وہی ہوجاتی ہے کہ ایک مچھلی سارے تالاب کو گندا کردیتی ہے۔" ضوفی نے فلاسفی جھاڑی۔

"ارے تم صبح صبح کیسی باتیں لے بیٹھی ہو، چھوڑو یہ سب...... آؤ ہم اپنی باتیں کرتے ہیں، تم کچھ میری سنو، میں کچھ تمہاری سنوں اپنی نئی زندگی کا آغاز اپنی باتوں سے کرنا چاہیے، دوسروں کی سننے کو تو عمر پڑی ہے۔" میں نے مسکرا کر ضوفی کو دیکھا۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی، میں چونک گیا۔ نئے نویلے جوڑے کو تو کوئی ڈسٹرب نہیں کرتا، یہ بات میرے علم میں تھی...... پھر یہ صبح صبح کون آگیا۔ دروازہ کھولا سامنے مسکراتی ہوئی بھابی کھڑی تھیں۔

"ارے بھئی بہت سحر خیز جوڑا ہے، تم لوگ اتنی جلدی جاگ گئے۔ میں نے ٹی وی کی آواز سنی تو سوچا اگر تم جاگ ہی چکے ہو تو تمہیں ناشتا کروادوں، ارے بھئی اصل ناشتا تو ضوفشاں کے گھر والے لے کر آئیں گے یہ تو بس تھوڑا بہت شغل کا سامان ہے۔" وہ ٹرے میز پر رکھتے ہوئے بولیں۔ ضوفشاں نے انہیں سلام کیا...... انہوں نے اسے جواب دیتے ہوئے کہا۔

"مجھے خوشی ہوئی یہ دیکھ کر کہ تمہیں دیر تک سونے کی لت نہیں، بہت اچھی بات ہے، جو خواتین اور لڑکیاں سحر خیز ہوتی ہیں ان کے گھروں کا نظم ونسق کبھی نہیں بگڑتا، ہر کام وقت پر اور بڑے آرام سے ہوجاتا ہے خود ان کی زندگیوں میں بھی بڑا توازن رہتا ہے۔"

"بس بھابی کیا کروں سارے مارننگ شو نو بجے شروع ہوجاتے ہیں، مجبوری ہے دیکھنا بھی ضروری ہوتا ہے ناں اسی لیے جاگ جاتی ہوں......" وقفہ ختم ہوچکا تھا اور ضوفی دوبارہ ٹی وی کی طرف متوجہ ہوچکی تھی۔ بھابی نے حیرانی سے میری طرف دیکھا...... میں سٹپٹا گیا۔

"بہت بہت شکریہ بھابی، واقعی اس وقت چائے کی طلب ہورہی تھی۔" میں نے کن انکھیوں سے بیوی اور ٹی وی کو دیکھتے ہوئے بھابی سے کہا۔

"کوئی بات نہیں، شکریہ کی کیا ضرورت ہے۔" بھابی کمرے سے باہر چلی گئیں۔

"کچھ کھالو ضوفی۔" میں نے سینڈوچ کی پلیٹ اس کی جانب بڑھائی۔

آج اس کی میرے گھر میں پہلی صبح تھی، اس کی خاطر تواضع میرا فرض تھا، بعد میں تو اسی کو مجھے ناشتا کروانا تھا ساری زندگی میرا خیال رکھنا تھا۔ مجھے یہ سوچ کر گدگدی سی ہونے لگی کہ میں ایک عدد بیوی کا شوہر بن چکا ہوں، ایک دم مجھے اپنا آپ بڑا معزز معزز سا محسوس ہونے لگا مگر فی الحال بیوی مجھے لفٹ کروانے کے بجائے ٹی وی دیکھ رہی تھی، چاروناچار میں بھی چائے کا کپ ہاتھوں میں تھام کے ٹی وی کی طرف

متوجہ ہوگیا۔ شانو صاحبہ واپس آچکی تھیں اور ان کی ٹرین چل رہی تھی۔

"یہ جو الرجی کے خوفناک واقعات میں نے آپ کو سنائے ہیں اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارا آج کا ٹاپک ہے "الرجی۔" "جی تو ڈاکٹر صاحب آپ اس مرض کے متعلق لوگوں کا آگاہ کریں تاکہ ہماری عوام میں شعور بیدار ہو۔" ڈاکٹر صاحب کو بریک کے دوران شاید اچھی طرح منالیا گیا تھا کیونکہ ان کا پھولا ہوا منہ اپنی اصل حالت میں واپس آچکا تھا، انہوں نے کھنکھار کے گلا صاف کیا اور گویا ہوئے۔

"جی ہاں! الرجی دراصل ایک ایسی بیماری ہے جس میں بیرونی عوامل کی وجہ سے جسم کا مدافعاتی نظام......"

"معاف کیجیے گا ڈاکٹر صاحب، ایک کالر ہمارے ساتھ کافی دیر سے ہولڈ پر ہیں۔" شانو نے ڈاکٹر صاحب کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"جی تو کون ہے ہمارے ساتھ۔" دوسری جانب سے آواز آئی۔

"میں آسیہ بانو بول رہی ہوں۔"

"آپ کہاں سے بول رہی ہیں۔"

"جی، میں منہ سے بول رہی ہوں۔" وہ حیرت زدہ سی بولیں۔

"اوہو، بھئی منہ سے تو سب ہی بولتے ہیں، میرا مطلب ہے کہ آپ کس شہر سے بول رہی ہیں۔"

"تو ایسا پوچھیں ناں مگر میں کس شہر سے بول رہی ہوں یہ جان کر آپ کیا کریں گی، کیا آپ کو میرے گھر آنا ہے......؟"

"ٹھیک ہے نہ بتائیں مگر یہ تو بتادیں کہ آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں۔" شانو بیگم کو بھی کسی نے زچ کیا...... مجھے خوشی ہوئی۔

"میں کیوں پوچھوں، مجھے سب پتا ہے فون اس لیے کیا تھا کہ یہ بتانا تھا کہ آپ کا شو مجھے بہت پسند ہے، آپ کے کپڑے مجھے بہت اچھے لگتے ہیں اور وہ جو کونے والی میز پر گلدان رکھا ہوا ہے ویسا ہی میرے گھر میں بھی ہے، مجھے بہت شوق ہے جی ان چیزوں کا اور ہاں آپ لپ اسٹک ہلکے رنگ کی لگایا کریں آج کل فیشن نہیں ہے تیز تیز لپ اسٹکوں کا، کمال ہے پروگرام آپ کررہی ہیں اور بتانا مجھے پڑ رہا ہے۔"

"بہت بہت شکریہ شو پسند کرنے کا۔ میرے کپڑے آپ کو اچھے اسی لیے لگتے ہیں کہ میں اپنے کپڑے خود ہی ڈیزائن کرتی ہوں، اس معاملے میں میرا ذوق بہت اعلیٰ ہے۔" شانو نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈاکٹر صاحب بت بنے بیٹھے ہوئے تھے۔

"جی ہاں ڈاکٹر صاحب آپ کی طرف آتے ہیں...... تو آپ کچھ کہہ رہے تھے الرجی کے بارے میں......" میرے کان ایک بار پھر کھڑے ہوئے، الرجی میرا پرانا مسئلہ تھا۔

"جی ہاں، میں بتارہا تھا کہ الرجی دراصل......"

"اوہو، ڈاکٹر صاحب معاف کیجیے ایک کالر اور ہیں۔"

"جی کون اور کہاں سے؟"

"میں ارشد خان بات کررہا ہوں لاہور سے۔" کالر نے جواب دیا۔

"زندہ باد لاہور...... کیسا ہے لاہور اور اس کے مزے مزے کے کھانے، میں بچپن میں ایک دفعہ لاہور گئی تھی بڑا مزہ آیا تھا۔"

"لاہور تو ٹھیک ہے جی، کھانے بھی وہی ہیں مگر میں بڑا پریشان ہوں، میرا بچہ الرجی کا شکار ہے

اس کی بات کرنی تھی ڈاکٹر صاحب سے۔'' ارشد صاحب چڑ کر بولے۔

''ہاں، ہاں ڈاکٹر صاحب کو ہم نے آپ ہی کے لیے تو یہاں زحمت دی ہے، فرمائیں کیا مسئلہ ہے۔''

''اس کو جی جلد کی پرابلم ہے...... بڑے بڑے دانے نکل آتے ہیں، سرخ سرخ دھبے پڑ جاتے ہیں اور آنکھیں سرخ ہوجاتی ہیں جن میں سے مسلسل پانی بہتا رہتا ہے۔'' ارشد صاحب رونی آواز میں بولے۔

''کیا عمر ہے بچے کی......؟'' ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

''جی وہ آٹھ سال کا ہے، بڑا علاج کروایا کوئی فائدہ نہیں ہوا۔''

''میں بتاتا ہوں آپ پریشان نہ ہوں......... دراصل آپ کے بچے کو الرجی ہی کا مسئلہ ہے اور وہ کوئی ایسی غذا کھالیتا ہے جس کی وجہ سے یہ مسئلہ ہوجاتا ہے، آپ سب سے پہلے تو یہ جاننے کی کوشش کریں کہ وہ ایسی کون سی چیز کھاتا ہے جس کے کھانے کے بعد یہ حال ہوتا ہے پھر......''

''کون کس حال میں ہے یہ ضرور جانیں گے ڈاکٹر صاحب ہم آپ کی بات ضرور سنیں گے...... مگر ایک بریک سے واپس آنے کے بعد......'' شانو نے اسٹائل سے گردن کو جھٹکا دیا۔ ''آپ کہیں مت جائیے گا...... بس ہم ابھی واپس آتے ہیں۔''

''میں تو ضرور جاؤں گا چاہے آپ واپس آئیں یا نہیں آئیں۔'' میں دل میں پروگرام کو کوستا ہوا اٹھ کھڑا ہوا...... کتنا خوش ہوا تھا میں کہ مجھے اپنی دیرینہ بیماری کے متعلق کچھ معلومات حاصل ہونے جارہی ہیں شاید میرا کوئی فائدہ ہی ہوجائے۔ موسم بہار میں بھی تو ہر سال شدید الرجی کا شکار ہوجایا کرتا تھا مگر......

''کہاں جارہے ہیں آپ......؟'' ضوفی مجھے بیڈ سے اترتا دیکھ کر بولی۔

''واش روم...... فریش اپ ہونے کے لیے۔'' میں نے اسے جواب دیا۔ جب تسلی کے ساتھ سارے ضروری کاموں سے فارغ ہو کے باہر آیا تو وقفہ ختم ہوچکا تھا اور بیگم صاحبہ اسی انہماک کے ساتھ اسکرین پر نظریں جمائے بیٹھی تھیں۔

''ضوفی تم بھی فریش ہو کے تیار ہوجاؤ، تمہارے گھر والے بھی آتے ہی ہوں گے۔'' میں نے اسے اس سحر سے آزاد کروانے کی ایک کوشش کی۔

''بس یہ شو ختم ہوجائے پھر میں تیار ہوجاتی ہوں۔'' وہ جلدی سے بولی۔ میں نے ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑے ہو کے بال سنوارے، خود پر پرفیوم انڈیلا اور مجبوراً وہیں کرسی پر بیٹھ گیا...... ضوفی کے بغیر اکیلے باہر جانا بھی مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا اور یہاں بیٹھ کر ٹی وی دیکھنا بھی کوفت کا سبب تھا۔

''ہاں تو ڈاکٹر صاحب ان کالر صاحب کیا نام تھا ان کا، ارشد کے مسئلے کی طرف آتے ہیں مگر ایک منٹ ایک کالر اور ہیں۔ جی تو کون ہے اور کہاں سے؟''

''جی شاہدہ بول رہی ہوں صدر کراچی سے۔''

''جی شاہدہ جی کیا مسئلہ ہے آپ کا......؟''

''میں پچھلے دس سالوں سے الرجی کی مریضہ ہوں، جب تک دوائیں کھاتی ہوں تو ٹھیک رہتی ہوں جہاں دوائیں بند کیں پھر وہی حال...... آخر کوئی کب تک دوا کھائے......'' وہ بیزار سی بولیں۔

''شاہدہ صاحبہ...... اتفاقاً میرا کلینک بھی صدر ہی میں ہے، آپ وہاں تشریف لے آئیں، میں

آپ کے کچھ ٹیسٹ کرواؤں گا پھر دوا تجویز کروں گا۔'' ڈاکٹر صاحب جلدی جلدی بولے۔

''دیکھا شاہدہ صاحبہ آپ کا مسئلہ کیسا حل ہوا...... بھئی ڈاکٹر وجاہت کی اپائنٹمنٹ کے لیے لوگ ترستے ہیں آپ خوش نصیب ہیں کہ گھر بیٹھے مسئلہ حل ہوا۔ جی ڈاکٹر صاحب وہ پہلے والے کالر کے بچے کے مسئلے کا حل...... بے چارے بڑی دیر سے انتظار کررہے ہوں گے۔''

''جی ہاں، میں بھی انہی کے بارے میں بتانا چاہ رہا تھا دراصل یہ بہت تکلیف دہ سچویشن ہوجاتی ہے۔ انہیں میں یہی مشورہ دوں گا کہ......''

''پتا ہے ڈاکٹر صاحب میرے بچپن میں میرے پڑوس میں بھی ایک بچہ ایسا رہتا تھا، بے چارے کے جسم پر سرخ سرخ دھبے اور دانے تھے کہ وہ قمیص بھی پہن نہیں پاتا تھا، اس کی سرخ سرخ آنکھوں سے ہر وقت پانی بہتا رہتا تھا۔ ہم سب اس سے ڈرتے تھے اور اسے بھوت بھوت کہہ کر بلاتے تھے، اب پتا چلا کہ بے چارہ الرجی کا شکار تھا...... بچپن کے دن بھی کتنے معصوم سے ہوتے ہیں نہ کچھ پتا ہوتا ہے نہ کوئی کام کرنا پڑتا ہے...... ہائے میرا بچپن......'' ڈاکٹر صاحب کی بات کاٹ کے شانو ایک دم استغراق میں چلی گئیں۔ جب واپس آئیں تو جھٹ بولیں۔

''ایک چھوٹی سی بریک...... آپ سب اس بریک میں اپنے بچپن کو ضرور یاد کیجیے گا...... میں بھی یہی کرتی ہوں۔'' مجھے لگا جیسے میرا بلڈ پریشر ایک دم بڑھنے لگا ہے اور جسم پر سرخ سرخ دھبے نمودار ہونے لگے ہیں۔

''آج لائٹ کیوں نہیں جارہی ہے، روز تو ہر وقت جب نہ ہو تب چلی جایا کرتی ہے۔'' میں نے

غزل

ضبط ہی تو محبت ہے ، مانا ہم نے
یہ ہی تو اصولِ الفت ہے ، جانا ہم نے
وجود رکھتے ہو تم مگر راکھ کی صورت
کم دیکھا، راکھ بن کر سانس میں سمانا ہم نے
رات بھر چاند کو تکنا اور چپ رہنا
بہت چاہا تم کو تم سے ملانا ہم نے
رہتے ہو کیوں بن بانسی کی صورت
بس کرو اب اور نہیں سننا نہ نہ ہم نے
عجب گستاخی کی ہے خضرؔ تم نے
اب لفظ محبت ، کسے سمجھانا ہم نے

شاعر: محمد امین خضرؔ

مرسلہ: صائمہ امین، لاہور

غصے سے ٹی وی کو گھورا۔ ضوفی شانو کے پروگرام پہ حرف بہ حرف عمل کرنے کو تیار بیٹھی تھی۔

''کتنے اچھے ہوتے ہیں ناں بچپن کے دن...... اس نے میرے کندھے پہ سر ٹکا کے سسکی لی...... اگر وہ ویسے ہی میرے کندھے سے سر ٹکاتی تو میں خوشی سے جھوم اٹھتا مگر یہ صورتِ حال کچھ پریشان کن تھی۔

''ہاں، ہاں سب ہی کے بچپن کے دن بہت اچھے ہوتے ہیں مگر جوانی بھی کوئی ایسی بری چیز نہیں۔'' میں نے نرمی سے اس کی پیٹھ تھپکتے ہوئے کہا۔

''ہاں، مگر بچپن کی نادانیاں، کھیل کود، شرارتیں سب سے اچھی ہوتی ہیں۔ مجھے میرے امی ابو یاد آرہے ہیں......'' ضوفی نے ایک دم رونا شروع کردیا۔

"ارے، ارے یہ کیا بھئی...... ابھی تمہاری بہنیں اور بھابیاں آتی ہی ہوں گی، تم ان کے ساتھ چلی جاؤ گی، اپنی امی اور ابو سے مل لینا۔" میں گھبرا کے بولا۔

"مگر اب تو مجھے یہاں رہنا ہوگا، ان کے پاس تو نہیں رہوں گی ناں......" اس کے رونے میں اور شدت آگئی۔

"تمہارا میکا یہاں سے اتنا قریب ہے...... جب جی چاہے چلی جانا مل آنا، جب چاہو وہاں رک جانا میری طرف سے کوئی پابندی نہیں ہے۔" میں نے اسی لمحے عظیم شوہر بننے کا ارادہ کرلیا۔

"آپ بہت اچھے ہیں فیفو......" اس نے شرما کے کہا اور مجھے ایک دم پھندا سا لگ گیا اور میں کھانسنے لگا۔

"یہ لیں، پانی پی لیں۔" اس نے فوراً پانی کا گلاس میری جانب بڑھایا اور میں سارا پانی پی گیا مگر "فیفو" بدستور حلق میں پھنسا ہی رہا۔

"ویلکم بیک ناظرین......" شانو کی چہکتی ہوئی آواز سنائی دی۔ شو شروع ہو چکا تھا اور وہ محترمہ اپنے آنسو پونچھ کر واپس آچکی تھیں مگر میری بیگم بدستور اداس تھی...... مجھے ایک دم اس خاتون پر غصہ آنے لگا جس نے میری ہنستی بولتی بیوی کو اداس کر دیا تھا۔

"جی جناب تو اب وقت ہوگیا ہے اس لکی ونر کا نام بتانے کا جس کو آج ملنے جا رہا ہے ہمارا آج کا گفٹ ہیمپر...... گفٹ ہیمپر کے اندر کیا ہے...... یہ تو صرف اسی کو پتا چلے گا جسے ملنے جا رہا ہے باقی اگر جاننا چاہتے ہیں تو کرتے رہیں ہمیں ایس ایم ایس زیادہ سے زیادہ تاکہ ہمارے اگلے ونر آپ ہوں۔ تو آج کی خوش نصیب خاتون جنہیں گفٹ دیا جا رہا ہے وہ ہیں راولپنڈی کی ماریہ کمال، ان کو ہماری جانب سے دلی مبارک باد......" انہوں نے میز پر رکھے چھوٹے سے ڈبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے خوش ہو کر بتایا۔

"ماریہ کا کہنا ہے کہ وہ میری بہت بڑی فین ہیں...... میں آپ کو بتاؤں میں کتنی خوش نصیب ہوں کہ میرے فینز کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ میں خود حیران ہو جاتی ہوں، آپ لوگ مجھ سے اتنی محبت کرتے ہیں، اس کا اندازہ مجھے آپ کی فون کالز، ایس ایم ایس اور ای میلز سے ہوتا ہے۔ بس ایک میرے گھر والوں کو ہی میری قدر نہیں ہے، خیر جانے دیں، کیا رکھا ہے ان سب باتوں میں، ہمیں اچھا اچھا سوچنا اور کہنا چاہیے اور خوشیاں بانٹنی چاہئیں۔ جیسے مجھے یقین ہے کہ آپ ہمارا پروگرام دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں...... تو ڈاکٹر صاحب اب وقت ہوگیا ہے اجازت لینے کا...... آپ کا بہت بہت شکریہ آپ نے اپنے قیمتی وقت میں سے کچھ لمحے ہمارے لیے نکالے اور اتنی مفید گفتگو کی۔ امید ہے کہ ان معلومات سے بہت سے لوگوں کا بھلا ہوا ہوگا اور یہی ہمارا مقصد ہے، ہم مشہور و معروف ہستیوں کو اپنے چینل کے ذریعہ عوام تک پہنچا دیتے ہیں تاکہ ان کے مسئلے حل ہوں، تاہم مجھے لگتا ہے کہ آج بھی تشنگی پوری طرح مٹی نہیں لہٰذا اگلے جمعہ کو ڈاکٹر صاحب ہم آپ کو ایک بار پھر زحمت دیں گے......" اونگھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ان کی تقریر کے جواب میں کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا محض سر ہلا کر رہ گئے، بے چارے کو اس سے زیادہ اور کچھ کرنے کا موقع بھی نہیں ملنے والا تھا۔

"تو کل ایک نئے مہمان، نئے موضوع، نئے گفٹ اور جی ہاں ایک نئے دن کے ساتھ ہم آپ کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوں گے...... بائے بائے۔" وہ سر ہلاتی ہاتھ لہراتی رخصت ہوئیں اور میں نے شکر کی سانس لی۔

"ہوگیا ختم شو؟" میں نے دل کے مزید اطمینان کے لیے ضوفی کی طرف دیکھا۔

"ہاں...... کتنا اچھا تھا ناں...... شانو کے کپڑے اچھے تھے، کتنا اچھا بولتی ہے وہ، مزہ آجاتا ہے۔" ضوفی شائستہ خان شارق کی تعریف میں رطب اللسان نظر آرہی تھی۔

"اچھے کا تو پتا نہیں البتہ بہت زیادہ بولتی ہے اتنا بولتی ہے کہ باقی سب کی بولتی بند کروا دیتی ہے۔" میں چڑ کر بولا۔

"چلیں شو تو اچھا لگا آپ کو......" ضوفی تعریف سننے پر بضد تھی۔

"ہاں، شو تو بہت اچھا تھا بس ایک خرابی تھی......" میں نے خفگی سے کہا۔

"کیا خرابی تھی...... مجھے بتائیں، میں شانو کو فون کر کے آپ کی رائے پہنچا دوں گی۔" ضوفی جلدی سے بولی۔

"خرابی یہ تھی کہ اس میں ڈاکٹر صاحب کو ناحق زحمت دی گئی۔" میں آرام سے بولا۔

"اتنی کارآمد باتیں تو کیں بے چارے ڈاکٹر صاحب نے......" ضوفی ڈاکٹر صاحب سے اظہارِ ہمدردی کرتے ہوئے بولی۔

"مثلاً کیا کارآمد باتیں کیں ڈاکٹر صاحب نے......؟ شانو اور وقفوں سے بچ بچا کے۔"

"انہوں نے الرجی کے بارے میں بتایا تھا ناں......!"

"کیا بتایا تھا، میرا مطلب ہے بے چارے کیا بتا سکے......؟"

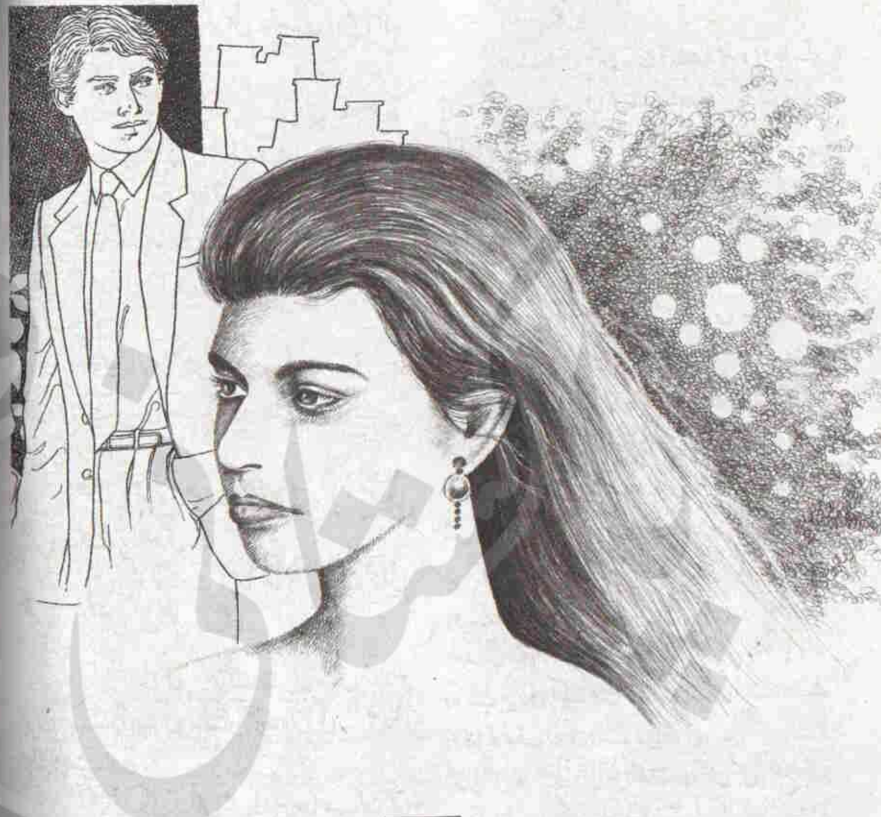
"وہ الرجی، وہ ہوتی ہے جو...... جو......"

"جو...... جو کیا......؟"

"ارے وہی جس میں دھبے وغیرہ ہو جاتے ہیں، آنکھوں سے پانی گرتا ہے اور...... پتا نہیں کیا، کیا ہو جاتا ہے......" وہ الجھ سی گئی۔

"مجھے دیکھو، ڈاکٹر صاحب کا مجھے پتا نہیں کہ اس شو میں آنے سے پہلے اور جانے کے بعد اُن پر کیا گزری ہوگی مگر میں اپنا بتا سکتا ہوں، اس وقت میرے کانوں، آنکھوں اور بھیجے پر سرخ سرخ دھبے پڑ چکے ہیں، میں الرجی کا مریض ہوں، تمہارے اس شو سے میرے مرض میں افاقے کے بجائے ٹھیک ٹھاک اضافہ ہو چکا ہے، دوسرے لفظوں میں جن جن چیزوں سے مجھے الرجک ری ایکشن ہوتا ہے ان میں سرِفہرست اب یہ شو ہے، خبردار میرے سامنے جو یہ پروگرام دوبارہ دیکھا، ورنہ مجھے بھیانک الرجی ہوتے دیر نہیں لگے گی۔" میں گربہ کشتن روزِ اول کے مصداق بیگم کو خوفزدہ کرنے میں کامیاب ہوگیا......

وہ بے چاری ایک دن کی بیاہی دلہن، نئے نویلے دولہا کو خوف زدہ ہو کے دیکھنے لگی۔ یہ اچھی بات تو نہیں تھی کہ پہلے دن ہی تعلقات میں کسی قسم کا بگاڑ پیدا کرلیا جائے مگر یہ ضروری تھا...... الرجی سے بچنے کے لیے علاج بہت ضروری تھا، بے چارے ڈاکٹر صاحب تو علاج بتانے میں ناکام و نامراد ہی رہے تھے لیکن میں ہار ماننے والا نہیں تھا، الرجی تو مجھے ہوئی تھی مگر علاج ضوفشاں کا ہونا تھا، پہلی ڈوز دینے میں، میں کامیاب ہوگیا تھا۔ میں نے سرخ سرخ آنکھوں سے ایک بار پھر ضوفی کی طرف دیکھا...... وہ بے چاری گھبرا کے جلدی سے ٹی وی آف کرتے ہوئے باتھ روم میں گھس گئی۔ میں مسکراتے ہوئے بیڈ پر نیم دراز ہوگیا...... میں نے صحیح کیا یا غلط...... کیا آپ مجھے بتائیں گے......؟



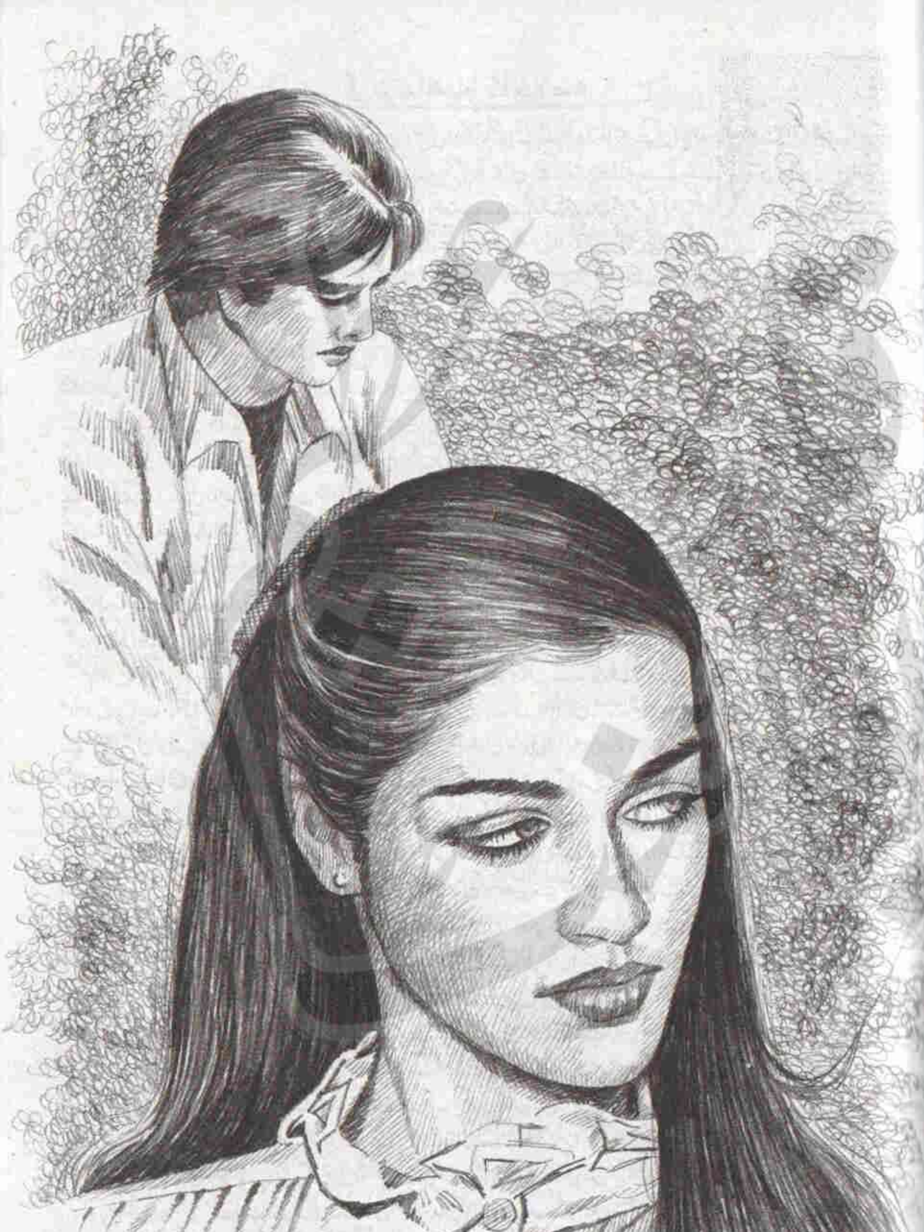
قسط 10

ایک تھی نیناں

راحت وفا

کچھ کھٹی سی، کچھ میٹھی سی ... کبھی شعلہ سی ... کبھی شبنم سی ... تھوڑی بھولی سی ... تھوڑی نادان سی ... محبت، نفرت اور اعتبار کے تکون میں سرگرداں ... رشتوں کے ٹکراؤ اور الجھاؤ کی داستان ... جس میں بھول اور نادانی کی کسک اور گناہِ بے لذت کی حقیقت کا اسرار ہر قدم پر کچوکے لگاتا ہے۔

ایک نابغۂ روزگار، پرتجسس، نفسیاتی اور رومانوی ناول جو آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا



گزشتہ اقساط کا خلاصہ

خان جی کی اکلوتی لاڈلی بیٹی ڈاکٹر مہ جبیں کو لاکھ خواہش اور فرمائش کے باوجود نہ ملازمت کی اجازت ملی اور نہ ذاتی کلینک اور اسپتال بنانے کی اجازت ملی۔ راجا صاحب متوسط طبقے کے بیروزگار نوجوان تھے۔ خان صاحب نے جانے کیا سوچ کر اکلوتی بیٹی ان سے بیاہ دی تجوریوں کے منہ کھول کے جہیز اور بنگلا، گاڑی، خدمت کے لیے مہ جبیں کی ہم عمر ملازمہ سکھاں بھی ساتھ میں رخصت کردی۔ سکھاں کے والدین نے رقم لے کر بیٹی ساتھ بھیج دی۔ بیٹی کے ارمانوں کا ذرا خیال نہیں کیا۔ ڈاکٹر مہ جبیں کو راجا صاحب نے میٹھی زبان سے رام کیا ان کی خواہش پر بنگلے کے وسیع کشادہ لان میں چھوٹا سا اسپتال نما کلینک بنادیا یوں مہ جبیں کی خواہش کو راجا صاحب نے ناجائز کمائی کا ذریعہ بنادیا۔ دولت بڑھتی گئی مگر مہ جبیں بستر سے لگ گئیں۔ وسیمہ باپ کی دی ہوئی آزادی اور ناجائز دولت کی ریل پیل سے مادر پدر آزاد ہوگئی۔ بیٹا ریحان اختر بھی اپنی ڈگر پر چل پڑا۔ وسیمہ نے گھر سے بھاگ کر شادی کی حادثے کا شکار ہوئی اپنا بیٹا لاوارث چھوڑا۔ پولیس نے بچہ راجا صاحب تک پہنچایا۔ جس کا نام طلال رکھا گیا۔ مہ جبیں کے والدین اور سکھاں کے والدین اپنے آبائی علاقے میں خان جی کے سوتیلے بھائی کی گولیوں کا نشانہ بن گئے۔ راجا صاحب اور ڈاکٹر مہ جبیں کے انتقال کے بعد ریحان اختر نے بھانجے کی بہت لاڈ پیار سے پرورش کی مگر ستم رہ گئے۔ طلال ایک ضدی، ہٹ دھرم نوجوان تھا۔ ریحان اختر نے امیر کبیر گھرانے کی رابعہ سے محبت کی شادی کی، اس سے بیٹی پیدا ہوئی جس کا نام نیناں رکھا گیا۔ نیناں میں ریحان اختر کی جان تھی۔ اچانک رابعہ کو کچھ ایسا ثبوت دیکھنے کو ملا کہ وہ ریحان اختر سے نفرت کرنے لگی۔ دونوں کے درمیان فصیل قائم ہوگئی۔ نیند کی گولیوں اور اعصابی تناؤ سے کمی کے لیے رابعہ تقریباً ذہنی مریضہ بن گئی مگر ریحان نے وہ ثبوت غائب کردیے۔ طلال کی نیناں پر نظر تھی جبکہ رابعہ کی بڑی بہن عارفہ کا اکلوتا بیٹا رمان احمر جو کہ ملٹی نیشنل کمپنی میں ریجنل منیجر ہے وہ اور نیناں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں مگر رمان کی پھپھو کی بیٹی دعا فاطمہ، رمان سے جنون کی حد تک عشق کرتی ہے لیکن وہ اسے صرف دوست سمجھتا ہے۔ دعا بار بار رمان سے کھلم کھلا نیناں کی وجہ سے دو بدو ہوتی ہے مگر رمان کے دل میں صرف نیناں ہے۔ عارفہ، رابعہ ان کی دادی زیتون بیگم بارہا اس موضوع پر بات کرچکی ہیں۔ عارفہ کو نیناں پیاری ہے تو دعا بھی عزیز ہے مگر رمان نہیں مانتا۔ نیناں کی سہیلی مدیحہ جو کہ اس کی کالج فیلو ہے اس کا تعلق غریب گھرانے سے اس کے گھر میں بڑا بھائی زلفی، اماں اکبری اور پھپھو موجود ہیں پھپھو کو وہ آپا کہتے ہیں آپا کی زندگی سنگین حادثے کا شکار ہے اس لیے مدیحہ اور زلفی ان سے بہت پیار کرتے ہیں۔ آپا مدیحہ کو امیر سہیلی سے دور رہنے کی تاکید کرتی ہیں ،سبحان رابعہ کے بہترین دوست ہیں مگر ان سے انہوں نے محبت نہیں کی جبکہ سبحان نے اپنی پیاری دوست کے بعد نہ شادی کی نہ اپنے تایا ابا کی بات مانی۔ بیرون ملک ملازمت کرلی اب وہ واپس آئے ہیں یہاں سے سب کچھ وائنڈ اپ کر کے باہر ہی مستقل سیٹ ہونے کے لیے...... جس پر تایا ابا راضی نہیں ان کے خیال میں سبحان کو سعدیہ سے شادی کرلینی چاہیے۔ جس کے لیے وہ راضی نہیں۔ کہانی میں نیا موڑ آیا ہے کہ رابعہ کی ملاقات میڈیکل اسٹور پر سیلز مین ذوالفقار سے ہوئی ہے جس نے دواؤں کے شارٹ ہونے اور نہ کھانے کا مشورہ دیا۔ رابعہ نے اس ہمدرد کی بات مان لی۔ رابعہ میں آنے والی خوش آئند تبدیلی سے نیناں بوا بہت خوش ہیں۔ ریحان اور طلال متحیر ہیں۔ طلال کی اور نیناں کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ طلال، نیناں پر ہاتھ اٹھا لیتا ہے جس پر رابعہ بہت غصہ ہوتی ہیں اور ایمان اختر کو بتاتی ہیں لیکن ایمان اختر کوئی رسپانس نہیں دیتے۔ رابعہ کی ذوالفقار سے اچھی دوستی ہو جاتی ہے جس پر ریحان اختر جیلس ہوتے ہیں۔ رمان، رابعہ کے کہنے پر نیناں کو مدیحہ کے گھر لے کر جاتا ہے بائیک پر جو دعا کو اچھا نہیں لگتا۔ ریحان اختر، رمان کو آفس ملنے کے لیے بلاتے ہیں تو وہ آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ ایک ایگزی بیشن میں رابعہ کی ملاقات سبحان سے ہوتی ہے تو سبحان رابعہ کو پہلے والے انداز میں دیکھ کر حیران ہوتے ہیں۔ رشتے کرانے والی کے مشورے پر اکبری بیگم، ذوالفقار سے گھر تبدیل کرنے کو کہتی ہیں۔ طلال اور ریحان اختر چاہتے ہیں کہ نیناں آفس جوائن کرے لیکن وہ یونیورسٹی میں ایڈمیشن لینا چاہتی ہے۔ نیناں رمان کو فون کرتی ہے لیکن دعا اس سے بات نہیں کراتی۔ ریحان اختر، رمان کو اپنے ساتھ بزنس میں شامل کرنا چاہتے ہیں لیکن رمان راضی نہیں ہوتا۔ ذوالفقار اپنے گھر تبدیل کرنے کے لیے کوششیں کر رہا ہے، سبحان اپنا گھر بیچ کر بڑے ابا کو بھی اپنے ساتھ لے کر جا رہے ہیں۔ ریحان اختر کلینک توڑ دیتے ہیں، جو بوا کو اچھا نہیں لگتا۔ زیتون بیگم کا انتقال ہو جاتا ہے۔ رابعہ ذوالفقار کو چیک دیتی ہے لیکن وہ کیش نہیں ہوتا۔ ——— (اب آگے پڑھیں)

''فارگاڈ سیک طلال بھائی آپ یہاں سے جائیں، جائیں، آپ رمان سے جیلس ہیں مگر میں رمان کو پسند کرتی ہوں۔'' نیناں کے نازک سے جسم کی ننھی منی چنگاریوں نے اسے جوالا مکھی بنادیا۔ توقع سے بالکل ہٹ کر محبت کا اعلان کردیا...... طلال شعلہ بار نگاہوں سے گھورنے لگا تو رابعہ کو مداخلت کرنی پڑی۔

''طلال! نیناں کسی کی جاگیر نہیں ہے، پسند اپنی اپنی ہوتی ہے۔''

''مگر ماموں نے اسے رمان سے ملنے سے منع کیا ہے اور یہ اتنی رات گئے رو، رو کر اس سے باتیں کر رہی تھی۔''

''ہاں! ہاں کر رہی تھی اور کرتی رہوں گی......'' نیناں نے چلا کر کہا طلال تلملاتا ہوا چلا گیا۔

''بابا نے کب منع کیا ہے......؟'' رابعہ نے حیرت سے پوچھا۔

''کرتے رہیں منع، میں اُن کی یہ بات نہیں مانوں گی، چاہے وہ مجھے جان سے ماردیں۔'' وہ بولتی گئی آخر میں بوا نے دھکا کھاتے دل کو سنبھال کر اس کے منہ پر اپنا کپکپاتا ہاتھ رکھ دیا۔

''چپ، چپ نیناں مت کہنا یہ، مت کہنا......'' بوا کی آواز میں بھی تھرتھراہٹ تھی۔

''آپ خود سوچیں بوا، رمان میں کیا خرابی ہے، طلال سے تو لاکھ گنا بہتر ہے، ریحان اس جاہلانہ روش پر کیوں چل رہے ہیں؟'' رابعہ اپنا احتجاج بوا کے سامنے تو کم از کم ریکارڈ کرا سکتی تھیں۔

''اچھا تو طلال نہیں اور ریحان جاہل کب نہیں تھا، بس جانے دو مگر پھر ایسی بات منہ سے نہ نکالنا...... سنا نیناں......'' بوا نے منت بھری نظروں سے نیناں کو دیکھا اور اُن دونوں کو وہیں چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔

''مما! بابا کو یہ حق حاصل نہیں، میں رمان کو اب نہیں چھوڑ سکتی، بتادیں بابا کو۔'' وہ بولی تو رابعہ نے اسے بانہوں میں بھر لیا اور پوچھا۔

''نیناں! محبت کرتی ہو رمان سے؟''

''مما! رمان کے لیے آپ میری فیلنگز سمجھتی ہیں۔''

''تو میرا خیال ہے رمان کی بہتری کے خیال سے اسے اپنے بابا سے دور رہنے دو۔''

''نہیں، میں رمان کے سوا کسی کو سوچ بھی نہیں سکتی......'' وہ رابعہ کے سینے پر سر رکھ کے منمنائی تو رابعہ خاموش ہو کر اس کے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگیں۔

''ویسے مما! بابا کو ایک دم کیا پرابلم ہوگئی ہے؟'' اس نے بے ساختہ پوچھ لیا۔

''پوچھ لینا تھا ضدی باپ سے۔''

''وہ تو رمان کو پسند کرتے تھے، یہ طلال بھائی کا چکر ہے شاید۔''

''نہیں معلوم، ہو بھی سکتا ہے مگر رمان بہت خود دار اور انا پرست ہے وہ کبھی ریحان کے سامنے گھٹنے نہیں ٹیکے گا۔''

''کیا مطلب مما؟''

''نیناں! ریحان کو انسانوں پر ان کے ذہنوں پر ان کے جسموں پر حکومت کرنے کی عادت ہے، رمان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں جو کہ ممکن نہیں۔'' رابعہ نے ضروری سمجھا کہ اپنی معصوم بیٹی کو کچھ نہ کچھ سمجھا دیں...... مگر

محبت تو ایسی طاقت ہے جو دل و دماغ میں اتر جائے تو پھر جسم و جاں کو اپنے قبضے میں لے لیتی ہے...... نیناں پر کچھ اثر نہیں ہوا نہ وہ اثر لینا چاہتی تھی، رمان کو سب کچھ بتا کر جو دلی خوشی اور سکون ملا تھا اس کا مزہ پہلی بار چکھا تھا، اسے تو اندازہ ہی نہیں تھا کہ وہ رمان کو اس قدر چاہتی ہے، بابا کے حکم کے بعد بھی اس سے بات کرتے ہوئے قطعاً کوئی خوف محسوس نہیں ہوا، اس کی اس جرأت پر رمان فون کانوں سے لگائے جھوم رہا تھا...... دو دلوں کے جذبات پہلی بار ڈائریکٹ ڈائل ہوئے تھے...... رمان کی مضمحل طبیعت پر چھائی اضطرابی پرچھائیاں معدوم ہو گئیں...... محبوب ساتھ دینے کا عہد کرے تو پھر اور کیا چاہیے؟ محبت کے لیے محبوب کی چاہت اور پیمان ہی کی تو ضرورت ہوتی ہے۔

☆☆☆

''ریحان اختر!'' دائیں کندھے پر ہاتھ کا دباؤ ڈال کر کہا گیا۔

''ہوں ہاں۔'' وہ گہری نیند سے ہڑبڑا کر اٹھے۔

''میرے کمرے میں آؤ......'' بڑے دھیمے مگر قوی لہجے میں حکم دے کر وہ کمرے سے باہر نکل گئیں...... ریحان اختر نے آنکھیں ملیں، دائیں ہاتھ بیڈ پر دیکھا، رابعہ وہاں نہیں تھیں...... گھڑیال پر نگاہ ڈالی اور پھر جمائی لے کر پوری سعادت مندی کا ثبوت دینے کے لیے سلیپر پیروں میں ڈال کر باہر نکل آئے...... بوا نے انہیں دیکھ کر جیسے کرسی کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

''بوا! میں کیا سمجھوں؟'' وہ دھیرے سے برابر والی کرسی پر ٹک گئے۔

''پرانی دیوار پر اب نئی کیل ٹھونکنے کی جگہ نہیں رہی...... سمجھدار ہو اس وقت میرے پاس یوں بیٹھا دیکھ کر کوئی بھی آسانی سے بہت کچھ سمجھ سکتا ہے۔'' ریحان اختر کے بت سے نکلا وہ سچ مچ نیا آدمی تھا جو سلیپنگ سوٹ میں بے ترتیب بالوں کے ساتھ گھر کی پرانی ضعیف ملازمہ کے پاس بیٹھا تھا۔

''ایسا کیا ہو گیا کہ آپ کو یوں سمجھانے کی ضرورت پڑ گئی......؟''

''ریحان اختر! میری بوڑھی آنکھیں اور کچھ نہیں دیکھ سکتیں...... مجھ سے میری وفاداری کا اور امتحان نہ لو، میں نے اپنی بی بی کے ساتھ کیے ہر عہد کو نبھایا ہے مگر اب بس کر دو...... یہ وفاداری گناہ گاری میں بدل گئی ہے۔''

''بوا! آپ نے تو کچھ نہیں کیا......؟'' وہ بولے۔

''کرتے ہوئے تو دیکھا ہے، وفاداری نبھانے کے لیے چشم پوشی کی ہے، جھوٹ بولے ہیں۔'' ان کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

''بوا! سب ٹھیک ہونے والا ہے، سب میں نے کیا ہے؟ میں ہی اقرار کروں گا۔'' وہ بولے۔

''نہیں، سب کیا دھرا اس کلینک کا ہے، تم نے بہت برا کیا ہے وہ کسی طرح بھی ٹھیک نہیں ہوگا...... بس اپنی بیٹی کو بچا لو، اس کو ضدی نہ بناؤ۔''

''کیا، کیا ہے نیناں نے؟'' وہ یکدم پریشان ہو گئے۔

''ابھی تک کچھ نہیں مگر وہ بھی ویسا کر سکتی ہے جیسا پہلے اس گھر میں ہو چکا ہے، یہ گھر برباد نہ کرو ریحان، ہم ہاتھ جوڑتے ہیں۔'' بوا نے دونوں ہاتھ ان کے سامنے جوڑ دیے، وہ بے کل ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے، بوا نے

کیا کیا سب منظر جھنجوڑ ڈالے۔

''ریحان اختر!''

''بوا! چپ رہیں، خاموش رہیں......'' وہ بیزار سے ہو گئے۔

''ٹھیک ہے جاؤ مگر فرصت نکال کر سوچ لینا، تمہاری ضد کو شکست نہ ہو نیناں بہت ضدی ہو چکی ہے...... تم پر گئی ہے...... دو بندوں کی ضد کے نتیجے میں کچھ نہیں بچتا۔'' وہ بولتی رہیں اور وہ سنتے رہے۔

''محبت میں نتیجے کی فکر نہیں کرتے۔''

''تو نیناں کو بھی محبت ہے رمان سے۔''

''آپ نہیں سمجھ سکتیں، رمان میری ضد بن گیا ہے......'' وہ یہ کہہ کر دوبارہ بیٹھ گئے۔

''جاؤ کمرے میں، رابعہ، نیناں کے پاس سے واپس کمرے میں جا چکی ہو گی۔''

''آپ پلیز کچھ نہیں جانتیں، بہت جلد سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''بھول ہے تمہاری، کانٹے کبھی پھول نہیں بنتے، راجا صاحب کو بی بی یہ کہتے کہتے قبر میں اتر گئیں مگر وہ کانٹے، پھول سمجھ کر جمع کرتے رہے...... تم نے بھی یہی کیا۔''

''اچھا بس! زبان بند کر لیں۔'' وہ کچھ جھنجلائے اور شکن آلود پیشانی کے ساتھ باہر نکلے...... نیناں کے کمرے کی لائٹ آف تھی، دروازہ بند تھا...... وہ سمجھ گئے کہ رابعہ کمرے میں ہیں...... دلِ مضطرب نے رخ بدلا اور ٹی وی لاؤنج میں صوفے پر نیم دراز ہو کر سوچ بچار کرنے لگے...... سکون جیسے کہیں چلا گیا تھا، اٹھ کر بیٹھ گئے...... ذہنی دباؤ نے سر درد کی شکل اختیار کر لی تو بے اختیار ہو کر فیفو کو آوازیں دینے لگے...... وہ تو اپنے سرونٹ کوارٹر میں سویا ہوا تھا۔

''کیا چاہیے ریحان......؟'' رابعہ نے آ کر پوچھا۔

''ک...... کچھ نہیں، بس چائے کے لیے فیفو کو بلا رہا تھا؟''

''بوا نے ایسا کیا کہہ دیا کہ چائے کی ضرورت پڑ گئی......؟'' رابعہ نے سامنے بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

''اپنا کام کرو۔'' وہ اپنی مخصوص ٹون میں آ گئے۔

''مجھے میرا کام کرنے تو دیا کریں۔''

''پلیز جاؤ، جا کر سو جاؤ......'' وہ چلائے۔

''ہش دھیرج، بیٹی سو چکی ہے، پہلی بار اس روپ میں دیکھا ہے، بیوی ہونے کے ناتے پوچھا ہے......'' وہ بہت آہستہ آواز میں بولیں۔

''ہونہہ، بیوی، کسی کی معشوق، کسی کی محبوب۔'' وہ یہ بڑبڑاتے ہوئے خود ہی اٹھ کر کمرے میں چلے گئے...... رابعہ بڑی دیر بیٹھی رہیں پھر خود بھی اٹھیں اور دھیرے دھیرے چلتے ہوئے کمرے میں آ گئیں...... ریحان بظاہر بستر پر تھے مگر نیند اُن سے کوسوں دور جا چکی تھی، پوری کھلی آنکھوں سے چھت کو گھور رہے تھے...... رابعہ کو تعجب ہو رہا تھا...... وہ سوچ رہی تھیں کہ کیا بات ہوئی جو ریحان اس قدر الجھے الجھے سے ہیں، اس وقت بوا کے کمرے میں گئے اور بوا نے کیا کہہ دیا کہ اپ سیٹ ہو گئے...... مگر ان سے یہ سب پوچھنا بیکار تھا...... اپنے

اندازے سے سمجھا کہ بوا نے طلال کی بدتمیزی کی بات کی ہوگی، ریحان اپنی بیٹی کی وجہ سے فکر مند ہو گئے ہیں۔ بس یہی سوچتے سوچتے وہ بستر پر آ گئیں...... لیکن یہ فیصلہ کر لیا کہ بوا سے پوچھ کر دم لیں گی۔

☆☆☆

تہجد کی نماز پڑھ کر عارفہ اپنے کمرے کی طرف جانے لگیں تو رمان کے کمرے کی لائٹ آن دیکھ کر ٹھٹکیں...... چند لمحے رکیں اور پھر کمرے کی طرف آ گئیں، رمان کو انہوں نے اپنے پاس ہی روک لیا، کچھ ضروری معاملات پر بات کرنی تھی...... مگر وہ اتنی رات تک جاگ رہا ہے یہ فکر انگیز بات تھی۔

''رمان! ابھی تک جاگ رہے ہو؟''

''وہ، امی! نیند نہیں آ رہی......'' وہ لان میں کھلنے والی کھڑکی سے ہٹ کر بولا۔

''وجہ؟''

''امی! نیناں کے فون نے مجھے ڈسٹرب کر دیا ہے۔''

''کیا ہوا، خیریت......؟'' وہ بھی پریشان ہو گئیں۔

''وہ رو رہی تھی، ریحان انکل نے مجھ سے ملنے پر پابندی لگا دی ہے۔''

''ارے کیوں بھئی......؟'' انہیں حیرت ہوئی۔

''وہی وجہ ہے یقیناً......''

''تو اس میں برائی کیا ہے؟ کوئی بات نہیں کام کرنے میں عار کیا ہے؟'' وہ سمجھ کر بولیں۔

''کمال ہے، عار ان کے ساتھ کام کرنے میں ہے، جو اتنی سی بات ضد بنا لے اس کے ساتھ کام کیسے کیا جا سکتا ہے؟''

''تو پھر اس کو نیناں کے لیے راضی کیسے کیا جا سکتا ہے؟''

''ان کی گیم ہے، طلال کے لیے راستہ ہموار کر رہے ہیں۔'' وہ یقینی طور پر بولا۔

''یہ کوئی اچھی بات نہیں میں رابعہ سے بات کروں گی۔''

''کوئی فائدہ نہیں، وہ تو خود وہاں اجنبی ہیں۔''

''یہی تو دکھ ہے کہ میری پیاری بہن ناکردہ گناہ کی سزا بھگت رہی ہے۔'' عارفہ گہرے تاسف کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئیں۔

''مجھے نیناں کی فکر ہے وہ بہت ڈسٹرب ہے۔''

''نیناں میں ریحان کی جان ہے وہ جلد مان جائیں گے۔''

''رابی خالہ کی الماری میں اب تک سبحان انکل کے تحائف، گریٹنگ کارڈز، خشک پھول محفوظ ہیں، جانے اس شدت کے باوجود ریحان انکل کے لیے فیصلہ کیوں کیا گیا؟''

''ہوتا ہے، ایسا بھی دھوکا ہو جاتا ہے۔''

''خیر، آپ سو جائیں۔''

''آپ کی طاہرہ پھپھو کا فون آیا تھا کہ کل کوئی فیملی دعا کو دیکھنے آ رہی ہے۔''

''آپ نے جب جانا ہو بتا دیجیے گا، میں لے جاؤں گا۔''

''نہیں یہاں ڈرائیور اور گاڑی موجود ہیں، مسئلہ کچھ اور ہے۔'' وہ رکیں۔

''کیا مسئلہ......؟''

''دادی جو معاملات دیکھتی تھیں وہ اب کون دیکھے گا؟ یہ اتنی بڑی کوٹھی خالی تو نہیں چھوڑی جا سکتی...... ہمارا میکا ہے یہ اس کی پروپر دیکھ بھال کیسے ہوگی؟''

''آپ فکر مند نہ ہوں، منیجر وغیرہ بڑی امی کو آ کر حساب کتاب دیتے تھے اب آپ یا میں دیکھ لوں گا...... باقی یہاں گلو ہے آدھا پورشن کرائے پر دیا جا سکتا ہے۔'' وہ بڑی آسانی سے تجویز دے کر ان کی طرف دیکھنے لگا۔

''چلو، دیکھتے ہیں، رابعہ سے بھی بات ہوگی۔''

''اب جائیں اور سو جائیں۔''

''مگر......'' وہ کچھ جھجک سی رہی تھیں۔

''مگر کیا......؟''

''دعا اچھی لڑکی ہے۔''

''کوئی شک نہیں......''

''نیناں کے لیے ایک ہزار لوگ آ جائیں گے مگر دعا کو تم سے بہتر کوئی نہیں رکھ سکتا۔'' بالآخر دل کی بات زبان پر آ گئی۔

''یہ غلط خیال ہے آپ کا، دعا میری دوست ہے، میری بہن ہے، میں اس کے لیے ایسا سوچتا بھی نہیں۔''

''اور نیناں کے لیے ریحان راضی نہ ہوئے تو......؟''

''کوئی بات نہیں، پھر بھی دل اور دماغ سے کوئی اسے نکال نہیں سکتا......'' عارفہ نے بے بسی سے بیٹے کو دیکھا اور پھر کچھ دیر مزید بیٹھنے کے بعد وہاں سے اٹھ آئیں۔

☆☆☆

بار بار ذوالفقار کے فون آنے پر رابعہ کو کچھ دیر کے لیے باہر جانے کی تیاری کرنی پڑی...... حالانکہ ریحان کو موسم کی تبدیلی کے باعث شدید فلو ہو گیا تھا، وہ آج آفس بھی نہیں گئے تھے...... وہ خاموشی سے گاڑی نکال لائی تھیں۔

سپریم کافی ہاؤس میں ذوالفقار پہلے سے موجود تھا...... وہ سامنے آ کر بیٹھ گئیں تو اسے تعجب سا ہوا، وہ تیاری میں بھی بجھی بجھی الجھی الجھی سی تھیں۔

''خیریت......؟''

''ہوں، آپ سناؤ خیریت ہے نا......؟'' انہوں نے سادگی سے پوچھا۔

''آپ ڈسٹرب ہیں۔''

''شاید، بس کچھ معاملات ایسے ہیں گھر میں جو الجھا رہے ہیں۔''

"اسی لیے تو آپ کو کہا تھا کہ پیار کا کوئی اور گھر بنا لیجیے۔" وہ عالمِ شوق میں بہک سا گیا جبکہ وہ چونکیں اور سنجیدگی سے بولیں۔

"ذوالفقار! میری بیٹی کی موجودگی کا خیال رکھا کرو۔"

"سوری! میرا مطلب یہ ہے کہ آپ کو خوش و خرم رہنا چاہیے، اس کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔"

"نہیں، شکریہ، میں شرمندہ ہوں کہ آپ کے لیے کچھ نہیں کرسکتی......" وہ نظریں جھکا کر وضاحت کرنے لگیں تو ذوالفقار کے چہرے پر سایہ سا لہرا گیا۔

"اوہ! میرا کیا بنے گا؟"

"سوری! میرے پرسنل اکاؤنٹ میں اتنی بڑی رقم نہیں، اگر کچھ مہلت آپ مالک مکان سے لے لیں تو کوشش کرسکتی ہوں۔"

"نہیں، دراصل مالک مکان کو ملک سے باہر جانا ہے اسے جلدی ہے۔" وہ افسردہ سا ہو کر بولا۔

"یہ تو مسئلہ ہے لیکن فی الوقت میں کچھ نہیں کرسکتی......" انہوں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کیا...... تو وہ کافی کا آڈر دے کر گہری سوچ میں ڈوب گیا۔

"رابعہ جی! اس طرح تو میرا ایڈوانس ڈوب جائے گا۔" وہ بہت پریشانی طاری کرتے ہوئے بولا۔

"مگر ذوالفقار! مجھے نہیں لگتا کہ میں فوری طور پر پیسوں کا بندوبست کرسکوں گی۔"

"اگر مسز راجا ریحان بے بس ہیں تو کیا کہا جاسکتا ہے؟" بڑے مٹھاس بھرے لہجے میں طنز کا سہارا لیا گیا جو انہیں نشتر کے مانند لگا۔

"کاش! میں مسز راجا ریحان نہ ہوتی۔"

"سوری! آپ اداس نہ ہوں، الجھن کیا ہے......؟" یکدم ہی وہ سارے زمانے سے بڑھ کر ہمدرد ہوگیا۔

"آپ کے بار بار فون کرنے کی وجہ سے مجھے آنا پڑا ورنہ میں بہت ڈسٹرب تھی۔"

"بتائیں تو......؟"

"بس کچھ اور نہیں، ازدواجی زندگی بالکل الٹ پلٹ گئی ہے، وہ گھر نہیں مہمان سرائے ہے، نہ اپنے لیے محبت پاسکی اور نہ بیٹی کو دلوا سکتی ہوں۔" وہ بے حد مغموم سی ہوگئیں...... رات کے واقعے کا ذہن پر گہرا اثر تھا۔

"پلیز! میرے سامنے بیٹھ کر یوں رنجیدہ نہ ہوں، میں آپ کے لیے کچھ بھی کرسکتا ہوں...... میں آپ کو وہ سب دے سکتا ہوں جو آپ کو نہیں ملا۔" وہ جذباتی سا ہوگیا۔

"کاش! ان سب باتوں کا وقت ہوتا۔"

"وقت کو کچھ نہیں ہوا، میرا ہاتھ تھام لیں...... پھر دیکھیں دنیا کیسے بدلتی ہے؟" بڑی ہمت سے اس نے رابعہ کا دایاں ہاتھ تھام لیا...... جسے انہوں نے جلدی سے آزاد کرایا۔

"کیسی باتیں کرتے ہو؟ یہ سب باتیں ریحان سے میں سن چکی ہوں۔"

"میرا اعتبار کریں، آپ کو سچے پیار کی ضرورت ہے۔"

"پلیز! تھی اب نہیں رہی، نیناں کو یاد رکھا کرو۔" وہ خاصے جنوں خیز لمحات سے گزر کر جھٹکے سے اٹھیں اور جانے سے پہلے بولیں۔

"ذوالفقار! مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کی مدد نہیں کرسکتی، تاہم کوشش کروں گی، پلیز۔" وہ چلی گئیں...... اور وہ اپنے مقصد میں ناکامی کے باعث غم و غصے سے کھول اٹھا۔

☆☆☆

ظہورہ بی بی لڑکے والوں کو اصرار کر کے آخر کو لے ہی آئی تھی۔ طاہرہ بیگم کو بڑی اطمینان بھری خوشی محسوس ہو رہی تھی، صبح سے ہی انہیں مہمانوں کی آمد کا انتظار تھا۔ گھر کے کونے کونے کی ملازمہ کی مدد سے خود صفائی کرائی تھی، ہر شے اجلی، اجلی اور شفاف لگ رہی تھی، لباس تبدیل کر کے کچن کا رخ کیا تو دعا کو خاموش اور کھویا کھویا سا دیکھ کر پہلے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ سوچ کر خوش دلی سے بولیں۔

"دعا! چندا کپڑے تبدیل کر کے بالوں کو کھلا چھوڑ دینا، ہاں کاجل ضرور لگا لینا۔"

"اور کچھ......" بڑا مختصر اور منتشر سا جواب آیا۔

"اور یہ کہ مہمان آچکے ہیں جلدی سے آکر ٹرالی تیار کرو۔" وہ بولیں۔

"مامی آگئیں......؟" غیر متوقع سوال تھا۔

"یہ سوال کہاں سے آگیا......؟"

"بتائیں......"

"ہاں! کچھ دیر پہلے آئی ہیں۔"

"اور رمان......"

"دعا! رمان کو میں نے سموسے اور کیک لانے کے لیے بھیجا ہے۔" طاہرہ بیگم اسے اطلاع کی صورت بتا کر باہر چلی گئیں، دعا جانتی تھی کہ وہ اس کے سوالوں سے کترا رہی ہیں اور یہ سچ بھی تھا، آنکھیں بھر آئیں، پلو سے رگڑیں اور پہلی بار مہمانوں کے لیے تیار ہونے کی غرض سے اپنے کمرے کا رخ کیا...... اماں جان نے اس کے لیے اورنج کلر کا کُرتہ اور شلوار منتخب کر کے رکھا تھا، بقول ان کے وہ اس پر خوب جچتا تھا ماں کی فکرمندی پر ہولے سے مسکرائی اور کپڑے لیے واش روم میں چلی گئی۔

ڈرائنگ روم کے نیم وا دروازے سے جھانکا تو بالکل سامنے ظہورہ بی بی ہی دکھائی دیں۔

"ارے آؤ دعا بیٹی، آجاؤ......" بی بی نے بھی اسے دیکھ لیا تھا...... سو بلا لیا۔ وہ سر پر دوپٹا ٹھیک سے جما کر اندر داخل ہوئی۔

"السلام علیکم!" دھیرے سے سلام کیا تو سب کی ملی جلی آواز میں جواب آیا۔ اس نے بی بی کے اشارے کو سمجھ کر دو مہمان خواتین کے درمیان بیٹھنا تھا...... اس کی ہچکچاہٹ محسوس کر کے عارفہ اور مہمان خواتین ایک ساتھ بولیں۔

"ارے بیٹا بیٹھو!" وہ کسمسا کر درمیان میں بیٹھ گئی۔

"ماشاء اللہ! بہت دراز قامت بیٹی ہے۔" ایک خاتون نے اس کے لمبے قد کو سراہا۔

"ارے اکبری بہن! صرف قد ہی کو نہ دیکھو، آنکھ، ناک، بال سب خوب صورت ہیں۔" بی بی نے اپنی چرب زبان کا استعمال کیا۔

"ہاں جی! ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے۔" اکبری بیگم نے جواب دیا۔

"ہمارا بیٹا بھی بہت حسین ہے۔" دوسری خاتون نے ضروری سمجھا کہ لڑکے کے نمبر بھی بڑھائے جائیں۔

"سچ کہہ رہی ہیں آپا، جوڑی خوب سجے گی۔" بی بی نے لقمہ دیا۔

"جاؤ بیٹا دعا! چائے کی ٹرالی لے آؤ......" عارفہ نے دعا کے چہرے پر پھیلی بے چینی بھانپ کر کہا، وہ تو منتظر تھی تیزی سے اٹھی اور چلی گئی۔

"بس اب منہ میٹھا کرادو اکبری بہن۔" بی بی نے کہا۔

"بی بی پہلے تعارف تو کرادیجیے۔" عارفہ نے یاد دلایا...... تو بی بی شرمندہ سی ہوگئیں، جو کام سب سے پہلے کرانا تھا وہ بعد کرانا پڑا۔

"بس یادداشت اب ایسی ہی رہ گئی، یہ لڑکے کی اماں ہیں اکبری بیگم اور یہ رشتے میں لڑکے کی پھپو ہیں، سب انہیں آپا ہی کہتے ہیں...... اور یہ لڑکی کی مامی ہیں اور یہ ماں ہیں۔" بی بی نے تعارف مکمل کراتے ہوئے آخر میں عارفہ اور طاہرہ کی طرف اشارہ کیا۔

"آپ لوگ بہت اچھے لگے ہیں، بس جلد ہم نئے گھر میں چلے جائیں گے تو آپ کو دعوت دیں گے...... فی الحال ہمیں لڑکی پسند آگئی ہے......" اکبری بیگم نے کہا، طاہرہ کھل اٹھیں، خوشی سے عارفہ کی طرف دیکھا وہ بھی مسکرا دیں۔

"لڑکے کی تصویر آپ لوگ رکھ لیں، دعا بٹی کی بھی رائے لے لیجیے گا......" آپا نے اپنے پرس سے پوسٹ کارڈ سائز تصویر نکال کر عارفہ کی طرف بڑھائی۔

"شکریہ! ماشاء اللہ حسین بیٹا ہے......" بے اختیار ہی ان کے لبوں سے نکلا۔

"بہت نیک سیرت اور اطاعت گزار ہے۔" آپا نے بھتیجے کی تعریف کی۔ وہ دونوں مطمئن ہو کر اثبات میں گردن ہلاتی رہیں...... کچھ دیر بعد دعا چائے کے بھرپور لوازمات سے سجی ٹرالی لیے آگئی...... اس کا چہرہ دھواں دھواں تھا اور آنکھوں میں غبار تھا...... عارفہ دیکھ کر پہلو بدلنے پر مجبور ہوگئیں۔

☆☆☆

پہلی تاریخ کا چاند اس کی نگاہوں کی زد میں تھا...... چھوٹے سے لان میں کرسی کی پشت سے سر ٹکائے بڑی دیر سے عالمِ محویت میں تھا...... تنہائی، اداسی، افسردگی اور پشیمانی جیسے سب گڈمڈ ہو کر اس پر طاری تھے...... عارفہ تھکن کے باعث سو چکی تھیں...... اس کی آنکھوں سے نیند غائب تھی۔

"چاند دیکھ کر کیا دعا مانگ رہے ہو......؟" پشت سے دعا کی مدھم سی آواز آئی تو اس نے گردن گھما کر دیکھا، وہ اسی لباس میں اس کے سامنے تھی۔

"چاند ابھی نکلا ہی کہاں ہے؟ جب نکلے گا تو ہم بھی دعا مانگیں گے، اپنے حصے میں مقدر کا لکھا مانگیں گے، ہم طلبگار نہیں دنیا اور دولت کے، ہم اللہ سے فقط اس کی وفا مانگیں گے۔" وہ مدھم مدھم، سُریلے سے لفظوں میں بول

گیا۔

"ابھی مانگنا باقی ہے کیا؟" وہ برابر والی کرسی پر ٹک گئی۔

"نہیں شاید ایسا بھی نہیں ہے۔"

"رمان ڈسٹرب ہو؟" اس نے پوچھا۔

"شاید!"

"شاید نہیں یقیناً، بتاؤ......"

"کچھ نہیں، تم اچھی لگ رہی ہو۔" ایک دم ہی مسکرا کر موضوع بدل دیا۔

"آج تو اچھی لگوں گی ہی۔"

"وہ کیوں......؟" وہ کچھ نہ سمجھا۔

"تمہاری جان جو چھوٹ گئی......" گہرا درد جیسے جاگ اٹھا۔

"اوں اچھا! ہاں بھئی بلا سر سے ٹل گئی۔" وہ سمجھ کر شریر انداز میں بولا۔

"تو خوش ہونا چاہیے۔"

"خوش تو ہوں......" اس نے جھوٹ بولا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ فوراً سمجھ جاتی ہے۔

"اسی لیے اتنی رات گئے اندھیرے میں بے نام سے چاند کو گھور رہے ہو۔"

"ارے، میں اپنا چاند دیکھ رہا تھا، دیکھو بالکل نیناں جیسا ہے نا......" اس نے چھیڑا۔

"غلط، نیناں تو چودھویں کا چاند ہے۔" پہلی بار شاید اس نے اعتراف کیا تھا۔

"واہ! کیا بات ہے......؟" وہ اوپر اوپر سے ہنسا۔

"رمان! کیا بات ہے؟"

"میرا چاند مجھ سے دور رکھنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔" اس نے فقط اتنا بتایا۔

"مطلب......؟"

"رمان سے نیناں کو دور کرنے کا حکم ہے۔"

"ایسا کون کر رہا ہے، میں نے تو تمہیں آزاد کر دیا......" وہ بے قرار ہوگئی۔

"تھینک یو ویری مچ، دعا! یو آر گریٹ، تم میری دوست ہو، آج میں پشیمان تم سے ہوں۔" اس کا نرم ہاتھ تھام کر اس نے اعتراف کیا۔

"میں کچھ کر سکتی ہوں تو بتاؤ؟" بھیگے لہجے میں پوچھا گیا۔

"بس اچھی دوست بن کر دعا کرتی رہو اور مجھے سچے دل سے معاف کر دو۔"

"رمان! معاف کیا ہے تو شاید پسند کی گئی ہوں۔"

"خدا کرے کہ تم بہت خوش و خرم زندگی بسر کرو۔"

"ابھی تو پہلی سیڑھی پر قدم رکھا ہے۔"

"سب اچھا ہوگا انشاء اللہ......" وہ بولا۔

''چلو اندر جا کر سو جاؤ خنکی بڑھ رہی ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔
''دعا! اِدھر دیکھو میری طرف......'' ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف گھمایا۔
''ہوں!''
''مجھے معاف کر دیا ہوتا تو آنکھوں کے کنول مسکرا رہے ہوتے۔''
''آنکھوں کے دیپ جھلملا رہے ہوں تو بھی خوشی ہی ظاہر ہوتی ہے۔''
''پلیز! دعا اس سے محبت کا آغاز کرو جس کو دیکھا بھی نہیں پر وہ اپنا ہے۔''
''جاؤ سو جاؤ......'' وہ ہاتھ چھڑا کر پلٹ گئی...... رمان تاسف سے اپنا خالی ہاتھ دیکھتا رہا، اس راستے کو گھورتا رہا جہاں سے گزر کر وہ گئی تھی...... یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ اس کو چاہتی ہے پھر بھی ایسا مشورہ دے دیا۔

☆☆☆

بے تاب و بے قرار دل کے ساتھ تکیے پر سر رکھا ہی تھا کہ اشکوں نے رستہ بنالیا...... دائیں بائیں بند آنکھوں سے گویا دریا بہہ نکلا...... رمان کو کیا معلوم تھا کہ کس ضبط کے امتحان سے گزر کر اس نے کسی اور کو اپنانے کے لیے گردن جھکائی تھی...... محبت میں محبوب بانٹ دینا کتنا کڑا ہوتا ہے یہ کوئی اس کے دل سے پوچھے، وہ تو ذرا سی مجبوری پر دل چھوڑ... بیٹھا تھا۔
''رمان! خدا کبھی نہ کرے غم سے ہمکنار تمہیں اور تمہاری محبت کو، بس یہ جو اس میں اور تم میں رابطہ ہے خدا کرے یہ سدا رہے، تمہاری محبت کا چراغ ہمیشہ جلا رہے، تم دونوں کی الفت کا کنول کھلا رہے، تمہیں مسکراہٹیں نصیب ہوں، تم دونوں ہمیشہ ایک دوسرے کے حبیب بن کر رہو، تمہارا جیون خوشیوں سے بھرا رہے...... بس میری یہ دعا ہے......'' صدقِ دل سے رمان کو مخاطب کر کے اس نے محبت بھری دعائیں دیں...... لیکن چھما چھم برستی گھٹا نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ تکیہ بھگوتے بھگوتے، کروٹیں لیتے لیتے سکون نہ آیا تو جانے کیوں دھیرے سے ایک بار پھر دبے قدموں سے آنچل سنبھالتی وہیں رمان کے پاس پہنچ گئی...... وہ بھی چاند میں اپنا چاند دیکھ رہا تھا...... اسے دیکھ کر چونکا اور اٹھا۔
''دعا!'' فقط منہ سے اتنا نکلنے کی دیر تھی کہ وہ چیخیں مار مار کر روتے ہوئے اس سے لپٹ گئی۔
''رمان! میں تمہارے سوا کسی کے ساتھ نہیں رہ سکتی، میں نے جھوٹ بولا ہے، میں کیسے تمہیں بھول جاؤں...... پلیز، پلیز مجھے یوں نہ دکھ دو......'' وہ شدت سے اپنے بازوؤں میں اسے دبائے روتے ہوئے التجائیں کر رہی تھی، رمان نے خود کو ڈھیلا اور نرم چھوڑ دیا اس کے سر پر اپنی ٹھوڑی رکھ دی اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں، سسکیاں تھمیں تو بہت غیر محسوس طریقے سے اسے ذرا سا الگ کر کے ایک ٹک دیکھنے لگا۔
''پلیز! رمان......'' بہت التجا تھی اس کی آنکھوں سے، بہتے اشکوں میں۔ وہ تڑپ اٹھا لیکن پھر دور جا کر کھڑا ہوا...... اس کے وجود سے لپٹے احساس کو خود سے جدا کرنے میں کچھ وقت گزر گیا...... سنبھل کر پلٹا اور بولا۔
''اسیر کس نے کیا ہے گلوں کی خوشبو کو؟ صبا کے پاؤں میں زنجیر کس نے دیکھی ہے؟ بجھے ہیں صرصرو

طوفاں سے کب چراغِ نجوم، جنوں کے خواب کی تعبیر کس نے دیکھی ہے؟ لکھی ہے خاک کے ذروں پہ وقت کی تحریر مگر ناداں لڑکی مگر یہ وقت کی تحریر کس نے دیکھی ہے؟ میرے مقدر کا تمہیں کیا پتا......؟'' وہ بولتا رہا وہ سنتی رہی، اس کے بولنے سے دیکھنے تک بے بسی اور بے چارگی تھی، دوسرے لفظوں میں وہ یہ سمجھا رہا تھا کہ اسے مقدر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لو۔ اس نے نظریں جھکا لیں...... کچھ لمحے سکوت چھایا رہا...... پھر وہ قریب آ کر بولا۔
''میری چاہت اگر تم ہوتیں تو بہت کافی تھے تم سے لپٹنے والے گرم لمحات...... کیا تم اب بھی نہیں جان سکیں کہ میرے اور تمہارے درمیان ایسا کچھ نہیں ہے۔''
''صرف تم، تم فاصلہ رکھے ہوئے ہو......'' اس نے احتجاج کیا۔
''دعا! فار گاڈ سیک، پڑھی لکھی سمجھدار لڑکی والا انداز اختیار کرو......'' کچھ سنجیدگی سے کہہ کر وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گیا...... اس کے جاتے ہی عارفہ نے اپنے کمرے کی کھڑکی بند کر لی...... اور غمگین سی بستر پر بیٹھ گئیں...... انہیں تو بیٹے کی اداسی اور پریشانی کا غم ہی کھائے جا رہا تھا، دعا کی طرف سے ذرا سا اطمینان ہوا تھا سو وہ بھی سامنے آ گیا کہ وہ رمان کو چھوڑنا ہی نہیں چاہتی۔
''یا خدا! کیا بنے گا ہمارے بچوں کا......؟'' دل سے تاسف بھری آہ نکلی...... تینوں بچے ہی جگر کے ٹکڑے تھے...... کس کو سنبھالیں اور کس کو نہیں، عجب دوراہے پر زندگی آ گئی تھی...... بہن اور بھانجی، نند اور بھانجی سب ہی پیار کے رشتے تھے، سب سے بڑھ کر ان کی عمر بھر کی کمائی، پیارا اکلوتا بیٹا جو نیناں سے محبت کرتا ہے، اس کا کیا ہوگا؟ نیناں پر کیا گزر رہی ہوگی؟ دعا کی حالت تو وہ دیکھ ہی چکی تھیں...... اتنے بدلاؤ کے بعد وہ یوں دیوانی ہو کر اس طرح رمان سے آ لپٹے گی یہ تو انہیں یقین ہی نہیں آ رہا تھا۔
''سچ کہتے ہیں محبت اندھی ہوتی ہے۔'' بیڈ کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے انہوں نے سوچا۔

☆☆☆

رات وہ بہت دیر سے آیا تھا۔ مال آیا تھا، میڈیسن سیٹ کرنی تھیں...... اس لیے خاموشی سے آ کر سو گیا مگر اکبری بیگم کو رشتے کے بارے میں بتانے کی بے چینی ہو رہی تھی، ناشتا کرنے کے لیے جونہی وہ آیا تو وہ جیسے تیار بیٹھی تھیں...... پراٹھا آملیٹ، چائے کا کپ فوراً اس کے سامنے رکھ دیا۔
''رات بڑی دیر سے آئے؟''
''بس کام تھا۔'' وہ ناشتا کرتے ہوئے بولا۔
''لڑکی ہمیں پسند آ گئی بلکہ وہ ہے ہی پسند کرنے کے قابل، میں نے انہیں کہہ دیا ہے کہ جلد نئے گھر میں بلائیں گے۔''
''اماں! چھری تلے دم لے لیا کرو، فی الحال اتنی جلدی کیا ہے؟ کوئی نیا گھر ورا بھی نہیں مل رہا......'' وہ بہت تلخ ہو گیا۔
''تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ لڑکے رشتے کی بات سن کر خوش ہوتے ہیں اور تم......'' اکبری بیگم بھڑک گئیں۔
''میرا مسئلہ پیسہ ہے، بولیں حل کر سکتی ہیں میرا مسئلہ یا پھر مانگ لیں لڑکی والوں سے؟'' وہ تند لہجے میں بولا۔

”باؤلا ہوگیا ہے، بیٹی والوں کا یوں تمسخر اڑاتے ہیں، مت بھولو تمہاری بھی بہن ہے۔“ اماں نے اچھا خاصا لتاڑا۔

”میرا سر نہ کھائیں، رقم کا بندوبست نہیں ہوا، بیانہ ڈوب جائے گا۔“ وہ جھلا کر کہتے ہوئے اٹھ کر چلا گیا...... تو اکبری بیگم کو کچھ احساس ہوا، اندر سے مدیحہ شور مچاتے ہوئے آئی تو انہیں یاد آیا کہ مدیحہ کو امتحان سینٹر چھوڑنا تھا اس کا پیپر تھا۔

”ارے وہ تو گیا، اب، اب کیا کروں؟“ ان کے حواس جواب دے گئے۔

”کیا۔ اب میں کیسے جاؤں؟“ مدیحہ با قاعدہ رونے لگی۔

”ارے بھئی اسے فون کرلو، زیادہ دور نہیں گیا ہوگا......“ آپا نے آ کر مشورہ دیا۔

”فون میں بیلینس نہیں ہے۔“

”اوہو! جب بیلنس ڈلوا دیں تو باتیں ختم نہیں ہوتیں جانے کس سے باتیں کرتی ہو۔“ اکبری بیگم نے کہا۔

”بھئی اب دیر نہ کرو جو کرنا ہے جلدی کرو۔“ آپا نے پریشان ہو کر کہا۔

”اماں مجھے جلدی سے رکشا کرا دیں میں چلی جاؤں گی۔“ مدیحہ نے حل پیش کیا۔

”چلو میرے ساتھ، میں چلتی ہوں۔“ آپا نے صحن میں تار پر لٹکی اپنی چادر سنبھالی۔

”اوہو! میں بچی نہیں ہوں، بس باہر گلی سے رکشا کرا دیں۔“ وہ ٹھنکی اور اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر دروازے کی طرف بڑھی۔

”چلو۔“ مجبوراً اکبری بیگم کو ہتھیار پھینکنے پڑے۔

”واپس کیسے آؤ گی؟“ آپا نے باہر دروازے سے سر نکال کر پوچھا۔

”آجاؤں گی، پریشان نہ ہوں......“ وہ کہتے ہوئے چلی گئی۔ اکبری بیگم اس کے پیچھے تھیں، آپا نے دروازہ بند کیا، صحن میں آئیں تو فرش پر پڑے ہوئے وزیٹنگ کارڈ کو دیکھ کر ذہن پر زور ڈالتے ہوئے جھک کے کارڈ اٹھالیا۔ طلال اختر اسسٹنٹ ڈائریکٹر نیناں گروپ آف انڈسٹریز۔ پڑھ کر وہ سمجھ گئیں کہ یہ کارڈ مدیحہ کی ڈائری سے گرا ہے لیکن اس کارڈ نے آپا کے اندر ہنگامہ برپا کر دیا۔

”یہ طلال اختر کون ہے؟ مدیحہ کے پاس اس کا کارڈ کیوں ہے؟“ ان دونوں سوالات نے انہیں ہلا دیا...... کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ بات کیا ہے؟ مگر مجبوری تھی مدیحہ کے آنے پر ہی پتا چل سکتا تھا...... انہوں نے کارڈ اپنے تکیے کے نیچے رکھ دیا اور کرسی پر بیٹھ کر آنکھیں موند لیں...... ذہن میں کوئی پرانی فلم چلنے لگی تھی، چہرے کا رنگ متغیر سا ہوگیا، جبڑوں کی ہڈیاں سختی سے آپس میں جڑ سی گئی تھیں کچھ نہ کچھ ان کی سمجھ میں آرہا تھا...... مدیحہ کے اطوار، چال ڈھال اور انداز میں بہت بڑی تبدیلی سی تھی، جسے محسوس تو وہ کر رہی تھیں مگر پوچھا نہیں تھا...... فون پر باتیں، بلاوجہ قہقہے لگانا، بار بار آئینہ دیکھنا یہ شاید بلاوجہ نہیں تھا...... دل میں گرہ سی پڑ گئی۔

☆☆☆

شدید فلو اور بخار کے باوجود ریحان اختر کوئی فون سننے کے بعد صرف جوشاندہ پی کر تیزی سے چلا

گئے...... ان کے جانے کے بعد وہ چائے کا کپ لیے بوا کے پاس کچن میں آگئیں... نیناں ڈرائیور کے ساتھ یونیورسٹی ایڈمیشن کے لیے گئی تھی...... بجھی بجھی سی، روئی روئی سی، رابعہ کا دل دکھ سے بھر گیا اسے تو کچھ نہ کہا کیونکہ اس کا دکھ وہ جانتی تھیں...... البتہ بوا سے بات کرنے کے لیے اس سے بہتر موقع کوئی نہیں تھا۔

”کیا دیکھ رہی ہو؟“ بوا نے خود پوچھ لیا۔

”بوا! ماں سے بڑھ کر پیاری ہیں پھر نیناں کے لیے کچھ کیوں نہیں کرتیں؟“

”رمان کو سمجھاؤ وہ اپنی ضد چھوڑ دے، ریحان کی ضد تو راستے کی گرد ہے جلد بیٹھ جاتی ہے۔“

”بوا! کس قدر جانتی ہیں ریحان کو پھر مجھے کچھ نہیں بتایا، رمان کی ضد راستے کی گرد نہیں۔“ انہوں نے شکوہ کیا۔

”کیا نہیں بتایا؟“ وہ کچھ پریشان ہوگئیں۔

”بوا! آپ کو سب محبتوں کا واسطہ وہی بتا دیں جو رات کو ریحان سے کہا۔“ انہوں نے اس قدر اچانک کہا کہ وہ حیرت سے دیکھنے لگیں۔

”کیا، کیا کہا......؟“

”وہ سب جس نے ریحان کو رات بھر سونے نہیں دیا، وہ آپ کے کمرے میں بہت دیر رہے، یہ سب کیا ہے؟“ انہوں نے جرح کی...... بوا کچھ نہ بول سکیں صرف آنکھیں جھکالیں۔

”بولیں بوا!“ وہ مصر ہوگئیں۔

”کیا، کیا بتاؤں؟ میں نے ریحان کو کچھ غلط نہیں کہا، مجھ پر شک مت کرو۔“

”نہیں، نہیں اللہ نہ کرے کہ میں آپ پر شک کروں مگر بوا مجھے وہ سچ بتائیں جو ریحان کی سچائی ہے۔“

”پھر اس کے بعد......؟“ استفہامیہ نظروں سے دیکھا گیا۔

”میرے لیے نہ اب کچھ ہے اور نہ بعد میں مگر میری نیناں کا خیال کرلیں۔“

”نیناں کی بات تو رمان کے سمجھوتے پر ختم ہوتی ہے، اصل مسئلہ تو اس نیناں کا ہے جس کی ضد کو شکست میں بدلنے کا ریحان انتظار کر رہا ہے......؟“

”کیا مطلب؟ اس نیناں سے کیا مراد ہے؟“ انہیں شدید ذہنی جھٹکا لگا۔

”وہی نیناں جس کی فوٹو تم نے دیکھی، ریحان کی جنونی محبت۔ مگر اتنی ہی اس کی جنونی نفرت نے ریحان کو بے قرار ضدی بنا دیا...... تمہاری نیناں کا نام اس کی محبت میں رکھا ہے...... مگر کتنے زمانے گزر گئے اس ضدی عورت نے ریحان کو شوہر تسلیم نہیں کیا۔“

”کیا! وہ ریحان کی بیوی ہے، کہاں چھپا رکھا ہے......؟“ رابعہ پر یکے بعد دیگرے حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے۔

”نہیں معلوم، اس نے نکاح کے بعد سنا ہے بھاگ کر کسی بند کنویں میں چھلانگ لگا دی تھی، ریحان کے آدمیوں نے کنویں سے نکال کر کسی نامعلوم جگہ پر پہنچا دیا۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی پر چوٹ لگی تھی دھڑ بیکار ہوگیا، ریحان اب تک علاج کرا رہا ہے مگر بقول اس کے وہ نہ دوا کھاتی ہے نہ ریحان سے بات کرتی ہے۔“ وہ

دھیرے دھیرے ایسے بتا رہی تھیں جیسے کسی فلم کی اسٹوری سنا رہی ہوں۔

''اوہ میرے خدا! اتنا ظلم...... آپ کہانی سنا رہی ہیں یا حقیقت......؟'' رابعہ سر تھام کر رہ گئیں۔

''ایسی بہت سی حقیقتیں میرے دل و دماغ میں ہیں مگر اپنی بی بی کی اولاد کو بے عزت نہیں کرا سکتی......'' انہوں نے اعتراف کیا۔

''مگر آپ نے اچھا نہیں کیا میرے ساتھ، نیناں کے ساتھ، ایک دفعہ بھی آپ سچ نہ بتا سکیں، ریحان نے مجھ سے محبت کا کھیل کھیلا، مجھے اذیتیں دیں اور آپ نے ریحان کا ساتھ دیا......'' رابعہ کو ایک دم اشتعال آ گیا۔

''تو کیا کرتی؟ ہم جیسی نوکرانیوں کو مالک اسی لیے خریدتے ہیں، بی بی کے ساتھ آئی تھی ان کے بچوں کا بھرم نہ رکھتی......'' وہ بولیں۔

''مگر بوا آپ نے میرے اعتماد کو کرچی کرچی کر دیا، میری بیٹی کا نام ریحان نے نیناں رکھا تو آپ نے کچھ نہ کہا۔'' رابعہ آبدیدہ ہو گئیں۔

''ریحان کو کون سمجھا سکتا ہے بولو، وہ آج کہیں اور نہیں گیا اسی سے ملنے گیا ہے۔ وہ اسے یہاں لانا چاہتا ہے، میں اور تم کیسے روکیں گے؟ بس مجھے نیناں کی خوشی عزیز ہے۔''

''مت کریں یہ بناوٹی باتیں، ریحان نے مجھے میری بیٹی کے نام سے نفرت کرا دی ہے، میری سوتن کا نام میری بیٹی کو دے دیا...... اب وہ اپنے بھانجے کو اس کا ہاتھ پکڑا دے گا۔'' وہ تقریباً غصے سے چلا اٹھیں۔

''نہیں، طلال کے لیے وہ ایسا نہیں کر سکتا......'' وہ وثوق سے بولیں۔

''میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، میری اس قدر توہین کی ریحان نے، اب میں ایک پل بھی یہاں نہیں رہ سکتی۔''

''پاگل نہ بنو، ریحان کو مات ہونے تک ایسا مت سوچو، مجھے یقین ہے کہ وہ نیناں، ریحان کو کبھی قبول نہیں کرے گی۔'' وہ سختی سے بولیں۔

''پتا نہیں کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ...... میرا سر چکرانے لگا ہے۔''

''معاف کر دو، یہ سب کچھ چھپانا میری مجبوری ہے۔''

''رہنے دیں بوا! آپ کو مجھ پر ذرا ترس نہیں آیا، میں دوائیں کھاتی رہی، مار کھاتی رہی اور آپ نے زبان نہ کھولی۔''

''سب شکایتیں ٹھیک ہیں، مجھے برا بھلا کہو۔''

''میری بیٹی سے نہیں اس کے نام سے محبت ہے ریحان کو بس۔''

''بتایا تو ہے کہ اس کے حسن نے ریحان کو دیوانہ بنا دیا، اس کی نفرت نے ضدی بنا دیا۔''

''مجھ سے محبت کا ڈراما رچانے کی ضرورت کیا تھی؟'' وہ رو دیں، بوا نے ندامت سے سر جھکا لیا۔

''اور کچھ بھی کہیں، کیوں چپ ہو گئیں۔''

''بیٹا! رمان کو سمجھاؤ، نیناں مرجھا کے رہ گئی ہے۔''

''مت فکر کریں نیناں کی، وہ آپ سے کس قدر محبت کرتی ہے اور آپ نے اسے بھی دھوکا دیا۔'' رابعہ یہ

کہہ کر باہر نکل گئیں...... بوا نے ان کے جانے کے بعد ندامت کے آنسو بہائے۔

☆☆☆

عارفہ دادی کی طرف جانے کی تیاری کر رہی تھیں کہ طاہرہ بیگم پریشان حال آ گئیں...... وہ اس طرح دیکھ کر خود بھی فکرمند ہو گئیں۔

''بھابی! دعا بخار میں پھنک رہی ہے، بے سدھ پڑی ہے۔''

''ہیں! لیکن رات کو تو وہ یہاں سے ٹھیک گئی......'' غیر ارادی طور پر انہوں نے کہہ دیا۔

''کیا رات کو یہاں آئی تھی......؟''

''ہاں! لیکن بالکل ٹھیک تھی، اب کیا کریں......؟'' عارفہ بیگم کے ہاتھ پاؤں بھی پھول گئے۔

''اس کے ابا کو ڈاکٹر صاحب کو بلانے بھیجا ہے۔''

''تو صبح سے آپ کو پتا نہیں چلا میں رمان کے ساتھ اسپتال لے جاتی۔''

''میں نے سمجھا کہ سو رہی ہے اٹھ جائے گی، کل اس نے بہت کام کیا تھا، اس وجہ سے میں نے بے آرام نہیں کیا......'' طاہرہ بیگم پر تو رقت سی طاری ہو گئی۔

''اچھا گھبرانے کی کیا بات ہے؟ چلو چل کر دیکھیں......'' عارفہ بیگم نے ہمت بندھائی...... دونوں فوراً دعا کے پاس آ گئیں۔

''دعا! دعا! بیٹا آنکھیں کھولو......'' عارفہ اس کے سرہانے بیٹھ کر ماتھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں...... مگر اس میں جیسے کوئی بیداری پیدا نہیں ہوئی...... گرم گرم لمبی سانس پیدا ہو رہی تھی...... چہرہ سرخ انگارے کے مانند دمک رہا تھا۔

''کل تو خوش تھی...... آپ نے دیکھا تھا نا بہت مطمئن تھی......'' طاہرہ بیگم بولیں عارفہ بیگم کے اندر جیسے کسی نے تیز دھار آلے سے گھاؤ لگا دیا...... وہ طاہرہ بیگم کی اس لاعلم خوش فہمی کو کیسے مایوسی میں بدل دیتیں؟ رات کا وہ کربناک نظارہ انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا...... وہ رنجیدہ ہو گئیں...... مگر بولیں کچھ نہیں۔ اسی اثنا میں ڈاکٹر صاحب آ گئے...... عارفہ سرہانے سے اٹھ کر ذرا فاصلے پر کھڑی ہو گئیں...... ڈاکٹر نے کچھ ضروری سوالات کیے، اچھی طرح معائنہ کیا اور مُرتشویش انداز میں نسخہ لکھتے ہوئے ہدایت کی۔

''یہ میڈیسن فوراً منگوا کر دیں، آدھے گھنٹے تک بخار کی شدت میں کمی آنی چاہیے اگر نہ آئے تو اسپتال لے جائیں، ماتھے پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھیں۔'' برکت اللہ، ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ ہی باہر نکل گئے...... عارفہ نے رمان کو فون کیا اور فوراً گھر آنے کو کہا...... طاہرہ بیگم فریج سے ٹھنڈا پانی لائیں عارفہ نے ان کے ہاتھ سے پانی اور پٹیاں لے کر خود بہت پیار سے اس کے ماتھے پر رکھیں۔

''مجھے لگتا ہے میری بچی کو نظر لگ گئی، وہ اکبری بیگم اور آپا گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں۔'' طاہرہ بیگم نے خدشہ یقین میں بدل کر پیش کیا۔

''ارے نہیں، وہ کوئی بری نظر سے تھوڑی دیکھ رہی تھیں، مجھے لگتا ہے موسم کی تبدیلی کی وجہ سے بخار ہوا ہے۔'' عارفہ بیگم نے سچ پر پردہ ڈالتے ہوئے تسلی دی...... حالانکہ وہ حقیقت سے آشنا تھیں۔ بے سدھ پڑی دعا

کی آنکھوں کے کنارے اب تک آنسوؤں کے خشک ہونے کے آثار ظاہر کر رہے تھے...... وہ جانتی تھیں کہ دعا نے یہ فیصلہ قبول نہیں کیا صرف مجبوراً گردن جھکائی ہے اور مجبوری کا صدمہ بخار کی حدت میں بدل گیا ہے۔

''کچھ فرق پڑ رہا ہے کیا......؟'' طاہرہ بیگم نے ٹھنڈی پٹیاں بدلنے کے باعث چھو کر دیکھا۔

''انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں سوچ رہی ہوں اگر آپ چلی گئی ہوتیں تو میرے لیے کتنی مشکل ہوتی؟''

''ایسا کیوں سوچا؟ ارے آنا کوئی مشکل تھا اور اب جب تک میری دعا ٹھیک نہیں ہوتی میں یہیں رہوں گی۔'' ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ دعا کے لیے کیا کچھ کر ڈالیں، اس کی اس حالت کا ذمے دار وہ خود کو سمجھ رہی تھیں۔

''کاش! میری دعا کو آپ کے ساتھ ہی رہنے کا موقع ملتا؟'' بے خیالی میں ممتا کے احساس نے یہ جملہ طاہرہ کے منہ سے نکلوا دیا...... عارفہ کا دل تڑپ اٹھا...... وہ خود کو کسی بلندی سے گرتا محسوس کرنے لگیں۔

باہر گیٹ پر رمان کی گاڑی کا ہارن سن کر انہیں جانا پڑا...... مگر اندر اٹھتے شدید طوفان کے ساتھ......

☆☆☆

اپنے نام کی آواز سن کر دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے قدم کالج سے باہر نکالے...... سیاہ مرسڈیز اس کے لیے موجود تھی جس میں طلال اس کا منتظر تھا...... جلدی سے دروازہ کھول کر وہ اس کے برابر بیٹھ گئی...... گاڑی میں برق دوڑنے لگی...... کچھ دور کشادہ سڑک پر پہنچ کر طلال نے گاڑی کی رفتار کم کی اور بائیں ہاتھ سے اس کا دایاں ہاتھ تھام لیا۔

''جی جناب! اب کیا ارادے ہیں؟'' وہ عالمِ مدہوشی میں بولا۔

''وہ، وہ بس مجھے جلدی گھر جانا ہے دراصل......''

''یہ اگر مگر...... دراصل وراصل چھوڑو، یہ بتاؤ کتنی دیر ہمارے دل کو سکون پہنچا سکتی ہو؟''

''اللہ! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' وہ شرمائی۔

''ٹھیک کہہ رہا ہوں، آج دور تک ساتھ چلو، طبیعت اداس ہے۔''

''کیوں......؟''

''تمہاری سہیلی نے دل توڑا ہے، تم تو مرہم رکھ دو......'' زور سے اس کا ہاتھ دبا کر مخمور نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''مگر، وہ، میں تو شاید میں نے آپ کو فون کر کے غلطی کی......'' اب وہ کچھ بوکھلا سی رہی تھی۔

''مدیحہ! میں اس سرکش لڑکی کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ میں اس کے سوا بھی کسی سے محبت کر سکتا ہوں۔''

''محبت تو آپ کو نیناں سے ہی ہے۔''

''نہیں اب نہیں ہے، جانتی ہو کیوں......؟''

''بتائیں......؟''

''میرے ماموں اپنی لاڈلی نیناں کو میرے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔''

''دیکھیں! ہم بہت دور آ گئے ہیں......'' اس نے آبادی سے باہر نکلنے پر یاد دلایا۔

''کم آن یار! اب چپ کر کے بیٹھو، نیناں تمہاری دوست ہے ذرا سوچ جب اسے یہ پتا چلے گا کہ میں نے تمہیں کس قدر قریب کر لیا ہے تو اسے غصہ آئے گا۔''

''نہیں آئے گا کیونکہ وہ کہتی رہتی ہے کہ طلال اچھے نہیں ہیں۔'' مدیحہ نے بتایا تو وہ قہقہہ لگا کے ہنسنے لگا۔

''ہا، ہا، ہا لیکن تم بھی یہ سمجھتی ہو......؟''

''نہیں، اسی لیے تو آپ کے ساتھ ہوں......''

''اوہ میری نمکین! دل چاہتا ہے کہ تمہیں اڑا لے جاؤں......'' یہ پہلا موقع تھا کہ وہ دونوں ہی اظہارِ محبت کر رہے تھے۔

''ہائے! میری اماں اور آپا جان سے مار دیں گی، اب مجھے کوئی رکشا کرا دیں۔''

''ابھی سے، ابھی تو دل سنبھلا نہیں۔'' اسے سچ مچ غصہ تھا۔

''ایک بات بتائیں، اگر نیناں مان گئی تو......''

''نہیں وہ اپنے خالہ زاد کزن رمان کے لیے تڑپ رہی ہے، جسے ماموں نے ملنے سے بھی منع کر دیا ہے۔'' اس نے دھڑلے سے کہا۔

''طلال! نیناں بہت خفا ہوگی......'' وہ کچھ سوچ کر ڈر گئی۔

''کیوں؟ یہ تمہاری زندگی ہے، میری زندگی ہے، ہم جو چاہیں کریں۔'' وہ بڑی بے باکی سے بولا۔

''اچھا پلیز مجھے اب رکشا کرا دیں، دیر ہو گئی ہے، اماں تو کالج پہنچ جائیں گی۔'' مگر ابھی وہ جواب بھی نہیں دے پایا تھا کہ سلور جی ایل آئی بالکل برابر آ گئی، اس میں پچھلی سیٹ پر بیٹھی نیناں کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئی تھیں...... مدیحہ کو طلال کے ساتھ دیکھ کر اسے شاک لگا...... وہ تو یونیورسٹی سے واپس آ رہی تھی...... مدیحہ اور طلال نے اسے نہیں دیکھا...... گاڑی دائیں طرف ڈرائیور نے موڑ لی تو نیناں نے دکھ سے آنکھیں موند کر سر سیٹ کی پشت سے لگا لیا...... اسے دلی صدمہ پہنچا تھا، مدیحہ کو کتنا سمجھایا تھا مگر طلال کی شخصیت کے سحر میں وہ گرفتار ہو کر رہی...... اس حد تک آزادانہ میل جول کا مطلب یہی تھا کہ پانی سر سے گزر چکا ہے، مدیحہ کو سمجھانا بیکار ہے۔

☆☆☆

آج بھی اوجھل ہے نگاہوں سے نشانِ منزل
اے زندگی!
تو ہی بتا کتنا سفر باقی ہے؟

ایسے ہی بیکار، دائیں بائیں سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھیں کئی گھنٹے بے سبب گزر گئے...... پھر دوست پرانا یاد آیا تو جانے کہاں سے ڈھیر سارا اطمینان دل میں بھر گیا...... سبحان نے باہر ہی ان کی گاڑی دیکھ لی تھی...... گھر کے دروازے پر جونہی وہ پہنچیں تو وہ تیز قدموں سے چل کر قریب آ گئے...... سبحان کی ایک گاڑی کھڑی ہونے کے بعد دوسری گاڑی کی گنجائش نہیں رہتی تھی...... اس لیے انہوں نے باہر ہی

''ارے نہیں، ریحان آجائیں تو بات کرتی ہوں، تم سناؤ کب جارہے ہو؟'' انہوں نے اپنا ذہنی دباؤ کم کرنے کی خاطر موضوع بدلا۔

''بس ایک ڈیڑھ ماہ کے اندر، مکان کی رجسٹری ہونے کی دیر ہے۔''

''اچھا! اتنی جلدی وہ بھی میرے حالات جان کر۔''

''رابی! جانا تو ہے، نوکری جو وہاں ہوئی...... بڑی مشکل سے بڑے ابا کو راضی کیا ہے...... گوکہ وہ اب تک ضد پر اڑے ہیں۔''

''چھوڑ دو وہ نوکری، یہاں دادی کے بعد آفس کے معاملات دیکھو، مجھے دوست کی ضرورت ہے، پلیز......'' وہ یکدم منت سماجت پر اتر آئیں۔

''کم آن! یہ باتیں سننے کے لیے کہ دوست کاروبار کا لالچی تھا...... ریحان تمہیں بہت کچھ کہے گا۔''

''وہ اب کون سا رکتے ہیں اور پھر اُن سے کوئی رشتہ میں رکھنا نہیں چاہتی۔''

''ٹھنڈے دل سے غور کرو، میں ذرا نور بابا کو چائے کا کہہ دوں۔'' وہ یہ کہہ کر کچھ دیر کو باہر گئے...... واپس آئے تو انہوں نے اصرار کیا۔

''سبحان! پلیز میری خاطر نہ جاؤ، بڑے ابا کی بات مان لو۔''

''یعنی سعدیہ سے شادی کرلوں؟'' وہ مسکرائے۔

''ہاں! اور یہیں زندگی شروع کرو، میں نے کبھی کچھ نہیں مانگا مگر اب مجھے تمہاری اشد ضرورت ہے۔'' وہ بے بسی سے بولیں تو سبحان گڑبڑا گئے۔

''یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ نہ میری محبت ہے نہ عشق......'' انہوں نے پوچھا۔

''ہاں! اگر میری خواہش بڑے ابا کی مرضی اور تمہاری ضرورت ہے۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سعدیہ کا عشق کامیاب ہوگیا۔''

''ابھی تو تم نے کہا تھا کہ عشق دوطرفہ ہونے کا محتاج نہیں ہوتا۔'' نوردین بابا چائے اور بسکٹ لے آئے تو سبحان نے ان سے بڑے ابا کے متعلق پوچھا۔

''وہ تو سعدیہ بیٹیا کے پاس رہتے ہیں، وہ اکیلی جو ہوتی ہیں۔'' نوردین بابا کے لہجے میں معلومات کے ساتھ ساتھ ترحم کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

''نوردین بابا! یہ کمرا کتنا بے ترتیب ہورہا ہے؟'' رابعہ نے چاروں طرف بکھرے ہوئے بندھے ہوئے سامان کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ سامان یہاں سے جانے کا انتظار کررہا ہے۔''

''کہیں نہیں جارہا، آپ سارا سامان کھول کر سیٹ کردیں۔'' رابعہ نے نوردین بابا سے کہا تو وہ غیر یقینی کی سی کیفیت میں کبھی رابعہ کو دیکھنے لگتے اور کبھی سبحان کو۔

''سبحان کہہ دو نوردین بابا کو پھر سے گھر سجادیں۔'' رابعہ نے انہیں مخاطب کیا، وہ کچھ دیر انہیں دیکھتے رہے پھر اثبات میں گردن ہلا کر اشارہ کردیا...... نوردین بابا کی خوشی سے آنکھیں جھلملا گئیں...... بڑھ کر رابعہ

گاڑی لاک کی اور ان کے ساتھ اندر آگئیں۔

''خیریت، بڑے عرصے بعد ہماری یاد آئی......؟'' سبحان نے بکھری بکھری بے ترتیب سی حالت دیکھ کر پوچھا۔

''سبحان! میں سکون کی تلاش میں آئی ہوں، مجھے اپنے کمرے میں لے چلو، وہ سب یادیں میرے سامنے پھیلا دو جن میں اپنا سکون رکھ کے میں بھول گئی تھی......'' وہ بہت پژمردگی کے ساتھ چلتے ہوئے بولیں۔

''تم بھی کمال کرتی ہو، اس شخص کے پاس سکون ڈھونڈنے آئی ہو، جو خود سکون کی پہچان بھی کھوچکا ہے۔'' انہوں نے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آنے کا اشارہ کیا۔

''تم کیا جانو کہ تمہارے پہلو میں کتنا سکون ہے جبکہ نہ تم مسجد ہو، نہ مندر ہو اور نہ گرجا ہو۔'' وہ صوفے پر تقریباً گر سی گئیں...... سبحان کو افسردہ سی حیرت نے آگھیرا۔

''کیا بات ہے اتنا فلسفہ وہ بھی مجھ عاجز کے لیے......؟'' انہوں نے مذاقاً پوچھا تو ان کی افسردہ نگاہوں میں ہلکی سی چمک آئی۔

''سبحان! وہ سب باتیں کرو جو ہم کرتے تھے، میں بہت تنہائی محسوس کررہی ہوں۔''

''میں دیکھ رہا ہوں کہ کچھ عرصے پہلے جو تبدیلی تم میں آئی تھی وہ پھر رخصت ہوگئی ہے۔'' انہوں نے ان کے حلیے پر نظر ڈال کر کہا۔

''بس پر کھول کر اڑان بھرنے کی کوشش تھی۔''

''وہ کوشش اچھی تھی۔'' انہوں نے اعتراف کیا۔

''تم نہیں سمجھو گے، قدم قدم پر نت نئے دھوکے کھانے کے بعد کیا رہ جاتا ہے؟''

''اب ملال کے موسم سے باہر نکلو۔''

''کیسے نکلوں؟ جانتے ہو ریحان اختر کی پہلی بیوی ہے جس سے ریحان کو جنون کی حد تک عشق ہے۔''

''وہاٹ! یہ کس نے بتایا؟ یہ کیسے ممکن ہے......؟'' وہ تقریباً اچھل ہی پڑے۔

''بوا نے بتایا ہے، تمہیں یہ جان کر اور بھی حیرت ہوگی کہ اس کا نام نیناں ہے، میری بیٹی کو ریحان نے وہ نام دے دیا...... جس عورت کو ریحان سے شدید نفرت ہے وہ اس سے عشق کرتا ہے۔''

''عشق چیز ہی ایسی ہے، اس میں دوطرفہ کی تو شرط ہی نہیں ہوتی۔''

''قیمت دے کر عشق کرنا، یہ کہاں کی رسم ہے؟'' وہ طنزیہ بولیں۔

''ایک تاجر سے یہ سوال فضول ہے، اس کی شخصیت، حسب نسب ذہن میں رکھو۔'' سبحان نے انتہائی نرمی سے کہا۔

''سبحان! میں اس گھر میں رہنا نہیں چاہتی مگر میری بیٹی وہاں ہے اس کی خاطر میں کچھ نہیں کرسکتی۔''

''کیوں نہیں کرسکتیں، اسٹینڈ لو، ڈٹ جاؤ۔''

''ریحان کو سمجھانا آسان کام ہے کیا؟''

''کوئی مشکل نہیں ہے، میں بات کرتا ہوں۔''

کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھا تو رابعہ کو بھی جیسے قرار آ گیا۔

☆☆☆

شام کا ملگجا سا اندھیرا باقی تھا...... مدیحہ کے گھر میں قدم رکھنے کی دیر تھی کہ اکبری بیگم نے اسے بالوں سے پکڑ کر دبوچا اور سیدھے آپا کے سامنے لا پٹخا...... مدیحہ کو شدید ردِعمل کا خدشہ تو تھا مگر اتنے شدید اشتعال انگیز رویّے کا اندازہ نہیں تھا۔

''یہ لیں، سنبھالیں اپنی لاڈلی کو، پوچھیں اب تک کہاں تھی؟ کون چھوڑ کے گیا ہے؟'' اکبری بیگم نے کہا۔

''مدیحہ! طلال کون ہے؟'' آپا نے براہِ راست اس کو مخاطب کیا، اس کے چہرے پر رنگ سا آ کر چھا گیا۔

''طلال کہاں سے درمیان میں آ گیا......؟'' وہ فقط منمنائی۔

''کون طلال آپا......؟'' اکبری بیگم نے کچھ تعجب سے آپا کو دیکھا۔

''یہ طلال اختر......'' آپا نے اپنے تکیے کے نیچے سے وزیٹنگ کارڈ نکال کر سامنے رکھ دیا۔ مدیحہ کے پاس سچ بتانے کے سوا اب کچھ نہیں بچا تھا۔

''یہ سب کیا ہے مدیحہ بتاؤ، زلفی نے سن لیا تو خون پی جائے گا تیرا۔'' اماں نے باقاعدہ رونا شروع کر دیا۔

''کیوں طلال کسی خلائی مخلوق کا نام ہے؟ میری سہیلی نیناں کا کزن ہے، اس کا کارڈ ہونا کوئی جرم ہے؟'' اس نے الٹا چور کوتوال کو ڈانٹے کے مصداق رویہ اختیار کیا۔

''نیناں کا کزن ہے، تمہارا کیا واسطہ ہے اس سے......؟'' اماں نے زور سے دوہتھڑ مارتے ہوئے پوچھا۔

''اکبری! تم جاؤ میں پوچھتی ہوں، جاؤ جا کر ہنڈیا بھونو......'' آپا نے کافی متانت سے کہا۔ وہ بڑبڑاتے ہوئے چلی گئیں۔

''نیناں، راجا ریحان اختر کی بیٹی ہے، طلال کس کا بیٹا ہے؟'' انہوں نے عجیب سے انداز میں پوچھا۔

''نیناں کی پھپو کا بیٹا ہے......'' وہ بھیگی پلکیں صاف کرتے ہوئے بولی۔

''کون سی پھپو کا بیٹا؟''

''وسیمہ پھپو کا بیٹا، نیناں کی سگی پھپو کا بیٹا ہے......'' مدیحہ نے تلملا کر بڑے دباؤ کے ساتھ کہا...... آپا کے حلق کے اندر ہی سب چیخیں جیسے کسی نے قید کر دی تھیں...... کچھ دیر تو وہ بول بھی نہ سکیں...... مدیحہ کپڑے بدلنے کے لیے اٹھنے لگی تو انہوں نے روک لیا۔

''اور کتنے بیٹے ہیں نیناں کی پھپو کے؟''

''بس طلال ہی ہیں، باقی مجھے نہیں پتا......''

''کہاں تھیں اس کے ساتھ......؟'' انہوں نے تفتیشی نظروں سے گھورا۔

''بس لانگ ڈرائیو پر گئے تھے۔'' وہ نظریں جھکا کر بولی۔

''اس کی قماش تو پتا چل گئی، اب خون کا پتا لگانا باقی ہے......'' آپا نے گویا خود سے بات کی۔

''طلال مجھے پسند کرنے لگے ہیں، بہت اچھے ہیں، نیناں تو بلاوجہ انہیں برا بھلا کہتی ہے۔'' وہ جیسے شیر ہو گئی، اپنی ترنگ میں بولتی چلی گئی۔

''نیناں، کیوں برا بھلا کہتی ہے یہ نہیں سوچا تم نے، حسین و جمیل نیناں کو چھوڑ کر وہ تمہارے ساتھ وقت بتانے لگا...... کیوں؟'' آپا کو غصے آ گیا۔

''نیناں، رمان کو پسند کرتی ہے اس لیے۔'' وہ منہ پھلا کر بولی۔

''کچھ بھی ہے اب طلال کا نام بھی تمہاری زبان پر نہ آئے، ہمارا ان سے کوئی مقابلہ نہیں...... کاش! یہ بات مجھے تمہاری عمر میں بتائی جاتی۔''

''آپا! طلال اپنے فیصلے میں خود مختار ہے۔''

''وہ تمہارا رشتہ مانگنے آئے گا؟''

''ہاں! آپ اسے غلط نہ سمجھیں، مل کر دیکھیں۔''

''گھر سے نہ قدم نکالنا اور نہ اس سے رابطہ کرنا، میرے ملنے تک سمجھ گئیں......؟'' انہوں نے بہت سنجیدگی سے کہا۔

''اچھا۔''

''اب اٹھو، مغرب کی نماز کا وقت نکل رہا ہے۔'' وہ یہ کہہ کر جائے نماز بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

☆☆☆

رمان کے دھونس جمانے پر وہ تیار ہو کر گیٹ تک آ گئی۔ اس نے مما کو بتا دیا تھا، بوا ویسے ہی سمجھ گئی تھیں...... کچھ نہیں بولیں...... جس دن سے رابعہ سے بات ہوئی تھی۔ وہ اپنی ذات تک سمٹ کر رہ گئی تھیں، چپ چپ اور شرمندہ، شرمندہ سی...... رمان نے گیٹ کے باہر گاڑی کھڑی کی تھی، نیناں تیز قدموں سے باہر نکلی اور گاڑی کا فرنٹ ڈور کھول کر بیٹھ گئی...... رمان نے گاڑی اسٹارٹ کی۔

''پتا بھی ہے کہ بابا نے منع کیا ہے پھر بھی فون کیوں کرتے رہے؟'' وہ بڑی روانی میں کہہ گئی، رمان نے اس کی اس ادا پر فریفتہ ہوتے ہوئے کہا۔

''پتا بھی ہے کہ رمان احمر کا دل بے قرار تھا، نیناں ریحان کا دل بے تاب تھا سو ملنا ضروری تھا۔''

''لیکن حالات ہمارے لیے ٹھیک نہیں ہیں، اب ٹینشن ہے بابا اگر پیچھے سے آ گئے تو......؟'' وہ حد درجہ خوف زدہ سی تھی۔

''کمال ہے یار! تم تو آج بھی اتنی بزدل ہو، یہ جانتے ہوئے بھی کہ تمہارے بابا غلطی پر ہیں۔'' وہ سبک روی سے مصروف شاہراہ پر گاڑی چلاتے ہوئے بولا۔

''میں کر بھی کیا سکتی ہوں؟ اپنی مما کو تو خوش دیکھا نہیں۔''

''دیکھو! اب بہت ہو گیا ہے تم اور رابی خالہ اسٹینڈ لو۔'' ایک آئس کریم پارلر کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کرتے ہوئے اس نے کہا۔

''بابا کو کیا فرق پڑے گا؟''

"پڑے گا، تم ان کی کمزوری ہو یار، فائدہ اٹھاؤ......" آئس کریم کا آرڈر دے کر وہ اس کی طرف متوجہ ہوا۔

"تو تم بابا کی فرمائش پوری کر دو، میری خاطر۔" نیناں نے بڑی بڑی سرگیں آنکھوں سے دیکھتے ہوئے خواہش کا اظہار کیا...... اس سمے رمان کا دل چاہا کہ اسے بانہوں میں سمیٹ کر چوم لے...... مگر ضبط کا تقاضا اور تھا۔

"مجھے چاہتی ہو یا میری توہین چاہتی ہو......؟"

"غلط سمجھ رہے ہو، طلال بھائی گھات لگائے بیٹھے ہیں، بوا مکمل خاموش اور لاتعلق ہوگئی ہیں، مما تو اس قدر اپ سیٹ ہیں کہ کیا بتاؤں؟ اب ایسے میں تم ذرا سی گردن جھکا لو گے تو کیا ہو جائے گا۔"

"یہ ذرا سی بات نہیں ہے کچھ اصولی موقف ہوتے ہیں، دعا کس قدر مجھے چاہتی تھی بلکہ اب بھی اس کی حالت سے پتا چلتا ہے کہ وہ میرا خیال دل سے نہیں نکال سکی...... حالانکہ اس نے رشتہ قبول کر لیا...... میں نے اس کی خاطر فیصلہ نہیں بدلا۔"

"اچھا، بس بس، سمجھ میں آ گیا، طلال بھائی سے پھر میں کیسے بچ سکتی ہوں......؟" اس نے جذباتی انداز میں اس کا ادھورا جملہ اچک لیا۔

"طلال کو تو میں دیکھ لوں گا......" آئس کریم آ چکی تھی، ونیلا و چاکلیٹ اس کی فیورٹ تھی اس لیے انکار نہیں کیا...... ہاتھ بڑھا کر کپ لے لیا۔

"طلال بھائی تو ویسے ہی حد درجہ گھٹیا پن پر اتر آئے ہیں......" یکدم ہی اسے مدیحہ اور طلال کے چہرے نظروں کے سامنے دکھائی دینے لگے۔

"کیوں، اس نے چھیڑا ہے تمہیں......؟" رمان کا لہجہ پر مزاح تھا۔

"میں قتل کر دیتی ان کا......" وہ سیخ پا ہوگئی۔

"پھر......؟"

"میری سہیلی کے قریب ہونے کی کوشش کر رہے ہیں۔"

"تو اچھی بات ہے، تمہاری جان چھوٹ جائے گی......" آئس کریم کا مزہ لیتے ہوئے بڑے سرسری انداز میں وہ کہہ گیا۔

"جانتے ہو مدیحہ ایک غریب مگر شریف گھرانے کی لڑکی ہے، طلال بھائی کی عیاشی اس کا خاندان افورڈ نہیں کر سکتا، مدیحہ کا نقصان ہو سکتا ہے۔" وہ بہت مہربان ہمدرد سی سہیلی بن کر مخاطب ہوئی۔

"تو اس مدیحہ کو عقل دینی تھی۔"

"بس اسے طلال بھائی کی پرسنیلٹی بہت متاثر کرتی ہے۔"

"تو ڈوبنے دو، جو خود ڈوبنا چاہتا ہے اسے چھوڑ دیتے ہیں۔"

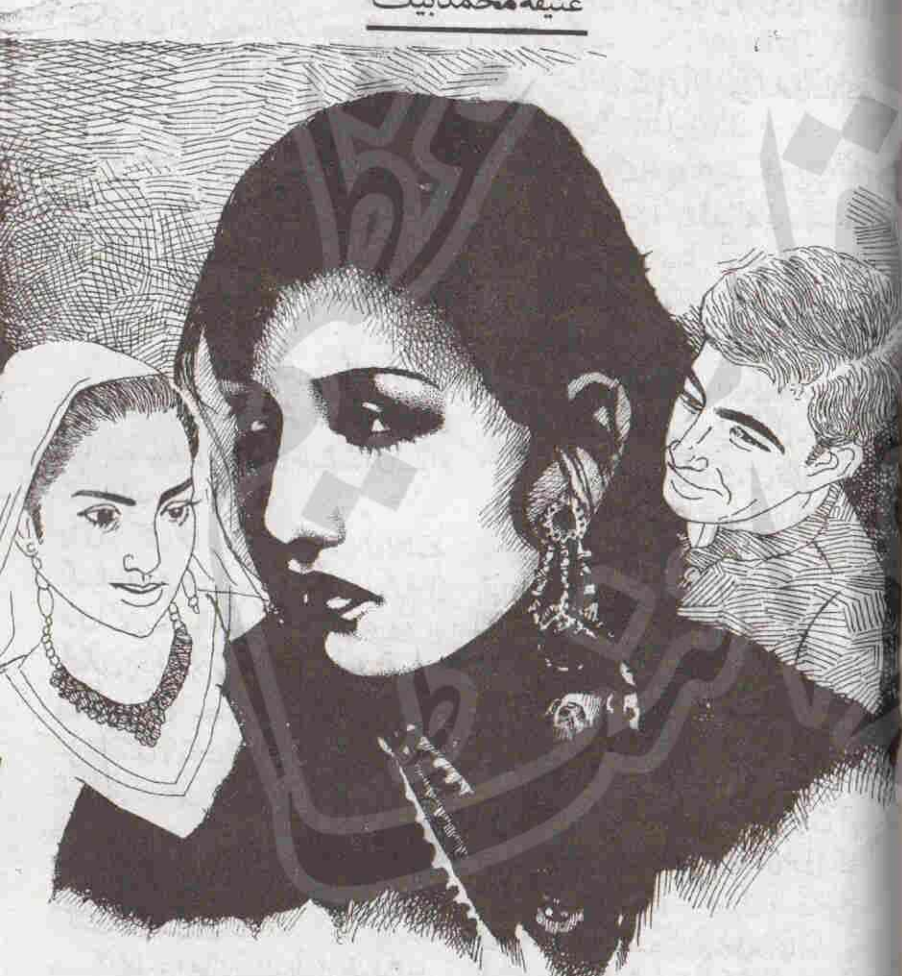
"یہ خود غرضی ہے۔"

"کم آن یار، ہم ایک دوسرے کے لیے آئے ہیں، مدیحہ اور طلال گئے بھاڑ میں۔" وہ کچھ خفا سا ہو کر بولا تو وہ مزید کچھ اور نہیں بولی، دھیرے دھیرے آئس کریم سے گویا کھیلتی رہی، ذہن تو مدیحہ کی جانب تھا۔

بقیہ اگلے ماہ پڑھیں

آوارہ رکھوالا

عنیقہ محمد بیگ



"ہیلو شمسہ...... تم فون کیوں نہیں اٹھا رہی تھیں...... میں کب سے فون کر رہا تھا ہر دفعہ طوبیٰ بھابی تمہاری فون اٹھا رہی تھیں......" تیمور نے خفگی بھرے لہجے میں پوچھا...... جب دوسری جانب فون پر طوبیٰ کے بجائے اس نے شمسہ کی آواز سنی۔

شمسہ دبی آواز سے بولی...... "تیمور مجھے اندازہ تو ہو گیا تھا کہ فون پر تم ہو مگر ابھی بھابی گھر سے دوائی لینے نہیں نکلیں...... ایسے میں کیسے فون اٹھا سکتی

ہوں۔" اس نے ڈرتے ڈرتے نظریں طوبیٰ کے بند دروازے پر ٹکا کر جواب دیا۔

وہ آہ بھر کر بولا۔ "اچھا...... ایسی ویسی بات ہو تو پلیز فون اٹھا کر ہیلو بول کر رکھ دیا کرو...... مجھے اشارہ مل جائے گا کہ گھر پر تم اکیلی نہیں ہو۔" اس نے اپنی بے قراری جتلائی کہ اس کے فون نہ اٹھانے پر وہ فکر مند ہے۔

وہ ڈرے ڈرتے بولی...... "میں فون رکھتی ہوں، بھابی کو شک ہوگیا کہ یہ کالز میرے لیے تھیں تو وہ میرا جینا حرام کردیں گی۔" اس کی آواز لرز رہی تھی۔

"تمہاری آواز سنی تو چین ملا۔ تمہیں نیا سال بہت بہت مبارک ہو اور اب میں فون رکھتا ہوں کہیں تمہارے لیے کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔" اس نے آہ بھر کر جواب دیا۔

"تمہیں بھی نیا سال مبارک ہو۔ دل کرتا ہے کہ سارا دن تم سے بات چیت کرتی رہوں مگر طوبیٰ بھابی کے ڈر سے ہاتھ فون کی طرف نہیں بڑھتے، وہ مجھے فون پر دیکھ کر خرم بھائی کے کان بعد میں بھر دیتی ہیں ...... جس سے ان کا موڈ آف ہوجاتا ہے...... تمہیں تو پتا ہے کہ میں ان کی ذمّے داری ہوں، بچپن میں ہی میرے والدین ایک کار حادثے کا شکار ہوگئے۔ خالہ شبنم نے پالا پوسا اور وہ بھی چل بسیں......" اس نے افسردگی سے بات ختم کی اس کی آنکھیں بھی بھر آئیں۔

"اچھا...... اچھا بس نئے سال میں خود کو دکھی نہ کرو...... میں ٹھیک بارہ بجے کے بعد فون کروں گا، تم گھر کے ہینڈ سیٹ کی بیل آہستہ کردینا۔"

"ہاں ٹھیک ہے، اب میں رکھتی ہوں...... بھابی کے کمرے سے آواز آرہی ہے شاید وہ تیار ہوگئیں۔" اس نے خدا حافظ کہہ کر ابھی فون رکھا ہی تھا اور جیسا اس نے سوچا ویسا ہی ہوا طوبیٰ نے یک دم دروازہ کھول دیا شمسہ جہاں کھڑی تھی کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

شمسہ کو فون کے پاس کھڑا دیکھ کر طوبیٰ نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔ "کس کا فون تھا؟"

شمسہ کی ٹانگیں کانپنے لگیں...... خود پر بہ مشکل قابو پا کر وہ نظریں چرا کر بولی۔ "بھابی رانگ کال تھی۔"

طوبیٰ نے غصے سے کہا۔ "صبح سے رانگ کالز آرہی ہیں...... پتا نہیں کون کمبخت ہے۔" اس نے اپنے دوپٹے کو سنبھال کر کہا۔ اس کی حالت سے اندازہ ہورہا تھا کہ وہ بازار کے لیے نکلنے لگی ہے۔

"بھابی...... آپ کہیں جارہی ہیں؟" اس نے بات کو پلٹا...... اور پیار سے پوچھا۔

"ہاں جہنم میں جارہی ہوں...... جہاں تمہارے والدین ہیں کاش کہ تم بھی اس گاڑی میں ہوتی...... تو خرم پر کوئی بوجھ نہ رہتا......" وہ پاؤں پٹخ کر بیگ سنبھالے یہ کہہ کر گھر سے نکل گئی اور شمسہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

❄❄❄

شمسہ کی صبح شام بھابی کے طعنوں پر شروع ختم ہوتی تھی...... اور تیمور سے بھی فون پر دوستی طوبیٰ کے طعنوں کی وجہ سے ہوئی تھی...... شمسہ کی دوست مریم اس کی ہمسائی کی جب سے شادی ہوئی وہ تنہا ہوکر رہ گئی...... وہ جب بھی طوبیٰ کے ظلم کی کہانی سناتی وہ اسے نصیحت کرتی۔

"خدا تعالیٰ سے دعا کرو، نماز کی پابندی کرو، خدا تمہیں بھابی کے قہر سے نکال دے گا۔" یوں شمسہ نماز کی طرف بڑھی مگر طوبیٰ کے برتاؤ میں کوئی تبدیلی

نہیں دیکھتی تو وہ مریم سے شکوہ کرتی کہ خدا میری دعا قبول کیوں نہیں کرتا۔ جس پر مریم ہمیشہ ایسے تسلی دیتی۔

"نماز میں پابندی رکھو...... خدا تمہاری مشکل آسان کردے گا۔" طوبیٰ کی جلی کٹی سے بچنے سے نماز کے علاوہ اسے کہیں...... سکون بھی نہیں ملتا تھا۔ اس کی میٹرک کے بعد پڑھائی چھڑوا دی گئی۔ گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد وہ مریم سے گپ شپ کرلیا کرتی تھی۔ مریم پیا گھر گئی تو پھر خدا کے سوا اس کا کوئی نہ رہا...... اس رات بھی وہ بھابی کے طعنوں کو سوچ کر رو رہی تھی جب تیمور کا فون آگیا...... وہ رات کو فون نہیں اٹھاتی تھی...... مگر اپنے اندر کی خاموشی کو توڑنے کے لیے اس نے تیمور سے بات کرلی...... یوں بات چیت کا سلسلہ جاری ہوگیا...... اور یہ بات چیت کب محبت میں تبدیل ہوگئی وہ نہیں جان سکی۔ وہ تیمور سے صرف اپنے دکھ شیئر کرتی تھی اور وہ اس کے دکھوں پر دلاسا دیتا، اس کے لیے تیمور ہی سب کچھ ہوگیا۔ جس دن طوبیٰ بھابی اسے نفرت سے پکارتیں وہ تیمور سے اس رات زیادہ باتیں کرتی۔ طوبیٰ کے چلے جانے کے بعد اس نے مین گیٹ کو لاک کیا اور فون کی طرف بڑھی۔

تیمور نے فون پر شمسہ کا نمبر دیکھا تو خوشی سے اٹھایا...... اور پیار سے بولا۔ "اتنی جلدی موقع مل گیا؟"

دوسری طرف وہ خوشی سے بولی۔ "جی ہاں، سچی محبت جو کرتی ہوں اس لیے خدا نے جلد ہی موقع فراہم کردیا۔"

تیمور ہنس کر بولا۔ "اچھی بات ہے، سچی محبت ہی کرنی چاہیے مگر میرے خیال میں سچی محبت کوئی نہیں کرتا۔"

اس کا چہرا بجھ سا گیا...... وہ افسردگی سے بولی۔ "تو کیا تم مجھ سے سچی محبت نہیں کرتے۔" اس کی آواز میں خفگی محسوس کرنے کے بعد وہ ہنسا۔ "یار مذاق کررہا ہوں اور تم سنجیدہ ہوگئیں۔"

"نہیں...... مجھے تم پر اعتبار نہیں...... میں فون رکھ رہی ہوں۔" وہ لرزتی آواز میں بولی۔

"اوہو...... جانو آپ تو خفا ہوگئیں، میں کان پکڑ کر مرغا بن جاتا ہوں۔" اس نے پیار سے جواب دیا۔

"نہیں، مجھے کوئی سزا آپ کو نہیں دینی۔" وہ غصے سے بولی۔

"اچھا، تو پھر مجھے معاف کردو، اگر سزا نہیں دینا چاہتیں۔" وہ ہنس کر بولا۔

"نہیں، میں اتنا بڑا دل بھی نہیں رکھتی۔" اس کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور وہ رونے لگی۔ تیمور کی یہ بات اسے کچھ زیادہ اس لیے بری لگی طوبیٰ بھابی جو اسے اور اس کے والدین کے لیے برا بول کر گئی تھیں وہ اس کے رونے پر ڈر سا گیا۔

"اوہو، شمسہ کیا ہوگیا ہے، تم جانتی تو ہو کہ پچھلے پانچ گھنٹے سے میں تمہاری آواز کا منتظر تھا، یہ پیار نہیں تو اور کیا ہے؟" وہ گھبرا سا گیا۔

"تیمور، میں تمہاری وجہ سے نہیں رو رہی، وہ تو بھابی" اس نے بات ادھوری چھوڑی۔

"اوہو، بھابی کے طعنوں پر نہ رویا کرو، تم جانتی ہو کہ ان کے پاس تمہارے لیے نفرت ہی ہوگی۔ ان سے پیار کی امید مت رکھو۔" اس نے خفگی سے جواب دیا۔

"مگر وہ میری بھابی ہیں، میرے بھائی کی بیوی...... وہ کیوں مجھے اپنا نہیں سمجھتیں؟" اس نے روتے روتے پوچھا۔

وہ خفگی سے بولا۔ ''تمہارے بھائی کو کب تمہاری فکر ہے تو پھر بھابی سے کیسے امید رکھتی ہو؟''

تیمور نے لفظ چبا چبا کر کہا تھا، جس سے وہ خاموش ہو کر رہ گئی۔ سچ ہی تو وہ کہہ رہا تھا خرم بھائی کی شادی کو دو سال ہو رہے تھے ایسے میں کسی دن بھی انہوں نے پیار سے اسے مخاطب نہیں کیا وہ سوچ میں پڑ گئی۔

وہ دوسری طرف خاموشی محسوس کر کے پیار سے بولا...... ''اچھا سب کو بھول کر مجھ سے باتیں کیا کرو اور پلیز ایک سیل فون خرید لو، میں تم سے بات نہ کروں تو دن بجھا، بجھا سا گزرتا ہے۔'' وہ خاموش رہی بلکہ اس کی سانس کی آواز آرہی تھی۔

''اب کیا ٹافی لے کر دوں تو بولو گی؟'' وہ ہنس کر بولا۔

اس کی بات پر وہ بھی ہنس دی اور ہنس کر بولی۔

''ٹافی نہیں مجھے سیل فون خرید کر دو۔''

تیمور جس کے پاس پیسے نہیں تھے، شمسہ کے یوں سیل فون مانگنے پر بوکھلا سا گیا...... تیمور نے شمسہ کو ابھی دیکھا ہوا نہیں تھا...... ان دونوں کی محبت فون پر ہی چل رہی تھی۔

تیمور کی طرف خاموشی رہی تو وہ ہنس کر بولی۔ ''لو جی اِک فون کیا مانگ لیا تمہاری بولتی بند ہو گئی۔''

تیمور جو یہ سوچ رہا تھا کہ اس نے سیل فون خریدنے کی کیوں رائے دی ہے جو الٹی اس پر آگری...... اب بات کو کیسے سنبھالے...... شمسہ نے یہ کہہ کر دوسرا حملہ کر دیا۔ وہ اکڑ کر بولا۔ ''نہیں، نہیں ایسی بات نہیں ہے، ایک کیا میں دو تین سیل فون خرید کر دے سکتا ہوں۔ میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ تمہیں سیل فون دینے آؤں گا تو اپنے چاند کا دیدار کروں گا۔'' وہ ہنسا۔ اس سے پہلے کہ شمسہ کی شوخی بڑھتی...... دروازے پر دستک ہوئی اس نے تیمور کو کسی کے آنے کی اطلاع دی اور تیزی سے فون کٹ کر دیا۔

❋❋❋

''مریم تم، شکر ہے تمہیں میری یاد تو آئی۔'' دروازے پر مریم کو کھڑا پا کر وہ اس کے گلے سے لپٹ کر بولی تھی۔

''یار! کب سے دروازے پر دستک دے رہی تھی، کیا تم سو رہی تھیں؟'' اس نے اندر آکر خفگی سے پوچھا۔

''نہیں، وہ فون آیا ہوا تھا۔''

''کس کا؟ تمہارے اس رات کے ساتھی کا...... جو تمہارے دکھوں کو سنتا ہے؟'' مریم نے مٹھائی کی پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

''یہ مٹھائی کس لیے؟'' وہ حیرت سے بولی۔

مریم نے خوشی سے کہا...... ''نئے سال پر تمہارا منہ میٹھا کرنے کے لیے لائی ہوں...... گلاب جامن تمہاری پسند کے ہیں۔'' اس نے خوشی سے بتایا۔

''گلاب جامن سے خالی کام نہیں چلے گا، میرا تحفہ کدھر ہے؟'' اس نے پلیٹ سے گلاب جامن اٹھا لیا اور کھاتے کھاتے پوچھا۔

''تمہارے لیے تحفہ بھی لائی ہوں...... درودِ پاک کثرت سے پڑھو...... سب مصیبتیں آسان ہو جائیں گی۔''

شمسہ کی آنکھیں بھر آئیں۔ ''بھابی نے آج نئے سال کے دن پھر مجھے طعنے بخشے۔''

مریم نے اس کا کندھا دبایا...... اور پیار سے بولی۔ ''جو تحفہ میں نے آج دیا ہے اس پر عمل کرو...... سب پریشانیوں سے نجات مل جائے گی......'' اس نے پُراعتماد ہو کر جواب دیا۔

شمسہ سنجیدگی سے بولی۔ ''بھابی کا رویہ ویسا ہی

ہے...... میں اپنی ہر نماز کی ادائیگی کے بعد دعا کرتی ہوں کہ خدا بھابی کے دل میں میرے لیے رحم پیدا کر دے۔'' اس نے پُرنم آنکھوں سے کہا تھا...... جس پر مریم بھی اداس ہو گئی۔ فون کی گھنٹی بج اٹھی...... شمسہ بوکھلا سی گئی۔

''کیا ہوا؟ اس دکھ کے ساتھی کا فون ہے کیا؟ ادھر دو...... میں بات کرتی ہوں اور اس سے پوچھتی ہوں کہ وہ رشتہ کب لینے آرہا ہے۔'' اس سے پہلے شمسہ فون اٹھاتی...... فون بند ہو گیا۔

شمسہ نے افسردگی سے کہا...... ''بات ابھی اتنی آگے تک نہیں پہنچی...... ابھی تو میں نے اسے دیکھا تک نہیں۔''

''تو دیکھ لو......'' مریم نے مسکرا کر کہا۔

''اچھا...... مگر مجھے لگتا ہے کہ بھابی کبھی یہ شادی ہونے نہیں دیں گی۔''

''یار! تم خدا سے مانگو...... جو مانگنا چاہتی ہو، بندوں پر امید مت رکھا کرو۔ اپنے سارے مسئلے خدا پر چھوڑ دو۔ مجھے دیکھو پچھلے ماہ میں کتنی پریشان تھی۔ نعیم کو ملازمت سے نکال دیا گیا بس خدا سے سچے دل سے اور درودِ پاک کثرت سے پڑھا...... خدا نے جلد ہی نعیم کو ملازمت دلوا دی......'' وہ پُرجوش انداز میں بولی تھی۔

''ہاں...... مریم شاید...... تم ٹھیک کہہ رہی ہو، مجھے بندوں سے امید نہیں رکھنی چاہیے، مجھے اپنے خدا سے مدد مانگنی چاہیے، اب میں بھی نماز کے ساتھ درودِ پاک کثرت سے پڑھوں گی۔'' اس نے ہنس کر دوسرا گلاب جامن منہ میں ڈال لیا اور مریم بھی خوش سی ہو گئی۔

☆☆☆

رات کو اس نے کھانا ٹیبل پر سجا کر بھابی کو آواز دی، کھانے کی ٹیبل پر طوبیٰ اسے خفا چہرے سے ملی اور خرم بھائی کا بھی موڈ آف تھا۔ وہ خاموشی سے کھانا کھانے لگی، تھوڑی دیر کے بعد خرم بھائی کی آواز نے خاموشی کو توڑا۔

''طوبیٰ میں نے جو فیصلہ کیا ہے اس میں میرا مقصد تمہیں دکھ پہنچانا نہیں، پلیز آرام سے کھانا کھاؤ، تمہاری طبیعت پہلے ہی ناساز رہتی ہے۔'' خرم بھائی نے سنجیدگی سے بات کو ختم کیا۔ طوبیٰ جو پلیٹ میں کھانا ڈال کر چمچے کے ساتھ چاولوں کی پہاڑیاں بنا رہی تھی وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور اس نے کھانا پھر بھی نہ شروع کیا۔

خرم فکرمندی سے کھانا کھانے لگا...... اپنے بھائی کو اداس دیکھ کر وہ پیار سے بولی...... ''بھابی کھانا کھا لیجیے...... میں بھائی کی طرف سے معافی مانگ لیتی ہوں۔'' اس نے خوشی سے کہا تھا۔

وہ غصے سے پھٹ پڑی...... ''تم کس بات کی معافی مانگ رہی ہو، تمہاری وجہ سے تو ہم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے۔''

''میری وجہ سے......'' وہ حیرت سے بولی، اس نے اپنے بھائی کو دیکھا۔

خرم نے افسردگی سے کہا۔ ''طوبیٰ خاموشی سے کھانا کھاؤ...... اور میں جانتا ہوں کہ میں جو کر رہا ہوں وہ ٹھیک ہے۔''

''زندگی جس نے گزارنی ہے اس سے پوچھ لیں؟'' طوبیٰ نے غصے سے جواب دیا۔

''کیا بات ہے بھائی...... آپ کیا بات کرنا چاہ رہے ہیں......'' اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔

خرم کھانا چھوڑ کر غصے سے چلا گیا...... وہ آواز دیتی رہ گئی...... ''بھیا...... بھیا ٹھہریں......'' مگر خرم نے مڑ کر نہیں دیکھا۔

طوبیٰ غصے سے بولی۔ ‘‘شمسہ یہ سب تمہاری وجہ سے ہو رہا ہے...... ہماری آمدنی بہت کم ہے اور اس پر تمہارا بوجھ...... یعقوب صاحب کا رشتہ تمہارے لیے آیا ہے مگر تمہارے بھائی کو تمہاری فکر پڑی ہے۔’’

‘‘یعقوب صاحب کا...... وہ جو آپ کے ابو کے دوست ہیں؟’’

‘‘ہاں...... وہی یعقوب صاحب...... بیس سال ہی بڑے ہیں زیادہ بڑے نہیں...... عمر کو مت دیکھو، ان کی دولت کو دیکھو۔’’ شمسہ کی آنکھیں حیرت سے پھٹی رہ گئیں...... اس کا جسم کانپنے لگا۔

‘‘شکر کرو کہ یہ رشتہ تمہارے لیے آیا ہے...... ورنہ تو ان سے بیاہ کے لیے ہزار لڑکیاں راضی ہیں۔’’ طوبیٰ نے اکڑ کر اپنے ابا کے دوست یعقوب کی تعریف کی...... شمسہ کی آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے...... مگر دل میں ڈر نہیں تھا کیونکہ اس کے بھائی نے رشتے کے لیے نفی کر دی تھی۔

‘‘روتی رہو......’’ طوبیٰ غصے سے بول کر اپنے کمرے میں چلی گئی اور شمسہ کھانا چھوڑ کر روتی رہ گئی۔

☆☆☆

‘‘پلیز...... رونا بند کرو...... اور تیمور سے بات کرو۔’’ اس نے مریم سے کل رات کی بات روتے روتے شیئر کی تو مریم نے اس کی بھابی طوبیٰ کی اکڑ اور مزاج سے ڈر کر اسے تیمور سے شادی کی بات کرنے کا مشورہ دیا۔

‘‘خرم بھائی نے میری سائڈ لی ہے۔’’ اس نے روتے روتے بتایا۔

مریم فکرمندی سے بولی۔ ‘‘تمہاری طوبیٰ بھابی ضد کی پکی ہیں، اپنی بات منوانے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہیں...... اس لیے تیمور سے بات آج رات ہی کرو۔’’ مریم نے چائے کا سپ لے کر جواب دیا...... مریم اپنے میکے میں ہی تھی اس لیے صبح گھر کا کام سمیٹ کر وہ اس کے پاس آ پہنچی...... خرم بھائی آفس نکل گئے تھے اور طوبیٰ مزے سے سو رہی تھی۔ وہ دیر تک سوتی رہتی تھی اس لیے شمسہ، مریم کے گھر چلی آئی...... مریم نے اس کے لیے ناشتا تیار کیا مگر اس نے ناشتا نہ کیا...... البتہ چائے پکڑ لی۔ کل رات کے واقعے سے اس کے سر میں درد اٹھ رہا تھا...... چائے سے اسے سکون ملا۔

شمسہ نے چائے کا سپ لیا...... اور آہ بھر کر بولی...... ‘‘مجھے کیا کرنا ہوگا؟’’

مریم نے ایک سلائس پر جیم لگا کر اسے تھمایا اور پیار سے بولی۔

‘‘تمہیں ناشتا کرنا ہوگا...... پھر دماغ چلے گا اور تمہارے کچھ کرنے یا نہ کرنے سے کچھ نہیں ہونے والا ہے...... یہ سب کام خدا کرتا ہے، خدا سے دعا کرو، تمہیں ہر مصیبت سے وہ بچا لے گا......’’ مریم نے اس کا کندھا دبایا۔

وہ سلائس چبا کر بولی...... ‘‘میں دن رات درودِ پاک کثرت سے پڑھ رہی ہوں مجھے بہت سکون ملتا ہے، کل رات بھی روتے روتے خدا کے سوا کسی کو نہیں پکارا اور میرا خدا کے سوا بھی تو کوئی نہیں......’’ اس کی آنکھیں پھر نم ہو گئیں۔

اس سے پہلے مریم کچھ بولتی...... محلے کا ایک بچہ آ کر بولا۔ ‘‘شمسہ آپی! آپ کو بھابی گھر پر بلا رہی ہیں...... بہت غصے میں نظر آ رہی ہیں۔’’

شمسہ نے چائے کا کپ وہیں چھوڑا...... اور گھبرا کر اٹھی۔

‘‘چائے تو پی لو......’’ مریم نے افسردگی سے کہا۔

‘‘نہیں...... بھابی بہت ناراض ہوں گی......’’ اس نے دوپٹا سنبھالا...... اور گھر سے باہر نکل گئی۔ مریم اداس سی ہو گئی...... البتہ اس کے ہونٹ دعا کے لیے ہلے۔

❊❊❊

‘‘پورے محلے کو جا کر بتاؤ کہ تمہاری بھابی بہت ظالم ہے اور تم مظلوم......’’ وہ گھر پہنچی تو اس کی بھیگی پلکوں سے طوبیٰ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ مریم کے گھر پر رو کر آئی ہے۔

‘‘بھابی میں نے آپ کے خلاف کسی سے کوئی بات نہیں کی۔’’ وہ سہم سی گئی۔

وہ غصے سے بولی...... ‘‘اچھا، اچھا...... زیادہ بکو مت...... جلدی سے ناشتا تیار کر کے دو...... کل رات بھی تمہاری وجہ سے کھانا نہیں کھایا، مجھے آج میکے جانا ہے۔’’ اس نے کہا تو شمسہ خوش سی ہو گئی...... کہ وہ تیمور سے جلد شادی کی بات کرے گی۔

طوبیٰ گھر سے نکلی...... تو شمسہ فون کی طرف لپکی...... اس نے تیمور کو مس کال دی دو منٹ کے بعد اس کے گھر کا فون بج اٹھا...... اس کا بجھا چہرہ کھل اٹھا۔

‘‘ہیلو...... تیمور...... کیسے ہو......؟’’ اس نے ہنس کر پوچھا۔

‘‘بالکل فٹ جناب...... تیمور کی جان کیسی ہے؟’’ اس نے شوخی سے پوچھا۔

‘‘میں بھی خوش ہوں مگر تھوڑی اداس بھی ہوں۔’’ اس نے کل کے واقعے کو یاد کر کے جواب دیا۔

‘‘کیوں...... اداس کیوں ہو......؟’’ اس نے حیرت سے پوچھا...... وہ جو ابھی ابھی نیند سے بیدار ہوا تھا اس نے کروٹ لے کر حیرانی دکھائی۔

‘‘میری شادی ہوتے ہوتے رہ گئی......’’ اس نے ہنس کر کہا۔

‘‘کیا......؟’’ اس کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔

‘‘سچ...... میری شادی طوبیٰ بھابی اپنے ابا جی کے دوست سے کروا رہی تھیں، وہ تو شکر ہے کہ میرے بھائی کے دل میں ابھی تھوڑی میری محبت ہے ورنہ میری زندگی برباد ہو جاتی۔’’ اس نے اداسی سے بتایا۔

‘‘اوہو...... مائی گاڈ...... تمہاری بھابی کتنی بری ہیں اور اگر تمہارا بھائی بھی مان جاتا تو......؟ اُف میرا کیا ہوتا......؟’’ وہ گھبرا کر بولا۔

‘‘کیوں...... تم کیوں اتنے پریشان ہو گئے...... کیا تم مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہو؟’’ اس نے مریم کی بات کو ذہن میں لا کر بات پوچھ ہی لی۔

‘‘ہاں...... تو اور کیا......’’ وہ ہنسا۔

‘‘سچ...... مگر ابھی تو تم نے مجھے دیکھا تک نہیں۔’’ وہ افسردگی سے بولی۔

‘‘یار! میں تمہیں آج دیکھنے آ جاتا ہوں، تم فکر کیوں کر رہی ہو؟ تمہیں سیل فون بھی تو دینا ہے۔’’ وہ گھر کا ایڈریس بے تابی سے مانگنے لگا۔

‘‘اچھا...... بابا...... کل گھر کا ایڈریس دے دوں گی...... پرسوں بھابی نے لاہور اپنی دوست کی شادی پر جانا ہے پھر تم گھر آ سکتے ہو۔’’

‘‘کیا...... گھر میں...... تم سچ کہہ رہی ہو، میں خواب تو نہیں دیکھ رہا۔’’ اس نے اپنے ہاتھ پر چٹکی کاٹی۔

‘‘اُف......’’ وہ چیخا۔

‘‘کیا ہوا......؟’’ وہ گھبرائی۔

‘‘یار سپنا نہیں...... تم سچ میں گھر کے اندر آنے کی دعوت دے رہی ہو، تمہیں اپنی بانہوں میں ابھی

سے دیکھ رہا ہوں۔" اس نے ہنس کر اپنے خواب کا اظہار کیا۔

"کچھ تو شرم کرو...... کیا بول رہے ہو۔" وہ شرما سی گئی۔

"میں کیوں شرم کروں، میں نے تو تمہیں اپنا ہم سفر مان لیا ہے...... پھر شرم کیسی......" اس نے اکڑ کر بات کا جواب دیا۔

شمسہ ہنس کر بولی۔ "اگر میں بدصورت نکلی تو پھر کیا کرو گے؟"

"کچھ نہیں...... میں نے تمہارے چہرے سے تھوڑی پیار کیا ہے۔" اس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

شمسہ کا دل چاہا کہ وہ تیمور کی بانہوں میں سما جائے...... مگر وہ کچھ کہہ نہ پائی۔

وہ شریر لہجے میں بولا۔ "اگر میں بڈھا آدمی نکلا...... تو تم کیا خودکشی کرلوگی؟" اس نے پوچھا۔

"میں کیوں کروں خودکشی...... بلکہ تمہیں اتنے طعنے دوں گی کہ تم خودکشی کرنے پر مجبور ہوجاؤ گے......" اس نے ہنس کر جواب دیا کہ رات کی اداسی تیمور سے باتیں کرنے پر اڑ سی گئی۔ وہ خوش دکھائی دے رہی تھی جیسے کل کچھ ہوا ہی نہیں ہو۔

تیمور نے ہنس کر کہا۔ "پیاری...... بڈھے لوگوں کو طعنے کھانے پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے، ہاں ایک دوہا کی کھانے پر جان نکل سکتی ہے۔"

"اچھا...... ایسی بات ہے تو میں ہاکی مارنے آجاتی ہوں۔" اس نے ہنسی دبالی۔

"سچ...... یا خدا مجھے جلدی سے بڈھا بنادے۔" وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔

"ایسی دعا کیوں مانگ رہے ہو...... بڈھے ہوجاؤ گے...... تو میں گھاس نہیں ڈالوں گی۔"

"یار! میری دعا کے پیچھے...... تمہارے پاس آنے کا راز ہے، بڈھا ہوجاؤں گا تو تم مجھے اپنے گھر جلد بلوالوگی۔" تیمور شوخی سے بولا۔

"ہاہاہا......" وہ ہنسی...... ظہر کی اذان ہونے لگی۔

"دیکھ لیں...... خدا تعالیٰ بھی...... لڑکیوں کے ظلم ہم معصوم مردوں پر......" تیمور نے ہنس کر کہا تھا۔

جس پر اس کا قہقہہ چھوٹ گیا...... "میں فون رکھتی ہوں، کل رات کو بات کریں گے، میں نماز پڑھ لوں......" وہ ہنس کر بولی۔

"اوہ...... میری اسلامی گرل فرینڈ......" اس نے ہنس کر کہا...... اور خدا حافظ کہہ کر فون رکھ دیا...... وہ وضو کے لیے باتھ روم میں مسکرا کر چلی گئی۔

❊❊❊

شمسہ کی آنکھ صبح فجر کی اذان پر کھلی...... اس نے سکون سے نماز کی ادائیگی کی اور پھر کچن کا رخ کیا...... برتن گندے سنک میں پڑے تھے...... رات کو طوبیٰ کے برتن دھونے کی ڈیوٹی تھی مگر یہ ڈیوٹی کا عمل نام کا تھا...... وہ خرم کے سامنے ڈیوٹی کا اعلان کرتی...... مگر خود اس پر عمل نہیں کرتی تھی، شمسہ نے جلدی سے ان پر ہاتھ چلایا...... یہ اس کا روز کا کام تھا مگر وہ کس سے شکوہ کرتی...... خدا کی ذات ہی تھی جس سے شکوہ کرتی...... برتن دھونے کے بعد اس نے کچن کے چھوٹے موٹے کام کیے کہ اسے کتے کے بھونکنے کی آواز آئی۔ وہ مسکرائی...... اور اس نے ٹفن میں سے روٹی کا پیس نکالا اور خاموشی سے مین گیٹ کی طرف بڑھی۔ طوبیٰ نے اسے کتے کو روٹی ڈالنے سے منع کیا ہوا تھا مگر اسے گلی کے آوارہ کتے پر ترس آہی جاتا...... نہ چاہا کر بھی وہ اس کو روٹی کا پیس ضرور ڈالتی جس پر طوبیٰ ہزار لعنتیں اسے بھیجتی۔ اس نے مین گیٹ کو آہستگی سے کھولا...... وہ اسے گیٹ سے پندرہ قدم دور کھڑا ملا...... شمسہ کو دیکھ کر اس نے اپنے قدم پیچھے کی طرف کردیے...... وہ کمزور حالت میں تھا اور ہر کسی سے گھبرا جاتا تھا۔ اس نے روٹی کا پیس اس کی طرف اچھالا...... وہ اس پر جھپٹا اور منہ میں روٹی کا پیس ڈال کر بھاگ گیا...... کتے کے منہ میں روٹی دیکھ کر اسے سکون سا ملا...... نہ جانے کیوں وہ اس آوارہ کتے کو روٹی کا پیس ڈال کر خوشی محسوس کرتی تھی۔ جیسے خدا تعالیٰ نے اسے اس کے رزق کا وسیلہ بنایا ہو۔ اس نے خوشی سے مین گیٹ بند کیا تو سامنے اپنے بھائی اور بھابی کو پایا۔

"کون تمہیں ملنے آیا تھا......؟" خرم نے غصے سے پوچھا۔ وہ تو ہکا بکا رہ گئی...... کہ خرم بھائی اس سے کیسا سوال کررہے ہیں۔

"نہیں بھیا...... ایسا کچھ نہیں، وہ تو میں......" وہ ڈر کر بولی۔ اس نے بات مکمل کرنا چاہی مگر طوبیٰ غصے سے بول اٹھی۔

"انہیں صفائی پیش مت کرو...... ہم دونوں سب کچھ جان چکے ہیں...... خرم میں نے یہ دیکھ کر آپ سے یعقوب صاحب کی بات پر زور دیا تھا۔" طوبیٰ نے طنزیہ لہجے میں خرم کو بتایا۔

خرم بھائی غصے سے کمرے میں چلے گئے وہ تڑپ کر بولی...... "بھابی خدا کے لیے بھائی جان کی غلط فہمی دور کریں...... وہ تو میں اس گلی کے کتے کو روٹی ڈالنے گئی تھی...... آپ تو جانتی ہیں کہ میں روز اسے کھانے کے لیے کچھ ڈالتی ہوں...... پلیز خدا کے لیے بھائی کی غلط فہمی دور کردیں...... ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔" اس نے روتے روتے التجا کی۔

طوبیٰ نے منہ پھیر لیا...... وہ ہاتھ جوڑ کر بولی۔ "بھابی پلیز! میں گھر کا سارا کام کروں گی...... آپ کے سامنے منہ تک نہیں کھولوں گی...... پلیز بھائی جان کو سچ بتادیں۔"

طوبیٰ نے خفگی سے کہا...... "میں کیا سچ بتاؤں...... انہوں نے جو دیکھا ہے وہ ہی ان کے لیے سچ ہے...... اس معاملے میں، میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتی۔" اس نے منہ بنا کر جواب دیا۔

وہ طوبیٰ سے التجا کررہی تھی کہ خرم بھائی آفس کے لیے تیار ہوکر آکھڑے ہوئے۔ انہوں نے ایک خفگی بھری نظر شمسہ پر ڈالی...... اور بولے...... "طوبیٰ تم یعقوب صاحب کی طرف ہاں کا پیغام بھیج دو...... اس سے پہلے کہ ہماری عزت محلے میں رسوا... ہوجائے۔" وہ یہ کہہ کر گھر سے نکل گئے...... طوبیٰ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی...... اور شمسہ کا جسم کانپنے لگا۔

وہ رو رہی تھی.......... جب طوبیٰ کی آواز اسے صحن سے آئی...... "دروازہ لاک کرلو، میں یعقوب صاحب کے گھر جارہی ہوں۔" وہ صحن کی طرف دوڑی...... کہ بھابی کے ہاتھ پاؤں جوڑ کر انہیں منالے گی مگر طوبیٰ تیزی سے نکل کر جاچکی تھی۔ اس نے روتے روتے گیٹ کو لاک کیا اور پھر فون کی طرف لپکی...... اس نے تیمور کو مس کال دی۔

پانچ منٹ کے بعد گھر کے فون پر بیل بج اٹھی...... اس نے فون اٹھایا تو رونا شروع کردیا۔

تیمور بھی گھبرا سا گیا...... "کیا ہوا، کیوں رو رہی ہو؟" شمسہ کے رونے پر اسے اندازہ ہوگیا کہ مسئلہ کچھ سنجیدہ ہے۔

وہ روتے روتے بولی۔ "تیمور وہ میری شادی یعقوب صاحب سے کروانے لگے ہیں...... پلیز مجھے بچالو...... ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔"

"کیا...... اُف...... اب کیا ہوگا...... وہ تو میرے رشتے کو بھی انکار کردیں گے...... اگر میں نے اپنی اماں کو تمہارے گھر بھیجا۔" اس نے افسردگی سے جواب دیا۔

"میں تمہارے بغیر مر جاؤں گی......" وہ چیخ کر بولی۔

"ہم بھاگ نکلتے ہیں؟" اس نے سنجیدگی سے کہا۔

"بھاگ کر......" وہ رونے لگی۔

تیمور نے سنجیدگی سے کہا...... "اس کے علاوہ اور ہمارے پاس راستہ بھی نہیں ہے اور میں تمہیں یہ بتانا نہیں چاہتا تھا کہ میری اماں اپنی بھانجی کو بہو کے روپ میں دیکھ رہی ہیں، اتنی جلد ان کو راضی کر کے تمہارے گھر نہیں بھیج سکتا...... تم میرے ساتھ بھاگنا چاہتی ہو تو میں تمہیں لے کر جا سکتا ہوں۔" اس نے سنجیدگی سے بات ختم کی۔

"تیمور مجھے آ کر لے جاؤ...... میں اس بڈھے سے بیاہ نہیں کر سکتی...... پلیز مجھے لے جاؤ۔" اس نے روتے روتے جواب دیا۔

تیمور پیار سے بولا۔ "اپنے گھر کا ایڈریس دو...... اور کل رات تمہاری بھابی لاہور کے لیے جا رہی ہیں...... بس ہم کل ہی بھاگ نکلتے ہیں۔"

اس نے روتے روتے گھر کا ایڈریس لکھوایا...... مگر دوسری جانب تیمور بہت مطمئن دکھائی دے رہا تھا۔

❋❋❋

صبح اس کی آنکھ دیر سے کھلی...... اس کے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ ساری رات وہ روتی رہی تھی اور خدا تعالیٰ کو یاد کرتی رہی...... کہ وہ اس کو اس مشکل سے نکال دے۔ طوبیٰ اپنی لاہور جانے کی پیکنگ کر رہی تھی وہ ایک دن کے لیے جا رہی تھی...... اس نے مریم کی والدہ فاطمہ سے بات کر لی تھی کہ وہ رات کو شمسہ کے پاس آ کر سو جائیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد خرم اور طوبیٰ سفر کے لیے روانہ ہو گئے...... اس نے گیٹ کو لاک کیا...... اور تیزی سے اپنی پیکنگ کرنے لگی...... اس نے اپنے چند سوٹ اور کچھ ضروری سامان ایک بیگ میں ڈال دیا...... اور پھر تیمور کو کال کی۔

"ہیلو...... تیمور...... بھابی اور بھائی جان چلے گئے ہیں...... میں نے ایک بیگ میں کچھ سامان رکھ لیا ہے مگر میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔" اس نے افسردگی سے بتایا۔

"یار! کیسی باتیں کر رہی ہو...... تمہیں پیسوں کی کیا ضرورت...... تم تو خود ہیرا ہو...... ہیرا...... میری جان میں اِک دوست کی طرف گھر کا پتا کرنے آیا ہوں، تم تیار رہنا...... میں تقریباً دس بجے رات کو تمہارے گھر کے پاس آ جاؤں گا......" اس نے پیار سے بتایا...... وہ خوش سی ہو گئی اور اس نے فون بند کر دیا۔

عصر کی اذان ہونے لگی...... اس نے جائے نماز بچھا لی...... اور خدا تعالیٰ کے حضور گر پڑی...... اس نے رو رو کر خدا سے شکوہ کیا...... کہ اس کے لیے یوں غیر محرم کے ساتھ بات کرنا، بھاگنا گناہ ہے...... مگر وہ کیا کرے...... اس کی دعائیں وہ کیوں نہیں سن رہا...... یہ سب خدا کی مرضی سے ہو رہا ہے کہ وہ یوں گھر سے بھاگ رہی ہے۔ اس نے رو، رو کر برا حال کر لیا تھا اس نے ایسا کبھی نہیں سوچا تھا...... کہ طوبیٰ اس کی بھابی اسے یوں بھائی کی نظروں میں نیچا کر دے گی...... اس کا دل چاہا...... کہ وہ مریم کو فون کر کے اپنے گھر سے جانے کی اطلاع دے...... مگر

پھر اس نے یہ سوچ کر نفی کی کہ کہیں مریم کسی کو بتا نہ دے...... جس سے تیمور کی زندگی خطرے میں پڑ جائے...... صبح اور دوپہر میں اس نے کچھ نہیں کھایا تھا۔ وہ افسردہ ہو کر کچن میں آ گئی...... اور چولھے پر چائے کا پانی چڑھایا...... پانی ابلنے لگا تو اسے یوں لگا جیسے اس کی زندگی ابل رہی ہے...... اگر وہ یہ گھر چھوڑ کر نہ گئی...... اس کی آنکھیں پھر آنسوؤں سے بھر گئیں...... اس نے بھاگنے کا تو کبھی سوچا نہیں تھا۔

❋❋❋

رات کے دس بج رہے تھے...... وہ بے صبری سے تیمور کا انتظار کر رہی تھی...... کہ ٹھیک دس بج کے پانچ منٹ پر گھر کا فون بجا۔

اس نے بے تابی سے فون اٹھایا تو دوسری طرف سے تیمور کی آواز ابھری...... وہ آہستگی سے بولا۔ "شمسہ میں تمہارے گھر کے سامنے جو میدان ہے، وہاں کھڑا ہوں تم باہر آ جاؤ۔"

"میں آتی ہوں......" اس نے یہ کہہ کر فون رکھا...... اور بیگ سنبھالا اور چادر اوڑھ کر مین گیٹ کی طرف لپکی۔ اس نے صحن میں آ کر گھر پر ایک گہری نظر ڈالی...... اس کی آنکھیں پُرنم سی ہو گئیں دل کو مضبوط کر کے اس نے مین گیٹ کھولا تو اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

"اوہ...... یہ یہاں...... کیسے......؟" اس نے آوارہ کتے کو اپنے مین گیٹ کے ساتھ بیٹھا دیکھا...... اس کا جبڑا شمسہ کو بہت خونخوار لگا...... وہ اسے گھورنے لگا۔ شمسہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا بیگ اس کی جانب کیا تا کہ وہ اپنی جگہ چھوڑ دے اور وہ باہر نکل سکے۔

بیگ کتے سے چھوا تو وہ شمسہ پر زور سے

غزل

ہمیں دریافت کرنے سے ہمیں تسخیر کرنے تک
بہت ہیں مرحلے باقی ابھی زنجیر کرنے تک

ہمارے ہجر کے قصے سمیٹو گے تو لکھو گے
ہزاروں بار سوچو گے ہمیں تحریر کرنے تک

یہ جگنو رقص بھی کرتے نہیں گو شب اندھیری ہے
ستارے گردشوں میں ہیں کسے تقدیر کرنے تک

تمہارے حسن کے جلوے نئے رنگوں میں ڈھالیں گے
ہمیں کچھ ہوش تو آئے تمہیں تصویر کرنے تک

ذرا میں بھی تو یہ دیکھوں، کہاں تک جاؤ گے آخر
بہت ہیں پستیاں حائل مری تحقیر کرنے تک

جہانِ خواب سے اکثر ہمیں تم نے پکارا ہے
چلو نکلیں سفر پہ اب اسے تعبیر کرنے تک

بہت انمول ہوتا ہے مگر صورت ہے اک باقی
تم اپنی زندگی دو گے، یہ دل جاگیر کرنے تک؟

کلام: یمنیٰ احمد

بھونکا اس نے تیزی سے گیٹ کو بند کیا اور لمبے لمبے سانس لینے لگی۔ اس کے بھونکنے پر اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ وہ منہ میں بڑبڑائی۔

”اُف، اب کیسے نکلوں...... یہ آوارہ کتا پاگل ہوگیا ہے......“ اس نے بیگ صحن میں چھوڑا...... اور تیمور کو فون کیا۔

دوسری طرف تیمور نے بے تابی سے فون اٹھایا اور بے چینی سے بولا۔ ”یار تم نے گیٹ کھولا مگر باہر نہیں نکلیں...... کیا ہوا ہے؟“

”ہاں! کتا...... وہ گلی کا آوارہ کتا میرے گیٹ کے ساتھ بیٹھا ہے...... اس کو آکر پیچھے کرو، مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔“ وہ گھبرا کر بولا۔

”اچھا فون رکھو...... میں گیٹ کے پاس آتا ہوں اور اس آوارہ کتے کا حشر نشر کرتا ہوں، جو ہماری محبت میں دیوار بنا بیٹھا ہے۔“

اس نے فون رکھا اور دوبارہ گیٹ پر پہنچی...... اس نے گیٹ کھولا تو اپنے سے دس قدم دور تیمور کو کھڑا پایا۔

وہ شرما سی گئی...... وہ پیار سے بولا۔ ”یار تم کتنی پیاری ہو۔“ اس سے پہلے کچھ اور کہتا...... آوارہ کتا اس پر بھونکنے لگا...... اس کے جسم کی پھرتی دیکھ کر تیمور تھوڑا سا گھبرا کر پیچھے ہٹا...... یوں لگ رہا تھا کہ جیسے تیمور گیٹ کے پاس آیا تو وہ اس پر حملہ کردے گا...... تیمور کافی دور چلا گیا...... اور اس نے شمسہ کو کال کی...... وہ بھی آوارہ کتے کے عمل سے گھبرا گیا۔

شمسہ فون کی طرف لپکی...... اس نے فون اٹھایا...... تو تیمور نے فکر مندی سے کہا۔ ”یہ کیا مصیبت ہے، یہ کس کا کتا ہے؟“

”آوارہ گلی کا کتا ہے...... اس کتے کی وجہ سے تو بھائی خرم نے یعقوب صاحب سے جبراً شادی کا سوچا...... یہ کتا میرے لیے عذاب ہے...... دیکھو آج پھر کیسے آگیا...... اور مجھ سے ڈر بھی نہیں رہا...... یہ کتا تو بہت ڈرپوک تھا...... مگر آج پتا نہیں کیوں مجھ پر بھونک رہا ہے۔“

”ٹھہرو...... ایک منٹ میں اس کا کام تمام کرتا ہوں۔“ تیمور نے غصے سے ایک اینٹ اٹھائی...... اور اس کتے کو ماری...... کتے نے زور سے بھونکنا شروع کردیا۔ شمسہ گیٹ کی طرف آئی...... اس نے گیٹ کھولا...... تو کتے کے سر سے خون ٹپک رہا تھا۔

”اوہ...... نو......“ کتے نے شمسہ کو دیکھا تو اس پر زور سے بھونکنے لگا...... شمسہ نے ڈر کے مارے دروازہ بند کرلیا۔ وہ منہ میں بڑبڑائی۔

”یا خدا...... یہ کس عذاب میں ڈال دیا ہے...... مجھے اپنے حفظ و امان میں کیوں نہیں رکھ رہا۔ آخر مجھ سے کیا غلطی ہوگئی ہے......“ وہ یہ کہہ کر رونے لگی...... تیمور نے شمسہ کے محلے داروں کو گھر سے کتے کے بھونکنے پر نکلتے دیکھا...... تو اس نے کال لگائی۔

شمسہ نے روتے روتے فون اٹھایا...... تیمور نے گھبراہٹ میں کہا۔ ”شمسہ میں جارہا ہوں...... تمہارے محلے کے لوگ نکل آئے ہیں...... میرے خیال میں کل رات ہم بھاگ جاتے ہیں...... آج خطرناک لگ رہا ہے۔“ اس نے لرزتی ہوئی آواز میں ہاں کہہ کر فون رکھ دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

❋❋❋

رات کو بارہ بجے گیٹ پر بیل ہوئی...... اس نے افسردگی سے گیٹ کھولا۔ جانتی تھی مریم کی والدہ خالہ فاطمہ اس کے پاس سونے کے لیے آئی ہیں۔

”بچی! ٹھیک ہو......“ خالہ فاطمہ نے اس کے سر پر پیار دے کر پوچھا...... وہ اندر آئی تو اس نے باہر دیکھا...... وہ آوارہ کتا اس کے گیٹ کے تقریباً دس قدم کے فاصلے پر بیٹھا ہوا ہے۔ ایک غصیلی نظر اس نے کتے پر ڈالی اور زور سے گیٹ بند کیا...... خالہ فاطمہ گھبرا سی گئیں۔

”کیا ہوا...... بچی...... پریشان ہو کیا؟“ خالہ فاطمہ نے پیار سے پوچھا...... وہ خالہ فاطمہ کے گلے سے لگ کر رونے لگی۔

”بس...... صبر کرو...... میں جانتی ہوں مجھے علم ہے سب باتوں کا۔ میں ابھی عشا کی نماز ادا کر کے تمہارے لیے دعا کر رہی تھی کہ اللہ تمہیں ہر مصیبت سے بچائے۔“

”خدا میری دعا قبول نہیں کرتا...... میری شادی یعقوب سے بھابی کرادیں گی...... مجھے خدا پر بھروسا نہیں رہا۔ میں نے دن رات اس کی عبادت کی مگر وہ پھر بھی مجھ سے خوش نہیں۔“

”نہیں میری بچی...... ایسی بات نہیں سوچتے...... خدا تعالیٰ اپنے بندوں کی سنتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ بس صبر سے کام لو......“ خالہ فاطمہ نے اسے تسلی دی اور اسے درودِ پاک پڑھنے کی نصیحت کی...... خالہ فاطمہ کے ساتھ اس نے رات کو درودِ پاک کی کافی تسبیح پڑھیں...... اسے اپنا دل ہلکا محسوس ہونے لگا جیسے بھابی اور بھائی اس کی شادی نہیں کریں گے۔

❋❋❋

صبح نمازِ فجر کی اذان پر اس کی نیند کھلی...... خالہ فاطمہ کو اس نے وضو کرتے پایا دونوں نے مل کر نماز ادا کی اور پھر خالہ فاطمہ اپنے گھر چلی گئیں۔

اس نے آٹھ بجے کے قریب تیمور کو فون کیا...... اس کا نمبر آف جارہا تھا...... وہ پریشان سی ہوگئی۔ اس نے اپنے لیے ناشتا تیار کیا...... اور جو بیگ اس نے اپنے لیے بنایا ہوا تھا اس میں سے چیزیں نکال لیں...... بھابی اور بھائی نے دوپہر کو آنے کا کہا تھا...... اس لیے اس نے ہنڈیا بنانے کے لیے پیاز کاٹی...... ہنڈیا چولھے پر رکھ کر اس نے دوبارہ تیمور کو کال کی...... تیمور کا نمبر آف جارہا تھا۔ وہ اداس سی ہوگئی...... اس نے گھر کی خاموشی کو توڑنے کے لیے ٹی وی آن کرلیا اور صوفے پر بیٹھ گئی۔ کافی چینلز تبدیل کرنے کے بعد ایک نیوز چینل پر بریکنگ نیوز پر اس کی نظر ٹھہری گی...... نیوز کاسٹر بہت دکھ سے بول رہی تھی۔

”کل رات اِک ایسا درندہ گرفتار کیا ہے......

جو لڑکیوں کو اپنے پیار کے جال میں پھنسا کر انہیں بھگا لینے کے بعد دوسرے ملکوں میں فروخت کر دیتا ہے اور خوب پیسہ کماتا ہے۔ یہ دیکھیں اس خطرناک درندے کی تصویر۔'' اس نے تیمور کو پولیس کے ہجوم کے ساتھ ہتھکڑی پہنے دیکھا تو اس کی سانس اٹک گئی۔ ہاتھ پاؤں لرزنے لگے آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے اور اسے تیمور کی بات یاد آئی۔

''تمہیں پیسوں کی کیا ضرورت ہے، تم تو خود ہیرا ہو۔'' نیوز کاسٹر بہت خفگی سے بول رہی تھی۔

''اس درندے نے اپنے گروپ کا نام بھی ہیرا رکھا ہوا...... اس کے دو ساتھی اور ہیں...... جن کو بہت جلد پکڑا جائے گا۔''

شمسہ یہ سب کچھ دیکھ کر سن کر سن سی ہوگئی۔ تھوڑی دیر بعد اسے اس صدمے سے فون نے نکالا جو مکمل طور پر خود کو مفلوج سمجھ رہی تھی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا...... دوسری طرف طوبیٰ کی آواز ابھری۔ وہ خوشی سے بولی۔ ''ہم گھر شام تک آجائیں گے...... یہاں ثمینہ کی ماں نے تمہارا رشتہ آفتاب کے لیے مانگ لیا ہے۔ آفتاب جو ثمینہ کا اکلوتا بھائی ہے...... جو لندن میں رہتا ہے۔ تمہاری نمازیں تمہارے کام آگئیں...... خدا نے بہت اچھا رشتہ دیا ہے...... یعقوب صاحب سے بھی اچھا...... بہت امیر لوگ ہیں......'' وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

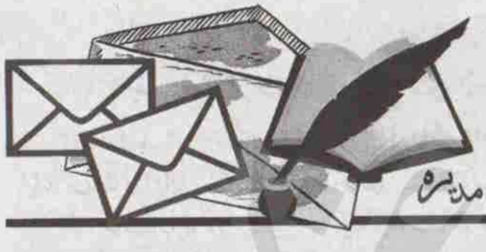
طوبیٰ نے ہنس کر کہا۔ ''خوشی کے آنسو ہیں...... نکال لو...... جتنے نکالنے ہیں اچھا میں رکھتی ہوں......'' اس نے خوشی خوشی فون رکھ دیا۔

آفتاب جیسے لڑکے کے ساتھ شادی اسے خواب لگ رہی تھی۔ آفتاب بہت سمجھدار اور حسین نوجوان پڑھا لکھا تھا...... اس نے آفتاب کو دو سال پہلے اپنے بھائی کی شادی پر دیکھا تھا جو اس کے ہر بار دیکھنے پر ایسے مسکراہٹ بخشتا اور وہ شرما سی جاتی...... شمسہ کا خواب آفتاب تھا...... جس کی آج ایسے تعبیر مل گئی تھی۔ اس نے اپنے آنسوؤں کو پونچھا اور وضو کر کے درودِ پاک کی تسبیح پڑھنے لگی۔ تیمور جیسے درندے کی سوچ ختم ہوتی چلی گئی اس نے ظہر کی نماز سکون سے ادا کی اور خدا تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ خدا تعالیٰ نے اسے تمام مصیبتوں سے آزادی دلا دی ہے پھر اسے اپنے گیٹ کے پاس کچھ بچوں کا شور سنائی دیا، وہ گیٹ کے پاس پہنچی۔ اس نے آہستگی سے گیٹ کھولا تو اس نے باہر کا منظر دیکھا اس آوارہ کتے کو بچے پتھر مار رہے تھے اور وہ ڈر کر ادھر اُدھر بھاگ رہا تھا۔ کتے کے سر سے خون ابھی بھی ٹپک رہا تھا۔

اس نے بچوں کو چیخ کر کہا۔ ''کیوں اس کو مار رہے ہو...... مت مارو۔''

ایک ہوشیار بچہ ان میں سے بولا۔ ''آپی یہ آوارہ کتا ہے اس کو محلے سے بھگا رہے ہیں ورنہ یہ کسی کو بھی کاٹ لے گا۔'' باقی دوسرے بچوں نے پھر پتھر اٹھا کر اس کو مارنا شروع کردیے۔ کتا میدان کی طرف ڈرتا ڈرتا بھاگا۔ بچے اس کے پیچھے تھے یہ منظر دیکھ کر شمسہ کو احساس ہوا کہ خدا تعالیٰ نے اس آورہ کتے کو اس کی عزت کا محافظ بنا کر بھیجا تھا۔ جو کل اینٹ سے نہیں ڈر رہا تھا اور صبح چھوٹے چھوٹے پتھروں سے گھبرا رہا ہے۔ وہ خدا تعالیٰ کے کرشمے پر سبحان اللہ کہہ کر درودِ پاک پڑھنے لگی...... ساری خوشیاں اس کو خدا تعالیٰ نے ایک لمحے میں بخش دیں...... آوارہ کتا اس کی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ بچے آوارہ کتا...... آوارہ کتا پکار رہے تھے مگر اس کا دل اسے رکھوالا کہہ کر پکار رہا تھا۔

❊❊❊



بہنوں کی محفل

مدیرہ

☆ عزیز از جان بہنو! السلام علیکم رحمتہ اللہ و برکاتہ!

☆ حمد و ستائش اس ذات کے لیے جس نے کارخانۂ عالم کو وجود بخشا اور درود و سلام حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنہوں نے دنیا میں حق کا بول بالا کیا۔

☆ کتنی عجیب بات ہے کہ پہلے نئے سال کے قدموں کی آہٹ دل کو الوہی خوشیوں اور اُمنگوں سے بھر دیتی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے زندگی میں اچانک بہت سارے خوشنما رنگ شامل ہوجائیں گے، جو بیتے سال میں نہیں تھے...... جیسے سب کچھ آناً فاناً تبدیل ہوجائے گا۔ نیا سال آئے گا تو کسی پری کی چھڑی کی طرح گھڑی کی سوئیوں کے گھومنے کے ساتھ ہی زندگی بھی اپنا پیراہن تبدیل کرے گی۔ ہر سُو رنگ، پھول، خوشبو، روشنی اور قوسِ قزح کی حکمرانی ہوگی۔ کہیں کوئی دکھ، پریشانی، اُداسی کا گزر تک نہیں ہوگا...... نیا سال، نئے جذبے، نئے رنگ اور نئی روشنی لائے گا۔

اور اب یہ سب باتیں کسی دیوانے کا خواب لگا کرتی ہیں...... لیکن ہمیں اسی ملک میں رہنا ہے...... ناامیدی کفر ہے...... نامساعد حالات میں بھی ہمیں اپنے آپ کو سنبھال کر رکھنا ہے تو ہم سب کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک نظر سالِ گزشتہ پر ڈال کر ضرور یہ سوچیں یہ سال اس کے لیے کیسا رہا؟ اس نے کیا کھویا، کیا پایا۔ کتنی غلطیاں سرزد ہوئیں اور کتنی کامیابیاں حاصل ہوئیں...... تاکہ نئے سال کے لیے اپنا لائحہ عمل ترتیب دیتے ہوئے انہیں دھیان میں رکھا جائے...... ہر شخص نئے سال کے آغاز پر اپنے لیے کوئی نہ کوئی ٹارگٹ ضرور رکھتا ہے...... اسے بہتر طور پر گزارنے کے لیے پلاننگ بھی کرتا ہے اسی لیے مجھے آپ سے ایک چھوٹی سی بات بھی کہنی ہے کہ نئے سال کے لیے آپ یہ ٹارگٹ ضرور رکھیے گا...... اگر آپ کی ذات سے کسی کو کوئی فائدہ نہ پہنچے تو کسی کو کوئی نقصان بھی نہ پہنچے...... اور رشتے داریوں کو نہ توڑیں کہ یہ سخت گناہ ہے...... اور ہمیں گناہوں سے حتی المقدور اپنے آپ کو بچانا ہے۔ (انشاءاللہ)

✱✱✱

آئیں اب سرگرمیوں پر نظر ڈالنے سے قبل درودِ ابراہیمی پڑھتے ہیں جو نماز میں پڑھا جاتا ہے اور اس کے بعد صرف تین بار آیت کریمہ پڑھ کر اپنے لیے، اپنے ملک کے لیے اور عالمِ اسلام کی پریشانیوں کو رفع کرنے کے لیے ضرور دعا مانگیں۔ ابھی پڑھ لیں۔

آیت کریمہ یہ ہے۔

لا الہ الا انت سبحنک انی کنت من الظالمین ٥

* * *

مصنفات، شاعرات اور قارئین پاکیزہ بہنوں کی تازہ بہ تازہ سرگرمیاں

☆ ہماری مایہ ناز مصنفہ عمیرہ احمد کو بہترین ڈراما نگار کا ایوارڈ گزشتہ دنوں دبئی کی ایک تقریب میں دیا گیا جو لکس اسٹائل ایوارڈ کے تحت منعقد کی گئی تھی۔ (بے حد مبارک باد)

☆ افسانہ نگار، شاعرہ اور ریڈیو پروڈیوسر سیما رضا ردا ان دنوں اپنا افسانوی مجموعہ ترتیب دے رہی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ علامہ عبدالستار عاصم کی نئی کتاب ڈینگی سے تحفظ کیسے شائع ہوگئی ہے اور اس کتاب کی ضرورت ہر شخص کو ہوگی جو خود ڈینگی کا شکار ہو چکا ہے یا اس سے بچنا چاہتا ہے۔ اس کتاب میں ڈینگی بخار اور دیگر بیماریوں سے بچنے کی دعائیں بھی موجود ہیں۔ صفحات 112۔ کتاب کا ہدیہ صرف سو روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس۔ مقبول اکیڈمی۔ 199۔ سرکلر روڈ چوک اردو بازار۔ لاہور۔ فون نمبر 042-37324164۔

☆ پیر عبداللطیف خان نقشبندی کی تحریر کردہ جامع کتاب شائع ہوگئی ہے۔ نماز سے متعلق اسلامی و روحانی تعلیمات کا انسائیکلوپیڈیا حسنِ نماز ایک ہزار صفحات پر مشتمل یہ کتاب آپ فی سبیل اللہ بھی حاصل کرسکتی ہیں اور عطیہ بھی (اپنے حساب سے) بھیج سکتی ہیں تاکہ دیگر لوگ بھی یہ کتاب مفت حاصل کرسکیں۔ رابطہ۔ رضویہ ٹرسٹ۔ سینٹرل کمرشل مارکیٹ۔ ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون نمبر۔ 042-35855537

☆ طنز و مزاح سے مزین نمکین کلام کا مجموعہ سلولی سلولی شائع ہوگیا ہے۔ جس کے شاعر سید سلمان گیلانی ہیں۔ یہ ان کا پہلا شعری مجموعہ ہے...... اور بہت دلچسپ ہے کہ اس کو پڑھتے ہی ڈپریشن دور اور چہرے پر مسکراہٹ پھیل جائے گی۔ صفحات 206 ہیں اور قیمت 250 روپے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ ادارہ سادات۔ 487۔ عباس بلاک۔ مصطفیٰ ٹاؤن۔ وحدت روڈ۔ لاہور۔ فون نمبر 042-35421487۔

☆ بفضلِ خدا ہماری سولھویں کتاب کھری کھری شائع ہوگئی ہے۔ یہ طنز و مزاح کی ضخیم کتاب ہے جو 366 صفحات پر مشتمل ہے، اس کتاب کا انتساب محسن پاکستان ڈاکٹر قدیر خاں کے نام ہے۔ قمر علی عباسی، مسز فریدہ لاکھانی، حکیم عزیز الرحمن جگرانوی، علامہ عبدالستار عاصم اور مسز شمع حسین کی آرا شامل ہیں۔ کتاب کی قیمت صرف 350 روپے ہے۔ کتاب منگوانے کا پتا۔ مقبول اکیڈمی۔ 199۔ سرکلر روڈ۔ اردو بازار چوک۔ لاہور۔ فون نمبر 042-37324164۔

☆ شاعرہ فریدہ خانم لاہور کا پہلا شعری مجموعہ مختلف اتنا مشہور ہوا ہے کہ اب انہوں نے اپنا تخلص بھی مختلف ہی رکھ لیا ہے کہ اب ان کے ایس ایم ایس فریدہ خانم مختلف کے نام سے ہمارے پاس آتے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی شاعرہ نگینہ ضیا بنگش، کراچی کی شاعری بہت پسند کی جارہی ہے۔ ان کے بچوں کے اسکول

میں ان کو بطور خاص بلایا جاتا ہے۔ (ماشاءاللہ)

☆ مصنفہ، شاعرہ، ڈریس ڈیزائنر زہرہ جنید، کراچی ان دنوں ٹی وی کے مختلف چینلز پر اپنا کلام پڑھتی دکھائی دے رہی ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری فریدہ سجاد، کراچی اپنے بچوں سے ملنے کینیڈا جانے والی ہیں۔

☆ شاعرہ، افسانہ نگار، کالم نگار فریدہ لاکھانی، آسٹریلیا بہت جلد پاکستان آنے والی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ ہماری نئی کتاب انمول خزانے اور آزمودہ ٹوٹکے اور وظائف شائع ہوچکی ہے۔ کتاب حاصل کرنے کے لیے آپ اس نمبر پر رابطہ کرسکتی ہیں۔ 021-36981952۔

☆ پاکیزہ میں 26 ماہ سلسلے وار چلنے والا ہمارا ناول محبت ہم سفر میری کتابی صورت میں شائع ہوگیا ہے۔ یہ ہماری پندرھویں کتاب ہے۔ اس کا انتساب ڈاکٹر شمیم صدیقی کے نام ہے۔ اس ضخیم ناول کے صفحات 576 ہیں اور قیمت صرف پانچ سو روپے، کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ القریش پبلی کیشنز۔ سرکلر روڈ۔ چوک اردو بازار۔ لاہور۔

☆ ہمارے بیٹے عمیر صدیقی کے دوست حماد خان کی پیاری بہن اور نگہت اجمل اور اجمل خاں کی پیاری بیٹی حرا انعم کی شادی سید وقار احمد کے بیٹے سید احمد ثاقب کے ساتھ گزشتہ دنوں کرسٹل لان، کراچی میں ہوئی۔ جس میں ہم نے بھی شرکت کی۔

☆ پاکیزہ کی پرانی تبصرہ نگار اور شاعرہ صائمہ پراچہ، بھیرہ والی نے دس سال بعد رابطہ کیا ہے کہ اب وہ راول پنڈی میں ہوتی ہیں۔ ماشاءاللہ تین بچوں کی امی بن چکی ہیں...... اور اب دوبارہ پاکیزہ کے سلسلوں میں حصہ لینا چاہتی ہیں۔ (خوش آمدید)

☆ پاکیزہ کی مستقل تبصرہ نگار صابرہ سلطانہ، کیماڑی کراچی ان دنوں بیمار ہیں ان کی کلی صحت کی دعا کریں۔

☆ ہماری پیاری مصنفہ رضوانہ پرنس ایک پیارے سے بھتیجے کی پھپو بن گئی ہیں۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی قاری رمیز کے دوست شاہ زیب کی والدہ سخت بیمار ہیں ان کی صحت اور زندگی کے لیے دعا کریں۔

☆ آمنہ مشیر اور مشیر الحسن طالب، نیویارک ان دنوں اپنے چھوٹے بیٹے سامی مشیر کی شادی کی تیاریاں کررہے ہیں۔ (ماشاءاللہ)

☆ پاکیزہ کی مستقل قاری نگہت ظفر، نیویارک کے نواسے شہریار کو اپنے اسکول سے آنر ایوارڈ ملا ہے۔ (مبارک باد)

☆ پاکیزہ کی قاری سلمیٰ ناز کراچی کی رخصتی گزشتہ ہفتے ہوئی۔ اب وہ لاہور میں ہیں۔ (مبارک باد)

☆ معروف ادیب امجد جاوید کی نئی کتاب سائبان سورج کا شائع ہوگئی ہے۔ یہ ایک ناول ہے جو چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کی قیمت چار سو روپے ہے۔ کتاب منگوانے کا ایڈریس یہ ہے۔ علم و عرفان پبلیشرز۔ الحمد مارکیٹ۔ 40 اردو بازار، لاہور۔

انتقالِ پُرملال

☆معروف رائٹر رؤف خالد انتقال کر گئے۔ یہ اطلاع ہمیں شاعرہ فریدہ افتخار نے پشاور سے دی ہے۔

☆پاکیزہ کی قاری نگہت ظفر کی والدہ جنت قدیر، حیدر آباد میں انتقال کر گئیں۔

نوٹ ☜ مرحومین کے لیے دعائے مغفرت کریں اور تین بار سورۂ اخلاص پڑھ کر دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے، آمین۔

✱✱✱

✍ اقبال بانو کی رائے ویہاڑی سے۔ ''عمیر اور ثمینہ کی شادی کا احوال پڑھ کر بہت لطف آیا۔ انجم، ماشاء اللہ تمہاری دونوں بہویں ..... بہت پیاری سی ہیں ...... عمیر بھی بہت اچھا لگا۔ دولھا، دلہن دونوں ہی کم عمر نظر آئے اور بہت پیارے بھی۔ عمیرہ احمد کا ناول عکس ٹاپ پر جا رہا ہے، ہماری جانب سے مبارک باد۔ انجم تمہارے ناولٹ کی پہلی قسط پڑھی۔ کانچ سی لڑکی میں نئے موضوع پر تم نے قلم اٹھایا ہے...... آخری سطر تک پڑھنے میں دلچسپی رہی، ویل ڈن۔ عالیہ بخاری کو بھی مبارک باد کہ ان کا خوشبو کا سفر خیر و عافیت سے منزل تک پہنچا۔ ہمیں بہت پسند آیا۔ دیگر افسانے بھی بہت اچھے تھے۔ ہاں بہنوں کی محفل تو کسی ناول کی طرح ہوتی ہے۔ سب بہنوں کی باتیں پڑھ کر واقعی لطف آیا کرتا ہے۔'' (اس کا کریڈٹ میں تبصرہ نگار بہنوں کو ہی دوں گی جو اتنے اچھے انداز میں تبصرہ کیا کرتی ہیں)

✍ مسز نزہت اشفاق، نارتھ کراچی سے۔ ''عمیرہ احمد کے ناول کی قسط شاندار رہی۔ اس کو تو فوراً ٹی وی پر آجانا چاہیے۔ (جی ہاں...... یہ ٹی وی کے لیے لے لیا گیا ہے) کانچ سی لڑکی پڑھ کر بہت اچھا لگا۔ کہانی در کہانی کے ساتھ ساتھ زبان و بیان کی دلچسپی نے گہرا تاثر چھوڑا۔ شیریں حیدر کی قسط بھی ٹھیک رہی۔ عمیر اور ثمینہ کی شادی کا احوال اتنے اچھے انداز میں لکھا ہوا تھا کہ مجھے یوں لگا کہ اس میں شرکت کر لی ہو۔ شگفتہ کنول کے انتقال کا پڑھ کر بہت افسوس ہوا...... مگر یہ جان کر اچھا لگا کہ آپ لوگ اپنی رائٹرز، اپنی تبصرہ نگار بہنوں کو کتنی عزت دیتے ہیں ان کی زندگی میں بھی اور بعد میں بھی ...... اور یہ ماہنامہ پاکیزہ کی واقعی اپنی انفرادیت ہے۔'' (ہماری تمام رائٹرز اور تمام شرکت کرنے والی بہنیں چاہے وہ کسی بھی سلسلے میں شرکت کرتی ہوں ہمارے لیے واقعی بہت خاص الخاص ہیں...... کہ درحقیقت یہی سب پاکیزہ کا سنگھار ہیں اور پاکیزہ کی آن بھی)

✍ ذکیہ ایوب، کراچی سے۔ ''اداریہ اچھا لگا۔ عمیرہ احمد کے ناول میں تجسس برقرار ہے۔ پتا نہیں چڑیا کا کیا حال ہے۔ ناہید فاطمہ نے بھی اچھا لکھا۔ عقیلہ حق نے بہت بڑی بات کہہ دی۔ سدرۃ المنتہیٰ کے ناولٹ کے آخری جملے ان کی ناولٹ کی جان تھے۔ ان کی بھابی کنیز نبوی کے افسانوں کا انتظار ہے۔ فرزانہ گیلانی نے بھی ٹھیک لکھا۔ عذرا آفتاب کا بھی اچھا لگا۔ ناشکری جیسے افسانے پڑھ کر کوئی ایک لڑکی بھی سنبھل جائے تو کیا بات ہے اور اب آتی ہوں کانچ سی لڑکی پر...... انجم تم نے کہاں سے اتنے پیارے اور اچھے موضوع پر یہ ناولٹ لکھ ڈالا؟ تجسس ہر سطر سطر پر...... اس وقت مینا اور نہاں...... دونوں ایک ہی ٹریک پر ہیں اور یہ بے

چینی ہے کہ اگلی قسط میں کیا ہوگا۔ جلترنگ زبردست مگر شوق سب پر بازی لے گیا۔ بہنوں کی محفل، مستقل سلسلے اور پاکیزہ.... کارنرز سب ہی اچھے لگے۔'' (نوازش)

✍ جیم۔ جیم، بلوچستان سے۔ ''پیاری باجی جلترنگ کا خاکہ برسات...... کسی دوسری جگہ پڑھا اور احساس ہوا کہ ہماری باجی ہر جگہ اپنے خوب صورت الفاظ کی وجہ سے کامیاب اور مقبول ہیں کیا ہم بھی آپ کے جلترنگ کے خاکے آپ کے نام کے ساتھ کسی دوسری جگہ دے سکتے ہیں۔'' (جی ضرور...... کہ میری یہ خواہش ہے کہ میری بات میرے پڑھنے والوں تک زیادہ سے زیادہ پہنچے)

✉ ساجدہ کریم، یورپ۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ میری تمام کتابیں آپ کو میرے پبلشر سے مل جائیں گی اور وہ آپ کو خود بتا دیں گے کہ وہ ان کو یورپ کیسے بھیج سکتے ہیں۔ پاکیزہ کی بہنوں میں اگر آپ اپنی خوشیوں بھری نیوز لگوانا چاہتی ہیں تو فون پر بھی لکھوا سکتی ہیں۔ میرا فون نمبر آپ نوٹ کر لیجیے۔ 021-36981952۔

✍ منور شہزادی، گوجرانوالہ سے۔ ''خوشبو کا سفر کا اختتام پسند آیا۔ آپ کا بہت شکریہ کہ آپ نے اپنا ناولٹ کانچ سی لڑکی شروع کیا۔ اس کی پہلی قسط پڑھ کر ہی مجھے کو تو بے چینی ہو گئی ہے کہ آگے کیا ہوگا۔ عمیرہ احمد کے ناول کی قسط پڑھ کر دل چاہ رہا ہے کہ ان کے ہاتھ چوم لوں۔ آپ میری ڈھیر ساری مبارک باد عمیرہ احمد کو پہنچا دیں اور انہیں بتا دیں کہ ہم انہیں بہت پسند کرتے ہیں۔'' (عمیرہ آپ کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہہ رہی ہیں کہ وہ بھی آپ سب بہنوں کو بہت پسند کرتی ہیں)

✍ زبیدہ حبیب، لاہور سے۔ ''عمیرہ احمد کے ناول کی قسط بہت پسند آئی...... بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ افسانوں میں عاشفہ مسعود ٹاپ پر رہیں، کیا کمال کا لکھا ہے۔ شیریں حیدر کے ناول کی قسط بھی اچھی رہی...... عالیہ بخاری کے ناول کا اختتام مجھے تو بہت پسند آیا۔ ایسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ ہاں انجم...... کانچ سی لڑکی آپ نے بہت غضب کا لکھا ہے اس کی کہانی پڑھ کر تجسس بے حد بڑھ گیا ہے۔ جملے بھی بے حد شگفتہ سے لگے...... اس ناول کا موضوع آپ کے ختم ہونے والے ناول سے بالکل جدا ہے۔ بہنوں کی محفل، میرا انتخاب پسند آئے۔ کئی بار عمیر اور ثمینہ کی تصویریں دیکھیں اور ان کی شادی کا احوال پڑھا۔ آپ کو بے حد مبارک ہو۔'' (شکریہ)

✍ ڈاکٹر شہلا عامر، کراچی سے۔ ''اللہ کا شکر کہ آپ نے ہم سب بہنوں کی فرمائش پر اپنا ناولٹ شروع کیا۔ پہلی قسط پڑھ کر بہت مزہ آیا۔ ہاں بھئی عمیرہ احمد نے تو ہمارا دل تھام لیا ہے...... کیا زبردست قسط تھی۔ شاباش عمیرہ شاباش...... دیگر تحریریں بھی پڑھیں...... مگر آپ کے بیٹے عمیر کی شادی کا احوال پڑھ کر ایسا لگا جیسے ہم نے اس میں شرکت کر لی ہو۔ بہنوں کی فیس بک...... فرسٹ کلاس...... شیریں حیدر بھی اچھا لکھ رہی ہیں۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ مسرت رانی خلیل، کراچی سے۔ ''2011ء کا آخری شمارہ زبردست رہا...... اداریہ زبردست۔ قیصرہ حیات نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموں کے بارے میں بہت اچھا لکھ رہی ہیں، سبحان اللہ۔ عمیرہ احمد کا ناول بہت خوب صورت ہے پڑھ کر مزہ آ رہا ہے...... کانچ سی لڑکی کی پہلی قسط پڑھ کر لطف ہی... آگیا......

اس دفعہ کے افسانے بھی اچھے تھے اور جلترنگ بھی اور بہنوں کی محفل جسے میں تو ناول ہی کہوں گی...... وہ تو اے ون ہے۔'' (نوازش)

✍ ملیحہ بانو، حیدرآباد سے۔ ''عمیرہ احمد کا ناول بہت پسند آرہا ہے۔ بس آپ سے ایک چھوٹی سی بات پوچھنی تھی کہ اس میں بونوں کی کہانی کا کیا مطلب تھا؟ (بونے...... ایک استعارہ ہے۔ اب آپ کی سمجھ میں یہ بات آگئی ہوگی) راحت وفا کا ناول کب ختم ہو رہا ہے، یہ ہمیں جلدی سے بتائیں۔'' (آپ ان کے ناول کی اختتامی قسطیں ہی پڑھ رہی ہیں)

✍ ساجدہ ضیا، سکھر سے۔ ''باجی آپ کا فون بہت انگیج ملتا ہے اور جب آپ سے بات ہو رہی ہو تو آپ کا موبائل بولنے لگتا ہے کیا آپ کے پاس بہت فون آتے ہیں؟'' (ہاں، یہ بات صحیح ہے کہ فون تو بہت آتے ہیں...... اور ان دنوں ٹیلی فون کالز کچھ ہماری عمیرہ احمد کی وجہ سے بھی بہت بڑھ گئی ہیں کہ ہمارے قارئین کی ایک بہت بڑی تعداد فون پر اس ناول کی بہت زیادہ پسندیدگی کا اظہار بھی کرتی ہے...... جن کے نام بھی اس محفل میں شامل نہیں ہو پاتے)

✍ فرزانہ شاہد، گوجرانوالہ سے۔ ''ایک دن میں ہی پاکیزہ پڑھ لیا۔ ویلے جو تھے۔ میرا مطلب ہے فارغ تھے اس لیے جلد پڑھ لیا۔ عمیرہ کی کہانی نے خوفناک انگڑائی لی ہے۔ کیا چڑیا مر جائے گی...... او مائی گاڈ۔ ایک ننھی نیناں پر بڑی تنقید ہوتی ہے مجھے تو یہ ناول بہت پسند ہے اور میں بڑے شوق سے پڑھتی ہوں...... ویل ڈن راحت وفا۔ کس کی جیت کس کی مات، مدیحہ عدنان کی اچھی کاوش تھی۔ مہر بانو کا غرور ٹوٹنے پر بڑا سکون ملا۔ بندہ کچھ تو خدا کا خوف کرے۔ پاؤ بھر دودھ تو اتنی ڈھیروں بھینسوں کا صدقہ بھی کم تھا۔ جلترنگ میں دیور کے نام خط پڑھ کر سارا دن ہنستی رہی۔ عالیہ بخاری نے بہت اچھا اینڈ کیا۔'' (شکریہ)

✍ پروفیسر عابدہ خان، ایبٹ آباد سے۔ ''اللہ کے فضل و کرم سے میں بھی ٹھیک ہوں بلکہ یوں کہو کافی عمر (اسی سال) ہو جانے کے باوجود اللہ تعالیٰ نے سب اعضا و قویٰ چند نوجوانوں سے بہتر ہی رکھے ہیں۔ پاکیزہ پابندی سے پڑھتی ہوں۔ انگریزی کی نظمیں کبھی کبھی خود بخود دماغ میں آجاتی ہیں، وہ لکھ لیتی ہوں۔ ایک انگریزی کا ناول شروع کیا ہے۔ شیریں حیدر کا شیشوں کا مسیحا میری سمجھ میں بالکل نہیں آتا۔ ایک ننھی نیناں بھی کچھ سطحی سا ہے۔ پڑھ لو مگر مزہ کچھ نہیں۔ البتہ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کو اس شمارے میں دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ وہ میری بہت پسندیدہ لکھنے والی ہیں لیکن ان سے گزارش ہے وہ کوئی اچھا سا ناول لکھیں۔ جتنا خوب صورت ناول عالیہ بخاری کا تھا خوشبو کا سفر...... اس کی تو میں تعریف بھی نہیں کر سکتی۔ اس کا انجام بھی اتنا ہی خوب صورت ہوا۔ زارا کی خاطر سیف نے تہمینہ سے شادی کر لی اور یوں زین کی شادی روما سے ہو سکی اور اس کی جان عارف اور اس کی ماں سے چھوٹ گئی جو سمیعہ صرف اس لیے کروا رہی تھی کہ زارا کو طلاق دے کر ہارون خود سمیعہ سے شادی کر لے۔ پھر اس سمیعہ کا انجام بھی ایسا ہوا کہ جیسا اس کا حق تھا۔ سب سے خوب صورت کردار سیف الاسلام کا ابھر کر سامنے آیا جو سچی اور بے لاگ محبت پر اعتقاد رکھتا تھا اور اسی محبت کی خاطر اس نے قربانی بھی دی اور سب کچھ ٹھیک ہو گیا۔ سمیعہ کو چونکہ اپنی شکل پر بہت ناز تھا اور وہ مکار بھی تھی، منہ پھٹ بھی۔ اس لیے اس کا انجام بھی بالکل حسبِ فطرت ہوا۔ کردار نگاری بھی بہت خوب صورت رہی اور زبان کا استعمال

بھی۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ زرقا محسود، جنوبی وزیرستان محسود قبائل سے۔ ''میں دس سال سے پاکیزہ بڑے شوق سے پڑھتی ہوں۔ کبھی خط لکھنے کا موقع نہیں ملا تو جناب میرا تعلق جنوبی وزیرستان کے قبائلی علاقے سے ہے۔ آپ کی محفل میں پہلی بار شرکت کر رہی ہوں۔ پلیز اس نئے مہمان کو خوش آمدید کہیں۔ میری فرمائش ہے کہ محسود قبائل کی عورتوں کا جو لباس ہے وہ کسی ماڈل کو پہنا کر پاکیزہ کی زینت بنائیں۔ وہ فراک پہن کر ماڈل بہت ہی خوب صورت لگے گی...... اور مجھے بھی بہت خوشی ہوگی۔ عمیرہ احمد اور شیریں حیدر دونوں کو میری طرف سے ڈھیر سارا سلام کہ یہ دونوں ناول نگار میری پسندیدہ ہیں۔'' (اس محفل میں خوش آمدید۔ عمیرہ احمد اور شیریں حیدر شکریہ کہتی ہیں۔ آپ کی فرمائش نوٹ کر لی گئی ہے)

✍ زرقا افشین، جام پور سے۔ ''سات ماہ پہلے اپنی خالہ کو شہر سے کوئی ڈائجسٹ لانے کو کہا اور وہ پاکیزہ لے آئیں اور ان کے اس تحفے نے مجھے خوش کر دیا۔ جی ہاں اور اس میں اپنی موسٹ فیورٹ عمیرہ احمد کو دیکھ کر تو او جی سوری عمیرہ کو نہیں ان کی کہانی کو دیکھ کر دل خوش ہو گیا۔ لگتا ہے اس کہانی میں عکس ماضی کی ہیروئن اور چڑیا مستقبل کی ہیروئن کا کردار ادا کرے گی، موضوع بہت مختلف اور اچھوتا سا ہے بور ہونے کی کہیں گنجائش نہیں نکلے گی۔ انجم باجی مجھے کچھ کہنا ہے میں آپ کی بات کہ محبت زندگی میں ہوا پانی سے زیادہ ضروری ہوتی ہے اتنی پسند آئی کہ اس سادہ سی آدھی لائن کو دس بار پڑھا بس ایسے ہی دل چاہ رہا تھا آپ کو جان کر اور آپ سے پیار کرنے والوں کو جان کر اتنی حیرت ہوئی کہ کیا بتاؤں...... باجی کیا آپ واقعی اتنی اچھی ہیں اگر ہاں تو پھر مجھے کیوں دیر سے ملی ہیں؟ زندگی سے بس یہ گلہ ہے تو بہت دیر سے ملا ہے۔ اس بات سے یہ مت سمجھیے گا کہ میں اولڈ ہوں بالکل نہیں ابھی ہم 18 نومبر کو 23 کے ہو جائیں گے لیکن ڈیئر یہ بھی تو سوچیں جو لڑکی گیارہ سال کی عمر سے رسائل وغیرہ پڑھ رہی ہے تو اس کے لیے پاکیزہ سے اتنی دیر سے متعارف ہونا بھیانک ظلم ہے نہایت ایمانداری کے ساتھ اگر مجھے پاکیزہ سے عشق ہوا ہے تو وجہ صرف اور صرف آپ ہیں۔ اچھی کہانیاں بہت سے رسالوں میں مل جاتی ہیں لیکن اتنی اچھی مدیرہ انجم باجی صرف اور صرف پاکیزہ میں ملی ہیں۔ مجھے پاکیزہ پڑھتے ہوئے صرف سات ماہ ہوئے ہیں اور دعا ہے کہ میرا اور آپ کا ساتھ آخری سانس تک بندھا رہے، آپ واقعی میں بہت اچھی ہیں میرا دل مانتا ہے۔'' (پیاری گڑیا...... اپنی 100 نظموں میں سے کچھ نظمیں ہمیں بھی بھیج دو)

✍ صائمہ احمد، کراچی سے۔ ''مجھے ایک گڈ نیوز لگوانی ہے وہ یہ ہے کہ 19 اکتوبر کے دن میرا پیارا بھتیجا پیدا ہوا ہے جس کا نام رکھا گیا ہے سید روحان علی۔ ماشاء اللہ بے حد پیارا اور کیوٹ ہے۔ عذرا آنٹی کو ذیشان رسول کے حج پر جانے کی بے حد مبارک باد اللہ کرے کہ وہ حج کر کے خیریت سے واپس لوٹ آئے، آمین۔ عالیہ بخاری نے بالآخر اپنا ناول ختم ہی کر دیا انجام پسند آیا۔ عظمیٰ نے بالکل ٹھیک کہا کہ راحت وفا کے ناول کی قسطیں اب بہتر ہونا شروع ہو رہی ہیں لیکن کہانی ابھی بھی کھل کر سامنے نہیں آرہی ہے۔ عکس بلاشبہ ایک بہترین ناول ہے۔ یاسمین رشید صاحبہ سے یہ ضرور کہیے گا کہ یہ آپ تمام ڈیزائنرز خواہ وہ مرد ہوں یا خواتین اپنے کپڑے اس قدر مہنگے کیوں فروخت کرتے ہیں کہ مڈل کلاس لوگ صرف انہیں دیکھ سکتے ہیں خرید نہیں

سکتے۔ ایسے کون سے سرخاب کے پر لگے ہوتے ہیں ان کے کپڑوں میں۔ یہ جملہ میری امی کہتی ہیں، میں نہیں...... پلیز آنٹی کپڑے تھوڑے سستے کریں تاکہ ہم جیسی مڈل کلاس لڑکیاں بھی ان کپڑوں کو خرید کر پہننے کا شوق پورا کر سکیں۔ ویسے آنٹی کیا آپ بھی ڈیزائنر ہیں۔'' (نہیں، میں نہیں ہوں اور جو بھی پہنتی ہوں اللہ کا شکر کر کے پہنتی ہوں)

ثریا آغا، لاہور سے۔ ''کسی بھی میگزین کے لیے میرا یہ پہلا خط ہے اور اس کی طرف اور صرف وجہ پاکیزہ کی بہنوں کی محفل ہے۔ اس میں ہر وہ چیز مل جاتی ہے جو ہمارے لیے مفید ہوتی ہے۔ آپ نے اس ماہ ایک بہن کو دعا کے بارے میں بتایا ہے، یقیناً مجھ سمیت نہ جانے کتنی بہنوں نے اسے اپنی ڈائری میں لکھ لیا ہو گا...... آپ اس محفل میں بہنوں کو جس طرح آگاہی دے رہی ہیں، یہ ایک بہت اچھی بات ہے...... آپ سے یہ کہنا ہے کہ آپ گاہے بہ گاہے...... مختصر ترین دعائیں اس محفل میں بھی لکھتی رہا کریں...... کہ ہم سب کو اپنے رب سے ہی مانگنا ہے، جو ہر حاجت پوری کرنے والا ہے۔'' (بے شک ہم سب اللہ ہی کے محتاج ہیں اور ہمیں یہ لفظ بھی اپنی دعا میں ہمیشہ شامل رکھنے چاہئیں۔ اے رب اپنے سوا کسی کا محتاج نہ رکھنا۔ ایک بہت پیاری دعا لکھ رہی ہوں۔ جو کسی بوڑھی خاتون نے اپنے گاؤں میں ٹیلے پر چڑھ کر کی تھی اور وہ ٹیلے سے اتری نہیں تھی...... کہ وہ بادل جو بن برسے واپس جا رہے تھے...... اس کی دعا سن کر...... دوبارہ لوٹ کر آئے اور برس گئے...... اور اس کی دعا پوری ہو گئی تھی۔ مزید حوالہ جات اس وقت ذہن میں نہیں ہیں۔ اس کے لیے معذرت...... ہاں یہ دعا جوں کی توں تو نہیں ہے...... مگر کچھ اس طرح کی ضرور تھی۔ ''اے عرش والے! تو جو چاہے کر۔ ہمارا رزق، ہماری عزت آبرو، ہماری صحت اور ہماری کامیابیاں اور کامرانیاں تو تیرے ہی ذمے ہیں کہ تو ہی ہر شے پر قادر ہے۔ یارحیم یاکریم۔''

شبنم نذیر، حیدرآباد۔ آپ کے خط کا میں کیا جواب دوں کہ میری رائٹرز سینئرز ہوں یا نئی میرے لیے سب ہی بے حد خاص ہیں۔ میری سب ہی رائٹرز میری پسندیدہ ہیں اور وہ رائٹرز...... جو کم کم لکھ رہی ہیں...... ان کی کمی میں بے حد محسوس کرتی ہوں جن میں عنیزہ سید۔ نگہت سیما۔ شوکت رانا، ساجدہ حبیب، سیما مناف، اقبال بانو اور بھی بہت بڑی تعداد ہے جو اس وقت میرے قلم کے ذہن میں نہیں آ رہیں۔

رفاقت جاوید، اسلام آباد سے۔ ''ایک طویل گیپ کے بعد دوبارہ لکھنے کا آغاز کیا ہے...... بہنوں کے کئی رسالوں میں، میں نے فون کیے۔ اول تو وہاں فون اٹھائے ہی نہیں جاتے اور اگر مارے باندھے اٹھا بھی لیے جائیں تو کبھی صحیح طرح سے بات نہیں کی جاتی...... اور اگر کوئی بات بھی کرے...... تو حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی۔ یہ میرا اپنا تجربہ ہے...... میں کسی کو موردِ الزام ٹھہرانا نہیں چاہتی...... مگر میں یہ بات بالکل سچ کہہ رہی ہوں کہ جب میں نے پہلی مرتبہ انجم انصار کو فون کیا تو انہوں نے میری بات بڑی محبت سے سنی اور مجھ سے کہا کہ آپ مجھے اپنے افسانے بھجوائیں...... میرے لکھنے میں خاصا گیپ آ گیا ہے...... یقیناً...... ڈائجسٹوں کا مزاج بھی تبدیل ہو چکا ہے...... اور ہم جیسے لکھنے والوں کی تحریروں پر ایڈیٹر کو کچھ نہ کچھ محنت بھی کرنا پڑے گی...... مگر میں واقعی خوش ہوں، میں نے پاکیزہ کا انتخاب بالکل درست کیا...... یہاں رائٹرز سے واقعی محبت بھی کی جاتی ہے...... اس محفل میں جو لوگوں کو ایک کشش سی محسوس ہوتی ہے تو وہ اس لیے ہوتی ہے...... کہ یہ محبت کی

مقناطیسیت ہے جب ہی تو لوگ اس محفل کو بار بار پڑھتے ہیں۔'' (پیاری رفاقت...... آپ کا ایک افسانہ شائع ہو چکا ہے، انشاء اللہ دیگر افسانے بھی شائع ہو جائیں گے...... ہمارے لیے سینئر، جونیئر اور نئے تمام رائٹرز بے حد اہم ہیں)

نگینہ ضیا بنگش، کراچی سے۔ ''عمیرہ احمد، ویل ڈن...... قسط پڑھ کر زبان سے واہ واہ نکلا آپ کے لیے پھولوں کا ٹوکرا...... انجم آنٹی آپ کی کانچ سی لڑکی کی پہلی قسط بھی بہت اچھی رہی...... دوسری قسط پڑھنے کی بے چینی ہو رہی ہے۔ سلمٰی غزل اور عاشقہ مسعود کے افسانے اس ماہ کے بہترین افسانے تھے۔ سدرۃ المنتہیٰ نے بھی مایوس نہیں کیا۔ فرزانہ گیلانی کا ناولٹ بھی اچھا تھا۔ کسی بہن نے یہ تجویز دی تھی کہ اب ناول صرف دس اقساط تک ہونے چاہئیں...... تو یہ کلیہ ان رائٹرز پر تو ضرور لاگو ہونا چاہیے...... جن کو پسند نہیں کیا جا رہا...... یا جن کی تحریر کو درمیانی درجے کی تحریر کہا جا رہا ہے۔ اس ماہ کی سب سے اچھی اور دلچسپ تحریر سعدیہ سلیم کی رہی۔ ان کو میری جانب سے گلاب کی ایک کلی پہنچا دیں۔'' (آپ کی رائے اور تحائف پہنچائے جا رہے ہیں)

موناؔ، لاہور۔ بفضلِ خدا اس ہفتے آپ کا درود پاک صلی اللہ علیہ وسلم ایک کروڑ تک ہو گیا۔ ماشاء اللہ، میری جانب سے ڈھیر ساری مبارک باد۔ آپ اپنا مکمل ایڈریس مجھے فون پر بتا دیں میں آپ کو اپنی کتاب بھیجنا چاہتی ہوں۔

کوثر خاں، کراچی۔ صاعقہ ریاض، حیدرآباد۔ مسز نسیم تاج، لاہور۔ مسز رفیق احمد نشوری، لاڑکانہ۔ تسلیم ضیائی، کچا کھوہ۔ پروین عذرا تشنہ، کراچی۔ آپ سب کہاں ہیں......؟ کیسی ہیں...... مجھ سے رابطہ کیجیے۔ 021-36981952۔

صابرہ سلطانہ، کیماڑی، کراچی۔ تم بالکل بھی پریشان مت ہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اگر کوئی تمہیں تنگ کرے گا تو اس کے آگے خود آ جائے گا...... اللہ تمہیں کلی صحت اور زندگی عطا فرمائے، آمین۔

فائزہ شہزاد، حیات آباد پشاور۔ تمہاری بیٹی کی شادی کا احوال تاخیر سے شائع ہوا۔ اس کے لیے کیا ابھی تک ناراض ہو؟ جلدی سے آ جاؤ اپنے دلچسپ مراسلات کے ساتھ۔

نورین طلعت عروبہ، راولپنڈی۔ آپ نے اپنی جتنی نعتیں بھیجی تھیں وہ سب شائع ہو گئی ہیں۔ اپنی دیگر تحریریں جلد ارسال کریں۔

شبنم میر، سیالکوٹ اور میمونہ گل، سکھر۔ سندیسے میں شرکت کے لیے اپنے مراسلات میرے موبائل پر بھیجنے کے بجائے کاغذ پر لکھ کر لفافے میں ڈال کر پوسٹ کریں۔

شبانہ پروین، ملتان۔ اس محفل میں خوش آمدید۔ پاکیزہ میں اپنی یا اپنی کسی بھی رشتے دار کی شادی کا حال آپ شائع کروا سکتی ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ہر علاقے اور ہر شہر، گاؤں کی رسمیں، طریقے لوگوں کو بتائیں۔ ورنہ تو آج کل ٹی وی پر ہندوانہ رسموں ہی کی لوگ باگ نقالی کر رہے ہیں۔

مسز اسامہ ملک، راولپنڈی سے۔ عالیہ بخاری آپ نے بے حد طویل ناول لکھا اور باقی تمام قارئین سے قطع نظر مجھے کم از کم کسی بھی قسط میں یہ طوالت غیر ضروری یا غیر دلچسپ نہیں لگی۔ سب کچھ بے حد

تفصیل سے بیان کیا جاتا رہا اور درحقیقت یہ موضوع اتنی ہی طوالت کا متقاضی تھا مگر پھر ایسے میں آخری قسط میں یکدم جیسے تین چار اقساط کے مواد کو سمیٹ کر ایک ہی قسط میں ٹھونس دیا گیا وہ اچھا نہیں لگا۔ مجھے باقی قارئین کا اندازہ نہیں مگر میں ضرور کم از کم سمیعہ کاری ایکشن پڑھنا چاہتی تھی۔ سمیعہ سے اب تک ہم قارئین اتنی نفرت کر چکی تھیں کہ اس کو شرمندہ اور بے عزت ہوتے دیکھنا ہم سب کی خواہش تھی۔ اب جیسا کہ رضوانہ پرنس کا ناولٹ تھا قربتوں کی دوری، انہوں نے بھی بے حد زبردست لکھا مگر اینڈ میں انہوں نے بھی یکدم عجلت برتی ......لیکن بہرحال ان کی عجلت اس لیے اتنی محسوس نہیں ہوئی کیونکہ ان کے ناول کا ٹیمپو پہلے ہی فاسٹ تھا۔ اس میں کہیں بھی بے جا طوالت نہیں آئی۔ ہاں عکس کے بارے میں قارئین کا جو کہنا ہے کہ اس میں انگلش کی بھرمار ہے تو اگر آپ غور کریں تو یہ اپر کلاس کو لے کر لکھی گئی کہانی ہے جو کانونٹ یا بیرون ملک سے تعلیم یافتہ افراد پر لکھی گئی ہے تو ایسے میں اگر عمیرہ سادی یا گاڑھی اردو استعمال کریں تو یہ غیر حقیقی لگے گا، عمیرہ ان کا قصہ نہیں سنا رہی ہیں کہ وہ اپنی زبان استعمال کریں۔ عمیرہ آپ کو ان کے خاندان ......ان کی زندگی ......ان کے کلچر کے اندر لے گئی ہیں جہاں وہ وہی دکھا رہی ہیں جو وہ بولتے ہیں۔ آج کل تو مڈل اور لوئر مڈل کلاس کے افراد بھی اردو میں آدھے سے زیادہ لفظ انگلش کے بول رہے ہیں اور تتلاتے ہوئے بچے کو بھی سیب کے بجائے APPLE سکھانے کو ترجیح دیتے ہیں تو یہ تو پھر ڈپٹی کمشنر کلاس کا کلچر اور ماحول ہے۔ وہ یہ نہ لکھیں تو آپ کو فرق کیسے محسوس ہو۔ ڈراموں میں بھی ایسا ہو رہا ہے، اس پر اعتراض کیوں نہیں؟ ایک تھی نیناں، راحت وفا بے وجہ کی پُراسراریت اور ایک ہی بات بار بار دہرائی جاتی ہے۔ مکالمے بے ربط لگتے ہیں۔ کسی بھی کردار کا کوئی اچھا تاثر قائم نہیں ہو سکا۔ راحت اپنے ہر کردار کے ساتھ الگ الگ انصاف نہیں کر پا رہی ہیں، ہر چیز الجھی الجھی سی ہے۔ مجموعی طور پر عجیب سا ناول ہے۔ ہوتا ہے شب و روز، قرۃ العین رائے ......بکرا پرانا مگر انداز اور کہانی نئی ......انٹرسٹنگ اچھا لگا۔ سچا دوست، عتیقہ کا معصوم سا افسانہ تھا۔ کس کی جیت کس کی مات، مدیحہ عدنان پرانا موضوع پرانا انجام مگر انداز بیاں خوب صورت۔ ہم اور تم لبنیٰ عروج رونگٹے کھڑے کر دیے یار۔ گولڈ میڈل کی حق دار ہیں آپ۔ حالات و واقعات بے حد حقیقی تھے۔ کچھ بھی افسانوی، فلمی یا ڈرامائی نہیں تھا۔ ہمارے بکرے، رفاقت جاوید بس ٹھیک ہی تھا۔ ببول کا سایہ، شمیم فضل خالق ...... برا مت مانیے گا مگر وہی پرانا موضوع۔" (تبصرے کا شکریہ)

✍ جبین ہاشمی، بھیرہ ضلع سرگودھا سے۔ "آپی انجم کا ناولٹ کانچ سی لڑکی پڑھا اور خط پوسٹ کر دیا۔ آپی جی آپ نے رب دی قسمیں کمال کر دتا۔ اتنا اچھا ناولٹ، زبردست۔ آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ کا ناولٹ دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی دل چاہا خوشی سے دھمال ڈالوں۔ پہلے تو جناب تب قدم آگے بڑھاتے تھے جب تک آپ کچھ کہہ نہیں لیتی تھیں اور ہم بڑے مؤدب ہو کر آپ کا حکم سنتے، آپ کی باتوں پر عمل کرنے کی حامی بھرتے اور آگے بڑھ جاتے ...... پر آج تو ہم نے آپ کی ایک نہیں سنی۔ آپ آواز دیتی رہیں جبین تم سے کچھ کہنا ہے! پر آج ہم بھی بڑی بدتمیزی اور بے صبری سے چھلانگیں مارتے کانچ کی گڑیا کے پاس پہنچ گئے۔" (پسندیدگی کا شکریہ)

✍ زاہدہ نسیم، مانسہرہ سے۔ "پہلے ایک خاموش قاری تھی۔ ہم پاکیزہ آپا کے دور سے پڑھتے آرہے

ہیں۔ پھر باجی اور اب میں۔ آپ کی تصاویر میں سے میں نے ایک تصویر میں بہت غور سے محسوس کیا اور اس بات کا میرے دل نے بھی اعتراف کیا کہ آپ کی آنکھوں میں محبت ہے۔ اس کا اثر کہیں نہ کہیں آپ کی تحریروں میں بھی ملتا ہے۔ مجھے پاکیزہ نہ صرف پڑھنا اچھا لگتا ہے بلکہ میں اس کو ہر لحاظ سے سب سے آگے دیکھنا چاہتی ہوں۔ باجی آپ یقین مانیں کہ اس مرتبہ عکس پڑھ کر طبیعت بے حد اداس اور دکھی ہو گئی۔ کبھی کبھی قلم کتنا کڑوا سچ اگلنے لگتا ہے۔ لبنیٰ کا ہم اور تم بھی بے حد سبق آموز ناول تھا۔ دل بے حد اداس و غمگین ہو گیا کہ کاش نور کا گھر نہ اجڑتا اور وہ وقت پر سنبھل جاتی۔ عالیہ بخاری نے کیا خوب صورت انجام دیا ناول کو کہ محبت قربان کی جا سکتی ہے مگر رشتے قائم رہنے کے لیے بنائے جاتے ہیں۔ محبت کی قربانی انسان کو باوقار بناتی ہے، ویل ڈن عالی۔ باجی جانے کیوں تمام مصنفات سے ایک درخواست کرنے کو دل چاہتا ہے کہ پلیز محبت کی قربانی دے دیا کریں اپنے ناولوں یا افسانوں میں مگر رشتوں کا اعتبار قائم رہنے دیں تا کہ اور کچھ نہیں تو ہم رشتوں کے اعتماد، اعتبار کے سہارے زندگی گزار لیں۔" (اس محفل میں خوش آمدید۔ اپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے۔ ہاں افسانہ قابلِ اشاعت ہے)

✍ ماہا بخاری، مظفر گڑھ سے۔ "ضروری تو نہیں کہ ہر بار دلہن ہی ٹائٹل پہ سجے۔ کسی کنواری دوشیزہ کو بھی ٹائٹل کی زینت بنایا جا سکتا ہے۔ (دسمبر کے پاکیزہ میں دلہن نہیں تھی سرورق پر) بات کرتے ہیں عکس کی۔ گرفت بہت مضبوط ہے عمیرہ احمد کی ناول پر......لیکن ایسے افلاطون بچے، اتنے پرفیکٹ کپل، ایسی اعلیٰ ذہانت کی حامل خاتون ...... یہ سب ملتے کہاں ہیں؟ ہم نے تو آج تک نہیں دیکھے۔ (آپ نے نہیں دیکھے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ایسے لوگ ہوتے نہیں ہیں۔ ہوتے ہیں کہ یہ دنیا ہے......اس میں بھانت بھانت کے لوگ موجود ہیں) خوشبو کا سفر تمام ہوا۔ اختتام بہت اچھا ہوا۔ عالیہ بخاری کو مبارک باد۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں اچھا ناول ہے۔ ہم اور تم بہت ہی شاندار تحریر تھی۔ لبنیٰ عروج نے بہت خوب صورتی سے ایک حساس موضوع پر لکھا۔ مجھے پاکیزہ میں بہنوں کی محفل بہت پسند ہے۔ بہت اپنائیت سی محسوس ہوتی ہے۔ یہ آج تک پتا نہیں چل سکا کہ سندیسے کیسے اور کس نمبر پر بھیجے جاتے ہیں۔" (نمبر پر نہیں بھیجے جاتے۔ لفافے میں رکھ کر بھیجئے)

✍ فرحت جمال، کراچی سے۔ "اس ماہ کا پاکیزہ بہت اچھا رہا۔ ہوتا ہے شب و روز، قرۃ العین رائے کی بہترین تحریر رہی۔ کس کی جیت کس کی مات، مدیحہ عدنان کی تکبر پر لکھی اچھی تحریر لگی۔ ہم اور تم، لبنیٰ عروج کی بہت اچھی تحریر تھی۔ ہمارے بکرے، رفاقت جاوید کی تحریر کافی اچھی لگی۔ ببول کا سایہ، شمیم فضل خالق کی تحریر لاجواب رہی۔ خوشبو کا سفر تمام ہوا ایک بہت ہی خوب صورت تحریر جو اپنے آپ سے باندھ گئی...... ویلڈن عالیہ بخاری بہت خوب......اور باقی تمام سلسلے اپنی جگہ خوب سے خوب تر ہیں۔ انجم باجی آپ کی ایک محبت بھری شام پڑھ کر بڑا اچھا لگا۔ ہمیں بھی ایسا لگنے لگا ہم بھی وہاں موجود تھے۔" (نوازش)

✍ فاطمہ قاضی، کینیڈا سے۔ "پہلی دفعہ اس محفل میں بہت دور سے شرکت کر رہی ہوں تبھی پہنچنے میں اتنے سال لگے حالانکہ ہر مہینے پچھلے دس بارہ سال سے بہنوں کی محفل میں چپکے چپکے شرکت کرتی ہوں۔ کبھی ہنستے ہنستے بے حال ہوتی ہوں تو کبھی کسی کا دکھ یا کوئی غم کی خبر سن کر آنسو نکل آتے ہیں اور دل سے یہی دعا نکلتی ہے کہ اللہ ان پر اپنا رحم کر اور ہم سب کو اپنی امان میں رکھنا۔ خاص طور پر عذرا آپا کے لیے بہت دعائیں...... بہت اچھا

ڈائجسٹ جس نے ہم سب کو خلوص کے دھاگے میں باندھا ہوا ہے۔ ہر ناول...... ہر کہانی بے مثال ہوتی ہے۔ انجم آپا کے جلترنگ تو لاجواب ہوتے ہیں۔ کبھی کوئی خاتون یاد آجاتی ہیں اور کبھی ایسا لگتا ہے کہ انجم آپا نے کہیں مجھے دیکھ لیا۔ نومبر کے شمارے میں عالیہ بخاری نے خوشبو کا سفر انتہائی عجلت میں سمیٹ دیا شاید ہماری تنقید نگار بہنوں کی باتوں سے پریشان ہوگئیں لیکن ویسے اس سفر میں ہمیں کہیں بوریت کا احساس نہیں ہوا۔'' (شکریہ)

بختاور بلوچ لوہی بلوچستان سے۔ ''ہم سب سے پہلے بہنوں کی محفل کا رخ کرتے ہیں جہاں وطنِ عزیز کے دور دراز علاقوں، گاؤں، دیہات سے آنے والی بہنوں سے ملاقات دل کو بے انتہا سکون سے نوازتی ہے۔ باجی! ہم آپ سے محبت کرتے ہیں اور آپ ہم سے...... لیکن کبھی کبھار ہماری باتیں آپ کے لیے ٹینشن کا سبب بھی بنتی ہیں۔ آپ کی سر درد والی بات سے ہمیں بھی بے انتہا دکھ ہوا...... اور اپ سیٹ ذہنی کیفیت مزید بڑھ کے آپ کی طرح ہماری بھی ٹینشن میں اضافہ کرگئی۔ ایسی باتیں ایسے واقعات ذہن کو تو ڈسٹرب کرتے ہی ہیں لیکن ایسے بے ضمیر واقعات دل کے درد میں بھی اضافہ کرتے ہیں۔ ہمیں آپ کی یادداشت حیران بے حد حیران کرتی ہے کہ آپ کو ہم سے متعلق ہر چھوٹی سے چھوٹی بات اس طرح یاد ہے۔ جس طرح ایک ماں کو اپنے بچوں کی چھوٹی سے چھوٹی شرارت اور میٹھی، کڑوی باتیں یاد ہوتی ہیں۔ پاکیزہ ڈائری میں نسیم نیازی کی نظم محبت کا پیکیج سے ہم بھی متفق ہیں۔ ڈیئر نسیم بالکل سچ لکھا آپ نے۔ سندیسوں میں مصباح رضا کا انتخاب پڑھ کر بے ساختہ مسکراہٹ لبوں کو چھوگئی۔ نواب شاہ سے ہم قبیلہ جمالی سسٹرز کی آمد اچھی لگی۔ شاید کہ وہ ہمارے بعد جمالی قبیلے کی نمائندگی کرسکیں اور اپنا آپ منوا سکیں لیکن پیاری بہنو! خدارا ایک دو سال بعد غائب مت ہونا۔ جس طرح کہ بعض بہنیں کچھ عرصے شرکت کے بعد پاکیزہ سے اپنی پاکیزہ رفاقت اور تعلق ہمیشہ کے لیے توڑ کے نئی دنیاؤں میں کھو کے، قلم و کتاب سے اپنا ہر رشتہ ختم کر کے غائب ہوگئیں نہ جانے کہاں؟ مجھے شکایت ہے محفل پاکیزہ کو ہمیشہ کے لیے الوداع کہنے والی بہنوں سے کہ وہ ہر ماہ نہیں تو سال میں کم از کم ایک مرتبہ تو حاضری دیا کریں۔ لگتا ہے کہ ان سب نے پاکیزہ سے اپنے تمام پاکیزہ تعلق توڑ لیے ہیں اپنا میکا اور اس میں بسنے والے رشتوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ کچھ رائٹر اور تبصرہ نگار بہنیں تو مکمل طور پر غائب ہوگئی ہیں۔ ان کی جگہ نئی آنے والی قاری بہنوں نے لے لی۔ پیاری بہنو! ہماری تمہاری غیر حاضری سے محفل پاکیزہ کی رونقوں پر کچھ اثر تو نہیں پڑا مگر اس طرح مضبوط اور پاکیزہ تعلقات کو توڑنا اچھی بات نہیں، ہمیں ان گمشدہ بہنوں میں، چاندنی بی بلوچستان، چاندنی عمران، صائمہ الطاف پراچہ، زریں زبیر، آصفہ منیر اور بہت پہلے شریک ہونے والی بہنیں۔ نورین سرفراز اعوان، روبینہ حیات مغل، نیلم بھٹی، بشریٰ افضل اور ایڈووکیٹ سعدیہ ہما کی ہمت اور وفاداری قابلِ ستائش ہے جن کا نام اکثر ہی جاسوسی، سسپنس اور پاکیزہ میں نظر آتا ہے۔ لکھنے والی معزز بہنوں میں بھی اکثر کا نام پاکیزہ کے صفحات سے غائب ہے جن میں ناہید سلطانہ اختر...... پلیز ناہید صاحبہ کوئی زنداں میں پھول جیسی تحریر پاکیزہ کو تحفے میں دے دیں۔ (آپ کی فرمائش پوری ہوگئی) ساجدہ حبیب، راحت جبیں، حمیرا راحت، اقبال بانو، ثمرہ بخاری، آسیہ مرزا، فائزہ افتخار، نویدہ تارڑ، جن کا شمار بھی گم گشتہ بہنوں میں کیا جاسکتا ہے۔ پیاری بہنو! مجھے آپ سب کی یہ بے وفائی کی ادا بالکل پسند نہیں آئی۔ ان تمام بہنوں کے لیے کسی معروف و مشہور اخبار میں تلاشِ گمشدہ کا اشتہار دیا جاسکتا ہے۔ اس استدعا کے ساتھ کہ وہ جہاں بھی

ہوں جلد واپس آنے کی کوشش کریں کہ گلشن پاکیزہ کا رنگ ان کے بغیر پھیکا ہے اور مجھے معلوم ہے کہ ہماری باجی اتنا ظرف رکھتی ہیں کہ بغیر کسی جرمانے کے محفلِ پاکیزہ میں شامل ہونے کی اجازت دیں۔ عمیرہ احمد کے دل کی گہرائیوں سے نکلنے والے خوب صورت الفاظ ہمارے بھی دل پر اثر کرتے ہیں۔ عکس بہترین ناول ہے۔ لبنیٰ عروج کی تحریر ہم اور تم ایک سبق آموز تحریر تھی۔ جہاں محبت کے نام پر جھوٹے بہلاووں نے ایک ہنستے بستے گھر کو اجاڑ دیا لیکن عنوان کہانی سے مطابقت نہیں رکھتا تھا۔ خوشبو کا سفر بالآخر اپنی منزل پر پہنچ کے اختتام پذیر ہوا۔ میرے خیال میں اس لازوال تحریر کا تمام حسن اینڈ میں ہی چھپا ہوا تھا جو ہماری توقعات کے عین مطابق تھا۔ ویل ڈن میڈم عالیہ بخاری آپ نے حقِ قلم ادا کیا۔'' (تبصرے کا شکریہ۔ گم شدہ بہنیں فوراً سے پہلے آجائیں...... آپ نے چاندنی عمران کا نام بھی لکھا ہے شاید آپ کو علم نہیں...... وہ ہمیشہ کے لیے ہم سب کو چھوڑ کر چلی گئی ہیں)

تسنیم منیر علوی، دبئی سے۔ ''لبنیٰ عروج کا افسانہ حقیقت سے قریب تر ایک کامیاب افسانہ تھا، ہمارے اردگرد ایسے کردار نظر آتے ہیں۔ مدیحہ عدنان نے سیلاب کے حوالے سے اچھا منظر نامہ تحریر کیا، یہ ایک پُراثر تحریر تھی۔ شمیم فضل خالق نے ببول کا سایہ بچیوں کے رشتے کے حوالے سے خوب لکھا۔ لفظوں کا برمحل استعمال اور کہانی کی نسبت نے ایک جیتا جاگتا شاہکار تخلیق کیا۔ عمیرہ احمد آج کے دور کی پسندیدہ افسانہ نگار ہیں ہمیشہ خوب جم کر لکھتی ہیں۔ اب ذرا ہٹ کر لکھ رہی ہیں مگر اچھا لکھ رہی ہیں، ان کی اگلی قسط کا قاری بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ پاکیزہ ڈائری، جلترنگ اور میرا انتخاب بھی خاصے کی چیز ہیں اس کے بغیر پاکیزہ ادھورا سا لگتا ہے اب تو عادت سی ہوگئی۔ ہاں ایک تحریر ارسال ہے لگا دیں۔ آپ اور بہنوں کو بھی دعوت دے سکتی ہیں کہ اگر کسی نے کوئی دعوت نامہ عام روایت سے ہٹ کر لکھا ہو تو تحریر بھیج سکتی ہیں ہمارے پاس اور بھی ایسے شاہ پارے موجود ہیں۔'' (آپ مزید دعوت نامے ارسال کرسکتی ہیں اور دیگر بہنیں بھی)

درخشاں ضیا، حیدرآباد سے۔ ''مجھے کچھ کہنا ہے میں انجم آنٹی نے لاکھ روپے کی بات کہی ہے ویسے بھی جو معافی مانگے یا پہل کرے ضروری نہیں کہ وہ غلط ہو بلکہ اس سے پتا چلتا ہے کہ سامنے والے کو انا سے زیادہ رشتے عزیز ہیں اور ایک اچھی بیوی اور عورت وہی ہے جس کا خاندان جسمانی اور ذہنی طور پر تندرست ہو۔ خوشبو کا سفر بالآخر اپنے اختتام کو پہنچا، آخری قسط کچھ خاص مزہ نہ دے سکی ایسا لگ رہا تھا کہ کہانی کو زبردستی لپیٹ دیا گیا ہو۔ جلترنگ کا تو کوئی جواب نہیں ہے۔ خاص طور پر دیور کے نام ایک خط کا تو کیا ہی کہنا۔ جلترنگ تو پاکیزہ کا دل ہے۔ نئے سب لکھاری بھی بہت اچھا لکھ رہے ہیں۔ میری تمام پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ وہ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کریں، آپ کی حوصلہ افزائی سے نئے لکھنے والوں کے قلم مزید رواں ہوتے ہیں۔ پاکیزہ نے بہت اچھے رائٹرز دیے ہیں۔ شاعری تو تقریباً سب کی ہی اچھی تھی نسیم نیازی کی نظم محبت کا پیکیج دورِ حاضر کی عکاسی کر رہی تھی۔ ایک محبت بھری شام میں مس یاسمین کی کئی مفید باتیں پڑھیں۔'' (شکریہ)

ثمرین وحید، ساہیوال سے۔ ''نومبر کے شمارے میں ٹائٹل پر دلہن پیاری تھی مگر تصویر بنواتے وقت اس نے منہ بہت زیادہ اونچا کیا ہوا تھا۔ ناول میں شیریں حیدر کا ناول شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں میں آنٹی

نے کرداروں کی بھرمار کر کے بازار لگا دیا ہے۔ پڑھتے پڑھتے میں دو چار بار کرداروں کے بارے میں بھول گئی لیکن شیریں آنٹی کی زبردست کاوش جاری رہی ہے۔ راحت وفا کا ایک تھی نیناں اچھی تحریر ہے۔ گزشتہ شمارے میں موٹر سائیکل پر رمان اور نیناں کی سیر ایک فلمی گانے کی صورت میں دل کو بھا گئی۔ فلم آئینہ کا گانے وعدہ کرو ساجنا مجھے بہت بہت پسند ہے۔ ناول دلکشی لیے ہوئے ہے مگر پتا نہیں پاکیزہ بہنیں راحت وفا کے اس ناول سے بیزاری کیوں دکھا رہی ہیں۔ ارے بہنو! اچھا ناول ہے اتنا بھی بور نہیں جتنا آپ لوگوں نے کہنے کی عادت بنالی ہے۔ عالیہ جی مبارک ہو آپ نے اپنا ناول خوشبو کا سفر مکمل کر لیا۔ پھولوں کے ٹوکرے کے ساتھ مبارک باد لیجیے۔ ہم اور تم ناولٹ بہت پسند آیا۔ اس قدر محبت کے باوجود احد کو اپنی بیوی کو ایک موقع ضرور دینا چاہیے تھا کہ غلطی کرنے والا جب اپنی غلطی پر شرمندہ ہو کر معافی مانگے تو اسے معاف کر دینا چاہیے۔ آنٹی عذرا کو بہت بہت مبارک باد کہ ان کے بیٹے ذیشان حج کر کے آگئے ہیں۔ دعا ہے کہ ان کا یہ حج قبول ہو۔'' (آپ کی رائے پہنچائی جا رہی ہے)

✍ صائمہ سجاد بنگش، کوہاٹ سے۔ ''باجی آپ بہت کم نیٹ یوز کرتی ہیں انجم باجی ذرا ٹائم نکالیں اور پاکیزہ کے پرانے شمارے اٹھا کر پرانی مصنفات کے انٹرویوز اور دلچسپ تحریر UPLODE کرتی جائیں پرانی یادیں تازہ ہو جائیں گی۔ (مجھے واقعی ٹائم نہیں ملتا یہ کام تم کر دو ناں) انجم باجی! مجھے لگ رہا ہے کہ خوشبو کا سفر کا کوئی ایک پیج مسنگ تھا اینڈ سمجھ میں نہیں آیا کہ زارا اور زین کے بیچ میں کیا ہوا۔ (ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ناول نہایت عمدگی کے ساتھ اختتام کو پہنچا ہے) شمیم فضل خالق نے اچھا لکھا بہت اچھے موضوع پر لڑکوں کی ماؤں کے اسٹینڈرڈ کتنے ہائی ہوتے ہیں، اپنی ناک سے نیچے تو دیکھتی ہی نہیں ہیں جو اونچے گھرانے سے لڑکی لے کر آتی ہیں، وہ ان کو ناکوں چنے چبوا دیتی ہے سارا مسئلہ ہی اسی ناک کا ہے جو بندے کو ذلیل کرواتی ہے۔ رفاقت جاوید کے بکروں کی رام کتھا بھی اچھی لگی۔ کوئی گھریلو خاتون کم از کم بکرے کی ڈیلنگ نہیں کر سکتی بلکہ وہ تو بکرے کو ایک ٹائم کا چارہ بھی نہیں کھلا سکتی جس کا کام اسی کو ساجھے۔ مردوں کو کچن سے اور عورتوں کو بکرا منڈی سے کم از کم دور ہی رکھنا چاہیے۔ مدیحہ عدنان نے اچھے موضوع پر لکھا۔ اللہ کی لاٹھی بے آواز نہیں ہے۔ قدرت کس کو شاہ کرے کسے گدا یہ کوئی نہیں جانتا، ہر بندہ اپنے اعمال کا خود ذمے دار ہے زمانے کی قسم انسان خسارے میں ہے۔'' (بے شک)

✍ ناہید صدیقی، کورنگی کراچی سے۔ ''آپی میں آپ کو 18 سال بعد خط لکھ رہی ہوں۔ پہلے میں ناہید قریشی کے نام سے لکھا کرتی تھی پھر شادی ہو گئی لکھنا چھوڑ دیا تھا پڑھنا نہیں چھوڑا۔ پڑھنے میں دین کی باتیں اور بہنوں کی محفل سب سے پہلے پڑھتی ہوں۔ عمیرہ احمد کا عکس سب سے زبردست جا رہا ہے۔ ویسے سارے ہی سلسلے اچھے ہیں آپی میں بھی پاکیزہ کے لیے لکھنا چاہتی ہوں۔ کیا میں اپنی تحریریں اسی ایڈریس پر ارسال کروں؟'' (خوش آمدید...... فوراً سے پہلے اپنی تحریریں بھیج دو)

✍ رخسانہ ناز، کراچی سے۔ ''بہنوں کی محفل میں پہلی بار شریک ہونے کی آرزومند ہوں اگر مجھے جگہ ملی تو انشاء اللہ ہمیشہ ساتھ رہوں گی باجی میں اپنی کالج لائف سے ہی پاکیزہ کی قاری ہوں لیکن خاموش...... پھر شادی ہو گئی اور سسرال میں ایک تکلیف دہ دور گزارہ اور دس سال بعد الگ ہوئی تو میاں کا انتقال ہو گیا بس

بے حد مشکل وقت لیکن میں نے پاکیزہ کبھی نہیں چھوڑا اب تو خیر بچے بڑے ہیں۔ باجی میرے پاس رشتوں کی بہت کمی ہے میرے تین بچے ہی اصل میرے رشتے دار ہیں ایسے میں بہنوں کی محفل میں دکھ کی بات پر رو پڑتی ہوں اور خوشی کی بات پر اس طرح خوش ہوتی ہوں جیسے یہ میری ہی خوشی ہے اور میں سب بہنوں کو ایک طرح سے اپنا رشتے دار سمجھ بیٹھی ہوں۔'' (یہ محفل آپ کا اپنا میکا ہے۔ آپ ہر ماہ اس محفل میں شرکت کیجیے۔ بُری باتیں بھول جائیں۔ صرف اچھی باتیں یاد رکھیں)

✍ مصباح رضا سعید، فیصل آباد سے۔ ''آپی جی کون کیا کر رہا ہے اس کا ہمارے پاکیزہ میں کیا کام۔ مجھے یہ سلسلہ ذرا پسند نہیں آیا۔ بزم پاکیزہ کیوں ختم کر دیا۔ آپ کے اتنے مزے کے جوابات پڑھ کر ہنسی آتی رہتی تھی دوبارہ ضرور شروع کریں۔ نہیں تو آپ کی بہت بڑی فین آپ سے ناراض بھی ہو سکتی ہے۔ حالانکہ مجھے ناراض ہونا نہیں آتا۔ انعامی سلسلہ ضرور شروع کریں کوئی بک ہی مل جائے گی۔'' (آپ کے مشورے پر جلد عمل کریں گے)

✍ رفعت مبین رفی، کراچی سے۔ ''عائشہ خان کے خط سے معلوم ہوا ہماری انجم انصار ایک بہترین اسکرپٹ رائٹر بھی ہیں یعنی ہر فن مولا ہیں۔ سندیسے اچھا سلسلہ ہے پڑھ کر مزہ آیا۔ روحانی مشورے ہمیشہ کی طرح کارآمد ہے۔ خوشبو کا سفر کا اختتام بہت اچھا رہا۔ بس ذرا اور واضح کر دیتیں۔ شہوار اور تنویر کا انجام بتاتیں۔ زارا اور ہارون کو خوش دکھاتیں تو اچھا لگتا۔ ببول کا سایہ بہت اچھا لگا۔ ساتھ میں مکمل ناول ہم اور تم نہ سمجھ عورتوں کے لیے بہترین سبق ہے۔ کس کی جیت کس کی مات جو سمجھنا چاہیں ان کے لیے اشارہ کافی ہوتا ہے سچا دوست دل کو چھونے والی تحریر ہے اور عکس، عکس پڑھ کر تو اس رات میں سو نہیں سکی۔ پڑھ کر دل چاہ رہا تھا کسی طرح اس شیطان کے چنگل سے معصوم چڑیا کو چھڑا کر بانہوں میں چھپا لوں۔ یہی عمیرہ احمد کا کمال ہے ان کی تحریر میں حقیقت کا گماں ہوتا ہے۔ محبت کی شام اچھا جا رہا ہے دیکھیے آگے کیا ہوتا ہے۔ معراج رسول صاحب اور عذرا رسول صاحبہ کو ذیشان کا حج بہت بہت مبارک ہو۔'' (عذرا شکریہ کہہ رہی ہیں)

✍ انجم گلزار، کراچی سے۔ ''ہوتا ہے شب و روز، قرۃ العین رائے آپ نے بجھے دل کو تر و تازہ کر دیا ہو زورِ قلم اور زیادہ۔ عمیرہ احمد میری پسندیدہ ہیں۔ ایک گزارش جو کہ ایک اور بہن نے بھی کی تھی کہ انگریزی الفاظ کے ساتھ ترجمہ بھی لکھ دیا کریں تو پڑھنے کا مزہ دوبالا ہو جائے گا ویسے یہ بھی چلے گا کہ بہت مزہ آ رہا ہے لگتا ہے کہ چڑیا ہی عکس ہے۔ رائٹر کی گرفت کہانی کے ہر پہلو پر مضبوط ہے لگتا ہی نہیں کہ اگلے پیراگراف میں کیا ہوگا۔ فائزہ افتخار وہ تیرا خالی کمرا کب آباد ہوگا؟ آنٹی ایک گزارش...... ایک طرف تو آپ عمیرہ احمد جیسی مایہ ناز مصنفہ کو لے کر چل رہی ہیں تو دوسری طرف نئی رائٹرز کو شامل کر دیتی ہیں۔ مصنفات کو شامل ضرور کریں مگر معیار کم نہ ہونے دیں۔ اقبال بانو کہاں ہیں؟ عظمیٰ پاکیزہ ڈائری کے لیے اپنا انٹرویو بھجواؤں۔'' (بہت بہتر)

✍ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی، کی رائے کراچی سے۔ ''دسمبر کا پاکیزہ ڈائجسٹ ملا تو ابتدائی اوراق پڑھنے کے بعد بہنوں کی محفل پڑھنی شروع کی اس میں شگفتہ کنول کی اچانک موت کی خبر میرے لیے بڑی روح فرسا تھی۔ بہت دیر تک یقین ہی نہیں آیا۔ کافی دنوں سے اس کا فون بھی نہیں آیا تھا، میں اس کے بارے میں اکثر

سوچا کرتی تھی۔ شگفتہ کنول بہت کم عمر اور خوب صورت لڑکی تھی۔ اس نے اسلامیات میں ماسٹر کیا تھا۔ پچھلے سال اپنے شوہر کے ساتھ مجھ سے ملنے آئی تھی۔ قرآن حکیم لکھ رہی تھی اور بہت خوش دکھائی دیتی تھی۔ مجھ ناچیز سے ملنے کی اسے تمنا تھی جو پوری ہوگئی تھی۔ کیا خبر تھی کہ اس سے یہ پہلی اور آخری ملاقات ہے۔ اس بات کی خوشی ہے کہ اس کا قرآن پاک مکمل ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ اس نیک اور پاکباز لڑکی کو جنت الفردوس میں بہت اعلیٰ مقام عطا فرمائے۔ (آمین) اور اس کے شوہر، والدین اور بہن بھائیوں کو صبرِ جمیل عطا فرمائے۔ (آمین) دیگر افسانے ناولٹ اور ناول اچھے تھے۔ انجم آپ کے بیٹے عمیر کی شادی کا احوال پڑھا۔ بہت اچھا لگا عمیر تو بہت ہی معصوم سا لڑکا ہے اور اس کی دلہن بھی مجھے بہت بھولی بھالی سی لگی۔ آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔" (شکریہ)

✍ شگفتہ ملک، ایلی پور سے۔ "دسمبر کے شمارے میں عکس اور کانچ سی لڑکی پڑھ کر بہت خوشی ہوئی پھر دوبارہ اٹھایا تو شگفتہ کنول کی انتقال کی نیوز پڑھی دل افسردہ سا ہوگیا۔ اللہ تعالیٰ ہماری اس بہن کے درجات بلند کرے، آمین۔ اس ماہ میری بہن چندا ملک جو پاکیزہ کی قاری ہے اس کے ہاں بیٹا ہوا ہے جس کا نام حماس رکھا گیا ہے اور میری بہن نایاب کے ہاں بچی ہوئی ہے جس کا نام اقدس رکھا گیا ہے۔ دسمبر کا شمارہ اے ون تھا آپ سعدیہ سلیم کو بتا دیجیے گا کہ انہوں نے عمیر اور ثمینہ کی شادی کا احوال اس طرح لکھا ہے کہ ہم نے اس میں شرکت کرلی۔" (آپ اپنی دونوں بہنوں کو ہماری جانب سے مبارک باد پہنچا دیجیے گا)

✍ نور افشاں، شکار پور سے۔ "باجی شکریہ...... کہ آپ نے ہماری فرمائش پوری کی۔ آپ کا ناولٹ کانچ سی لڑکی بہت پسند آیا اور اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کا طرزِ تحریر بہت آسان ہوتا ہے اور اس میں دلچسپی بھی ہوتی ہے...... بہت زیادہ کردار ہوں تو ہمارے لیے سمجھنا مشکل ہو جاتا ہے۔ عکس ناول اس وقت ٹاپ پر ہے آپ عمیرہ جی کو بتا دیں۔ (وہ شکریہ کہہ رہی ہیں) اور ہاں میں تصویر کے ساتھ اپنا انٹرویو بھیجوں تو کیا شائع ہوگا۔" (جی ہاں......ضرور)

✍ پروین عذرا تشنہ، کراچی سے۔ "جب بھی تمہیں فون کرتی ہوں تم دوسرے فون پر مصروف ہوتی ہو۔ آخر میں کس وقت تم سے بات کروں کہ لمبی بات کرنا چاہ رہی ہوں۔ (میرے پاس آجاؤ کسی بھی دن) دسمبر کا شمارہ اچھا لگا۔ عکس ناول اچھا جا رہا ہے۔ عمیر اور ثمینہ کی شادی کا احوال بے حد پسند آیا۔ بہت بہت مبارک ہو۔" (خیر مبارک)

✍ رخسانہ امجد، پنجاب سے۔ "مجھے خوشی ہوئی فون پر نام بتانے سے پہلے آپ نے مجھے پہچان لیا۔ مجھے یہی بات تو پسند آتی ہے کہ آپ ہم بہنوں سے محبت کرتی ہیں۔ میری تین سالہ بیٹی کہہ رہی تھی کہ مجھے بھی آنٹی سے بات کرنی ہے تو آپ نے بات نہیں کی۔ سچی باجی میری بچی کا دل ٹوٹ گیا۔" (پیاری رخسانہ اللہ آپ کی منی بیٹی کو جلدی سے بڑا کردے۔ انشاء اللہ اس سے بات بھی ہوا کرے گی۔ مجھے فون کرنے والی بہنوں کی تعداد بہت زیادہ ہوتی ہے۔ مجھے سب کی بات سننی ہوتی ہے۔ یوں بھی فون کا مطلب گپ بازی نہیں ہوتا۔ کام کی باتیں کرنا ہوتی ہیں)

✉ روما ایاز، نامعلوم مقام سے۔ آپ کی دعاؤں کے لیے بے حد مشکور ہوں۔

✍ نرگس نسیم، صابہ موہڑہ سے۔ "بیٹے کی شادی مبارک ہو۔ ویسے کپل اچھا ہے اللہ ان کو خوش و آباد رکھے۔ باجی آپ نے بزم پاکیزہ کیوں بند کردیا ادھر ہمارے گاؤں میں سب بہنیں بہت شوق سے پڑھتی تھیں۔ پلیز یہ سندیسے بند کرکے دوبارہ بزم پاکیزہ لگائیں۔ ہمیں آپ کے کھٹے میٹھے جوابات اچھے لگتے تھے۔ روحانی مشورے اچھا سلسلہ ہے۔ آپ نے اداریہ اچھا لکھا ہے۔ آپی کیا ہم مسلمان ہیں سچے۔ آج ہم کس موڑ پر کھڑے ہیں۔ کیا ہمارا اللہ توکل پر یقین نہیں۔ آج بھی ہم سب متحد ہو جائیں تو کوئی ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔" (پاکیزہ میں تبدیلیاں ہم آپ بہنوں کے مشوروں سے ہی کیا کرتے ہیں۔ بزم پاکیزہ اگر آپ بہنوں کو پسند ہے تو ہم اسے دوبارہ شروع کرسکتے ہیں)

✍ شگفتہ شفیق، کراچی سے۔ "سعدیہ سلیم نے بہت ہی بھرپور شادی کی کوریج کی ہے دلہن اور دولہا پرفیکٹ کپل لگ رہے ہیں ماشاء اللہ۔ ہم سب منتظر ہیں کہ ثمینہ کو بہ نفسِ نفیس دیکھ سکیں ولیمے میں انشاء اللہ۔ اس بار پاکیزہ بہت ہی خوب رہا۔ خاص کر آپ کا ناولٹ کانچ سی لڑکی بے حد پسند آیا۔ اگلی قسط کا دل سے انتظار ہے۔ عکس کی یہ قسط زبردست رہی باقی سارے افسانے بھی بہت اچھے لگے۔ جلترنگ مسکراہٹوں کا خزانہ لیے شامل تھا۔ پاکیزہ ڈائری، بہنوں کی محفل اور میرا انتخاب میرے پسندیدہ سلسلے ہیں۔ انجم باجی ابھی 2 نومبر کو قومی اخبار کے آواز خواتین میگزین کی ایڈیٹر ثمینہ احمد نے ہمارا انٹرویو کیا تھا تو ہم نے انہیں فخریہ بتایا تھا کہ ہمارا سب سے پہلے کلام پاکیزہ ہی چھپا تھا اور دوسرا انٹرویو جس کی پروڈیوسر سیما رضا ردا تھیں اور انٹرویو خالد معین صاحب نے کیا تھا جو کہ خود بہت ہی بہترین شاعر اور کمپیئر ہیں۔ ریڈیو پر انٹرویو ایک زبردست تجربہ رہا۔"

(دلی مبارک باد)

✍ رفعیہ ابدالی، نارتھ کراچی سے۔ "دسمبر کا پاکیزہ ملا سب سے پہلے تو آپ کو عمیر کی شادی کی مبارک باد دے دوں۔ میری طرف سے خوش و خرم زندگی بسر کریں۔ (آمین ثم آمین) اب آتے ہیں اس ماہ کے پاکیزہ کی طرف سلسلے وار ناول تینوں ہی اچھے جا رہے ہیں پہلے مجھے عکس کی قسط پسند نہیں آ رہی تھی لیکن اب یہ دلچسپ ہوتا جا رہا ہے۔ ناولٹ میں فرزانہ گیلانی کا ناولٹ کھلا دریچہ محبت کا بہت پسند آیا۔ ناولٹ محبت کی شام کا اینڈ پسند آیا۔ افسانے میں راستے زندگی کے بہت اچھا لگا آخر کار نو مولود کو عقل آ ہی گئی۔ عقیلہ حق نے اپنے افسانے رنگ کیسے کیسے میں زندگی کی تلخ سچائی کو بیان کیا ہے۔ شمع خانم کی تحریر نے آنکھیں پرنم کردیں۔ عاشفہ مسعود کے افسانے یہ زندگی ہے میں ساس بہو کے روایتی جھگڑے کو بہت خوب صورت انداز میں تحریر کیا ہے۔ سلمٰی یونس کا افسانہ سر پر سے گزر گیا مزہ نہیں آیا۔ سلمٰی غزل کی تحریر سبق آموز تھی لڑکیوں کے گھر اجاڑنے میں لڑکی کے میکے والوں کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے، عذرا آفتاب کا گھونسلہ بھی پسند آیا۔ خصوصی مضمون شادی عمیر اور ثمینہ کی پڑھ کر بہت مزہ آیا یوں محسوس ہوا کہ میں بھی اس تقریب میں موجود تھی۔ بہنوں کی محفل سب پر بازی لے گئی۔ پاکیزہ ڈائری ہمیشہ کی طرح شاندار رہی۔ جلترنگ پڑھ کر بے حد ہنسی آئی۔ خوش ذائقہ میں مچھلی کے کباب پسند آئے۔ میں اکثر گنگناتی ہوں میں اچھے اچھے اشعار پڑھنے کو ملے، روحانی مشورے بھی ایک اچھا سلسلہ ہے۔" (شکریہ)

✍ ڈاکٹر ممتاز ضیا، ضیاالدین اسپتال کراچی سے۔ "مجھے کچھ کہنا ہے میں ہمیشہ کی طرح ایک اہم

مسئلہ اوراس کے حل کی طرف رہنمائی کررہا ہے۔ شکر گزاری کا مشورہ بھی بہت خوب کاش لوگ شکر گزار بنیں۔ اس سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں...... دین کی باتیں اور حضور پاک کے بابرکت نام کی تشریح تبصرہ سے مبرا ہیں۔ عکس کی قسط اچھی لگی مگر عکس کی آمد اچھی نہیں لگی کے بے چاری شہر بانو کے لیے خطرے کی گھنٹی بج گئی۔ جہاں ہم ہیں گوارا تحریر ہے، شیشوں کا مسیحا اپنے موضوع کے اعتبار سے بہت اچھی جارہی ہے اگر ہم لوگ اس کا موازنہ شیریں حیدر کی دوسری تحریروں سے نہ کریں تو بہتر ہے کیونکہ اس کا اپنا پیغام ہے کردار ..... بے شک بہت ہیں مگر یہ بھی ہے کہ گاؤں میں سب گھر سانجھے ہوتے ہیں تو ظاہر ہے کردار زیادہ ہی ہوں گے۔ ایک تھی نیناں کو اب اگر انجام تک پہنچادیا جائے تو اچھا ہوگا، آئندہ مصنفہ اگر افسانے لکھیں تو شاید معیار بہتر ہو۔ انجم نیا ناولٹ شروع کرنے کا شکریہ۔ بہت انتظار تھا بہت اچھے موضوع پر تم نے قلم اٹھایا ہے قسط کا بے چینی سے انتظار ہے۔ سلمیٰ یونس کی تحریر تو جیسی تھی سوتھی اردو اور پنجابی کے جھگڑے نے اور بدمزہ کردیا تبھی تو ایسے کرداروں کے منہ سے دقیق اردو بلوائی جو آسان اردو بھی نہیں بول سکتے اور کبھی یہی سلوک پنجابی کے ساتھ ہوا۔ محبت کی شام گوارا ناولٹ تھا۔ عذرا آفتاب سے یہ کہنا ہے کہ ولیمہ نہ تو روایت ہے اور نہ ہی رسم بلکہ یہ سنت ہے اور جہاں تک رفاہی کاموں پر خرچ کا تعلق ہے تو جس طریق پر وجاہت صاحب برات لے کر گئے تھے اور جو سامانِ تعیش ان کے گھر میں تھا وہ اسراف ہے اس خرچ کو بچا کر بہت کچھ اچھا کیا جاسکتا تھا۔ ناشکری اچھی تحریر ہے۔ انجم عمیر اور ثمینہ کی شادی کی کوریج بہت اچھی لگی مشرقی اقدار کے مطابق سڈنی میں ایسی شادی لوگوں کو یاد رہے گی۔ تمہیں اور عبدالرب بھائی اور دیگر عزیز واقارب کو بہت بہت مبارک...... اللہ تعالیٰ دونوں جہانوں میں بابرکت کرے، آمین۔ عذرا پیاری تمہیں بھی ذیشان کا حج کرنا بہت بہت مبارک...... اس محفل میں شریک ہوکر بہت خوشی ہوئی۔ عذرا سے کہنا ہے تم گلے سے مل گئے سارے گلے جاتے رہے، معراج صاحب کے معالج سے مل کر اور ان کی صحت کے بارے میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ ان کے تمام فنکشن صحیح کام کررہے ہیں خوشی ہوئی اللہ تعالیٰ معجزہ دکھادے، آمین۔ بہنوں کی محفل کی باری بھی آگئی، شگفتہ کنول کی وفات کا بہت افسوس ہوا خاص کر وجۂ وفات جان کر بہت کوشش کی جارہی ہیں کہ دورانِ حمل اور دوران زچگی ماؤں کی وفات نہ ہو مگر افسوس...... اللہ تعالیٰ مرحومہ اور دیگر مرحومین کی مغفرت کرے، آمین، عالیہ بخاری نے ایک بہت اچھے ناول کا اختتام ایسے کیا کہ بدمزہ ہوگئے ایسا لگتا ہے ان سے جو کہا جارہا تھا اب اختتام کردیں تو انہیں غصہ آگیا اور انہوں نے سب کچھ ایک دم سمیٹ کر کہا تم خوش ہوجاؤ کردیا ختم۔" (ایسی بات ہرگز نہیں ہے ہماری بہت ساری بہنوں کو ان کے ناول کا اختتام اچھا لگا ہے۔ بہرحال تبصرے کا شکریہ)

اب اجازت دیجیے اس دعا کے ساتھ کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ارضی وسماوی آفات تمام پریشانیوں، بیماریوں اور شیطانوں کے شر سے بچا کر رکھے اور اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ اور عافیت کے ساتھ صرف اپنا محتاج رکھے، آمین ثم آمین۔

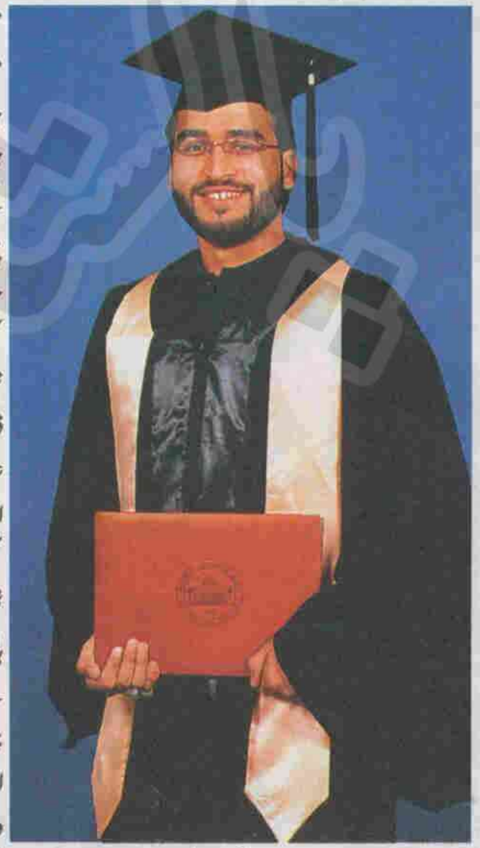
دعا گو

آپ کی اپنی باجی انجم انصار

پھولوں بھری تقریب

انجم انصار

یہ بالکل طے ہو چکا تھا کہ ذیشان رسول جب دبئی سے اپنی گریجویشن مکمل کر کے آئیں گے تو ہماری عذرا رسول ایک تقریب کا انعقاد کریں گی مگر جب ذیشان



ذیشان رسول ڈگری لینے کے بعد

بفضل خدا اپنی ڈگری لے کر آئے تو جون کے گرم جوش موسم نے ان کا استقبال کیا۔ مما اتنی گرمی میں آپ مہمانوں کو بلائیں گی؟ ذیشان نے اعتراض کیا۔ تو کیا ہوا کراچی میں ہر موسم میں تقریبات ہوا کرتی ہیں۔ عذرا نے مسکرا کر بیٹے کو سمجھایا تھا۔ نہیں مما، مہمانوں کو آنے جانے میں تکلیف ہوگی۔ موسم کی تندی تو دیکھیے کتنی گرمی ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ کسی مہمان کو آنے جانے میں تکلیف ہو۔ اچھا موسم قدرے ٹھنڈا ہو تو کرلیں گے۔ عذرا نے بیٹے کی بات مان لی۔ میں تو حج پر جاؤں گا۔ ڈگری کی تقریب بعد میں دیکھی جائے گی۔ ذیشان نے پھر ہونے والی تقریب کو آگے دھکیل دیا اور عذرا اپنے بیٹے کی حج کی تیاریوں میں لگ گئیں اور ماشاء اللہ جب ذیشان حج کی سعادت حاصل کر کے آئے تو عذرا نے ٹو ان ون کے طور پر ایک تقریب کا انعقاد کر ہی لیا۔ اور جاتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ جب میں نے ذیشان کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو وہ بہ مشکل چار یا پانچ ماہ کا پیارا سا بچہ تھا جو ہاتھ بڑھا کر گود میں آیا کرتا تھا۔ بہت پیارا بیٹا ہے تمہارا میں نے گود میں لے کر اس کی فراخ پیشانی کو چوم کر کہا تھا۔ معراج رسول صاحب اور عذرا رسول دونوں کو ہی اپنے گھر میں دوست واقارب کو بہانے بہانے سے ضیافت پر مدعو کرنے کا شوق تھا۔۔۔ اور ان تقاریب میں ہماری شرکت لازمی ہوا کرتی تھی۔ ذیشان اپنے دوستوں کے ساتھ علیحدہ ٹیبل پر بیٹھا نظر آیا کرتا



دائیں سے شائستہ اعجاز۔ انجم انصار۔ اجیہ آفاق۔ عظمیٰ آفاق۔ عذرا رسول۔ ذیشان رسول۔ یاسمین رشید۔ ہما بیگ۔ حمیرا

اور یہ بچہ مجھے شروع سے ہی تکبر سے پاک نظر آیا۔ بھولی بھالی شکل کے ساتھ اس کی معصوم سی باتیں مجھے آج بھی یاد ہیں۔ اپنی میڈ روشن کا خیال رکھنا، ان کے لیے بطور خاص تحائف خریدنا، یہ اس کے بچپن سے ہی معمولات تھے اور مذہب کی طرف لگاؤ اپنے گھر کے ماحول کی وجہ سے آیا۔ ورنہ ہم دیکھتے ہیں کہ اکثر گھرانوں میں جمعے کی نماز کے لیے کیسے دھکے دے دے کر مسجد بھیجا جاتا ہے بچوں کو مگر ذیشان ماشاء اللہ پنج وقتہ نمازی ہے۔ راستے بھر ذیشان کی باتیں ذہن میں گردش کرتی رہیں اور میں از خود مسکراتی رہی۔ میرے عمیر سے سال بھر چھوٹا ذیشان مجھے بے حد عزیز ہے۔ ہماری پیاری عذرا کے لیے آج کی یہ تقریب واقعی بے حد اہمیت رکھتی تھی۔ اللہ تعالیٰ اپنے بیٹے کی ہر خوشی ان کو دکھائے (آمین) تیئس سالہ خوبرو ذیشان رسول خود سے بڑھ کر مہمانوں کا خیر مقدم کر رہا تھا۔ گلے میں پھولوں کا موٹا سا ہار ڈالے دولھا سا لگ رہا تھا۔ حاجی ہونے کے ناتے ایک نور اس کے بھولے بھالے چہرے کا احاطہ کر رہا تھا اور جب ہم اسے گلے سے لگا کر مبارک باد دیتے ہوئے اندر بڑھے تو گھر روشنیوں سے بقعۂ نور تھا۔ لان کے ہر پودے میں باریک باریک بلب یوں لپٹے ہوئے تھے جیسے روشنی کے پھول ہوں۔

مہمانوں کو بٹھانے کا انتظام وسیع و عریض لان میں تھا جو اوول شیپ میں تھا۔ ہر کرسی ٹائی باندھے بیٹھی تھی اور ہر ٹیبل پر فریش پھولوں کا گلدستہ موجود تھا۔ ہر مہمان پھولوں سے لدا پھندا آرہا تھا...... کہ محفل محبت اور پھولوں کی خوشبو سے مسحور کن تھی۔

اس تقریب میں قریبی عزیز و اقارب کے ساتھ...... ان کی اپنی بچپن کی سہیلیاں بھی تھیں۔ جن کی حیثیت بھی کسی طرح عزیزوں سے کم نہ تھی۔

ذیشان براؤن کرتے اور سفید شلوار میں ملبوس تھے اور سب سے ہنستے مسکراتے مل رہے تھے۔

عذرا آف وائٹ اور فیروزی کامبی نیشن کے سوٹ میں خوب کھلی کھلی سی نظر آ رہی تھیں۔

ان کی نظریں جب بھی اپنے بیٹے کے چہرے پر پڑتیں تو وہ اس کی بلائیں لے لیتیں۔

آج کی اس تقریب میں ذیشان کی دونوں خالائیں موجود نہیں تھیں کہ دونوں ہی ملک سے باہر تھیں مگر ان کے فون متواتر آ رہے تھے۔ بجیا ماہ مبین حیدر آباد سے بطور خاص آئی تھیں کہ ماشاء اللہ ان کا بھتیجا حج کی سعادت حاصل کر کے آیا تھا۔ مسز اعجاز رسول...... ذیشان کی چچی بھی ہمیں نظر آ رہی تھیں اور ان کی پیاری سی بیٹی عنبرین اپنے پیارے پیارے سے بیٹے کے ساتھ موجود تھیں۔ نزہت اصغر، انیلا عباس، افشاں اور رضوانہ منظر ہر ہر مہمان کے پاس جا کر مل رہی تھیں...... عذرا رسول کی سب بھاوجیں ہی بے حد اچھی عادتوں کی ہیں اور ہم ان سے مل کر ہمیشہ ایک خوشی سی محسوس کرتے ہیں۔ نزہت اصغر کی پیاری سی بیٹی ام البنین سے ہم بطور خاص اس وجہ سے بھی ملے کہ بقول نزہت وہ ہمارے جلترنگ کی بہت بڑی فین ہے۔ ایلیا...... عذرا کی کزن ہمارے پاس آ کر ملی، تقریباً دس بارہ سال پہلے ایلیا کی تصویر پاکیزہ کے سرورق پر شائع ہوئی تھی جو کہ بہت پسند کی گئی تھی۔ ہماری ملاقات ایلیا سے بہت عرصے بعد ہوئی مگر ہمیں وہ ویسی ہی نازک اور پیاری سی لگیں۔

پیاری بہنو! آپ کو شاید یاد ہو کہ کافی عرصے پہلے نزہت رضوی کا ہم نے انٹرویو شائع کیا تھا۔ وہ زبردست پامسٹ ہیں اور عذرا رسول کی دیرینہ سہیلی بھی ہیں۔ ان سے کافی عرصے بعد ملاقات ہوئی تو وہ مجھے خاصی خاموش اور سنجیدہ سی لگیں۔ ورنہ نزہت رضوی کی بات ہی قہقہے کے ساتھ شروع ہوتی تھی۔

ڈاکٹر عالیہ امام اپنے شوہر کے ساتھ داخل ہوئیں تو عذرا فوراً ان کے پاس گئیں...... یہ ان کی قریبی عزیزہ ہیں اور ہم سوچ رہے تھے کہ علی سفیان آفاقی کی تصویر کی مشابہت ان کے شوہر میں کس قدر پائی جاتی ہے۔ شاید وہ ایک دوسرے کے عزیز ہوں یا شاید وہ بھی ادیب ہوں مگر بعد میں معلوم ہوا کہ اکثر لوگوں کی مشابہت ایک دوسرے سے ہوا کرتی ہے اور اس کے لیے رشتے داری کا ہونا ضروری نہیں ہوا کرتا۔

معراج رسول صاحب سے ملنے جب ان کے کمرے میں گئے تو یقین آ گیا کہ ریاضتوں اور دعاؤں کا کتنا اثر ہوا کرتا ہے۔ ماشاء اللہ وہ پہلے سے بہت بہتر نظر آئے۔ پہلے تو انہیں یہ تک احساس نہیں ہوتا تھا کہ کون ان کے کمرے میں آیا ہے اور کون گیا ہے اور اس شب وہ سب کو یوں دیکھ رہے تھے جیسے پہچاننے کی کوشش کر رہے ہوں۔ میں نے ان کے پاس جا کر دھیرے سے کہا۔ معراج صاحب آپ کو بہت بہت مبارک ہو...... آپ کے بیٹے نے حج کی سعادت حاصل کر لی ہے اور مجھے ان کی آنکھوں سے لگا جیسے وہ کہہ رہے ہوں خیر مبارک۔

ہم دوبارہ لان میں آئے تو ہما بیگ اپنی امی اختر بیگانہ کے ساتھ آتی نظر آئیں۔ اختر باجی معروف افسانہ نگار اور شاعرہ ہیں اور اتنی محبت کرنے والی ہیں کہ ایسے لوگ اب شاذ ہی نظر آیا کرتے ہیں۔ جب بھی ان کا فون آئے یا ان سے ملاقات ہو تھوڑی دیر تک ہم ان کی دعاؤں کی برکھا میں بھیگا کرتے ہیں۔ اختر باجی ان دنوں بیمار ہیں اللہ تعالیٰ ان کو صحت عطا فرمائے، آمین۔ ہما بیگ بھی خوب سج دھج کر آئی تھیں۔ ناک میں لشکارے مارتی لونگ، خوب صورت فراک اور پاجامے میں ملبوس تھیں۔ اپنے کپڑوں کی ڈیزائننگ خود کرتی ہیں اور بہت اچھی لگ رہی تھیں اور



دائیں سے نزہت اصغر - رضوانہ منظر - عذرا رسول - انیلا عباس - افشاں

ہماری ٹیبل پر ہی تھیں وہ سب سے زیادہ قلفی بھی انہوں نے کھائی تھی۔ یاسمین رشید تو ہماری چھوٹی بہن جیسی ہیں آج ان کا سوٹ بھی بہت خوب صورت تھا اور اسی کی مناسبت سے فیروزے کی چوڑیاں اور کڑے بھی پہنے تھے۔ شائستہ اعجاز بھی اپنی پوری فیملی کے ساتھ تھیں۔ ہنستی مسکراتی شائستہ کی بیٹی اور بہو دونوں ہی بڑی اسمارٹ ہیں۔ عذرا رسول کی دوست حمیرا بھی اپنے فیملی کے ساتھ آئی تھیں۔ حمیرا قدرے کم سخن ہیں مگر ہیں بہت محبت کرنے والی، ہمیں دیکھ کر ہی دور سے ہاتھ ہلائے، ہاں حمیرا...... تمہارے سولہ سترہ سنگھار بڑے اچھے لگے۔ ڈاکٹر ممتاز ضیا بے حد مصروف خاتون ہیں۔ گائنی کے اسپتال کی پوری ذمے داری ان کے اوپر ہے مگر عذرا کی محبت میں بہت دور سے وہ اپنی بہن اور بھانجی کے ساتھ تقریب میں پہنچیں، عذرا ان کو دیکھ کر لپک کر آگے بڑھیں، گلے لگا کر خیر مقدم کیا گیا۔ بے حد پیاری عادتوں کی مالک ڈاکٹر ممتاز ضیا کے چہرے پر خوشی کی کرنیں بکھر گئیں۔ عذرا سے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد وہ آخری ٹیبل پر جا کر بیٹھ گئیں۔ عذرا رسول اپنے گھر کی ہر تقریب میں ایسی میزبان نظر آتی ہیں جو اپنے ہر مہمان کا ذاتی طور پر بے حد خیال رکھتی ہیں۔ اسی لیے وہ میرے پاس آئیں اور بولیں۔ انجم ڈاکٹر ممتاز ضیا اپنی ٹیبل پر اکیلے بیٹھی ہیں، میں ان کے پاس چلی جاتی ہوں، ہم ان کی ٹیبل پر آ کر ان سے، ان کی بھانجی سے باتیں کرتے رہے۔ وہ پاکیزہ پر اپنے جارحانہ تبصرے کرتی رہیں کہ یہ بات بالکل سچ ہے کہ ڈاکٹر ممتاز ضیا تبصرہ کرتے وقت کسی کا لحاظ نہیں رکھا کرتی ہیں۔ ہم ان کی باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ اس تقریب کی فوٹو گرافی رضوانہ منظر کر رہی تھیں اور ذیشان جہاں جہاں جا رہے تھے سب سے مل رہے تھے۔ رضوانہ ان کی تصویریں بنا رہی تھیں اور پھر جلد ہی کھانا بھی شروع ہو گیا جو بے حد پُر تکلف تھا ہمیشہ کی طرح

بہترین انتظام بیرے مہمانوں کو ان کی میز پر سرو کر رہے تھے۔ اس کے باوجود عذرا اور ان کی بھابیاں ہر ٹیبل پر جا کر خود سے پوچھ رہی تھیں۔ نزہت تمہارا شکریہ تم نے ہمیں قلفی خود لا کر دی۔ گرم گرم پوریاں بے حد لذیذ تھیں۔ چائینیز رائس، اور باربی کیو چکن کا ذائقہ بھی لاجواب تھا۔ سلاد کی ڈشز تو بے شمار تھیں کہ کس کو لیا جائے اور کس کو چھوڑا جائے یہ بھی مشکل عمل تھا مگر کھانے والے خوب انصاف کر رہے تھے

کھانے سے ابھی فارغ ہی ہوئے تھے کہ پان کی تھالیاں آ گئیں اور جو ہم کبھی پان نہیں کھاتے مگر اس شب ایک پان کی گلوری منہ میں دبالی اور منٹوں میں سٹک گئے۔ پان کھانے والے لوگ نہ جانے ایک گلوری کو گھنٹوں کس طرح منہ میں ٹہلا لیا کرتے ہیں۔ (حیرت ہے) اب روشن ہر مہمان کو حج کے تبرکات دینا شروع ہو گئیں اور عذرا کی نظر یہ تھی کہ کوئی مہمان بھی بنا تبرک لیے جانے نہ پائے۔ سجا سنورا گھر جس کے باہر گاڑیوں کی قطاریں لگی ہوں۔ ڈھول اور نفری بجا کر خیر مقدمی گیت گانے والوں کا گروپ بھی خود ہی دروازے پر آ گیا۔ جو باہر اپنے ساتھیوں کے ساتھ گا رہے تھے پھر انہوں نے نعتیں پڑھنی شروع کر دیں اور یہ سب سن کر عذرا مسکراتے ہوئے کہہ رہی تھیں کوئی جا کر ان کو بھی کچھ دے دے۔

شاعرہ ہما بیگ نے ذیشان رسول کے لیے ایک دعائیہ نظم کہی تھی ہمیں بہت اچھی لگی تھی تو سوچا آپ سب بھی کیوں محروم رہیں۔ تو آئیے اس کے چند اشعار پڑھتے ہیں۔

مبارک ہو رحمتوں والا مہینہ آیا
دیارِ حرم سے ذیشان تیرا بلاوا آیا
حج اکبر کی آپ کو سعادت نصیب ہوئی
پھر سبز گنبد کی زیارت نصیب ہوئی
اک دفعہ جو پہنچے صحن کعبہ تک
اسے نبیؐ پاک کی سخاوت نصیب ہوئی
عذرا کے خوابوں کی تعبیر تھی تو ہو
ماں کی دعاؤں کی ریاضت نصیب ہوئی

عزیز بہنو! یہ جان کر آپ کو حیرت ہو گی کہ عذرا رسول کے میکے میں مرد و زن دونوں کو ہی شاعری سے بہت لگاؤ ہے عذرا کی چھوٹی بہن صغریٰ زیدی بہت اچھی شاعرہ ہیں بہنوئی بھی شاعر ہیں والدہ رقیہ بجیا کو نہ صرف شاعری سے بہت لگاؤ تھا بلکہ ان کی آواز بھی بہت اچھی تھی وہ جب جذب کے عالم میں نعتیں پڑھتی تھیں تو اس کی اٹھان اتنی اونچی ہوتی تھی کہ ان کے لیے کسی مائک کی ضرورت نہیں پڑتی تھی عذرا کی مامی سلطانہ قاسم صاحبہ بھی ایک اچھی شاعرہ ہیں اور انہوں نے اس تقریب میں ذیشان کے لیے یہ محبت بھری دعائیہ نظم پڑھی۔

آدمؑ ہوں، ابراہیمؑ، اسماعیلؑ، مصطفیٰؐ
یہ گھر ہر ایک دور میں مرکز تھا شان کا
میں کس زباں سے عظمتِ کعبہ کروں بیاں
مولود میرا مولا ہوا اس مکان کا
بچوں کرو نہ اپنے بڑھاپے کا انتظار
یہ تربیت فریضہ ہے ہر نوجوان کا
شادی سے پہلے حج کا ولیمہ ہوا نصیب
یہ خاص امتیاز ہے اپنے ذیشان کا
اللہ ہو نگہبان صدا اس جوان کا
حاجی ہے سب سے چھوٹا یہ اس خاندان کا

رات گہری ہو رہی تھی اور ہمیں کراچی کے دوسرے کونے پر جانا تھا اس لیے یاسمین رشید کو جانے کا اشارہ کیا اور عذرا کو ایک بار پھر مبارک باد دی۔ مزیدار کھانے کی تعریف کی اور انہیں خدا حافظ کہہ کر خوشگوار یادوں کے خوب صورت گلدستے کے ساتھ ہم گھر کے لیے روانہ ہو گئے۔


دائیں سے ممتاز ضیا - عذرا رسول - انجم انصار

مبارک باد

عظمیٰ آفاق

میری امی اور آپ کی باجی انجم انصار گزشتہ تئیس سال سے پاکیزہ سے وابستہ ہیں اور میں اپنی اسکول لائف سے ہی عذرا آنٹی کے گھر آ رہی ہوں۔ یہ کوئی پہلا موقع نہیں تھا کہ میں ان کے گھر اپنے بچپن سے ہی آ رہی ہوں مگر اس بار میری کیفیت قدرے جدا سی تھی اور اس کی خاص وجہ بھی تھی۔

مجھے اس دفعہ آ کر وہ پرانی دعوتیں یاد آ گئیں جب معراج انکل صحت مند تھے۔ ان کا رعب و دبدبہ ایک الگ ہی مقام رکھتا تھا۔ معراج انکل کی طبیعت پوچھنے میں ان کے کمرے میں گئی وہ کچھ بول نہیں سکتے ہیں نہ ہی اپنی مرضی سے بیٹھ اٹھ سکتے ہیں لیکن دیکھ رہے تھے شاید پہچانتے بھی ہوں، میں نے انہیں سلام کیا۔ امی، ابو بھی میرے ساتھ تھے۔ مجھے لگا کہ وہ سب کو پہچان رہے ہیں۔ جب سے ان کو دیکھ کر آئی ہوں بس ہر وقت اللہ سے یہی دعا ہے کہ اللہ پاک کوئی معجزہ کر دے اور وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں۔ ویسے ہی ایکٹو اور رعب دار باس بن جائیں جو ان کا خاصہ ہوا کرتا تھا۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اس کے خزانے میں تو کوئی کمی نہیں جو تنکے میں جان ڈال سکتا ہے تو یہ کام تو کچھ بھی نہیں۔ میں سلام کروں گی عذرا آنٹی کی ہمت حوصلے اور محبت کو کہ آپ نے بھی ایک نیک اور فرمانبردار بیوی کا حق ادا کر دیا ہے۔ اللہ آپ کو بہت خوشیاں دکھائے اور اس خدمت کا اجر دے۔ (آمین) سب لوگ یہ کہہ رہے تھے کہ آج اگر معراج انکل ٹھیک ہوتے تو کتنے خوش ہوتے کہ ان کا بیٹا اتنی چھوٹی سی عمر میں حج کر کے آیا ہے۔ میں نے وہاں تو معراج انکل کو مبارک باد نہیں دی لیکن یہاں دیتی ہوں کہ انکل آپ کو مبارک ہو۔ بہت دنوں سے دل چاہ رہا تھا کہ کسی اچھی سی تقریب میں شرکت کی جائے جہاں خوب صورت لوگ، خوب صورت ماحول ہو سو بہنوں شاید کوئی قبولیت ہی کی گھڑی تھی کہ دعوت آ ہی گئی اور دعوت بھی کوئی ایسی ویسی نہیں آپ سب کی جانی پہچانی عذرا رسول کے صاحب زادے ذیشان کی حج کی خوشی کی دعوت جو عذرا آنٹی نے اپنے گھر کے وسیع لان میں سجائی تھی۔ ذیشان ماشاء اللہ بہت ہی نیک اور فرمانبردار بچہ ہے جو اللہ نے اتنی کم عمری میں حج کی سعادت عطا فرمائی۔



پاکیزہ ڈائری

عظمیٰ آفاق سعید

حمدِ باری تعالیٰ

میں کیسے لکھوں تیری ثنا اے میرے اللہ!
پلکیں ہوں قلم، اشک سیاہی کا کام دیں
غافل پڑے ہوئے ہیں خرابی میں اس قدر
مشکل پڑے جو سر پہ تو تیرا ہی نام لیں
اپنے حضورِ پاکؐ کے مرقد کے سامنے
گر ہو قبول حاضری میرا سلام لیں
تو اپنے نبی پاکؐ کے صدقے میں کر قبول
میری دعا کو واسطۂ شہ خیرالانام دیں

شاعرہ: فریدہ افتخار، پشاور

نعتِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم

مثالی آئینے میں آئینے خورشیدِ رحمت کے
کہ سارے عکس اجالوں کے ہیں سب چہرے محبت کے
غبار جاں کو اجلے موسموں کے رنگ پہنائے
انہوں نے تو ستارے ہی بدل ڈالے عداوت کے
وہ جس نے عرش پر لوح و قلم کی پرورش کی ہے
محمدؐ اِک علامت ہیں اسی زندہ حکایت کے
سرِ غارِ حرا وہ ایک چہرہ اس طرح چمکا
کہ اپنے پاؤں پر خود گر پڑے آذر جہالت کے
خیال و خواب کی راہوں میں رہتا ہے چراغاں سا
عجب موسم ہیں کعبے سے مدینے کی مسافت کے
مجھے اس شہر کے رستوں میں کھو جانے کی ہے خواہش
کہ ہیں گمنامیوں کے درمیاں امکان شہرت کے
یہ سوچا ہے کہ اس دہلیز پر میں خود کو چھوڑ آؤں
مجھے درکار ہیں کچھ روز و شب اُن کی اجازت کے

شاعر: جاذب قریشی

مرسلہ: امینہ عندلیب، سلانوالی

بخار

علامہ ابن جوزیؒ نقل فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت ابی بن کعبؓ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ ''بخار کا صلہ کیا ہے؟'' آپؐ نے فرمایا کہ ''جب تک (بخار کی وجہ سے) قدم لڑکھڑاتے رہیں یا نبض تیز چلتی رہے اس وقت تک اس کے حق میں نیکیاں لکھی جاتی رہتی ہیں۔'' حضرت ابی بن کعبؓ نے یہ سن کر دعا فرمائی کہ ''خدایا! میں تجھ سے ایسے بخار کا سوال کرتا ہوں جو نہ مجھے تیری راہ میں جہاد کرنے سے روک سکے اور نہ تیرے گھر اور تیرے نبی کی مسجد تک جانے سے۔'' چنانچہ اس کے بعد ابی بن کعبؓ کو ہمیشہ بخار رہتا تھا۔ جو شخص بھی انہیں چھوتا اسے بخار محسوس ہوتا۔

مرسلہ: جمیلہ بلوچ، لوہی بلوچستان

انمول موتی

جب صبح اٹھو تو کلمۂ طیبہ پڑھو کیونکہ مرنے کے بعد جب قبر میں فرشتے ہم سے سوال جواب کرنے آئیں گے اور ہمیں اٹھائیں گے اور پوچھیں گے کہ تمہارا رب کون ہے؟ تمہارا دین کیا ہے تو ہم اپنی عادت کے مطابق کلمۂ طیبہ پڑھتے ہوئے اٹھیں گے اور کلمۂ طیبہ میں ہی ان فرشتوں کے سوالوں کے

جواب موجود ہیں۔

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

آمین

لفظ آمین کہنے کو تو چھوٹا سا لفظ ہے مگر اس کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ آمین کہنے سے مانگی ہوئی دعاؤں پر مہر لگ جاتی ہے اور دعا صرف اللہ سے ہی مانگو اور اچھی دعا، سننے یا خود دعا مانگنے کے بعد آمین ضرور کہو تا کہ اللہ تعالیٰ ہماری نیک تمناؤں اور دعاؤں کو قبول فرمائے، آمین ثم آمین۔

مرسلہ: رفعت مبین رفی، کراچی

دعا

خدا کرے کہ نیا سال تیرے دامن میں
وہ سارے پھول کھلا دے
کہ جن کی خوشبو نے
تیرے خیال میں شمعیں جلائے رکھی تھیں

شاعرہ: پروین شاکر

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

رفاقت جاوید سے ملاقات

اس ماہ آپ کی ملاقات شاعرہ، افسانہ و ناول نگار رفاقت جاوید سے کروا رہے ہیں جنہوں نے حور اور زیب النسا سے لکھنے کا آغاز کیا جو اپنے زمانے میں بڑے معروف اور مقبول ماہنامے تھے۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھتی ہیں بہت سارے تراجم کیے۔ نفسیات کی ایک کتاب کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا۔ تاریخی ناول بھی لکھا' مزید دو ناولوں کے اردو میں ترجمے کیے۔ انڈیا کے بانو میں بھی ان کے افسانے تواتر سے شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے اپنے تین بچے ہیں اور رفاقت نے تین بچے ایڈاپٹ بھی کیے اور ان چھ بچوں میں ان کے تین بچے ڈاکٹر ہیں اور تین انجینئر۔ سب کی شادیاں ہو گئیں سب بچے ملک سے باہر اچھی جگہ جاب کر رہے ہیں (ماشاء اللہ) بے حد مخلص اور پیار کرنے والی یہ مصنفہ اب پاکیزہ میں باقاعدگی سے لکھنے کا آغاز کر چکی ہیں۔ عمیرہ احمد ان کی پسندیدہ مصنفہ ہیں اور شاعرہ تو صرف پروین شاکر ہی اچھی لگتی ہیں کہ مرحومہ پروین شاکر سے ان کی دوستی بھی بے حد تھی۔ ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی کی یادوں کی مالا انہیں بہت اچھی لگی تھی اور ان سے بہت متاثر بھی ہیں۔ باغبانی، ڈریس ڈیزائنگ اور کوکنگ سے بے حد دلچسپی ہے۔ ان دنوں اپنا افسانوں کا مجموعہ بھی ترتیب دے رہی ہیں۔ ان کے شوہر قاضی جاوید (جو ائرفورس کے ریٹائرڈ ہیں) ان کے آئیڈیل ہیں کہ وہ بھی لکھنے پڑھنے کے شیدائی ہیں اور ان دونوں میاں بیوی کا زیادہ وقت اپنے گھر کی لائبریری میں ہی گزرتا ہے۔ رفاقت جاوید یوں تو اسلام آباد میں رہتی ہیں مگر اپنے بچوں کے پاس کبھی لندن کبھی امریکا اور کبھی آسٹریلیا گھومتی رہتی ہیں۔

ہر لفظ حقیقت

☆ ہر چھوڑ کر جانے والا بے وفا نہیں ہوتا اور ہر ساتھ رہنے والا اپنا نہیں ہوتا۔

☆ دوسروں کے دکھ شمار کریں تو تقدیر سے شکوہ نہیں رہے گا۔

☆ جتنا کسی کا ساتھ پرانا ہوا اتنا ہی اس کی بے وفائی کے لیے تیار رہنا چاہیے کیونکہ تبدیلی کائنات کا خمیر ہے۔

☆ لاحاصل محبت اور دیوانگی میں کچھ خاص فرق نہیں ہوتا۔ دونوں ہی جنون کی حدوں پہ لے جاتی ہیں۔

☆ بیٹی ساری عمر کے لیے بیٹی ہوتی ہے لیکن بیٹا اس وقت تک بیٹا رہتا ہے جب تک اسے بیوی

نہ مل جائے۔

مرسلہ: جبیں ہاشمی، بھیرہ

غزل

محروم تھی میں محبتوں کے ہوتے ہوئے
بے آسرا تھی میں سائباں کے ہوتے ہوئے
زیست کی رہ گزر پہ ہر آن
بے حال ہوئی میں غم کے کانٹوں سے الجھتے ہوئے
مانگیں جب اپنے حصے کی خوشیاں
ہنس پڑی تقدیر صفحۂ زیست دکھاتے ہوئے
کوئی تو ہو جو چن سکے دکھ میری پلکوں سے
تھک چکی ہوں تمام آپ اپنا حوصلہ بڑھاتے ہوئے
یہ نہ پوچھ کیا گزرتی ہے ہم پہ
روتے ہوئے دل کو بہلا کے مسکراتے ہوئے
یارب! ساحل پہ لگا دے اب کشتیِ حیات
تیری قسم بکھر چکی ہوں موجِ غم سے لڑتے ہوئے
سب کے چہروں پہ تھا غرور کچھ پانے کا
محروم تھی میں بختاور ہوتے ہوئے

شاعرہ: بختاور بلوچ، بلوچستان

اصل بات

چار دوست بیٹھے تھے۔ میز پر رکھے موبائل میں سے ایک بجا۔ آدمی۔ ''ہیلو''

بیوی: ''جان میں بازار میں ہوں، کیا میں لاکھ کا جیولری سیٹ لے لوں؟''

آدمی: ''ہاں جان لے لو۔''

بیوی: ''سلک کی ساڑی بھی جو دو لاکھ کی ہے؟''

آدمی: ''ایک ساڑی نہیں دو چار لے لو۔''

بیوی: ''او کے ڈیئر تمہارا کریڈٹ کارڈ میرے پاس ہے اسی سے لے رہی ہوں۔''

آدمی: ''ہاں ٹھیک ہے۔''

سارے دوست بولے۔ ''تو پاگل ہے یا تجھے چڑھ گئی ہے یا تو ہمیں نیچا دکھا رہا ہے کہ تو بیوی کو کتنا چاہتا ہے۔''

آدمی: ''وہ سب چھوڑو یہ بتاؤ کہ یہ موبائل کس کا ہے؟''

مرسلہ: مصباح رضا سعید، فیصل آباد

سیکھ لیا

لو آج بتا دوں تم کو
تم بن بھی جینا سیکھ لیا
دھنک رنگ چنری ملی نہ مجھ کو
کالا آنچل اوڑھ لیا
کانٹے چبھے مجھے پھولوں سے
گلشن میں جانا چھوڑ دیا
جب روٹھ گئیں بہاریں تو
خزاں میں مسکن ڈھونڈ لیا
آنکھوں میں شبنم کے موتی
مسکان سجا کر ہونٹوں پر
خود کو ہی نہیں لوگوں کو بھی
میں نے دھوکا دینا سیکھ لیا

شاعرہ: خالدہ نسیم

مرسلہ: صبا نور، لیہ

سچی بات

میں نے کہا تھا
شمع بجھنے والی ہے
ہاتھوں کی اوک
سے اس کو بچا لو
اور تم ہنس دیے تھے
اور پھر زندگی کی
شمع تمہاری بجھ گئی
اور اندھیرا میرے

شاعرہ: ذکیہ ایوب، کراچی

عربوں کی کچھار میں

نہ جانے کیسے گھس گئی میں عربوں کی کچھار میں
آتا تھا فقط ایک لفظ ہی عربی زبان میں
کہتے گئی جب میں نعم نعم (ہاں) اس کے ہر سوال پر
لے کر آ گیا وہ پھول 45 کی بہار میں

مرسلہ: فاطمہ قاضی، کینیڈا

ارادہ

اب کے برس کچھ ایسی تدبیر کرتے ہیں
مل کے اِک شہرِ محبت تعمیر کرتے ہیں
خزاں کی اجاڑ شامیں نہ آئیں اگلے سال
اس بہار رُت کو زنجیر کرتے ہیں

مرسلہ: عنبر وسیم، گوجرانوالہ

یہ دن اور رات

صبح نے شب کہیں گزاری ہے
چشمِ شبنم سے اشک جاری ہے
جلِ بجھا کالی رات کا جھومر
مہرِ تاباں کی دن نگاری ہے
خواب آنکھوں سے چھن گئے سارے
چشم وا پر سکوت طاری ہے
بے کلی کی سُبک خرامی ہے
شورشِ روزگار جاری ہے
منظرِ صبح دن کی تیاری
اور دن ہے کہ جاں پہ بھاری ہے

شاعر: مشیر طالب

مرسلہ: آمنہ مشیر، نیویارک

علامہ اور آم

علامہ اقبال کو آم بہت پسند تھے۔ زندگی کے آخری دنوں میں شدید بیمار تھے۔ حکیم صاحب نے آموں سے پرہیز بتایا لیکن علامہ اقبال نے اصرار کر کے روزانہ ایک آم کھانے کی اجازت حاصل کر لی۔

ایک دن ان کے ایک دوست ملنے آئے۔ علامہ اقبال چارپائی پر لیٹے ہوئے تھے اور پاس ہی تقریباً آدھا کلو کا آم پلیٹ میں رکھا ہوا تھا۔ ان کے دوست نے پوچھا۔ ”جناب یہ کیا ہے...... حکیم صاحب نے تو پرہیز بتایا ہے؟“ علامہ اقبال نے جواب دیا ”ہاں لیکن ایک آم کھانے کی اجازت ہے اور یہ ایک ہی آم تو ہے۔“

ماخوذ: میرا اقبال

مرسلہ: رفعت مبین رفی، کراچی

غزل

خیالوں میں تیرے رہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
تری الفت کا یہ گہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
میری آہوں میں بدلیں ساری خوشیاں
یوں آنسو کی طرح بہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
ترے وعدوں نے مجھ کو تو دیوانہ کر دیا ہے
لباسِ عشق جو پہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
بہاروں کی رہی ہوں منتظر کس کو بتاؤں
غموں کی دھوپ کو سہنا بڑا مہنگا پڑا ہے
مری فریاد اب خانم سنے گا میرا مولا
کسی سے حالِ دل کہنا بڑا مہنگا پڑا ہے

شاعرہ: فریدہ خانم، لاہور

خوشگوار زندگی کا راز

میری بیوی مجھے بہت پسند ہے اور وہ مجھ سے خوش بھی بہت ہے کیونکہ وہ سبزی کاٹتی ہے اور پکا میں لیتا ہوں۔ کھانا میں لگا دیتا ہوں اور کھا وہ لیتی ہے۔ پانی وہ گرم کر دیتی ہے اور برتن میں دھو دیتا ہوں۔ گاڑی میں دھوتا ہوں چلا وہ لیتی ہے۔ شاپنگ وہ کرتی ہے، بچے میں سنبھال لیتا ہوں۔ فون وہ کرتی

ہے بل میں ادا کرتا ہوں۔لڑائی وہ مجھ سے کرتی ہے
اسے میں منالیتا ہوں اور آخر میں وہ مجھ سے کہتی ہے
کہ ڈارلنگ اگر کوئی اور کام ہو تو میں دل وجان سے
کرنے کو تیار ہوں۔

مرسلہ: پروین افضل شاہین، بہاول نگر

نہ جانے کیوں

ہوا جو ظلم تو آنکھوں میں انتظار آیا
بجھی جو پیاس تو پھر زندگی پہ پیار آیا
جو اس کو دیکھ کے آنکھوں میں اشک بھر آئے
وہ لمحہ میری زندگی میں ایک بار آیا
جہاں پہ خواہشوں کو جیتنے کا جوا تھا
وہاں پہ نفس میرا اپنی بازی ہار آیا
میرا خلوص سوالی رہا توجہ کا
نہ جانے کیوں میرے حصے میں اختصار آیا

شاعرہ: مسز اسامہ ملک، راولپنڈی

سبق

استاد نے شاگرد سے پوچھا۔"تم شہد کی مکھی سے کیا سبق سیکھتے ہو؟"

شاگرد نے جواب دیا۔"جناب جو بھی تنگ کرے اس ڈنک ماردو۔"

مرسلہ: انجم گلزار، کراچی

دلیری

میں نے تمہارے خلاف
تمہاری یاد سے ساز باز کرلی ہے
اور اب
تمہاری بے وفائی کی آنکھوں میں
آنکھیں ڈال کر
دیر تک زندہ رہ سکتا ہوں

مرسلہ: فرحت جمال، کراچی

دریا جیسی

ہم لڑکیاں بھی دریا جیسی ہوتی ہیں
کہ جس کی سرکش موجیں
کبھی طغیانی میں آئیں بھی تو
خود اپنے ہی وجود سے ٹکرا کر دم توڑ جاتی ہیں
جہاں پہ آب ہو زیادہ
وہاں کی سرکشی اکثر خود ہی میں بھنور بنتی ہے
جب پاؤں میں ڈال دی جائیں بیڑیاں
وجود میں ٹھونک دی جائیں میخیں
پھر کہا جائے کہ
صبر کر کے دکھلاؤ
تو ایسے عالم میں
جذبے جذبوں سے لڑتے ہیں
عجب سا شور ہوتا ہے
کہ پل کر ہزاروں سوچیں اشک بن کر
آنکھوں میں ابھرتی ہیں

شاعرہ: نادیہ خان وسیر، کرم پور

دل کی باتیں

دل کی دل سے باتیں ہونا مشکل ہے
دامن کو اشکوں سے دھونا مشکل ہے
چاندنی جانے کس بادل میں الجھ گئی
شبنم سے پھولوں کو بھگونا مشکل ہے

مرسلہ: تانی چوہدری، یوکے

ہائیکو

تم دیکھ لو اک بار
ناراض آنکھوں میں
روٹھا ہوا اقرار
تا عمر دیتے پھروگے
اس نظارے کا صدقہ

شاعرہ: زرقی افشی، پنجاب

یادوں کی پٹاری

انجم انصار

پاکیزہ کے پرانے رسائل کا میں مطالعہ کر رہی تھی کہ میری نظر 1995ء کے پاکیزہ کے ایک سروے پر پڑی۔ یہ سالِ نو پر میں نے مصنفات سے چند سوالات پوچھے تھے اور آج سولہ سترہ سالوں کے بعد بھی اُن کے جوابات مجھے ایسے لگے جیسے کہ انہوں نے آج دیے ہوں۔ یقین نہ آئے تو پڑھ کر اندازہ کرلیں اور ہماری مصنفات بھی یادوں کی پٹاری کھول لیں۔ ہم نے پوچھا تھا کہ......

1۔ سالِ نو آپ کس کے نام منسوب کریں گی......اور کیوں؟

2۔ نئے سال کے لیے آپ کی کوئی پیش گوئی......؟

س۔3۔سال گزشتہ کی کوئی خوب صورت یاد، فقرہ، مکالمہ یا اشعار......؟

س۔4۔ نئے سال کا خوب صورت اور نیا تحفہ آپ کی نظر میں کیا ہوگا؟

بشریٰ رحمٰن

1۔ پیاری انجم ...... یہ ظالمانہ حرکت تمہارے سوا کوئی نہیں کرسکتا کہ جب کام کا انبار لگا ہو، شدید سردی ہو اور تم ایسا خط لکھ دو...... میں ابھی ابھی چین سے لوٹی ہوں اور آتے ہی تمہارے خط کے خطرناک سوالات پڑھ رہی ہوں تو سنو میں اپنا نیا سال، خلشِ ناتمام کے نام کروں گی۔

2۔ نیا سال بھی بارہ مہینے کا ہی ہوگا، اس ملک میں اور کوئی پیش گوئی نہیں ہوسکتی۔

3۔چند اشعار......

آج تک اس کی محبت کا نشہ طاری ہے
پھول باقی نہیں خوشبو کا سفر جاری ہے
اب اسے دل سے بھلا دینا ہے احساں کرنا
اب اسے یاد نہ کرنا ہی وفا داری ہے

4۔تحفہ، دعائیں، لاتعداد دعائیں پاکستان کے لیے اور کراچی کے لیے خصوصاً۔

ساجدہ حبیب

1 میں اپنی زندگی کا یہ سال امن اور سلامتی کے نام سے منسوب کرتی ہوں اور ان احباب کے نام بھی جو محبِ وطن ہیں اس لیے کہ آج اس شورش زدہ دنیا میں ہمیں ان نعمتوں کی بے حد ضرورت ہے۔آج کے اس سیاہ دور میں ہم ہر طرف ایک بے سکونی کے عالم میں بکھرے پڑے ہیں مگر امن، سلامتی، اتحاد اور حب الوطنی کی شاہراہ سے کوسوں دور ہیں اور یہ سفر بڑا ہی خطرناک ہے۔

2۔ میں نجومی تو نہیں مگر یہ قیاس آرائی ضرور کرسکتی ہوں کہ وہ خضرِ راہ جس کی ہمیں تلاش اور اشد ضرورت ہے شاید کبھی، کہیں، کسی وقت کسی خوش نصیب پل آن نکلے شاید...... اور تمام مسائل حل ہوجائیں گے کاش کہ یہ پیش گوئی پوری ہوجائے۔ انجم یقین نہیں اور جب کوئی قوم ایمان اور اتحاد کے ساتھ یقین بھی کھودیتی ہے تو اس کا وہی حشر ہوتا ہے

جو ہم سب کا ہو رہا ہے۔ اللہ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔ (آمین)

3۔ سالِ گزشتہ کی سب سے خوب صورت یاد...... یہاں میرے گھر میں تمہاری آمد ہے، انجم یاد ہے، وہ دن کتنا اچھا اور خوب صورت تھا یا پھر وہ پشاور کا وہ سفر اور غزالہ نگار اور کزئی سے وہ خوب صورت ملاقات، ہاں تمہیں وہ شام بھی ضرور یاد ہوگی جب ہم لوگ مسرت لغاری کے ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مظلوم زینب نور کا ذکر چلا تو مسرت لغاری نے کیا خوب کہا تھا اگر ایک زینب نور جلتی ہے تو ضرورت اس بات کی ہے کہ دو چار شوہروں کو بھی زندہ جلایا جائے تا کہ آئندہ کبھی کوئی زینب نور نہ جلے مگر آج کے مردوں کے اس معاشرے میں کہاں یہ ممکن ہے۔

4۔ امن کی فاختہ نہ جانے کہاں چھپی بیٹھی ہے، کاش کے سامنے آجائے تا کہ گھر نہ جلیں۔ مسجدیں مقتل گاہ نہ بنیں۔ آزادی ایک تعبیر بن جائے اور ہمیں امن وسلامتی نصیب ہو جائے۔

نویدہ تارڑ

1۔ اخلاق کے نام...... کہ لوگوں میں اس کی بے حد کمی ہے (پیاری بہنو...... یہ نویدہ ہمیشہ ذو معنی بات کرتی ہیں، صاف صاف لکھنا تھا کہ اپنے میاں جی کے نام، کرتی ہوں کہ نویدہ صاحبہ مسز اخلاق تارڑ کے نام سے بھی پہچانی جاتی ہیں۔ خیر یہ قطعی دوسری بات ہے کہ کمشنر کی بیگم کے علاوہ یہ بحیثیت افسانہ نگار زیادہ مشہور ہیں۔)

2۔ میں اس سال پاکیزہ کے لیے باقاعدگی سے لکھوں گی، (انشاءاللہ)

3۔ گزشتہ سال کی بہت خوب صورت یادیں ہیں، بھائی کی منگنی کی تقریب ہوئی۔ کزن کی شادی ہوئی اور سب سے بڑی بات کہ میں نے اور اخلاق نے عمرے کی سعادت حاصل کی۔ شوکت رانا الطاف سے بہاول پور میں ملاقات ہوئی۔

4۔ اس سال بھی پروین شاکر کی شاعری نے متاثر کیا اور مجھے پروین کی یہ نظم بڑی ظالم مگر جذبات سے لبریز لگی۔

نظم

سو یہ طے پایا
کہ اس شہد بھری نیند کا رس
میری آنکھوں کے سوا بھی کوئی پی سکتا ہے
اور وہ سرشاری
جواب تک کسی منتر کی طرح
صرف مجھے پڑھتی تھی
اب کسی اور بدن کو بھی یوں ہی ورد زباں جانے گی
وہی لمحے...... اسی شدت سے
تیرے خوں میں ستاروں کی طرح دمکیں گے
جن کی تنویر ابھی تک میری تقدیر رہی
آج معلوم ہوا
پلکوں کے عقب میں کسی جگنو کی طرح
جس کو چھپا لیتی تھیں تیری پلکیں
وہ میرا عکس نہ تھا...... وہ میری تصویر نہ تھی
خوابِ یکتائی کی میرے کوئی تعبیر نہ تھی
تیرا دلدار تبسم آخر
ناخنِ عذر سے کیا دل کی گرہ کھولے گا
آنکھ جب جھوٹ ہے
آئینہ کیا سچ بولے گا

4۔ نئے سال کا خوب صورت اور نیا تحفہ...... اعتبار کی فضا ہوگی جو عرصے سے ختم ہو چکی ہے۔

دلشاد نسیم

1۔ صرف اور صرف پروین شاکر کے نام منسوب کروں گی کہ وہ میری ہی نہیں تمام حساس دلوں کی پسندیدہ شاعرہ تھیں۔

بات وہ آدھی رات کی رات بھی پورے چاند کی
چاند بھی عین چیت کا اس پر تیرا جمال بھی
اسے نہ پا سکے تھے جب دل کا عجیب حال تھا
اب جو پلٹ کر دیکھتے بات تھی کچھ محال بھی
میری طلب تھا ایک شخص جب وہ نہیں ملا تو پھر
ہاتھ دعا سے یوں گرا بھول گیا سوال بھی

2۔ انجم پیش گوئی، کہاں میں کہاں پیش گوئی، سب کچھ ایسا ہی رہے گا۔ آپ دیکھیے گا ہم میں سے کچھ اور ساتھی جدا ہو جائیں گے، وہی اخبار کی سرخیاں، وہی سیاست اور ایسی ہی بدامنی رہے گی۔ ہاں یہ ضرور ہو سکتا ہے کہ انسان کی قیمت گھٹتے گھٹتے آٹے اور پھر نمک سے بھی کم تر ہو جائے۔ مہنگائی کا گراف بڑھتا جائے گا اور انسان کا گھٹتا جائے گا۔

3۔ سالِ گزشتہ کی کئی یادیں ذہن میں تازہ ہیں لیکن ایک یاد ایسی ہے کہ جب آتی ہے تو سب کچھ بھول جاتا ہے۔ نگہت نومبر کے آخری ہفتے میں آسٹریلیا چلی گئی۔ میں لاہور میں تھی، اسے کراچی سے ہی روانہ ہونا تھا۔ جاتے جاتے اس نے فون پر بات کی کہنے لگی۔ کاش میں تم سے ملنے آسکتی۔ یہ اس کی محبت اور شفقت ہے، اس نے الزام مجھے نہیں دیا۔ اب اس کی کمی میں اپنے دل میں محسوس کر رہی ہوں۔ سوچتی ہوں کہ کراچی جاؤں گی اور اس سے ملاقات نہیں ہو پائے گی، تب دل کتنا آزردہ ہوگا۔

ج۔4۔ ابھی تک نہیں ملا۔ انتظار کر رہی ہوں کہ اٹھارہ جنوری کو وہ کیا دیتے ہیں۔ (ہماری شادی کی سالگرہ جو ہے)

جلترنگ

انجم انصار



نئے سال کے پہلے دن

میں تو بھئی صاف بات کہنے کی عادی ہوں، لگی لپٹی رکھنے کی عادی ہی نہیں ہوں۔ جن کے چھوٹے بچے ہوں...... وہ مائیں نہ کہیں آنے کے قابل ہوتی ہیں اور نہ ہی کہیں جانے کے...... ان کے اپنے کاموں کے اتنے دلدر ہوتے ہیں جو ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتے۔

چھوٹے کے پیمپر ختم ہوگئے...... دوسرے کی بوتلیں بوائل کرنے میں جل گئیں۔

بڑی بچی اپنا اسکول بیگ بس میں بھول آئی۔

میاں جی کے کوٹ کی اندرونی جیب میں کمیٹی کے پیسے رکھے تھے...... وہ انہوں نے اپنے سمجھ کر خرچ کرلیے۔

سارے سسرالیے...... دوشالے میں لپیٹے بغیر...... جوتے مار گئے...... جب تک بدلہ نہ لوں چین کیسے ملے۔

ساس صاحبہ...... باری کے بغیر رہنے آگئیں...... جیٹھانی کے کرتوت معاف کرنے کے قابل نہیں...... اپنی باری پر وہ ساس صاحبہ کو ٹہلا کر میرے ہاں بھیج دیتی ہیں۔

اماں کی آنکھ کا موتیے کا آپریشن ہوا اور بھابی اپنے گھر جاکر بیٹھ گئیں۔

چھوٹی بہن کی جس جگہ منگنی ٹوٹی...... اسی لڑکے سے بڑی نند نے اپنی بیٹی کا رشتہ جوڑ دیا...... (کھلی دشمنی کا آغاز اسے ہی تو کہتے ہیں) میاں جانی نے اس ماہ جیب خرچ میں ڈنڈی ماردی...... تب مجبوراً ان کے والٹ سے جو ہزار کا نوٹ چرایا تھا...... وہ کہیں رکھ کر بھول گئی۔

گھر کے بکھیڑے دماغ ماؤف نہیں کریں گے تو پھر کیا کریں گے...... میرا تو یہاں تک کہنا ہے کہ چھوٹے بچوں والی ماؤں کا دماغ تک نارمل نہیں رہتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب بچے ہنستے ہیں تو وہ خود بھی بے وجہ ہنسنے لگتی ہیں۔ کھی...... کھی...... کھی...... اور جب بچے روتے ہیں تو وہ جوتا لے کر مارنے کو بھی دوڑتی ہیں اور بعض اوقات خود بھی روتے ہوئے یہ جملے دُہراتی ہیں...... پتا نہیں کہاں سے آگئی یہ مصیبت...... چھوٹے بچے والیوں کا گھر عموماً بکھرا ہوا رہتا ہے (شاید اپنی آسانی کی وجہ سے...... کہ ہر چیز نظر کے سامنے ہی رہے)

بکھرا ہوا، بے ترتیب گھر اکثر گھرانوں میں شام کو قدرے سمٹ جاتا ہے۔ (میاں کے آنے کا جو ٹائم ہوتا ہے)

اکثر غلیظ سے گھر اس صورت میں قرینے سے بھی نظر آتے ہیں...... جب تہذیب یافتہ مہمان اپنے آنے سے پہلے ٹیلی فون کردیں۔

پاکستان کے 99 فیصد مہمان غیر تہذیب یافتہ ہیں...... جو کسی کے گھر جاتے ہوئے کوئی اطلاعی فون کرنا ضروری نہیں سمجھا کرتے۔ صرف ایک فی صد مہمان نہ صرف تہذیب یافتہ ہیں بلکہ تربیت یافتہ بھی

ہیں۔ ان کے ٹھہرنے کا دورانیہ پندرہ بیس منٹ سے زیادہ نہیں ہوتا۔

آئے بھی وہ گئے بھی وہ...... ختم فسانہ ہوگیا...... ان ہی جیسے مہمانوں کے لیے کہا گیا۔

آنٹی چمو آرا یا صابرہ آنٹی...... جب ہمارے گھر آتی ہیں...... تو وہ صرف اتنی دیر رکتی ہیں...... جتنی دیر مجھے اپنا دوپٹا ڈھونڈنے میں لگتی ہے۔ میرے پاس ہر سوٹ کا دوپٹا موجود ہے...... مگر گھر میں تو زیادہ تر خواتین مردوں کے سے انداز میں گھومتی ہیں...... اس لیے مجال ہے کہ کبھی وقت پر دوپٹا مل جائے...... خیر صبح کے وقت تو میاں جی کو صاف تولیا اور کنگھا بھی نہیں ملا کرتا ہے۔ یہی وجہ سے کہ شادی کے ان دس سالوں میں ہماری سات سو لڑائیاں صرف تولیے اور کنگھے کی وجہ سے ہوئی ہیں۔ ان چیزوں کو بازیاب کرانا انتہائی مشکل کام ہے...... اور میں اس میں سارا قصور اپنی والدہ کا سمجھتی ہوں...... اگر وہ کسی گنجے داماد کا انتخاب کرتیں تو میری ان لڑائیوں میں ففٹی پرسنٹ کمی واقع ہوسکتی تھی۔ (جبکہ خاندان میں اچھے خاصے گنجے لڑکے بھی موجود تھے) میرا تو یہ کہنا ہے کہ چھوٹے بچے والیوں کے ہاں مہمان ہرگز نہیں آنے چاہئیں...... اور اگر آ بھی جائیں تو وہ اندھے، بہرے، گونگے اور ذائقے کی حس سے محروم ہونے چاہئیں۔

اب ہماری نانی ایسی پیاری عادتوں کی ہیں کہ کسی کے گھر بھی چلی جائیں...... آ کر وہ یہی کہتی ہیں کہ پتا نہیں یہ منا مجھے کہاں لے گیا تھا۔ پتا نہیں کون لوگ تھے۔ پتا نہیں کیا کھلایا تھا، پتا نہیں وہ کیا کہہ رہے تھے۔ وغیرہ وغیرہ...... مجال ہے کہ ایک لفظ بھی شکایتی ہو جبکہ میری ساس ایک جملے کے دس مطالب اخذ کرنا جانتی ہیں اگر کسی نے ان کی خیریت بھی دریافت کرلی تو وہ اس کو اس انداز میں دُہراتی ہیں۔

''اے لو...... ابھی میں نے اچھی خالہ کے ہاں قدم ہی رکھا تھا کہ ان کی بہو نے چمک کر پوچھا۔

''خالہ آپ ٹھیک ہیں نا...... ارے ماشاء اللہ صحت بھی اچھی نظر آرہی ہے۔'' اور میں صاف سمجھ گئی...... وہ کیا کہنا چاہتی ہیں...... ان دنوں میں اپنی بیٹی کے ہاں جو تھی...... اور وہ سمجھ گئی۔ خالہ ان دنوں سکون سے ہیں۔ ہر وقت کی کِل کِل نہیں ہوگی۔ اپنی نیند سوتی ہوں گی اور اپنی نیند جگتی (جاگتی) ہوں گی اور جب میں اپنے بیٹوں کے ہاں ہوتی ہوں تو ہنس کر مکھی مارنے کے انداز میں سلام کرتے ہوئے وہ پوچھتی ہے۔''

''اپنا حال تو بتائیں خالہ......؟''

''اب بتاؤ...... میں اس ٹانگ بھر کی چھوکری کے آگے اپنے آبلے پھوڑوں گی...... حالانکہ وہ چاہتی تو یہی ہے کہ میں رائی سے رتی تک کی ہر بات اسے بتاؤں اور وہ پورے خاندان میں انہیں لڈو کی طرح بانٹتی پھرے......''

اپنی بات بتا کر...... دوسرے سے راز داری کے انداز میں یہ کہنا...... کہ اسے تم کسی سے مت کہنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اسے ہر جگہ نشر کیا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ مجھے جو بات سب کو بتانی ہوتی ہے، وہ اسی کلیے کے ساتھ بیان کرتی ہوں۔

اور جب اسی نکتے کے تحت اپنی نندوں کو بتایا کہ ہماری اماں...... ہماری سب سے چھوٹی بہن کو سب سے زیادہ جہیز دیں گی...... جہیز میں پلاٹ بھی دیں گی اور سلامی میں کار بھی...... اور ساس کے لیے تو موٹے موٹے کپڑے بنوا کر رکھ بھی لیے ہیں مگر آپ کسی سے کہیے گا نہیں خوامخواہ کی نظر لگتی ہے...... اور پھر ہماری اماں کا یہ بھی کہنا ہے کہ ہم اپنی بچی کو کتنا

بھی دیں اس کا اس کی سسرال والوں پر بھلا کیا احسان...... ہماری مرضی ہم جس کو جتنا دل چاہے دیں ہمارے میاں کو تو انہوں نے کچھ بھی نہیں دیا تھا...... مگر چھوٹی بہن کی جس جگہ شادی ہوگی تو سمجھ لیں...... کہ ان کی لاٹری نکل آئے گی۔''ابھی...... یہ شوشا چھوڑے...... اڑتالیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے...... چاروں نندیں اپنی اپنی سسرالوں سے کوئی چودہ کے قریب رشتے لے آئیں۔

تب ہماری اماں نے ان میں جو کم لالچی اور کم ذلیل تھا، اسے چھوٹی بہن کے لیے منتخب کرلیا۔

آج ہماری اماں چین کی نیند سوتی ہیں...... کہ اپنی پانچوں بیٹیوں کے فرض سے وہ اپنی ذہانت کے ساتھ نمٹ گئیں۔ رہی بات دینے دلانے کی...... تو انہوں نے پیپری سے گاتی آئی دو کوڑی کا راج لائی کے مقولے پر عمل کیا...... لگتا ہے، آپ میری بات کا مطلب نہیں سمجھتیں...... تو آسان اردو میں سمجھاتی ہوں کہ شور مچایا لاکھ کا...... دیا خاک کا۔ بات سے بات نکلے تو کہاں چلی جاتی ہے...... بات ہو رہی تھی چھوٹے بچوں کی ماؤں کی، جن کے اوسان تو ہمیشہ ہی خطا رہتے ہیں۔ کوئی بری بات سن لی تو وہ دماغ میں اینٹ کی طرح لگتی ہے جیسے ابھی اماں نے مجھے فون پر بتایا ہے کہ بڑی بھابی کے بھائی نے ان کی سالگرہ پر سونے کی چین دی ہے۔

ہمارے بھائیوں نے سالگرہ تو کیا، بڑی سے بڑی تقریب پر بھی کچھ خاص نہیں دیا...... بلکہ اکثر نے تو منہ چھپانے کے بہانے ہی ڈھونڈے...... ہے نا تکلیف کی بات......

میں تو ویسے بھی پریشانیوں میں گھری رہتی ہوں۔ اوپر تلے کے چھ بچے پتیلیوں کے سیٹ کی طرح ہوں اور ان کی الٹی سیدھی دیکھ بھال کے ساتھ دو کنواری نندوں کا بھی ساتھ ہو تو مہمان کو تو کیا...... گھر کے لوگوں کو بھی چند گھنٹوں کے لیے (یہی چودہ سے پندرہ گھنٹے) باہر نکالنے کو دل چاہتا ہے۔ (دل تو بچہ ہے جی)

گو کہ حفظِ ماتقدم کے طور پر...... میں کبھی کبھی...... صفائی کے گھنٹے بھی منایا کرتی ہوں...... (آدھا گھنٹا یا پون گھنٹا) چھوٹے بچوں کی ماں ہوں ناں صفائی کا ہفتہ منانا کم از کم میرے لیے تو ناممکنات میں سے ہے۔ مگر میرے بچوں کو جو مزہ گندگی پھیلانے میں آتا ہے وہ صفائی سے کوسوں دور ہے۔

کینو کھاتے ہوئے...... اس کے چھلکے ایک دوسرے کو مارتے ہیں۔ سیب کو گیند کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ کیلے کے چھلکے پر خود پھسل پھسل کر دیکھتے ہیں۔ آنے والے مہمانوں کی راہوں میں رات کو لائٹ بند کر بچھایا تک کرتے ہیں۔ (منجھلی اور چھوٹی نندوں کے پیروں میں ماشاء اللہ چار دفعہ موچ...... میرے گھر آ کر تو آئی تھی......)

اب ہوتا یوں ہے کہ میرے گھر ناگہانی آنے والے مہمان آدھے آدھے گھنٹے نہ صرف گھنٹی بجاتے ہیں بلکہ گیٹ بھی دھڑ دھڑاتے ہیں جب تک دو چار لوگ ان کو اس فعلِ بد سے باز رکھنے کے لیے نہیں آتے ہیں، میں گیٹ نہیں کھولتی ہوں۔

زیادہ تر میرے گھر کی بیل بند ہی رہتی ہے مگر بچوں کی شرارتیں اور بدتمیزیوں کے طفیل وہ کھل بھی جاتی ہے۔ گو کہ میری نندیں کام کرنے کی شوقین نہیں ہیں مگر مہمانوں کو دیکھ کر پھرکی بن جاتی ہیں۔ یہ خوبی بہرحال ان میں پائی جاتی ہے۔ انتہائی کم وقت میں گھر خوب سنگوایا جاتا ہے۔ ہر چیز غلط جگہوں پر گھسیڑ دی جاتی ہے۔

بچوں کے اسکول کے یونیفارم...... مچان پر پھینک دیتی ہیں۔ کمبل، تکیے، بیڈ کے نیچے...... ایک مرتبہ ایک مہمان خاتون کا انتہائی بدتمیز بچہ کرولنگ کرتا ہوا جب بیڈ کے نیچے سے انتہائی غلیظ تکیہ باہر نکال لایا تو...... مہمان خواتین کی ہنسی نے مجھے خاصا زخمی سا کردیا تھا۔ تب سے میں نے یہ قانون نافذ کردیا کہ گھر کا وہ سامان جو چھپانا مقصود ہو وہ بستر پر ڈال کر اس پر رضائی اس طرح اڑھا دو جیسے کوئی سو رہا ہے۔ آرام سی میٹھی نیند...... جس کو جگانا بھی نہیں چاہیے بلکہ کسی کو سوتا دیکھ کر...... خاموشی سے اس کمرے سے از خود باہر نکل جانا چاہیے۔ تہذیب، تمیز کا یہی اصول نمبر ون ہے...... جس پر ہر آنے والے مہمان کو کاربند بھی رہنا چاہیے۔ یہ خیر قطعی دوسری بات ہے کہ اس تجربے کے طفیل بہت سے محاذوں پر مجھے سرخروئی بھی حاصل ہوئی تھی۔ مگر بعض مرتبہ برا وقت خود چل کر آتا ہے۔

بڑی نند باہر سے آئی ہوئی اپنی دونوں نندوں کو بغیر بتائے لے کر آ گئیں۔

آپ خود سوچیں کہ نند کی بھی نند اگر امریکا سے آ رہی ہو تو وہ کیا چیز ہوگی......؟ قصہ مختصر...... بتائے بغیر (پتا نہیں کیا سوچ کر) ہماری نند اپنی دو نندوں کو لے کر ہمارے دولت کدے پر حاضر ہو گئیں۔

''امی...... پھپو آئی ہیں......'' چھوٹی بچی نے ایسے خوش ہو کر بتایا جیسے عید کا چاند رویت ہلال کمیٹی والوں نے پشاور والوں کے ساتھ ہی دیکھ لیا ہو۔

''شبانہ...... فرزانہ......'' میں ڈکرائی۔

''کیا ہوا بھابی......؟'' وہ دونوں سہم کر جلدی سے آ گئیں۔ ''ایک منٹ والی صفائی فوراً کرلو۔'' اپنے بکھرے بالوں کو جوڑے کی گانٹھ دیتے ہوئے میں نے کہا اور وہ دونوں اس تیزی سے چیزیں بستر پر لا لا کر پھینکنے لگیں...... جیسے ایک بیڈ پر ہی...... سارا سامانِ غلاظت ڈالنا ہو۔ اخبار، میگزین، تکیے، میلے کپڑے، بچوں کے بستے، پھیلے ہوئے جوتے، آلو کا تھیلا، پیاز کی تھیلی، غرض سب ہی اللم غلم چیزیں ڈال کر ان پر دو موٹے موٹے لحاف اوڑھا دیے گئے...... پورا گھر چندن سا ہو گیا...... کبھی آپ بھی ایسی ایمرجنسی میں یہ طریقہ اپنائیے...... آپ کی پریشانیاں لمحے بھر میں ہوا ہو جائیں گی...... میرا خیال تھا...... نند اپنی گند کے ساتھ جلد رفو چکر ہو جائیں گی...... مگر وہ لگیں انڈیا کے ڈراموں کی تعریف کرنے

''پاکستان کے ٹی وی کے ڈراموں میں مزہ ہی نہیں آتا...... ایک انڈیا کے ڈرامے ہیں...... وہ اپنے ناظرین کو اپنے سامنے بٹھا کر رکھتے ہیں...... خوشی اور ارنف کا ڈراما کیسا اچھا چل رہا ہے۔''

''بالکل بکواس...... ڈراما تو صرف اس میں ہے ہی نہیں...... سارے سین...... ہیرو اور ہیروئن کے ایک دوسرے پر گرنے کے ہیں ایک دوسرے کو پکڑنے کے ہیں...... اگر ہیرو ہیروئن کو لے کر گر جائے تو اس کی ہیروئن آدھے گھنٹے تک یہ نہیں کہتی...... کہ بھیا ہٹ جاؤ...... ایک قسط تو اسی میں گزر جاتی ہے......'' میں نے جل کر کہا۔

''اے ہے...... تمہیں اتنے سارے بچوں کے ساتھ ٹی وی دیکھنے کا ٹائم مل جاتا ہے......'' نند کی نند نے بم باری کی۔

''ہاں، میں تو بچوں کو ان کے باوا کے حوالے کردیا کرتی ہوں وہ بوتل سے پیمپر تک کا خیال رکھتے ہیں...... اور میں تو کھانا تک...... کرن کی عدالت کا پروگرام دیکھتے ہو کے کھاتی ہوں کہ اس سے کہیں اچھا پروگرام...... تو ہمارے ہاں...... ماچس تھا......

کہ دیکھ کر رونے کے بجائے ہنسی آیا کرتی تھی۔''

میڈیا کی بحث میں...... جب وہ مجھ سے ہار گئیں تو سیاست میں کود گئیں۔

''نواز شریف کی پرسنالٹی بہت شاندار ہوگئی ہے...... شکر ہے سر پر بال لگوا لیے ہیں۔''

''میں اخبار نہیں پڑھتی۔''

''اے لو...... تمہیں تو پڑھنا چاہیے...... تم تو اتنا بولنے والی ہو کہ ہماری اماں کہتی ہیں کہ زبان کے نیچے زبان ہے تمہاری۔'' نند نے اپنا کوڑا لہرایا۔

''اٹھارہ گھنٹے جب میں ٹی وی دیکھوں گی تو ساری خبریں مجھے اخبار سے زیادہ تیز اور فوری معلوم ہوتی ہیں۔ جس علاقے میں ٹریفک جام ہونے والا ہوتا ہے ٹی وی والے پہلے ہی سے بتا دیتے ہیں تو اب اخبار پڑھنے کی کیا ضرورت ہے، جو پڑھے تو اس کی معلومات پرانی ہیں۔''

''اس سال الیکشن ہوئے تو ووٹ ڈالنے جاؤ گی؟'' ان کی باتوں کے پینترے ہی ختم ہونے میں نہیں آرہے تھے۔

''اگر میں الیکشن میں نہ کھڑی ہوئی تو......'' میں نے بھی انہیں کلسانے کے تمام گر اپنا لیے تھے۔

''ارے واقعی۔''

''اللہ کب......''

''افوہ...... بڑی اونچی جا رہی ہو۔'' وہ سب نہ جانے کیا کیا کہہ رہی تھیں۔ دل چاہ رہا تھا کہ وہ جلدی سے چلی جائیں۔ اچھی خاصی باتیں ہو چکی تھیں بول بول کر میرے جبڑے دکھ گئے تھے۔ چائے، پانی بھی خوب اچھا ہوگیا تھا مگر وہ جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں اور وہ ڈرائنگ روم سے اٹھ کر ٹی وی لاؤنج میں آئیں تو میرا دل گھبرا سا گیا۔

سامنے ہی تو میرا کمرا تھا...... جس کا دروازہ کھلا تھا، اب بڑی نند کے ساتھ ان کی گند میرے کمرے کی طرف بڑھیں۔

''تمہاری بھابی کا کمرا تو دیکھیں آج کیسا ہے......؟'' تب مجھے چکر محسوس ہونے لگے۔

''سنو میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' میں نے فرزانہ سے کہا۔

''کیوں بھابی؟'' وہ معصومیت سے بولی۔

''طبیعت خراب ہو رہی ہے میری...... گھر ہلتا ہوا لگ رہا ہے۔ پہلے پڑوس میں جا کر شربت پیوں گی اور پھر......''

''پھر آپ گھر آجائیں گی......؟'' اس نے پوچھا۔

''نہیں، اس کے بعد میں ڈاکٹر کے پاس جاؤں گی۔'' یہ کہہ کر میں کسی کو بتائے بغیر باہر نکل گئی۔

یہ تو بعد کی خبریں ہیں کہ وہ میرے کمرے میں آکر بولیں۔ ''اے ہے اتنی گرمی میں یہ اتنے زیادہ لحاف اوڑھے کون سو رہا ہے۔''

''آپا! ہمارے ہاں ایک مہمان خاتون آئی ہوئی ہیں، انہیں ٹھنڈ لگ گئی ہے...... وہ دوا کھا کر لحاف اوڑھ کر سو رہی ہیں، ڈاکٹر نے انہیں آرام کرنے کا مشورہ دیا ہے۔ پلیز آپ لوگ باہر آجائیں......'' فرزانہ (میری نند) نے اپنی بہن نند سے حرف بہ حرف یہی کہا تھا مگر نند کی گند نے فوراً ہی لحاف اتارتے ہوئے کہا۔

''ارے اتنی گرمی میں یہ لحاف اوڑھ کر لیٹنے سے تو کسی کی بھی طبیعت مزید خراب ہو سکتی ہے۔''

اور چند لمحوں بعد ان کی طبیعت ہی خراب ہوگئی۔ جب ان کے ہاتھ میں ساس کا چیکٹ چمبر آیا۔ پھر میلا دسترخوان، میلے تولیے، ٹاکی کے گیلے ٹکڑے، چھوٹا کپڑا جسے ہاتھ میں آتے ہی انہوں دور اچھال

دیا۔ آلو کی تھیلی تو اُن کا ہاتھ لگتے ہی پھٹ گئی تھی اور سارے آلو ان کے قدموں میں ہی ڈھیر ہوگئے تھے۔ پیاز بھی لڑھکنے کو تیار تھی۔

میری چھوٹی بیٹی نے ان سے جب یہ کہا۔

''آنٹی آپ نے تو ہمارے سارے آلو ہی گرا دیے، اب آپ کو ہماری ممی ماریں گی۔'' تو وہ از خود پشیمان ہوگئیں۔

وہ کیسے گئیں؟ اپنے گھر جا کر انہوں نے مجھے کیا کچھ کہا...... میں ان تمام جھمیلوں میں نہیں پڑتی کہ اس ضمن میں ساری غلطیاں ان ہی کی ہیں۔

(الف) وہ بتائے بغیر کیوں آئیں۔

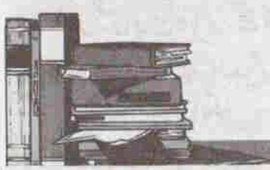
(ب) اگر...... آ بھی گئیں تو اتنی دیر کیوں رکیں؟

(ج) اگر رکنا ہی تھا تو صرف ڈرائنگ روم تک محصور کیوں نہ رہیں؟

(د) ڈرائنگ روم سے قدم کیوں باہر نکالا؟ اور جب قدم باہر نکالا اور خود ہی گھر کی سیاحت پر بھی روانہ ہوگئیں...... تو سزا تو انہیں پانی ہی تھی۔ اس میں میرا کیا قصور، ہے نا......

اگر کوئی مہمان نئے سال کے پہلے پہلے دن آکر اسے یوں خوار کر جائے تو غلطی مہمان کے کھاتے میں ہی ڈالنی چاہیے۔ اپنی غلطیاں، اپنی کوتاہیوں...... کو بھی کوئی اپنی کہا کرتا ہے، کوئی بھی نہیں کہتا...... تو پھر میں کیوں کہوں؟ آپ ہی بتائیں۔

☆☆



میرا انتخاب
آمنہ حماد

قوموں اور تہذیبوں کے عروج و زوال کے ساتھ ساتھ شعر و ادب کی دنیا بھی بدلتی رہتی ہے۔ اردو ادب اور شاعری کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ برصغیر میں تختِ طاؤس اور تاج محل کے معماروں کی سلطنت کا آفتاب روشن رہا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ہر رنگ اپنی کشش کھو دیتا ہے اور پرانا ہو جاتا ہے مگر ادب میں ایسا نہیں ہے۔ اس کا اندازہ اساتذہ کے کلام کو پڑھ کر ہوتا ہے۔ فراق گورکھپوری کی یہ غزل بھی کچھ اسی رنگ میں ہے جس کا انتخاب میمونہ عزیز نے کراچی سے کیا ہے۔

غزل

بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں
تجھے اے زندگی ہم دور سے پہچان لیتے ہیں
جسے کہتی ہے دنیا کامیابی وائے نادانی
اسے کن قیمتوں پر کامیاب انسان لیتے ہیں
طبیعت اپنی گھبراتی ہے جب سنسان راتوں میں
ہم ایسے میں تری یادوں کی چادر تان لیتے ہیں
تری مقبولیت کی وجہ واحد تیری رمزیت
کہ اس کو مانتے ہی کب ہیں جس کو جان لیتے ہیں
رفیقِ زندگی تھی اب انیسِ وقتِ آخر ہے
ترا اے موت ہم یہ دوسرا احسان لیتے ہیں
فراق اکثر بدل کر بھیس ملتا ہے کوئی کافر
کبھی ہم جان لیتے ہیں کبھی پہچان لیتے ہیں

☆

ہماری مہکتی فضاؤں میں یہ کیسا درد آ بسا ہے کہ منظر لہو لہو ہیں، دل درد سے بوجھل ہیں۔ گلاب چہرے مرجھا رہے ہیں۔ ناامیدی، مایوسی اور بے حسی کی فضا نے گھیر رکھا ہے۔ خلوص کی خوشبو، محبت کی روشنی اور امید کے رنگوں سے یہ گلستان پھر مہک سکتا ہے۔ ہم روشنی کے امین ہیں اور ہمارے بعد ہماری آنے والی نسلیں...... دور افق پر صبح کی سپیدی نمودار ہو رہی ہے۔ پھولوں پر شبنم کے قطرے مسکرا رہے ہیں۔ فضا میں پرندوں کی چہچہاہٹ گونج رہی ہے۔ ایک امید ہے آنے والے روشن دن کی۔ یہ امید محسن نقوی کی نظم میں بھی نظر آتی ہے۔ جسے شازیہ حمیر نے سیالکوٹ سے منتخب کیا ہے۔

نظم

آؤ وعدہ کریں
آج کے دن کی روشن گواہی میں ہم
دیدۂ دل کی بے انت شاہی میں ہم
زیرِ دامانِ تقدیسِ لوح و قلم
اپنے خوابوں، خیالوں کی جاگیر کو
فکر کے موقلم سے تراشی ہوئی
اپنی شفاف سوچوں کی تصویر کو
اپنے بے حرف ہاتھوں کی تحریر کو، اپنی تقدیر کو
یوں سنبھالیں گے، مثلِ چراغِ حرم
جیسے آندھی میں بے گھر مسافر کوئی
بجھتی آنکھوں کے بوسیدہ فانوس میں
پہرہ داروں کی صورت چھپائے رکھے
جانے والوں کے دھندلے سے نقشِ قدم

آج کے دن کی دلکش گواہی میں ہم پھر ارادہ کریں
جتنی یادوں کے خاکے نمایاں نہیں
جتنے ہونٹوں کے یاقوت بے آب ہیں
جتنی آنکھوں کے نیلم فروزاں نہیں
جتنے چہروں کے مرجان زرداب ہیں
جتنی سوچیں بھی مشعل بداماں نہیں
جتنے گل رنگ مہتاب گہنا گئے
جتنے معصوم رخسار مرجھا گئے
جتنی شمعیں بجھیں، جتنی شاخیں جلیں
سب کو خوشبو بھری زندگی بخش دیں،
تازگی بخش دیں
بھر دیں سب کی رگوں میں لہو نم بہ نم
مثلِ ابرِ کرم رکھ لیں سب کا بھرم
دیدہ و دل کی بے انت شاہی میں ہم
زخم کھائیں گے حسنِ چمن کے لیے
اشک مہکائیں گے مثلِ رخسارِ گل
صرف آرائشِ پیرہن کے لیے
مسکرائیں گے رنج و غم دہر میں
اپنی ہنستی ہوئی انجمن کے لیے
طعنِ احباب، سرمایۂ کج دلی، بجز اغیار سہہ لیں گے
فن کے لیے
آؤ وعدہ کریں
سانس لیں گے متاعِ سخن کے لیے
دیدہ و دل کی شوریدگی کی قسم
آسمانوں سے اونچا رکھیں گے علم
آؤ وعدہ کریں
آج کے دن کی روشن گواہی میں ہم

☆

محبت کرنے والے نامعلوم منزلوں کے مسافر ہوتے ہیں سب کی منزل الگ الگ ہے۔ تھوڑی دیر ایک ساتھ چلتے ہیں اور بچھڑتے ہیں...... اداسی ان کی ہم سفر رہ جاتی ہے۔ وہ گزرے لمحوں کو اس طرح تازہ کرتے ہیں کہ شامِ فراق، صبحِ وصال کی خوشبو بن کر ان کو نئی زندگی عطا کرتی ہے۔ محبت کا یہ رنگ فیض احمد فیض کی اس غزل میں نظر آتا ہے۔ جس کا انتخاب عینی عمر نے اسلام آباد سے کیا ہے۔

غزل

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا
غمِ جہاں ہو، رخِ یار ہو کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا
تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا اور کیا تو کیا نہ کیا
خوشا کہ آج ہر اِک مدعی کے لب پر ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا
وہ حیلہ گر جو وفا جو بھی ہے جفا خو بھی
کیا بھی فیض تو کس بت سے دوستانہ کیا

☆

اچھا شعر وہ ہے جس کے پڑھنے کے بعد کم از کم کچھ عرصے تک کوئی دوسرا شعر پڑھنے کی ضرورت نہ ہو بلکہ ایسے اشعار تو ذہنوں میں محفوظ ہو جاتے ہیں...... ناصر کاظمی کی یہ غزل بھی کچھ ایسا ہی تاثر قائم کرتی ہے۔ جس کا انتخاب صائمہ امین نے لاہور سے کیا ہے۔

غزل

کچھ یادگارِ شہرِ ستم گر ہی لے چلیں
آئے ہیں اس گلی میں تو پتھر ہی لے چلیں
یوں کس طرح کٹے گا کڑی دھوپ کا سفر
سر پر خیالِ یار کی چادر ہی لے چلیں
رنجِ سفر کی کوئی نشانی تو پاس ہو

تھوڑی سی خاکِ کوچۂ دلبر ہی لے چلیں
کہہ کے چھیڑتی ہے ہمیں دل گرفتگی
گھبرا گئے ہیں آپ تو باہر ہی لے چلیں
اس شہرِ بے چراغ میں جائے گی تو کہاں
آ اے شبِ فراق تجھے گھر ہی لے چلیں

☆

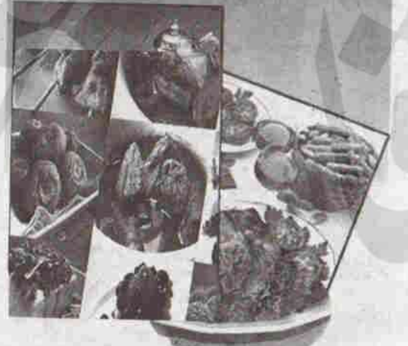
شاعری ہو یا مصوری یا موسیقی ان سب میں قدرِ مشترک جذبۂ عشق ہے...... عشق ایک ازلی حقیقت ہے جس کے مظاہر ہمیشہ زندہ رہتے ہیں لیکن کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی بات ایسی ہوجاتی ہے کہ وہ تصویر انسان اپنے دل سے خود ہی مٹا دیتا ہے۔ مصطفیٰ زیدی بھی کچھ اسی کشمکش میں مبتلا نظر آرہے ہیں۔ اس نظم کو ارم عقیل نے حیدر آباد سے منتخب کیا ہے۔

پرسیدم شکستم

مدتوں کا پرورہ
ایک نقش تھا دل پر
جس کو چند لمحوں نے
داستاں بنا ڈالا
رات بھر کوئی دل میں
کروٹیں بدلتا تھا
اِک چراغ بجھتا تھا
اِک چراغ جلتا تھا
سبھی چہرے
اِک دھوئیں کے بادل میں
ڈوب ڈوب جاتے تھے
صرف ایک چہرہ تھا
وہ کبھی نہیں بکھرا
اور پھر وہ دن آیا
جب یہ جاگتی آنکھیں
اس کو دیکھ سکتی تھیں
اس کو دیکھ لینے پر
دل کی ایسی حالت تھی
جیسے کوئی پردیسی
دور کے سفر کے بعد
ایک سرد چشمے پر
ہاتھ پیر دھوتا ہے
لیکن اے غمِ آخر
صرف ایک لمحے کو
زندگی نہیں کہتے
اے تلاشِ لاحاصل
مسکرا کے ملنے کو
دوستی نہیں کہتے
اے مرے تصور
ایک بات کہنی تھی
بات جس کے کہنے کو
میرے ہونٹ جلتے تھے
میرا دل سلگتا تھا
اب فقط یہ کہنا ہے
جو چراغ سینے کی
آندھیوں میں جلتے تھے
وہ ذرا سی کوشش سے
جھلملا بھی سکتے ہیں
حوصلے کے آدمی
اپنے دل کے زخموں پر
مسکرا بھی سکتے ہیں
بت بنانے والے ہاتھ
فیصلے کے لمحوں میں
بت گرا بھی سکتے ہیں

☆

خوش ذائقہ
پاکیزہ بہنیں



تھائی اسٹائل سویٹ کارن سوپ

اشیا: تیل، آدھا چائے کا چمچ۔ سبز پیاز (باریک کٹی ہوئی)، دو عدد۔ لہسن (باریک کترے ہوئے)، ایک پوتھی۔ چکن اسٹاک، ڈھائی کپ۔ میٹھی مکئی، چار سو پچیس گرام۔ جھینگے پکے ہوئے، دو سو پچیس گرام۔ چلی ساس، ایک چائے کا چمچ۔ نمک، حسبِ ضرورت۔ سیاہ مرچ، حسبِ ضرورت۔ دھنیا، چند پتے۔

ترکیب: تیل کو گرم کر کے اس میں لہسن اور پیاز تقریباً ایک منٹ تک پکائیں یہاں تک کہ نرم ہوجائیں۔ اس میں مکئی، چکن اسٹاک، جھینگے اور چلی ساس ڈال کر پکائیں۔ آمیزے کو ابالیں اور وقتاً فوقتاً ہلاتے رہیں۔ جب مکئی گل جائے اور سوپ گاڑھا ہوجائے تو حسبِ ذائقہ نمک، مرچ شامل کرلیں۔ سوپ ڈش میں نکالیں اور دھنیے سے سجائیں۔

مائدہ جاوید...... کراچی

آلو میتھی

اشیا: آلو، آدھا کلو۔ ہری میتھی، ایک چھٹانک۔ گھی، حسبِ ضرورت۔ پیاز، تین عدد۔ دہی، آدھا پاؤ۔ گرم مسالا، تین ماشہ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سرخ مرچ، حسبِ ذائقہ۔

ترکیب: آلوؤں کے پتلے قتلے کرلیں اور میتھی لے کر اس کی پتیاں توڑ لیں۔ پھر آلو اور میتھی دونوں کو ملا کر گھی میں تل لیں۔ تمام مسالا پیس کر گھی میں پیاز سرخ کر کے نکالیں اور مسالا ڈال کر خوب بھون لیں جب مسالا بھن جائے تو پھر تلے ہوئے آلو میتھی ڈالیں اور آدھا پاؤ دہی، گرم مسالا اور بھنی ہوئی پیاز ڈال کر خوب بھونیں۔ اول تو آلو اسی دہی میں گل جائیں گے اور اگر نہ گلیں تو ذرا سا چھینٹا پانی کا دے دیں جب آلو گل جائیں تو اتار لیں۔

میمونہ رشید...... راول پنڈی

قیمہ اور مٹر پلاؤ

اشیا: مٹر، آدھا کلو۔ قیمہ، ایک پاؤ۔ چاول، آدھا کلو۔ گھی حسبِ ضرورت۔ زیرہ بھنا ہوا، ایک چائے کا چمچ لہسن، ایک گٹھی۔ ادرک، ایک گرہ۔ گرم مسالا، حسبِ ضرورت۔ پیاز، دو عدد۔ لونگ و زیرہ، تھوڑا سا۔ دہی، ایک چھٹانک۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ کیوڑہ یا عرقِ گلاب، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: لہسن، ادرک، گرم مسالے اور پیاز کو پیس کر گھی میں لونگ اور زیرے کا بگھار دے کر اسی میں بھونیں پھر مٹر کے دانے اور قیمہ ڈال کر بھونیں۔ چھٹانک بھر دہی کا چھینٹا دیں پھر پانی ڈال کر پکائیں کہ قیمہ اور دانے گل جائیں۔ اس کے بعد چاول جو ایک گھنٹا پہلے سے بھگو لیے تھے ڈال کر نمک

اور تھوڑا پانی ڈال کر پکائیں اور جب چاول گلنے کے قریب ہوں تو دم پر لگا دیں۔ تیار ہو جائیں تو کیوڑہ یا عرقِ گلاب کا عرق چھڑک کر اتار لیں۔

صائمہ امین......لاہور

چکن کریم سوپ

اشیا: مرغی، آدھا کلو۔ پیاز، ایک عدد۔ میدہ، ایک چائے کا چمچ۔ کالی مرچ، ایک چائے کا چمچ۔ پانی، حسبِ ضرورت۔ مکھن، آدھی چھٹانک۔ نمک، ایک چائے کا چمچ۔ دودھ، آدھا پاؤ۔

ترکیب: مکھن اور میدے کو پھینٹ لیں۔ دو تین منٹ پکائیں۔ وہ ہلکا کریم رنگ کا ہو جائے گا لیکن اس کو براؤن نہ ہونے دیں۔ اس میں دودھ ڈال دیں۔ پریشر ککر میں تھوڑے سے مکھن میں پیاز براؤن کریں۔ مرغی صاف کر کے اس مکھن میں تل لیں۔ جب براؤن ہو جائے تو پانی اور نمک ڈال کر ابلنے کے لیے رکھ دیں۔ جب ابل جائے تو پریشر ککر بند کر دیجیے۔ بھاپ خارج کر دیں۔ مکھن اور میدے کے آمیزے کو ابلی ہوئی مرغی اور اس کے سوپ میں ڈال دیں۔ دو تین منٹ پکنے کے بعد کالی مرچ ڈال کر اتار لیں۔ پسند خاطر ہو تو سوپ میں دو تین ٹماٹر کاٹ کر ڈال لیں۔

ہما انصار......کراچی

گاجر کا حلوہ

اشیا: گاجر، دو کلو۔ دودھ، ایک کلو۔ چینی، ڈیڑھ پاؤ۔ گھی، حسبِ ضرورت۔ الائچی، لونگ، ایک سے دو عدد۔ کھویا، ایک پاؤ۔ پستہ بادام، گارنش کے لیے۔

ترکیب: گاجروں کو دھو کر چھیل لیں اور کدوکش کر لیں۔ کدوکش کی ہوئی گاجر میں دودھ ڈال کر ابال لیں پھر گھی گرم کر کے اس میں الائچی اور لونگ ڈالیں پھر ابلی ہوئی گاجر ڈال دیں اور اچھی طرح بھونیں۔ اس کے بعد اس میں کھویا اور چینی شامل کر لیں۔ چینی کے حل ہونے تک پکائیں۔ حلوہ گھی چھوڑنے لگے تو چولھا بند کر دیں اور پستے، بادام سے گارنش کریں۔

حنا عزیز......کراچی

دھواں دہی گوشت

اشیا: گوشت، ایک کلو۔ پیاز، درمیانے سائز کی، تین عدد۔ دہی، ڈیڑھ کپ۔ ادرک، لہسن پیسٹ، ایک، ایک کھانے کا چمچ۔ چھوٹی الائچی، چار عدد۔ ہری مرچ، ہرا دھنیا، پودینہ، سجاوٹ کے لیے۔ سرخ مرچ، حسبِ ذائقہ۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ پسا دھنیا، ایک چائے کا چمچ۔ تیل، آدھا کپ۔ کوئلہ، ایک درمیانے سائز کا۔

ترکیب: ایک پیاز باریک پیس لیں اور لہسن، ادرک، نمک، مرچ اور دھنیا کے ساتھ گوشت میں ملا دیں۔ دیگچی میں چار پانچ پیالی پانی ڈالیں، یہ مسالا ملا گوشت اتنا پکائیں کہ گل جائے، مرغی میں پانی کی مقدار کم رکھیں۔ گوشت گلنے پر اوپر سے تیل ڈال کر بقیہ پیاز کے گول گول لچھے کاٹ لیں۔ ایک سرونگ ڈش میں پہلے گوشت پھر دہی اور پھر ہرا دھنیا، ہری مرچیں کاٹ کر ڈالیں اسی طرح تہ لگاتی جائیں۔ کوئلے کو آگ پر خوب دہکا لیں۔ اب اس ڈش میں روٹی کے ٹکڑے یا پیاز کے اوپر سرخ کیا ہوا کوئلہ رکھ لیں اور اس پر ایک قطرہ تیل ڈال کر ڈش کا ڈھکن بند کر دیں کچھ دیر بعد روٹی اور کوئلہ نکال لیں۔

نرگسی کوفتے

اشیا: انڈے، تیرہ عدد۔ گھی، حسبِ ضرورت۔ قیمہ، تین پاؤ۔ ادرک، آدھی چھٹانک۔ پیاز، ایک پاؤ۔ لہسن، ایک پوتھی۔ ہری مرچ، چار عدد۔ ہری پیاز، دو عدد۔ سرخ مرچ، تین چھوٹے چمچ۔ ہلدی، ایک چھوٹا چمچ۔ دھنیا پسا ہوا، تین چھوٹے چمچ۔ ہرا دھنیا، آدھا چھوٹا چمچ۔ گرم مسالا، ایک چھوٹا چمچ۔ ٹماٹر، آدھا کلو۔ دہی، آدھا پاؤ۔ بھنے ہوئے چنے کا آٹا، چار کھانے کے چمچ۔

ترکیب: سب سے پہلے دس انڈے سخت ابال کر رکھ لیں لہسن اور ادرک کتر کر قیمے میں ملائیں اور تھوڑا پانی ڈال کر پیس لیں پھر پیاز، ہلدی، ایک انڈا، دہی، گرم مسالا اور چنے کا آٹا ان سب کو آپس میں ملا کر پسے ہوئے قیمے میں ملا کر انڈے پر چڑھائیں۔ پھر ہری مرچ اور پیاز کاٹ کر اور مناسب مقدار ہلدی میں تھوڑا سا پانی ملا کر ہری مرچ اور کٹی ہوئی پیاز میں ملا کر پکنے کے لیے رکھ دیں۔ پانی خشک ہونے پر اتار لیں اور سل پر باریک پیس لیں اب اس میں انڈا، دہی، گرم مسالا اور چنے کا آٹا ملا لیں۔ سخت ابلے ہوئے انڈوں کے چھلکے اتار لیں پھر اس قیمے کے آمیزے کو انڈے پر لپیٹ کر کوفتے کی شکل بنا لیں اب ایک فرائی پان میں گھی ڈال کر گرم کریں اور دو انڈے پھینٹ کر اس میں یہ کوفتے انڈے میں بھگو کر تل لیں سرخ ہونے پر نکال لیں۔ اس کے بعد کوفتے کے دو ٹکڑے کر کے شوربہ میں ڈال دیں نرگسی کوفتے تیار ہیں۔

عشا خاور......لاہور

فش بریانی

اشیا: زیتون کا تیل، دو کھانے کے چمچ۔ چاول، سوا کپ۔ ہلدی، ایک چائے کا چمچ۔ سرخ شملہ مرچ، ایک عدد ٹکڑے کی ہوئی۔ کارجیٹ، دو عدد درمیانی کٹی ہوئی۔ بٹن مشروم، دو کپ۔ چکن اسٹاک، ڈیڑھ کپ۔ سنگترے کا رس، دو تہائی (پونا کپ)۔ سفید مچھلی، تین سو پچاس گرام قتلے۔ جھینگے، بارہ عدد۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ سیاہ مرچ، حسبِ ذائقہ۔ پیاز، ایک عدد چھوٹی کتری ہوئی۔

ترکیب: تیل کو گرم کر کے اس میں ہلدی اور چاولوں کو ایک منٹ تک ہلکی آنچ پر بھونیں۔ اب اس میں شملہ مرچ، پیاز، کارجیٹ اور مشروم ڈالیں پھر سنگترے کا رس اور چکن اسٹاک ڈال کر ابالیں۔ آنچ ہلکی کر کے مچھلی کو شامل کریں اور ڈھکن ڈھانکنے سے پہلے نمک اور سیاہ مرچ حسبِ ذائقہ شامل کر دیں۔ جب چاول پک جائیں اور پانی خشک ہو جائے تو سنگترے کے چھلکے ڈال کر ڈھکن بند کر دیں۔ پندرہ منٹ ہلکی آنچ پر رہنے دیں پھر گرم گرم پیش کریں۔

سدرہ......بہاول پور

گاجر کا سوپ

اشیا: گاجریں، آدھا کلو۔ پیاز، دو عدد۔ لہسن، ایک گٹھی۔ ڈبل روٹی کے پیس۔ آلو، ایک عدد۔ انڈا، ایک عدد۔ مکھن، آدھا پاؤ۔ چاول پسے ہوئے، ایک کھانے کا چمچ۔ کالی مرچ، حسبِ ضرورت۔ نمک، حسبِ ذائقہ۔ دودھ، تین پاؤ۔ پانی، حسبِ ضرورت۔

ترکیب: پہلے لہسن چھیل کر باریک کاٹ لیں، انڈا ابال لیں اور آلو بھی باریک کاٹ لیں۔ گاجریں دھو کر چھیل کر باریک کاٹ لیں۔ ڈبل روٹی کے خشک چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تل لیں۔ جب یہ تمام اشیا تیار ہو جائیں تو اب پہلے مکھن کسی برتن میں گرم کریں اس میں کٹی ہوئی پیاز، گاجریں، لہسن، نمک، کالی مرچیں ڈال کر پکائیں۔ تھوڑی دیر کے بعد چمچ ہلاتی رہیں۔ دس منٹ پکانے کے بعد اس میں آلو ڈال دیں اور کچھ دیر کے بعد پسے ہوئے چاول ملا کر چمچ سے برابر چلاتی رہیں حتیٰ کہ سب کچھ مل جائے پھر اس میں دودھ ملاتی جائیں یہاں تک کہ چلاتے چلاتے اس میں جوش آ جائے اب چولھے کی آنچ مدھم کر کے اسے مزید بیس منٹ پکنے دیں لیکن چمچ برابر چلاتی رہیں۔ اس کے بعد اس آمیزے کو چولھے سے اتار لیں اور کسی چھلنی سے چھان کر سبزیوں کا پھوک نکال لیں۔ پھر انڈے کی زردی اچھی طرح پھینٹ کر کریم میں شامل کر دیں۔ سوپ کو دوبارہ آگ پر رکھیں کریم اور انڈا اس میں ڈال دیں۔ ہلکی آنچ پر رکھیں اور چمچ چلاتی رہیں حتیٰ کہ ابلے بغیر سوپ گاڑھا ہو جائے۔ اب اس سوپ کو بڑے برتن یا الگ الگ پیالوں میں ڈال کر ڈبل روٹی کے تلے ہوئے ٹکڑے ڈال کر پیش کریں۔ پودینے کے پتے باریک کاٹ کر گارنش کریں۔

حمیرا ناز......ملتان

سندیسے

پاکیزہ

بہنیں



گمان

ڈرے گا جو شخص اللہ سے
تو پیدا کرے گا وہ، اس کے لیے
نکلنے کی کوئی راہ
اور رزق دے گا اسے
ایسے طریقے سے جدھر
اس کا گمان بھی نہ جاتا ہو

شاعرہ......سعدیہ سلیم، سڈنی

چل تو سہی

قربِ الٰہی میں
کیسا نشہ ہے
اور کیسا مزہ بھی
ذرا اس راہ پر
چل کے تو دیکھو......!

شاعرہ......رفاقت جاوید، اسلام آباد

اپنی دوست حمیرا پروین بھکر کے نام

اے دوست
نیا سال ہے
کیا تحفہ دوں
دل دوں یا دل کا دھڑکنا دوں
سخت سردی ہو
اور میں محبت کی سمو دوں گرمی
ہو جو خواہش تیری
روح کی وہ تمنا دوں
نیا سال ہے
کیا تحفہ دوں؟

از: جبیں ہاشمی، بھیرہ

میرا کیا ہوگا؟

قریب المرگ عورت نے یہ کہا اپنے شوہر سے
اگر میں اٹھ گئی دنیا سے تو پھر تیرا کیا ہوگا؟
کہا شوہر نے گھبرا کر یہی تو سوچتا ہوں میں
اگر اس بار بھی تم بچ گئیں تو میرا کیا ہوگا؟

شاعرہ......جمیلہ بلوچ، لوہی بلوچستان

مقدر کی بات

ہمیشہ اک یہی تصویر رہ جاتی ہے آنکھوں میں
یہ پہلا ہجر ہے اور ایسا منظر کب بدلتا ہے
کسی کو سالِ نو کی مبارک باد کیا دی جائے
کیلنڈر کے بدلنے سے مقدر کب بدلتا ہے

عنبر وسیم، گوجرانوالہ

اپنی اوقات

کاش آزاد قبیلے کے سخن ور ہوتے
ہم محاذوں پہ نہ بکتے تو سکندر ہوتے
خود فریبی کے خرابوں میں رہے ہم ورنہ
اپنی اوقات میں رہتے تو قلندر ہوتے

شاعرہ......نوشین اقبال نوشی، گاؤں بدر مرجان

سنہری باتیں

ایک باپ کی ڈائری میں لکھی جانے والی خوب صورت

سطریں ہیں۔

میرا بیٹا اس وقت تک میرا بیٹا ہے جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی۔ بیوی کے آنے کے بعد وہ بیٹا نہیں رہے گا مگر میری بیٹی میری بیٹی ہی رہے گی اس وقت تک جب تک مجھے موت نہیں آئے گی یا میں جب تک زندہ رہوں گا۔

مرسلہ: فریدہ خانم مختلف، لاہور

آپا کے نام

پیاری آپا......
پہلی تاریخ کو گھر آ جانا
میری ساس اپنی بیٹی
کے گھر جا رہی ہیں
تم بھی دو ہفتے رہ جانا

فقط تمہاری بہن، س۔ش۔ پنجاب

شبینہ کے نام

خلوصِ دل ہی نہیں ربطِ باہمی کے لیے
وفا بھی شرط ہے اے دوست دوستی کے لیے

مرسلہ: ناہید صدیقی، کورنگی کراچی

ضیا عباس کے نام

جنم دن بہت بہت مبارک ہو
رب رہے تم پر ہمیشہ مہرباں
سدا پھولوں سے مہکے تمہارا گلستاں
چھوئے نہ کوئی مشکل تمہاری زیست کو
ہر قدم پر پاؤ تم منزلوں کے نشاں
یوں پاؤ تم زندگی کا ہر مقصد
فخر سے چھوے کامیابی کا آسماں
پاؤ گے نہ تنہا خود کو اس جہاں میں
تمہارے ہم قدم ہے ہمیشہ درخشاں

شاعرہ......درخشاں ضیا، حیدر آباد

گاہک: ”تمہاری دکان تو مٹھائی کی ہے۔ تمہارا دل کھانے کو نہیں کرتا؟“

شیخ: ”بہت کرتا ہے مگر ابا رس گلے گن کے جاتا ہے اس لیے چوس کے رکھ دیتا ہوں۔“

محسوسات

مسجد میں جوتے اتارتے وقت اور کسی کو مسڈ کال کرتے وقت کیا محسوس ہوتا ہے؟

کدرے چکی نہ جاوے۔

شک

ڈاکٹر: ”کیا آپ ڈلیوری کے وقت بچے کے باپ کو اپنے پاس دیکھنا چاہتی ہیں؟“

عورت: ”نہیں، ان پر پہلے ہی میرے شوہر بہت شک کرتے ہیں۔“

ساڑی

بیوی نے سائن بورڈ دیکھا۔

نائیلون ساڑی......35 روپے
کاٹن ساڑی......30 روپے
بنارسی ساڑی......10 روپے

بیوی: ”مجھے 500 روپے دینا میں 50 ساڑیاں لے لوں۔“

شوہر: ”اندھی یہ دھوبی کی دکان ہے۔“

مصباح رضا سعید، فیصل آباد

کیا کریں......؟

آنکھیں اداس ہوں تو نظاروں کا کیا کریں
دل ہی اداس ہو تو بہاروں کا کیا کریں

از: رفعت مبین رفی، کراچی

☆☆☆

میں اکثر گنگناتی ہوں

صغریٰ زیدی

☆نازیہ رحمٰن......بھاول نگر
ڈس گیا اسے بھی شاید ہجر کا ناگ
لہجہ تھکا ہوا، چہرہ بھی زرد تھا
جمی تھی جذبوں پہ کچھ برف اور
کچھ اس کے شہر کا موسم بھی سرد تھا
☆ثنا شفیق......چکوال
لبِ خاموش سے اظہارِ تمنا چاہیں
بات کرنے کو بھی تصویر کا لہجہ چاہیں
تو چلے ساتھ تو آہٹ بھی نہ آئے اپنی
درمیاں ہم بھی نہ ہوں یوں تجھے تنہا چاہیں
☆سنبل رضا......کوئٹہ
کیسا اس نفرت کے سناٹے میں گھبراتا ہے دل
اے محبت کیا ترے ہنگامہ آرا سو گئے
☆عائشہ فردوس......سرگودھا
راہ تاریک سہی پھر بھی ملے گی منزل
صرف ایک عزم کی قندیل جلادی جائے
☆زاہدہ جبار......فیصل آباد
جو فصل خواب کی تیار ہے تو یہ جانو
کہ وقت آگیا پھر درد کوئی بونے کا
☆سائرہ رانی......میاں چنوں
وہ آئینہ ہی نہیں عکس بھی ہوں لیکن تو
وہ روشنی ہے جو دامن کشا گزر جائے
ہے ایک خواب مری خود فریب آنکھوں میں
اگر یہ خواب مری روح میں اتر جائے
☆ثمرینہ نعیم......کراچی
ترا ہونا ضروری تھا نہ ہونا بھی ضروری تھا
کسی بھی یاد کا ہستی میں ہونا بھی ضروری تھا
کہاں تک سوچتے رہتے اسے شامِ غریباں میں
تھکن اتنی سفر کی تھی کہ سونا بھی ضروری تھا



☆فارحہ ارشد......سیالکوٹ
ہزاروں اشک قرباں اس کے افسردہ تبسم پر
چھپائی مسکرا کے جس نے شدت دردِ پنہاں کی
☆صائمہ امین......لاہور
سمندروں سے بہت دیر گفتگو مت کر
یہ لکھ نہ جائیں تری زندگی میں پیاس بہت
☆ارم خان......پشاور
خنک خنک سی مسکراہٹ کے ساتھ سالِ نو کہنے والے
مان لے کہ مجھ سے زیادہ خود کو جانتا تو بھی نہیں
☆سویرا علی......کراچی
مجھے کیوں عزیز تر ہے یہ دھواں دھواں سا موسم
یہ ہوائے شامِ ہجراں مجھے راس ہے تو کیوں ہے
تجھے کھو کے سوچتا ہوں مرے دامنِ طلب میں
کوئی خواب ہے تو کیوں ہے کوئی آس ہے تو کیوں ہے

☆نسیم چوہدری......جہلم
وہ جس کے نام سے مہکتے ہیں زندگی کے گلاب
وہ سردیوں کی دھوپ میں یاد آئے گا
☆میمونہ عزیز......اسلام آباد
کس تذبذب میں ہے نئے سال کی دہلیز پر
جو کھویا ہے اس کا غم نہ کر جو پایا ہے اس کا عہد کر
نہیں کچھ حاصل محرومیوں کے شمار سے
گزرے غموں کو بھول کر نئی خوشیاں تلاش کر
☆کوثر ریاض......شیخوپورہ
ہر سال تیری یاد کی چاہت کے نام تھا
ہر سال تیری دید کی چاہت ہمیں رہی
☆صدف......لیہ
گھر سے چلا تو دل کے سوا پاس کچھ نہ تھا
کیا مجھ سے کھوگیا ہے مجھے کیا ملال ہے
☆طلعت آفریدی......لاہور
نہ جانے کٹ گیا کس بے خودی کے عالم میں
وہ ایک لمحہ گزرتے جسے زمانے لگے
وہ ذوق شوقِ محبت کی واردات نہ پوچھ
جو آج خود بھی سنوں تو اِک فسانہ لگے
☆اریبہ گل......پشاور
کیا کریں اب تجھ سے ہم ترکِ تعلق کا گلہ
زہر جب پینا ہی ٹھہرا ذائقہ جیسا بھی ہو
اپنا قسمت کی لکیروں پر نہیں جب اختیار
فیصلہ تقدیر کا اچھا برا جیسا بھی ہو
☆راحیلہ مشتاق......جلالپور
بس اک خوابِ مسلسل کی زد پہ ہیں آنکھیں
خوشا وہ لوگ کہاں اور وہ ماہ وسال کہاں
☆شاہین شگفتہ......راول پنڈی
یہ رکھ رکھاؤ محبت سکھا گئی اس کو
وہ روٹھ کر بھی مجھے مسکرا کے ملتا ہے

کچھ اس قدر بھی تو آساں نہیں ہے عشق ترا
یہ زہر دل میں اتر کر ہی راس آتا ہے
☆سونیا سرور......کراچی
نہ کوئی رنج کا لمحہ کسی کے پاس آئے
خدا کرے کہ نیا سال سب کو راس آئے
☆ثریا ماجد......ڈیرہ غازی خان
تمہارے رنج سے اٹھتے رہے سوال بہت
گئے دنوں کا بھی آتا رہا خیال بہت
ذرا سی بات پہ وہ ہوگیا خفا ہم سے
ذرا سی بات کا دل کو ہوا ملال بہت
☆حنا عزیز......کراچی
اس برس کا بھی نام ہم نے تو
تیری یادوں کا سال رکھا ہے
☆انعم سعید......منڈی بہاؤالدین
میں اپنا دل ہی نہیں جاں بھی وار سکتا تھا
مگر یہ سوچ کہ تو نے مجھے پکارا کب
☆فائزہ کریم......اوکاڑہ
اب تک ہے کوئی بات مجھے یاد حرف حرف
اب تک میں چن رہا ہوں کسی گفتگو کے پھول
کلیاں چٹک رہی تھیں کہ آواز تھی کوئی
اب تک سماعتوں میں ہیں اِک خوش گلو کے پھول
☆سائرہ ضیا......ملتان
آگہی سے ملی ہے تنہائی
آ مری جان مجھ کو دھوکا دے
☆میمونہ عزیز......کراچی
ہے در بھی وہی اور گداگر بھی وہی ہیں
اس شہرِ غریباں کے مقدر بھی وہی ہیں
اب بچ کے کہاں جاؤ گے اس شہرِ غضب میں
اندر بھی وہی لوگ ہیں باہر بھی وہی ہیں

روحانی مشورے



ادارہ

”نئے سال کی ابتدا کیسے کریں؟“

نیا عیسوی سال اب شروع ہونے والا ہے......

آپ نئے سال کے پہلے دن پہلے دو نفل شکرانے کے ادا کیجیے کہ اللہ تعالیٰ نے 2011ء خیرو عافیت سے یہ سال گزروایا...... پھر دو نفل حاجت کے پڑھیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے رحم و کرم کے طفیل عزت و آبرو جان و مال کی حفاظت، ایمان کی سلامتی کے ساتھ نیا سال اچھا گزرے...... سال کے پہلے دن اپنا اور اپنے بچوں کا صدقہ بھی دیں۔ اس پہلے دن آپ نے اپنے آپ سے یہ وعدے کرنے ہوں گے۔

1- ہمارا کوئی دن بغیر نماز پڑھے نہیں گزرے گا۔

2- ہم بے شک ایک صفحہ قرآن کا پڑھیں مگر اس کے ترجمے کے ساتھ روزانہ پڑھیں گے۔

3- ہم روزانہ درود شریف کی ایک تسبیح پڑھیں گے۔

4- ہم روزانہ استغفار کی دو تسبیح (کم سے کم) پڑھیں گے۔

5- ہم اپنی کمائی میں سے ہر ماہ کچھ رقم اللہ کے نام پر ضرور کسی کو دیں گے چاہے وہ بے حد قلیل ہی کیوں نہ ہو۔

6- ہم روزانہ دو نفل شکرانے کے ضرور پڑھیں گے۔

7- ہم اپنی زبان سے کسی کو تکلیف نہیں پہنچائیں گے۔

8- ہم کسی کی بھی چغلی کسی سے نہیں کریں گے...... کہ یہ عادت ہم خواتین میں زیادہ ہوتی ہے کہ ایک کی بات دوسرے سے کہہ دی جاتی ہے بلکہ بعض خواتین تو اپنی بات دوسرے کے کندھے پر رکھ کر کہا کرتی ہیں۔

9- اپنا ہر کام بسم اللہ پڑھ کر کریں گے اور شرک اور بدعت سے بچیں گے۔

10- اور آخری بات یہ کہ تکبر سے ہم بچنے کی کوشش کریں گے...... کہ جانے، انجانے میں ہم سب تکبر کی باتیں کرلیا کرتے ہیں...... جو ناپسندیدہ عمل ہے۔

محفل میں بیٹھنے کے آداب

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ”جب تین آدمی ایک جگہ جمع ہوں تو دو آپس میں کان میں بات نہ کریں اس سے تیسرے کو تکلیف ہوگی۔“

(صحیح بخاری)

اس حدیثِ مبارکہ سے یہ پتا چلا کہ محفل میں جب دس لوگ بیٹھے ہوں تو چند لوگوں کو کان میں ہرگز بات نہیں کرنی چاہیے۔ یہ انتہائی بدتہذیبی ہے کیونکہ اس سے کسی اور کو یہ غلط فہمی ہوسکتی ہے کہ اس کے بارے میں بات ہورہی ہے۔

زور زور سے بات کرنا

قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے! ”اپنی آواز نیچی رکھو، بے شک تمام آوازوں میں سب سے بری آواز گدھے کی ہے۔“ (سورۂ لقمان: 19)

اس آیت مبارکہ سے یہ پتا چلا کہ گفتگو کرتے وقت اپنی آواز دھیمی رکھنی چاہیے اور اس بات کا بھی

خیال رکھیں کہ ہماری آواز سے کوئی دوسرا شخص پریشان نہ ہو۔ اونچی آواز میں قہقہے لگانا بھی تہذیب کے خلاف ہے۔ آپ ﷺ کبھی زور سے نہیں ہنسے بلکہ صرف مسکرا دیا کرتے تھے، اسی طرح عورتوں کے لیے بھی یہ حکم ہے کہ اتنی اونچی آواز میں بات نہ کریں کہ کوئی غیر شخص ان کی آواز سنے۔

اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا! ”غیب کی پانچ کنجیاں ہیں، جنہیں اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

☆ رحم مادر میں کیا ہے؟

☆ کل کیا ہوگا؟

☆ بارش کب آئے گی؟

☆ کون کس جگہ مرے گا؟

☆ قیامت کب قائم ہوگی؟“

بخل، کنجوسی کرنا

حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا! ”دو خصلتیں کسی مومن (کامل) میں جمع نہیں ہوسکتیں ایک بخل دوسری بد خلقی۔“ (ترمذی)

جہیز کی وجہ سے شادی میں تاخیر

☆ امیر طبقہ منہ مانگا جہیز دیا کرتا ہے۔ مڈل کلاس بھی اِدھر اُدھر سے ارینج کرکے اپنی لڑکیوں کی شادیاں اپنی اوقات سے بڑھ کر کرتا نظر آرہا ہے۔ مگر اس وقت سب سے زیادہ پریشان طبقہ لوئر مڈل کلاس اور غریب طبقہ ہے۔ جن کی بچیاں ہر لحاظ سے اچھی ہیں مگر جہیز نہ ہونے کی وجہ سے وہ اپنے گھر میں بیٹھی بوڑھی ہورہی ہیں۔ ایسی تمام لڑکیاں از، کے والدین بطور روحانی علاج رات سونے سے پہلے 101 مرتبہ سورۂ فاشیہ کی آیت نمبر (88) اول و آخر درود ابراہیمیؑ گیارہ، گیارہ مرتبہ پڑھ کر یہ دعا کریں کہ ان کی شادیاں بروقت ہوں اور جہاں ہوں، وہ خوشی کے ساتھ اپنی زندگی بسر کریں، آمین۔

مغرب کی نماز کے بعد 313 مرتبہ یا لطیفُ پڑھنا بھی ایک آزمودہ وظیفہ ہے۔ لڑکیاں خود پڑھیں اور اس وقت تک پڑھیں، جب تک ان کی شادی نہ ہوجائے۔

کھانسی

سردیوں میں اکثر کھانسی اور گلا خراب ہوجاتا ہے۔ لونگ اور شہد سے علاج کیجیے۔ اگر پانچ عدد لونگ ہوں تو ایک ٹی اسپون شہد لے لیں اسی مقدار کو جتنا دل چاہے بڑھالیں۔ طریقہ یہ ہے کہ جتنے لونگ لینے ہیں ان کو توے پر رکھ کر کسی اسٹیل کی چھوٹی پلیٹ یا گہری پیالی سے ڈھک دیں اور آگ جلا دیں۔ درمیانی آنچ ہو جب لونگ اچھی طرح جل جائیں تو چولہا بند کردیں اور چمٹے کی مدد سے پلیٹ یا پیالی اٹھالیں کسی چمچ کے پچھلے حصے سے گرم گرم لونگ پیس لیں اور پانچ لونگ اور ایک ٹی اسپون شہد کے تناسب سے مکس کرکے محفوظ کرلیں انگلی کی مدد سے دو دفعہ ایک وقت میں کھائیں آزمودہ ہے۔

دو ٹیبل اسپون اچھے قسم کے میوے لے کر اس میں ایک پیالی پانی اور ایک ٹیبل اسپون چینی ڈال کر اچھی طرح پکائیں جب آدھا پانی رہ جائے تو ٹھنڈا کر کے صرف شیرہ کھائیں۔

اس کے ساتھ ساتھ روزانہ سورۂ فاتحہ کم از کم تین مرتبہ پانی پر دم کرکے پینے کی عادت ضرور ڈالیں۔ ہر بیماری رفو چکر ہوجائے گی۔ انشاء اللہ ☆☆☆

اس بات کی ضرورت کافی عرصہ سے محسوس کرائی جا رہی تھی کہ کسی مستند ادارے کے تحت ماہر تجربہ کار ہومیو پیتھک ڈاکٹروں کا بورڈ ہو جو لوگوں کی صحت کے مسائل کو اپنی ماہرانہ رائے اور تجربے کی روشنی میں نہ صرف حل کرے بلکہ ان کی رہنمائی بھی کرے۔ لہٰذا اس سلسلے کے تحت ہماری کوشش ہوگی کہ ہم آپ کو مختلف امراض کے متعلق آگاہی بھی فراہم کریں اور آپ کے جو صحت کے مسائل ہوں اس کو بورڈ کے ماہر و تجربہ کار ڈاکٹرز کے ذریعے حل کرائیں تاکہ آپ کا معیارِ صحت بلند ہو لہٰذا آپ کے جو بھی صحت کے مسائل ہیں انہیں ہمیں اس پتے پر لکھ بھیجیں' پوسٹ بکس نمبر 733 کراچی۔ ہم ماہنامہ پاکیزہ کے ذریعے آپ کی بیماری کے متعلق آپ کی رہنمائی کریں گے لیکن اس کے لیے اپنا مکمل نام، عمر، پتا اور جو کام کرتے ہیں اس کے متعلق' ازدواجی حیثیت، بیماری کے متعلق، کب سے ہوئی، کیا علاج کیا؟ کسی قسم کی کوئی رپورٹس ہوں تو اس کی فوٹو کاپی جو پڑھنے کے قابل ہوں ساتھ بھیجیں تاکہ صحیح تشخیص کی جاسکے اور دوا بھی صحیح تجویز ہو۔

ہائی بلڈ پریشر
بلند فشارِ خون
HIGH BLOOD PRESSURE HYPERTENSION

ہمارے معاشرے کے اقدار جس تیزی سے بدلے ہیں اس نے ہمارے رہن سہن، کھانے پینے کی اشیاء وغیرہ پر گہرا اثر ڈالا ہے جس سے ہمارے جسم پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ کچھ بیماریوں نے ہمارے یہاں رواج پا لیا ہے۔ ان میں ہائی بلڈ پریشر بھی ایک ایسی ہی بیماری ہے جس میں ہر خاندان کا کوئی نہ کوئی فرد مبتلا نظر آتا ہے۔

تقریباً ہر 4 بالغ افراد میں سے ایک اور پاکستان کی کل آبادی میں سے ایک کروڑ افراد (10 ملین) اس مرض میں مبتلا ہیں۔ ان میں سے 30 فیصد ایسے افراد ہیں جن کو اس مرض کے ہونے کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ کچھ لوگوں میں اس کے بڑھنے کی کوئی علامت نہیں ہوتی۔

بلڈ پریشر کیا ہوتا ہے؟

آپ نے پانی کی نلی (پائپ) ضرور دیکھی ہوگی۔ جب پانی اس نلی سے گزرتا ہے تو وہ نلی کی دیواروں پر ایک پریشر/دباؤ ڈالتا ہے۔ یہ نلی پر پانی کا پریشر ہوتا ہے بالکل اسی طرح ہمارے دل سے کچھ نالیاں نکلتی ہیں

ٹوکن

برائے شوابے ہومیو کلینک

فروری 2012

اپنا مسئلہ اس ٹوکن کے ساتھ روانہ کریں۔ ٹوکن کے بغیر آئے ہوئے مسئلوں پر توجہ نہیں دی جائے گی' اپنا مسئلہ جس مہینے بھیجیں اسی مہینے کا ٹوکن استعمال کریں۔

نام: ....

پتا: ....

جنہیں ہم شریانیں اور وریدیں کہتے ہیں۔ دل شریانوں کے ذریعے خون کو پورے جسم میں پھیلاتا ہے جو واپس دل کو ان وریدوں کے ذریعے جاتا ہے۔ اس طرح خون مستقل ایک دباؤ یا پریشر ان نالیوں پر ڈالے رکھتا ہے جسے فشارِ خون یا بلڈ پریشر کہتے ہیں۔

بلڈ پریشر کو ناپنے کا طریقہ

اس کو ناپنے کے لیے ایک آلہ ہوتا ہے جسے Sphygno Monometer کہتے ہیں جہاں تک نارمل بلڈ پریشر کا تعلق ہے تقریباً ہر فرد میں مختلف ہوتا ہے اور رنگ و نسل سے بھی اس میں فرق پڑتا ہے۔ پھر بھی ایک بالغ کا اوسط بلڈ پریشر اوپر کا 120mmHg=10 اور نیچے کا 80mmHg=10 ہے۔

اوپر کا اور نیچے کا بلڈ پریشر کیا ہے؟

دل کی دو کیفیات نارمل ہوتی ہیں ایک یہ سکڑتا ہے جسے Systole کہتے ہیں۔ جب یہ سکڑتا ہے اس وقت سارا خون یہ پمپ کر رہا ہوتا ہے لہٰذا خون کی نالیوں میں اس وقت پریشر زیادہ ہوتا ہے یعنی اوسط نارمل 120 mm Hg اور جب یہ پھیلتا ہے جسے Diastole بھی کہتے ہیں اس وقت خون کی نالیوں میں خون کا دباؤ کم ہوتا ہے 80mmHg اوسط نارمل ہوتا ہے۔ پہلے والے کو چونکہ اوپر لکھتے ہیں اور دوسرے والے کو نیچے لکھتے ہیں اس لیے عام لوگ اسے اوپر اور نیچے کا بلڈ پریشر کہتے ہیں۔

یہ بڑھتا کیوں ہے؟

بلڈ پریشر کا بڑھنا عورتوں اور مردوں دونوں میں پایا جاتا ہے بالعموم 30 سال کے بعد اس کے بڑھنے کے چانس زیادہ ہوتے ہیں بلڈ پریشر کے بڑھنے کی کئی وجوہات و عوامل ہو سکتے ہیں۔

(1) فزیالوجیکل (فعلی): دوڑنے بھاگنے یا کوئی جسمانی مشقت یعنی ورزش وغیرہ سے، ہم بستری سے، کھانے کے بعد، ذہنی دباؤ سے، لیکن یہ وہ عوامل ہیں جن میں کچھ دیر بعد جب ان کا اثر ختم ہو جاتا ہے تو بلڈ پریشر اپنی نارمل حالت پر آجاتا ہے البتہ کچھ اسباب ایسے بھی ہوتے ہیں جو مستقلاً اس کے بڑھانے کے ذمے دار ہوتے ہیں۔ (۲) خاندانی رجحان: ایسے خاندان جن میں امراضِ قلب، فالج، ذیابیطس' بلند فشارِ خون یا گٹھیا کے امراض پائے جاتے ہیں تو ان خاندان کے افراد میں بلند فشارِ خون کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ (۳) نسلی و جغرافیائی عوامل: ساحلی علاقوں کے لوگوں میں بلڈ پریشر کا رجحان زیادہ پایا جاتا ہے۔ اس کی ممکنہ وجہ جسم سے پسینے کے ذریعے نمک کا ناکافی اخراج ہے مرطوب یا سرد ماحول کی وجہ سے۔ (۴) کسی ذہنی صدمہ یا دباؤ کی وجہ سے فکرات میں رہنا یا بے آرامی، غصہ، ڈپریشن، اعصابی تناؤ۔ (۵) کسی حادثہ کی وجہ سے مثلاً جلنے کی صورت میں، آپریشن کی وجہ سے۔ (٦) کسی نشہ کو ترک کرنے کے بعد خون میں گلوکوز کی کمی سے بھی یہ بڑھ سکتا ہے۔ (۷) حمل کے دوران بھی بلڈ پریشر بڑھ جاتا ہے۔ (۸) گردے کی بیماریوں کی وجہ سے مثلاً پتھری، سوزش، سکڑنے، چوٹ، رسولی وغیرہ (۹) شعاؤں کے اثر سے (۱۰) خون کی نالیوں میں سختی، رکاوٹ یا سکڑنے کی وجہ سے (۱۱) خون میں لوتھڑا بننے کے باعث (۱۲) نمکیات کی کمی ان میں پوٹاشیم، میگنیشیم شامل ہیں۔ جبکہ سوڈیم کی زیادتی اس کو بڑھا دیتی ہے (۱۳) کچھ ہارمونز کی کمی یا زیادتی کے باعث بھی ایسا ہو سکتا ہے (۱۴) اینڈوکرائن غدود کا صحیح طور پر کام نہ کرنا (۱۵) مانع حمل ادویات کا استعمال (۱٦) مٹاپے کی وجہ سے (۱۷) چائے، کافی، تمباکو، شراب وغیرہ کے استعمال سے۔ (۱۸) ادویات جیسے اسٹرائیڈز (Prednisone) درد ختم کرنے والی ادویات مثلاً

Cyclosporin NSADs وغیرہ (۱۹) عورتوں میں سن یاس میں۔

بلڈ پریشر بڑھنے کی علامات:

ضروری نہیں کہ کوئی علامت ہو۔ بعض اوقات جب آپ ڈاکٹر کے پاس کسی مرض کے علاج کے سلسلے میں جاتے ہیں اور جب ڈاکٹر بلڈ پریشر چیک کرتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ بڑھا ہوا ہے۔ لیکن اکثر اوقات اس کی علامات ہوتی ہیں جن میں: ۱۔ سر میں درد جو شدید بھی ہو سکتا ہے اور صرف بھاری پن بھی ہو سکتا ہے۔ بالعموم سر کے پیچھے کی جانب درد ہوتا ہے۔ ۲۔ اکثر آنکھوں میں جلن سی محسوس ہوتی ہے۔ ۳۔ نکسیر۔ ۴۔ چڑچڑا پن ۵۔ بے خوابی کی شکایت ہو جاتی ہے۔ ۶۔ بے چینی وگھبراہٹ ہو جاتی ہے۔ ۷۔ تھکان، کمزوری اور چکر آنے لگتے ہیں۔ ۸۔ سانس پھولنا شروع ہو جاتا ہے۔ ۹۔ دل کی دھڑکن اور نبض تیز ہو جاتی ہے۔ ۱۰۔ عضلاتی کمزوری، پیشاب کی زیادتی ۱۱۔ پسینے آتے ہیں اور متلی ہوتی ہے اور یہ سب علامات ضروری نہیں کہ ایک ساتھ ہوں، بلکہ ان میں سے کچھ علامات بھی ہو سکتی ہیں۔

ہائی بلڈ پریشر کی حتمی تشخیص

مریض کی مندرجہ بالا علامتوں کے مدنظر کہہ سکتے ہیں کہ اس کو یہ مسئلہ درپیش ہے۔

۲۔ مریض کا بلڈ پریشر مختلف حالتوں اور اوقات میں چیک کرتے ہیں اگر وہ نارمل سے بڑھا ہوا ہوگا تو وہ ہائی بلڈ پریشر کا مریض ہے۔

لیکن یہ معلوم کرنے کے لیے کہ یہ کس وجہ سے بڑھ رہا ہے اس کے لیے ہمیں لیبارٹری کے کچھ ٹیسٹ کرانے پڑتے ہیں جن میں۔

1. Lipidprofile 2. Blood CP & ESR 3. Urea 4. Uric Acid 5. Creatinine (Renal Function Test) 6. Urine Test 7. X-Ray Chest 8- ECG 9. FBS. RBS 10. Serum Electrotyes 11. Thyroid Function Test.

ان ٹیسٹ کے بعد ہم اس بات کی تشخیص کر سکتے ہیں کہ یہ مسئلہ آیا دل کی وجہ سے ہے یا خون کی۔ نالیوں یا گردے کی کسی خرابی کی وجہ سے یا اس کے علاوہ بھی کوئی اور وجہ ہے۔

بلڈ پریشر

جب بڑھ جائے تو پھر کیا کریں؟

۱۔ اپنے ہومیو پیتھک معالج سے رجوع کریں اور اس کی ہدایت پر عمل کریں۔ ۲۔ بلڈ پریشر باقاعدگی سے چیک کروائیں ۳۔ آپ کو جو ادویات استعمال کے لیے دی گئی ہیں ان کو باقاعدگی کے ساتھ استعمال کریں۔ ۴۔ ورزش کریں کم از کم آدھ گھنٹے سے ایک گھنٹے تک ۵۔ اپنے جذبات قابو میں رکھیں غصہ نہ کریں اور نہ ہی غم وفکر کریں۔ ۶۔ غذا ایسی استعمال کریں جس میں چکنائی کم سے کم ہو اور ریشہ والی غذائیں یعنی زیادہ تر سبزیاں، پھل اور دالوں کا استعمال کیا جائے، نمک کا استعمال کم کریں یا بند کر دیں۔ ۷۔ چائے، کافی، تمباکو نوشی اور دیگر نشہ آور ادویات کا استعمال نہ کریں، نیند کی گولیوں کا استعمال بند کر دیں۔ ۸۔ کسی بھی قسم کی بیماری کی علامت محسوس ہوں تو ہومیو پیتھک ڈاکٹر سے رجوع کریں۔ ۹۔ کام، آرام اور طعام میں توازن رکھیں۔ ۱۰۔ پوری نیند لیں اور ذہنی وجسمانی سکون لیں' اس کے لیے ایسے کام جو ذہنی یا جسمانی طور پر تھکا دیں نہ کریں۔ ۱۱۔ وزن کی زیادتی کو کنٹرول کریں۔

حفظِ ماتقدم (احتیاط)

بلڈ پریشر کے بڑھنے میں دو بڑے اسباب ہو سکتے ہیں۔

سوچ وتفکرات، غلط عادات واطوار۔ اس کے لیے اپنے جذبات کو قابو میں رکھیں، اپنے اوپر کسی کام یا چیز کو طاری نہ کریں۔ جو آپ کر سکتے ہیں مسئلے کے حل کے لیے کریں باقی اللہ پر چھوڑ دیں، شکر گزار اور قناعت پسند بنیں۔

کھانے پینے میں متوازن غذا استعمال کریں، ورزش کی عادت کو اپنائیں، سونے جاگنے کے اوقات مقرر کریں اور جتنی نیند آپ کو تازہ دم کرنے کے لیے ضروری ہے مثلاً ۶ سے ۸ گھنٹے، اس سے زیادہ آرام نہ کریں۔ اپنے جسم کے قد وقامت کے لحاظ سے اپنے وزن کا لحاظ رکھیں۔

اپنے فیملی ڈاکٹر سے اپنا چیک اپ کراتے رہیں۔ کوئی معمولی سی بھی تبدیلی کسی بھی عضو میں یا کسی عضو کے فعل میں محسوس کریں تو معالج سے فوراً رجوع کریں اور کسی بھی قسم کی کوئی دوا اپنے معالج کے مشورے کے بغیر استعمال نہ کریں۔

یاد رکھیں

معالج آپ کا رجسٹرڈ اور کوالیفائیڈ ہومیو پیتھ ہو۔

ہائی بلڈ پریشر کا علاج نہ کرائے جانے کے نقصانات۔

اس کے لیے میں پانی کے پائپ کی مثال ایک بار پھر دوں گا۔ ایک پائپ میں پانی آرہا ہے آپ اس پر پیر رکھ کر کھڑے ہو جائیں تو آپ دیکھیں گے کہ جس نلی سے وہ پائپ لگا ہوا ہے اور اس سے مستقلاً پانی نکل رہا ہے، نلی پر دباؤ بڑھتا جائے گا۔ نلی کمزور ہوگی تو پھٹ جائے گی یا اس میں چھید ہو جائے گا یا نل سے نلی نکل جائے گی۔ انسانی جسم میں دل اور شریانوں کی بھی تقریباً یہی صورت ہوتی ہے۔ باریک شریانیں ہائی بلڈ پریشر کی وجہ سے پھٹ سکتی ہیں۔ یہ حالت آنکھوں کی سفیدی میں دیکھی جا سکتی ہے۔ اس کے علاوہ جب بلڈ پریشر زیادہ ہو تو یہ آنکھ کے پردے (ریٹینا) کو خراب کرتی ہے جس سے اندھا پن ہو سکتا ہے۔ جب خون باریک نالیوں سے بہہ نکلتا ہے، فشارِ خون اگر مستقلاً بڑھ رہا ہے تو شریانوں کی اندرونی تہ سخت ہو کر ٹوٹتی ہے اور وہی ٹوٹے ہوئے اجزاء خون کی گردش کی وجہ سے دوسری نالیوں میں رکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں۔

یہ رکاوٹ دل کے دورے کا باعث بن سکتی ہے۔ دل پر جب شریانوں کی رکاوٹ کے باعث دباؤ پڑتا ہے تو اس میں ابتدائی طور پر دل کا کوئی ایک خانہ پھیل کر اس پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے اور جب یہ مسلسل اور حد سے بڑھ جائے تو پھر دل کا ایک حصہ پھیل جاتا ہے اس کیفیت کو دل کا کمزور پڑنا یا فیل ہونا کہتے ہیں اس وجہ سے پھیپھڑوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ ذرا سی حرکت سے سانس پھولے اور رات کو لیٹتے وقت سانس گھٹے یہ اسی بات کی علامت ہے۔ دماغ میں اسی دباؤ کے باعث جو کسی رکاوٹ کا نتیجہ ہوتا ہے شریان پھٹ جاتی ہے اور اس حصے کو جس کو وہ خون کی سپلائی کر رہی ہوتی ہے وہ حصہ مفلوج ہو جاتا ہے اور جسم کا وہ حصہ جس کو دماغ کنٹرول کرتا ہے اپنا کام چھوڑ دیتا ہے اور یہ کیفیت فالجی کہلاتی ہے۔ مثلاً چہرے کا لقوہ، جھٹکے لگنا، بے ہوش ہو جانا، ہاتھ پیر سوجنا وغیرہ، گردوں میں جب خون کی گردش کم ہو جاتی ہے تو گردے اپنا کام چھوڑ دیتے ہیں اس طرح خون میں یوریا کی مقدار بڑھ جاتی ہے آخر میں گردے فیل ہو جاتے ہیں یعنی خون صاف نہیں کر پاتے جو جان لیوا ہو سکتا ہے۔

اس کا کوئی علاج ہے؟

اس کا علاج دو طرح سے ممکن ہے۔ ایک تو حسبِ علامت دوا تجویز کردی جائے تاکہ وقتی طور پر بلڈ پریشر کم ہوتا کہ مزید کوئی پیچیدگی پیدا نہ ہو۔

دوسرا اس کے سبب کو معلوم کر کے اس کا علاج کیا جائے اور یہ ہومیو پیتھک علاج میں ممکن ہے۔

Belladona, Arsenic Alb, Adrenalin, Aurum Met, Baryta Mur, Carbo Animalis, Gelsemium, Glonoin Ignatia Nat-mur, Lachesis, Plumsnnmet, Thya, Vaaturink Strophanth, Cactus, Grtegm, Spigeliaetc.

یہ چند دوائیں عام استعمال میں آتی ہیں۔ ان کے علاوہ بھی کچھ دوائیں ہیں جو مریض کی کیفیت کے مطابق دی جاتی ہیں۔ اس لیے ہومیوپیتھک ڈاکٹر سے ملنا ضروری ہے۔

لو بلڈ پریشر

جب بلڈ پریشر 60 سے بھی کم ہو جائے تو اس کو ہم پست فشارِ خون یا لو بلڈ پریشر کہتے ہیں۔

بلڈ پریشر کم ہونے کی وجوہات

اس کے کم ہونے کی وجوہات بھی کئی ہوسکتی ہیں۔ جو مرضیاتی یا فعلیاتی ہوسکتی ہیں اور کچھ نفسیاتی بھی ہوسکتی ہیں ان میں:

☆ بہت زیادہ تھکان سے، بہت زیادہ چلنے، ورزش کرنے سے ☆ کسی بیماری (غم وفکر کے باعث) کے نتیجے میں کمزوری سے ☆ پانی و دیگر جسمانی رطوبتوں کی کمی کے باعث، دستوں میں آنتوں کی سوزش وغیرہ میں، کسی بھی جگہ سے خون کے اخراج کے باعث ☆ جلنے کے باعث ☆ خون کے زہریلا ہونے کے باعث ☆ صدمہ سے ☆ لو لگنے سے ☆ خون کی باریک نالیوں کے چوڑے ہونے کے باعث ☆ گردوں کی ایک بیماری سے ☆ دل کی بیماری کی وجہ سے، غم وفکر، ڈپریشن وغیرہ۔

علامات

اس حالت میں مریض مدہوش ہو جاتا ہے، رنگ پیلا ہو جاتا ہے، ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، سانس میں تیزی آجاتی ہے، نبض کمزور ہو جاتی ہے، ٹھنڈے پسینے آتے ہیں، چکر آتے ہیں، کمزوری محسوس ہوتی ہے، سر میں درد ہوتا ہے، نیند غائب ہو جاتی ہے اور بعض اوقات کوئی قابلِ ذکر علامت نہیں ہوتی۔ اگر یہ کیفیت برقرار رہے تو گردے خراب ہو جاتے ہیں، یوریا کی مقدار خون میں بڑھ جاتی ہے۔ دماغ کو خون پورا نہ ملے تو وہ بھی متاثر ہوسکتا ہے۔ ہاتھ پاؤں سوج سکتے ہیں۔

ایسی حالت میں کیا کریں؟

اگر مریض بے ہوش ہے یا سو رہا ہے تو اس کو اس طرح لٹائیں کہ اس کا سر نیچے اور ٹانگیں اوپر ہوں تاکہ دماغ کو خون کی سپلائی جاری رہے۔ اس کو فوراً کسی اسپتال یا کسی ڈاکٹر کے پاس لے جائیں جو اس کو ڈرپ لگائے گا اور ہوش میں ہے تو مریض کو نمکول یا شربت یا کولڈ ڈرنک میں ایک چٹکی نمک ڈال کر یا پانی میں نمک چینی ڈال کر پلائیں یا شہد ملا ہوا پانی دیں اور ساتھ ساتھ علاج پر بھی توجہ دیں۔ ڈاکٹر سے فوری رجوع کریں تاکہ ... ڈاکٹر سبب کی بنیاد اور علامات کی بنیاد پر جو دوا تجویز کرے اس کو استعمال کریں۔